داسی ڈھولن یار دی
فائزہ افتخار

دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔
کسی من چاہی چیز کو پا لینے کی جو سرشاری جو ہیجان ہونا چاہیے، وہ تھا مگر اتنا بلا خیز نہیں۔
اس نے اپنے اندر کوٹ کر یہ احساس بھرنا چاہا کہ آج وہ، وہ زندگی شروع کرنے جا رہا ہے جو اس کا خواب رہی ہے جو وہ ہمیشہ سے چاہتا تھا۔
اس احساس نے بیدار ہوتے ہی ایک بھرپور انگڑائی لی اور اس کا تو جیسے قد کئی انچ اونچا ہو گیا۔
ایک طویل گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے دل کو گویا کسی بھاری سل کے نیچے سے نکالا، جھاڑا پونچھا۔ امنگوں، آرزوؤں سے بساط بھر سجایا سنوارا اور دروازے کی ناب پہ ہاتھ رکھا۔

☆======☆======☆

اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا۔ دروازے کے باہر لگے راڈ کو گرفت میں لیا اور اپنے قدموں کی رفتار کچھ اور بڑھا لی۔
''ارے دیکھو، اس عورت کو، پاگل ہوئی ہے۔''
آس پاس سے گزرتے لوگوں نے بوکھلا کے کہا اور اسے سرزنش کرنے لگے۔
''بی بی...... کیا کر رہی ہو، خودکشی کا ارادہ ہے کیا؟''
ایک بڑے میاں نے تو ہانپتے کانپتے اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے باز رکھنے کی کوشش کی۔
اس نے اپنی رفتار بڑھاتے ہوئے ایک پاؤں اوپر کیا جو پائیدان پہ ٹک گیا۔ پلیٹ فارم پہ منہ اٹھا کے اسے تکتے لوگوں کا ایک سانس اوپر، ایک نیچے رہ گیا۔ دو تین عورتوں نے تو

جیسے چیخیں تک ماردیں۔

ٹرین کی کھڑکیوں سے جھانکتے بچوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ماؤں نے چھوٹے بچوں کو گردنوں سے پکڑ کر اندر کیا کہ کہیں معصوم ذہنوں پہ اس بہیمانہ حادثے کے اثرات نہ مرتب ہوجائیں جو کہ ان کی دانست میں ابھی ہونے والا تھا۔

مگر ایسا ہوا نہیں، ایک پاؤں پائیدان پہ جمانے کے بعد جب اس نے دوسرا اٹھا کے خود کو اونچا کیا تو وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ اب اس سے اگلے لمحے وہ کہاں ہوگی۔

ٹرین کے اندر......

یا ٹرین کے نیچے......

مگر دوسرے ہی پل اس کے دونوں قدم پائیدان پہ مضبوطی سے جمے تھے۔ اس نے ٹرین کے دروازے کے آہنی راڈ دونوں جانب سے تھام رکھے تھے اور اس کی سیاہ چادر ہوا سے پھڑ پھڑا کے باہر لہرا رہی تھی۔

پلیٹ فارم پہ کھڑے لوگ دور تک اس سیاہ دھبے کی صورت نظر آنے والی ہلتی چادر کو دیکھ کر اب تک تبصرہ کررہے تھے۔

''ایسی بھی کیا مصیبت تھی۔ اگلی ٹرین کا انتظار نہیں کرسکتی تھی۔ جان خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ہوسکتا ہے کوئی ایمرجنسی ہو۔ بے چاری کو کہیں جانے کی جلدی ہو۔''

''تم نے دیکھا...... خالی ہاتھ تھی...... سفر کے ارادے سے نکلی تھی تو سامان تو ہوتا پاس۔''

''ہاں، مجھے بھی معاملہ کچھ گڑ بڑ والا لگ رہا ہے۔ کوئی عام عورت ایسی جی داری کا مظاہرہ نہیں کرسکتی۔''

''ہوگی کوئی سرپھری۔''

☆======☆======☆

''اماں تیرے کو پتہ ہے نا، میں کتنی سرپھری ہوں۔ میرا مگز (مغز) نہ خراب کیا کر۔''
اس نے ہتھوڑے سے اخروٹ دھڑا دھڑ کوٹتے ہوئے کہا۔

''بوہتی زبان نہ چتر چتر چلا۔''

بھاگاں نے اس کے گندھی ہوئی مینڈھیوں والے سر پر ایک چپت لگائی اور وہ جو پنجوں کے بل کچی زمین پہ بیٹھی تھی، توازن برقرار نہ رکھ سکی اور آگے کی جانب لڑھکتے لڑھکتے بچی۔

''کیا ہے اماں! اپنے پنجے قابو میں رکھا کر۔''

وہ حلق کے بل چلائی اور بھاگاں کا اور تو بس نہ چلا، وہ لیروں لیر ہوئی جھولی اٹھا کے اسے منہ بھر بھر کے کوسنے دینے لگی۔

''چھوری......! دھیر راتی (آدھی رات) تیری منجی اٹھے۔''

''اچھا ہے آدھی رات کو اٹھے گی۔ تتی (گرم) دھوپ تو نہ ساڑے گی۔'' وہ قل قل کر کے ہنسی۔ دنداسے سے سجے بھرے بھرے ہونٹوں کی اوٹ سے کچے کھوپڑے کی گری کی سی رنگت والے دانتوں کی قطار بجی نظر آئی۔

''کیڑے پڑیں تیری مٹی میں۔'' وہاں بددعاؤں کا سلسلہ جاری تھا۔

''لے...... کون سی نویں بات ہے۔ ساروں کی مٹی میں کیڑے ہی ڈلنے ہیں اور کیا گندلوں کا ساگ پھوٹنا ہے۔'' یہاں قل قل کا سلسلہ جاری تھا۔

''بھری جوانی میں اجڑے شوہدی۔'' سلسلہ اور بھی شد و مد اختیار کر گیا اور اس بار وہ اس بات کو ہنسی میں نہ اُڑا سکی۔

''کیسی ماں ہے تُو...... کلیجہ نہیں پھٹتا ایسی بددعائیں دیتے ہوئے۔''

''اور تُو کیسی نکھٹی (نکمی) چھوری ہے، ماں کے منہ کو آتی ہے۔''

بھاگاں کو اس سے گلے ہی بڑے تھے۔ وہ تھی بھی تو اس کی سب سے نکمی بیٹی۔ بڑی والی مروفاں کا دم بھرتے وہ تھکتی نہ تھی۔ بے چاری کی عمر تھوڑی تھی۔ چھبیسویں سال تیسرا بچہ جنتے ہوئے مرگئی تھی مگر چھبیس سال تک جیتے جیتے بھی اس نے بھاگاں اور صدورے کو فاقے کبھی نہ کرنے دیئے تھے۔ کرموں والی ایسی چودھویں سال چڑھی تھی کہ پھر دونوں نے چھوٹی والی سے تو جیسے توجہ ہی ہٹالی تھی۔ چودہ سال کی کچی عمر میں ہی پٹواری صاحب کی نظر اس پہ ٹھہر گئی تھی۔ پٹواری کی بیوی، چونتیس سالہ بارہ من کی دھوبن ساتواں بچہ پیدا کر کے نواڑی پلنگ پہ ڈھیر پڑی تھی۔ مروفاں کو بھاگاں نے ہی اپنی جگہ بھیجا تھا۔ پٹوارن کی پنڈلیاں دبانے۔ ساتواں بچہ ہوئے کوئی تیسرا روز تھا جب پٹواری ماں کے کہنے سننے پر طوعاً و کرہاً پٹوارن کے کمرے میں داخل ہوا۔ مروفاں کی تب پیٹھ تھی اس کی جانب، وہ پلنگ کے ایک کونے پہ سکڑی بیٹھی پٹوارن کی پنڈلیاں دبا رہی تھی۔ پٹواری صاحب نے پنگھوڑے میں پڑے چھیچھڑا...... سے کاکے کو دیکھا۔ وہی ماں جیسا الٹے توے کی سی رنگت اور ابلے دیدوں والا۔ اس کے بعد دنیا داری کو یا شاید خدا خوفی کو۔ کھڑے کھڑے بیوی کا حال پوچھتے قریب آیا اور نظریں ہائے ہائے کرتی پٹوارن کی آبنوسی ستونوں جیسی پنڈلیوں پہ دھری مومی انگلیوں

پہ جم گئیں۔ سیاہی میں اجال کچھ زیادہ ہی اجلا لگ رہا تھا۔

اور مروفاں بعد میں دو سال اتراتی پھری تھی۔

''میرا مرد تو میرا منہ دیکھے بغیر...... نری میری انگلیاں دیکھ کے ہی لٹو ہو گیا تھا۔''

پٹواری اسے دو سال سے زیادہ اپنے نکاح میں نہ رکھ سکا تھا۔ اس کی بڑی بیٹی اپنے تایا کے گھر مانگی ہوئی تھی۔ پندرہویں لگتے ہی وہ بھائی کو اس کی امانت واپس لے جانے کے لیے اشارے دینے لگا مگر بھرجائی جو پٹوارن کی سگی بہن بھی تھی، یعنی پٹواری کی سالی...... اس کی شرط یہ تھی کہ پہلے وہ اپنی دوسری بیوی مروفاں کو طلاق دے پھر بیٹی رخصت کرنے کا سوچے۔

دوسری جورو کا کیا ہے، یہ نکلتی...... چند دن بعد اور آجاتی مگر بیٹی کی منگنی ایک بار ٹوٹ کر کہاں دوبارہ ہونی تھی، اس لیے نہ مروفاں کا پیر پکڑنا کام آیا، نہ بھاگاں کے واویلے اور کوسنے۔ پٹواری نے اسے طلاق دی، حق مہر کے گیارہ ہزار اور گیارہ تولے سونا ہاتھ میں پکڑایا اور اسے صدورے کے گھر دوبارہ بھجوانے کے اگلے ہفتے بھائی کو بیٹی کی رخصتی کی تاریخ دے دی۔

مروفاں جس نے جوانی میں پہلا قدم رکھنے سے بھی پہلے سوکن ہونے کا اعزاز پالیا تھا۔ عمر کے سولہویں برس میں آ کے ایسی منہ زور ہو چلی تھی کہ گاؤں بھر کی عورتوں کو اپنی سوکن لگنے لگی۔ ساری اس کے سائے سے بھی دور بھاگتیں۔ ادھر بھاگاں اور صدورا بھی اس سے خاص خوش نہ تھے۔

''چھوری...... تجھے جاچ نہ آئی خصم کو قابو میں رکھنے کی۔''

ماں کو ساری غلطی اس میں نظر آئی۔

''ایسی ملائی جیسی جورو جس کی ہو اور پھر بھی وہ اسے گنڈیری کا پھوک سمجھ کے تھوک دے تو گلتی (غلطی) کس کی، خصم کی یا جورو کی۔''

''اسے کیا کوستی ہے کوڑھی۔'' صدورا، بھاگاں کو لتاڑتا۔

''تُو ماں تھی...... تُو کوئی چج سکھا دیتی چھوری کو۔ ساری دیہاڑی بس گھاگرا ہلاتی لور لور کر چھوڑتی ہے۔ جرا گوڈے سے لگا کے کنی (کان میں) ڈالتی تو...... کہ کیسے اس کے ناک میں نکیل ڈالنی ہے۔ دو سال کھوہ میں ڈال دیئے اس کوڑھی نے۔''

''ابا......! وے میں نے کیا کیا۔ اس کے ڈھور ڈنگر کا گوبر تھاپا۔ اس کی اس بڈھی مسٹنڈی زن کے بچے پالے۔ یہ حویلی جتنے چوبارے کے پوچے لگائے۔ سفیدی کے لیپ کیے۔ راتی (راتوں کو) کالی کر کے اس مرن جوگے کے جھگے (کُرتے) کاڑھے۔ ہور کیا

کرتی میں۔ جتنا جوگا ہو سکا تمہارے منہ بھی بھرتی رہی۔''

''ہے...... کالی بوتھی......'' بھاگاں نے لپک کے اس کے گال پہ طمانچہ دے مارا۔

''ویہڑا ابھرا تھا تیرے خصم کا۔ دس دس بارہ بارہ مجیں (بھینسیں) کھڑی تھیں۔ دو تین سیر دودھ یا کدی کدی کا گھیو (گھی) مکھن بھیج کر کون سا احسان کرتی تھی؟''

''ہفتے کے ہفتے جو اناج گوشت پھل آتا تھا، اس میں سے پوٹلی بھر کے بھیج دینے سے کون سے منہ بھرتی تھی تُو۔ تیرے ان ہی بہن بھائیوں کے اوجڑ (معدے) بھرتے تھے۔'' باپ نے بھی آنکھیں دکھائیں۔

اصل غصہ ہی اس بات کا تھا کہ وہ جو دو سال ذرا خوش حالی دیکھ لی تھی کھاتے پیتے اور ڈولتی عمر کے داماد کی بدولت، وہ اچانک ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ دکھ بیٹی کو طلاق ملنے کا نہ تھا، اس بات کا تھا کہ اچھی بھلی چھ جانوں کا بوجھ اٹھانے والی خود ساتواں بوجھ بن کے دوبارہ سے چھاتی پہ مونگ دلنے آ بیٹھی تھی۔

''اور وہ دوجی کہاں ہے، نجر نہیں آتی؟''

صدورے کا دھیان مروفاں سے آٹھ سال چھوٹی گلابو کی جانب گیا۔ پانچ اولادوں میں یہ دو لڑکیاں تھیں۔ سب سے بڑی مروفاں پھر چار بچے اور ہوئے جن میں دو لڑکے بچ رہے، باقی ایک لڑکا اور ایک لڑکی بھوک اور مختلف بیماریوں کا شکار ہوئے۔ ان دونوں لڑکوں کے بعد گلابو تھی۔ اس کے بعد کا ڈھائی سال کا بچہ وہ تھا جو چوبیس گھنٹے بھاگاں کے کولہے پہ ٹکا رہتا تھا۔

''شوہدی کی اڈی (ایڑھی) ہی نہیں لگتی مٹی پہ۔ ہورے کدر اُڑی اُڑی پھرتی ہے؟''

ماں سدا سے اس سے بے زار تھی۔

''میں دیکھ کر آتی ہوں ابھی۔'' پنجوں کے بل بیٹھی آنسو بہاتی مروفاں ایک دم اٹھی اور ایک ہاتھ سے گھاگھرا ٹھیک کرتی دوسرے سے بکھرے بال سنوارتی تیر کی طرح کچی کوٹھڑی کا دروازہ پار کر گئی۔ صدورے اور بھاگاں دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

''چھوری کا من روز دیہاڑے گلی میں لگے ہے۔ جرا پتہ رکھا کر۔'' صدورے نے ٹھنڈی پڑی چلم کو کھنگھالتے ہوئے صلاح دی۔

''پتہ رکھنے کا ویلا گجر گیا صدورے۔ ہے تو سولہ ورے (سال) کی مگر دو سال مرد برت کے آئی ہے۔ تیرے میرے کہنے کی نہیں رہی اب۔ منہ جور سانڈنی بن گئی ہے۔''

''میں سنگی (گلا) نہ گھٹ کے رکھ دوں اس کی۔'' صدورا دھاڑا۔ اس کی دھاڑ سن کے بھاگاں کے کولہے پہ چھپکلی کی طرح چپکا بچہ اپنی گدلی آنکھیں میچ کے چلانے لگا۔

''اسے بتادیو، ابھی پیو جندہ ہے اس کا۔ کھے (خاک) چھانے گی تو کھے میں ہی ملا کے رکھ دوں گا۔ بلا اسے اور لاتاں توڑ کے بٹھا...... سنگلی (زنجیر) ڈال کے رکھ...... اگر آرام سے نہ مانے تو۔''

صدورا کم ذات سہی مگر غیرت بڑی بھرپور جاگی تھی اس کی اور اس کی بیداری کا مظاہرہ اس نے رات کو کیا بھی۔ مروفاں کی پسلیوں میں گھونسے مار مار کے۔

''بول ری...... کون ہے جس کے ساتھ کماداں میں منہ کالا کر رہی تھی۔''

''بولتی کیوں نہیں۔'' بھاگاں نے بھی ٹہوکا دیا۔ ''وے صدورے، مجھے تو لگے ہے۔ پٹواری نے بھی کوئی کیڑا دیکھا ہوگا تو ٹھڈا مار کے باہر نکالا ہوگا۔ چھوری کی منگ ٹوٹنے کی کہانی ساری اسی بدجات نے بنائی ہوگی۔''

''نہیں مائی...... میں نے کج نہیں کیا...... تیرے جوائی کے پاس جو دو ورے (سال) لگائے، میری اکھاں پھوٹ جائیں مائی جو اس کے علاوہ کوئی دوجا نجر بھر کے بھی دیکھا ہووے۔'' وہ بلک بلک کے رودی۔

''تو وہ کون سا شہجادہ (شہزادہ) ہے جسے نجر بھر کے دیکھنے تُو آدھی رات کو کماداں میں گئی تھی۔'' بھاگاں نے اس کی گز بھر لمبی چوٹی پکڑ کے جھٹکے لگائے۔

''چوہدری منظور......'' وہ درد سے دوہری ہوتی سسکیوں کے درمیان نام لے رہی تھی اور دونوں میاں بیوی بے یقینی سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

''چوہدری منظور کا پتر......'' سب سے پہلے صدورے کے ہونٹوں میں سرسراہٹ ہوئی۔

''پر کون سا والا؟ وڈا کہ چھوٹا...... کہ لہور شہر میں پڑھنے والا؟'' بھاگاں نے تین کے نام کھڑے کھڑے گنوائے۔

''یا وہ جو ولایت سے آیا ہے۔'' صدورے کو اس کا بھی خیال آگیا جو جرمن بیوی ساتھ لے کر آیا تھا۔ ایسی نیلی آنکھوں والی میم کے ہوتے اسے کیا ضرورت تھی۔ چنگڑوں کی جھونپڑی میں نظر ڈالنے کی۔

''نہیں، چوہدری منظور آپ......'' وہ بڑبڑائی اور صدورے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ بھاگاں کے ہاتھ کی گرفت سے مروفاں کی چوٹی بھی آپوں آپ نکل گئی۔

''چوہدری منظور...... وہ بڈھا......؟'' وہ چلائی اور پھر دونوں ہاتھوں سے ایک بار پھر پیٹنے لگی مگر اس بار تختہ مشق مروفاں نہیں، وہ خود تھی۔ صدورا بھی سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

''کوڑھی...... تجھے بھرے پنڈ میں وہی نجر آیا تھا۔''

''مجھے وہ نہیں، اسے میں نجر آئی تھی۔ تجھے پتہ تو ہے چوہدریوں کا اور دیکھ ابا! تُو جتنی مرجی (مرضی) سنگلیاں (زنجیریں) ڈال کے بٹھا دے مجھے، اگر چوہدری کو میرے سے ملنا ہوگا تو وہ بندے بھیج کے مجھے تیری اکھاں کے سامنے سے بھی اٹھا کے لے جاوے گا۔''

''چنگڑ، جرور ہوں چھوری...... عجت والا ہوں اور ایسا بھی اندھیر نہیں مچا۔ یہ کوئی انگریجوں کا جمانہ (زمانہ) نہیں ہے جو چوہدری من مانی کرتے پھریں۔ ووٹاں کا جمانہ ہے ووٹاں (ووٹ) کا۔ ہم گریب سہی پر ایک واج (آواز) دوں تو پرچے کاگد (اخبار) والے ان چوہدریوں کے کالے کرتوت سرکار کے سامنے لے آویں گے پھر کس منہ سے مانگیں گے یہ ووٹاں۔ میں ابھی جا کے سارا پنڈ اکٹھا کرتا ہوں۔ ساروں کو بتاتا ہوں چوہدری میری دھی کو دھمکی دے کر راتی ویلے کماداں۔''

''بس کر ابا...... گریبوں کی اب سنی جاتی ہے مگر عجت والے گریبوں کی۔ تیری طرح یو گلی محلے کا کوڑا اکٹھا کرنے والے چنگڑ کی کون سنے گا اور جن ووٹاں کا تُو رولا ڈال رہا ہے، وہ کب کے ہو کے مک مکا گئے۔ چوہدری منظور ہی جیتا ہے، آلے دوالے کے سات پنڈوں کے ووٹ لے کر۔ اب تیری کوئی نہیں چلنی اور میں بھی کوئی اس چٹے جھاٹے (بال) والے کے عشق میں ڈوب کر اپنی حیاتی کالی کرنے نہیں جاتی۔ تیرے اور تیرے ان تین پتروں کی حیاتی بچانے کے لیے جاتی ہوں۔''

دونوں اپنے نصیبوں کا ماتم کرنے بیٹھ گئے جس بیٹی نے عمر کے چودھویں سال انہیں ان کی برادری میں دو وانچ اونچا کر ڈالا تھا پٹواری کی بیوی بن کے، اب عمر کے سولہویں سال انہیں رولنے لگی تھی۔

''اس کے مہر کے گہنے بھی تُو نے بیچ ڈالے صدورے، ورنہ کوئی برادری کا لولا لنگڑا رشتہ ہی جڑ جاتا اور میں اسے نکال کے شکرانے کے نفل نیتتی (نیت باندھتی)۔ اب سانبھ (سنبھال) یہ گند۔ ساری حیاتی لوگوں کا گند سانبھا ہے، اب اپنا سانبھ۔''

''میں کل ای بات کروں گا چوہدری منظور سے۔''

صدورے کے فریاد کرنے پر چوہدری منظور نے اس سے کہا۔

''تُو خرچہ پانی لے لیا کر صدورے!''

وہ سن ہو کے رہ گیا۔ بیٹی کی عزت کی ایسی کھلی قیمت۔

''مائی باپ......دھی ہے وہ میری......''

''اسی لیے تو تجھے کہہ رہا ہوں کسی کی بیوی ہوتی تو دام اسے چکاتا، ابھی تو تیرا حق بنتا ہے۔''

گھنی بل دار مونچھوں کے پیچھے سے اس کی خبیث مسکراہٹ جھلک رہی تھی۔

''میں تو پنڈ میں کدرے (کہیں) منہ دکھانے جوگا نہیں رہوں گا۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑا اٹھا۔ جانتا تھا، اب تک بات چھپی ہوئی تھی۔ سو چھپی ہوئی تھی مگر جب چوہدری اتنا کھل کے بات کر رہا ہے تو پھر وہ دبنے والا نہیں۔ خرچہ پانی کی بات کر کے وہ گویا مروفاں کو اپنی باقاعدہ داشتہ بنانا چاہتا ہے۔

''تو کیا کرنا ہے منہ دکھا کے۔ تیرا منہ دیکھ کے گاؤں والے کون سا موتیوں سے بھر دیتے ہیں۔'' چوہدری منظور نے بلغم بھرا قہقہہ لگایا۔

''منہ چھپا کے بیٹھا رہ اور عیش کرتا رہ۔''

''نہیں چوہدری صاحب! ایہہ جلم نہ کماؤ۔ میری ایک دھی اور بیٹھی ہے۔ لوگ تھو تھو کریں گے میرے ناں پہ۔''

''اوئے کیا بک بک لگا رکھی ہے، چل اٹھ یہاں سے۔''

چوہدری منظور کے سر چڑھتے شوکے نے اسے بازو سے پکڑ کے اٹھانا چاہا مگر چوہدری نہ جانے کس ترنگ میں تھا، ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

''چھوڑ دے شوکے۔ ہاں، بتا صدورے! کیا چاہتا ہے؟''

''چوہدری صاحب! میری عجت کو اپنی عجت بنا لو۔ نکاح میں لے لو میری چھوری کو۔''

اس بات پہ چوہدری نے کچھ اس انداز میں صدورے کو گھورا کہ شوکے کا ہاتھ سیدھا اپنی قمیص کے داہنی جانب چلا گیا، جہاں بھاری ریوالور لٹک رہا تھا۔ وہ چوہدری صاحب کی ایک جنبشِ ابرو کا منتظر تھا اور چوہدری چند ثانیے کے سکتے کے بعد جنبش پہ آمادہ ہوا تو ایک بلند و بانگ قہقہہ اس کے پھیپھڑوں کو تھرتھرانے لگا۔ شوکے کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

صدورا جیسے خود یہ مطالبہ کر کے شرمندہ ہو گیا۔ اس کی جورو اور لڑکیوں کو تو حویلی کی عام ملازماؤں کی طرح وہ کام کاج کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی جو آدھے گاؤں کی عورتیں اجرت یا بغیر اجرت کے آ کے کیا کرتی تھیں۔ انہیں نہ برتن کپڑے کو ہاتھ لگانے کی اجازت تھی نہ

باورچی خانے کے اندر قدم دھرنے کی۔

اور وہ اپنی اس لڑکی کو چوہدری کے نکاح میں دینے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ دزدیدہ نظروں سے اس نے بھی شوکے کے پہلو سے کنڈلی مارے کالے ناگ کو دیکھا جو کبھی بھی اس پہ چل سکتا تھا۔ اب اسے اپنی زبان سے نکلے ان الفاظ کی سنگینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس نے چوہدری منظور کے پیروں میں گرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔

''غلطی ہو گئی مائی باپ......معاف کر دو سرکار...... بڑا بول منہ سے نکل گیا......معاف کر دو چوہدری صاحب......بس معافی دے دو......''

''اچھا اچھا......ٹھیک ہے۔ پیر چھوڑ اور شوکے اسے کچھ دے دلا کے فارغ کر، کہاں سے صبح سویرے متھے لگ گیا ہے۔''

''نہ چوہدری صاحب نہ......'' وہ پھر سے گڑگڑانے لگا۔

''دھی کے دام نہ لوں گا۔ اس کام کے لیے مجبور نہ کرو چوہدری صاحب! بس معافی دے دو ہم غریبوں کو۔ آپ کو کوئی تھوڑ تھوڑی ہے۔ جدھر ہاتھ ڈالو زنانیاں ہی زنانیاں۔ میری دھی کو بخش دو، بدنام ہو گئی تو کیا کروں گا چھوری کا۔ ابھی عمر کیا ہے نمانی کی۔ آپ کا جی بھر گیا تو بعد میں کون بیاہنے آئے گا کوڑھی کو۔''

'یہ ہے نا، شوکا......''

چوہدری منظور کے بے دھڑک کہہ دینے پہ شوکا تک بدک اٹھا مگر اگلے ہی پل نظریں جھکا کے سینے پہ ہاتھ باندھ لیے۔

''کیوں مخول کرتے ہو چوہدری صاحب...... پھٹا ہوا دودھ کون پیتا ہے؟''

''پھٹا ہوا دودھ اگر چوہدری منظور کا جھوٹا ہو تو شوکا تبرک سمجھ کے پی لے گا۔ کیوں شوکے؟''

''آپ سرکار ہیں چوہدری صاحب!'' وہ ادب سے گویا ہوا۔

''چلو، یہ گلہ بھی دور کرتے ہیں تمہارا صدورے، دراصل وہ جو لڑکی ہے نا تیری۔ کم بخت بڑی زور آور چیز ہے۔ کمال ہے تجھ چنگڑ کے گھر کیسے پیدا ہو گئی۔ آن بان تو حاکموں والی لگتی ہے۔ اوئے...... ذرا یاد کر کے بتا...... کسی چوہدری...... حاکم یا ٹھاکر کا آنا جانا تو نہیں تھا تیرے گھر۔''

اس نے ٹھٹھا لگایا۔ صدورے کا نسواری رنگ شرم کے مارے سیاہ پڑ گیا جبکہ شوکا چوہدری منظور کے قہقہے کا ساتھ دینے لگا۔

''واقعی...... کسی دن ٹُوہ تو لے زنانی کی۔ شاید سچ اگل دے۔ قسم رب کی۔ تیرا خون نہیں لگتی۔'' اس کا تھل تھل کرتا وجود صدورے کو زہر لگ رہا تھا اور وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب یہاں آیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا ابھی گھر جائے اور مروفاں کو تو جلتے تندور میں پھینکے ہی، ساتھ ساتھ بھاگاں کو بھی ادھیڑ کے رکھ دے جس نے اوقات سے باہر ہوتے ہوئے ایسی آفت لڑکیاں پیدا کر دی تھیں۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مروفاں کے لیے میں اتنا کر سکتا ہوں کہ نکاح کا بندوبست کر لوں۔ حالانکہ یہ میرا دردِ سر نہیں ہے لیکن پھر بھی۔ بات تو ٹھیک ہے تیری...... چھوٹا سا گاؤں ہے، بات چھپی نہیں اور نہ چھپے گی تو بے چاری کا اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو جائے گا تو ٹھیک ہے اگلے جمعہ کو نکاح رکھ لیتے ہیں۔''

صدورا گنگ بنا بے حس و حرکت، پلکوں تک کو جنبش دیئے بغیر اسے تک رہا تھا، جو صد فیصد سنجیدہ لگ رہا تھا۔

''مخول کر رہے ہو چوہدری صاحب؟''

''اوئے...... تیرا میرا مخول ہے......؟'' وہ گرجا تو صدورے کی بندھی ہتھیلیاں ماتھے پہ جا لگیں۔

''جا...... جا کے انتظام کر۔ جمعہ کو عصر کے بعد اور مغرب سے پہلے آجائے گا شوکا مولوی لے کر۔''

''شوکا......؟'' صدورا چونکا۔

''ہاں تو اور کیا گورنر کو بھیجوں تیرے دروازے؟ ذات کا لوہار ہے شوکا...... چھتیس سال کا گبھرو جوان...... مہینے کے سات ہزار کمانے والا...... اپنا پکی چھت والا مکان ہے اور اس سے اچھا جوائی کہاں سے ملے گا تجھے اپنی طلاقن لڑکی کے لیے۔''

صدورا نہ ہاں کرنے جوگا، نہ ناں کرنے کے قابل۔

☆======☆======☆

''یہ کیا کیا تُو نے صدورے...... تُو وہاں گیا ہی کیوں؟''

بھاگاں کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا تو وہ پیٹ اٹھی۔

کوٹھڑی کی ایک دیوار کے ساتھ مروفاں گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اسے بھی اب احساس ہو رہا تھا کہ پٹواری کے دھتکارے جانے کے بعد وہ جو اپنی کچلی ہوئی انا اور ترسی ہوئی خواہشات کی تسکین کے لیے اس پچاس پچپن سالہ چوہدری کی نظرِ التفات کو ہی بڑا سہارا مان کے بہل

گئی تھی۔ یہ سہارا اسے کس موڑ پہ لے جانے والا ہے۔

''مت ماری گئی تھی میری۔ میں نے سوچا عجت کی دہائی دوں گا۔ اسے کہوں گا تیری بھی دھی جیسی ہے میری چھوری۔ پہلاں تو مول لگانے لگا تھا بدجات۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ چنگڑ ہوں کنجر نہیں جو چھوری کی عجت کے پیسے لوں مگر اس نے مجھے کنجروں سے بھی گیا گزرا بنا دیا بھاگاں! اب وہ جورو شوکے کی ہوگی اور زن چوہدری کی۔''

''یہ بات تو تیرے میرے کو پتہ ہے نا صدورے! پنڈ کے سامنے تو ہم اسے شوکے کے ویہڑے ہی اتاریں گے۔ مولوی کے سامنے سر تو وہ شوکے کے نام پہ ہلائے گی۔ اپنی اتنی عجت ہی بن جاوے تو بڑی بات ہے۔''

''مگز (مغز) کھراب ہے کیا تیرا؟'' وہ بھڑا۔

''ناں...... تب تُو راجی (راضی) ہوگا جب چوہدری اسے اٹھا کے لے جائے گا اور سال ڈیڑھ سال بعد چبی (چبائی) ہوئی ہڈی کی طرح واپس پھینک جائے گا۔ تب روتے رہنا اس عجت کو۔''

بھڑا ہوا صدورا جلد ہی اعتدال پہ آ گیا۔ غیرت پہ مجبوری اور مصلحت حاوی ہو گئی۔

''چھوری...... چپ کر جا...... یہی لکھا تھا نصیبے میں۔''

سکتے کے عالم میں بیٹھی مروفاں کے سر پہ اس نے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''مائی...... یہ دیکھ تختی لکھی ہے میں نے۔''

آٹھ سالہ گلابو ہاتھ میں تختی اٹھائے ننھی منی ایڑیاں زمین پہ لگائے بغیر اچھلتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور اندر کا ماحول دیکھ کے رک گئی۔

''کٹ پڑی ہے مروفاں کو؟'' بہن کے آنسو دیکھ کے اسے پہلا خیال یہی گزرا۔

''ہاں، بڑی ڈھاڈی......'' مروفاں نے آہ بھر کے کہا۔

''نی چل نی...... ہوکے نہ بھر......'' بھاگاں نے گھرک کے اسے چپ کرایا اور پھر گلابو کو مطلع کیا۔

''تیری بہن کی شادی ہو رہی ہے۔ اگلے جمعہ جنج آئے گی۔''

''جنج......؟'' گلابو کو بارات کے نام پہ سہرا، باجہ، گھوڑا، دولہا، گوٹے کناری کا جوڑا، نہ جانے کیا کچھ یاد آ گیا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں مارے خوشی کے پھیل گئیں۔

''لاڑھا بھی آئے گا۔''

''لے...... جھلی...... بغیر لاڑھے (دلہے) کے کون سی جنج ہوتی ہے۔'' بھاگاں کی ہنسی

اس وقت مروفاں کو زہر لگ رہی تھی، جب ہی پھنکار کے بولی۔

''اک نہیں، دو دو لاڑھے۔''

''چپ نی......'' بھاگاں نے اس بار لحاظ نہ کیا اور رکھ کے ایک کرارا طمانچہ اس کے گال پہ دے مارا۔

''دو دو لاڑھے۔'' گلابو خوشی سے پاگل ہی تو ہو گئی۔

''ابا......دو دو لاڑھے آئیں گے......جنج آئے گی......مروفاں کے دو دو لاڑھے۔''

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کے ناچتی گاتی باہر گلی میں نکل کر اعلان کرنے ہی والی تھی کہ مروفاں کو لگنے والے طمانچے سے کئی گنا کرارا طمانچہ اس کے گال پہ لگا۔ اس بار ہاتھ اٹھانے والا صدورا تھا۔

''چل اندر...... ہر ویلے گلی کا ککھ بنی رہتی ہے۔ دفع ہو اندر۔'' وہ اتنی خوفزدہ ہوئی کہ رو تک نہ سکی۔ گال پہ ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

''یہ تو ہے ہی تھمنی (نکمی) گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتی کب ہے۔ اماں جنتے کے ویہڑے ہی گھسی رہتی ہے۔ کبھی قاعدے چاٹتی رہتی ہے، کبھی تختیاں لکھتی رہتی ہے۔ وڈی ماسٹرنی......''

بھاگاں نے اس کی شکایت لگائی۔

☆======☆======☆

اور پھر جمعہ کو شوکا حسبِ وعدہ بارات لے کر آیا جس میں اس کے اور نکاح پڑھانے والے مولوی کے علاوہ صرف دو لوگ اور شریک تھے۔ گلابو کے سارے جوش پہ پانی پھر گیا۔ وہ تو بارات پہ پھینکے جانے والے سکوں کو لوٹنے کے لیے پوری طرح سے تیار تھی۔ کرن لگا ننھا سا دوپٹہ کس کے کمر پہ باندھ لیا تھا۔ چوڑیاں...... اتار کے ایک طرف رکھ دی تھیں کہ پیسے لوٹتے ہوئے گلی کے دوسرے بچوں کے ساتھ دھکم پیل میں ٹوٹ ہی نہ جائیں مگر سکے تو ایک طرف، کسی نے چار پتی پھول کی پھینکنا گوارا نہ کیا۔ نارنجی رنگ کے بروکیڈ کے جوڑے میں لپٹی مروفاں چاندی کا ٹیکا، چاندی کی نتھ اور سونے کا چھلکا سا سیٹ پہنے دھاڑیں مار کے روتی اس شخص کے ساتھ رخصت ہوئی جس کے چہرے سے ہی واضح تھا کہ وہ اس تمام عمل کے دوران کتنے ضبط سے گزر رہا ہے۔

گلابو ایڑیاں اٹھا اٹھا کے وہ دوسرا دولہا ڈھونڈتی رہی جس کے بارے میں مروفاں سے سنا تھا۔ ایک بار دل چاہا کہ باپ سے جا کے پوچھ ہی لے اس کے بارے میں مگر پھر گال پہ

ہونے والی سنسناہٹ نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

''لے...... یہ تو ایسے پچھاڑیں کھا رہی ہے جیسے پہلی بار ووہٹی بنی ہو۔''

اس کے بدکنے کا تماشا دیکھتی ایک ہمسائی نے چٹخارہ لے کر کہا۔

''پتہ نہیں، اس چنگڑی کو اتنے اچھے وَر (بر) کدر سے مل جاتے ہیں۔ ہماری تو چن جیسی دھیاں بھوتوں سے ویاہی گئیں اور بھوت بھی بھوکے ننگے۔''

''تیری میری دھیاں عجت کج (ڈھک) کے گھراں کے اندر جو بیٹھی ہیں سیانیے۔'' دوسری نے نخوت سے ناک سکیڑ کے کہا۔

''صدورے کی یہ چھوری تو وَر تاڑتی پھرتی ہے۔''

''آپے مچل رہی تھی دوجی واری ووہٹی بننے کو۔ اب ایسے ڈھاٹیں مار کے رو رہی ہے جیسے قصائی مج لے کے جا رہا ہو اس کی۔''

سب اس کے تڑپنے اور چلاّنے پہ قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ صرف مروفاں ہی جانتی تھی کہ وہ کس عذاب سے گزرنے والی ہے۔ ایک کی بیوی بن کے دوسرے کی دلہن بننا آسان نہیں ہوتا۔ ایک سے نکاح کے بولوں پہ ہاں کہہ دینے کے بعد کسی دوسرے کی سیج سجانے کی تکلیف کم نہیں ہوتی۔

پھر یہ ہوا کہ جیسے کوئی درد، کوئی تکلیف مسلسل ہو تو بندہ بے پرواہ ہو جاتا ہے یا پھر عادی۔ ویسے ہی مروفاں بھی عادی ہو گئی اس کے لیے معمول سا بن گیا۔ دن بھر شوکے کے گھر میں ایک گھر ہستن کی طرح مصروف رہنا اور شام ہوتے ہی چوہدری منظور کے لیے بننے سنورنے میں لگ جانا۔ شوکا خود اسے پچھلے دروازے سے چوہدری منظور کے ڈیرے تک پہنچا کے آتا تھا۔ اس کے دل کا تو پتہ نہیں تھا مگر مروفاں کے لیے جیسے ایک ایک قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا تھا۔ بھلے چوہدری کے پاس جا کے وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اس کی محبت، اس کے تحفے، اس کے جھوٹے وعدے، سب اسے بہلا لیتے تھے لیکن وہ اکثر سوچا کرتی۔ اگر شوکا اسے چھوڑنے نہ جایا کرے تو یہ چھوٹی سی اندھیری گلی جو شوکے کے کوارٹر کے پچھلے دروازے سے سیدھی چوہدری کے ڈیرے تک جا نکلتی ہے، کتنی جلدی طے کر سکتی ہے وہ۔

''تو نہ جایا کر میرے ساتھ۔ میرے کو رستہ آتا ہے۔''

''اور میرے کو اپنا کام پورا کرنا آتا ہے۔''

اس نے چادر کی بکل لیتے ہوئے اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔ مروفاں نے ہمیشہ اس کی نظروں میں اپنے لیے نفرت اور غصہ ہی دیکھا تھا۔

''ڈیلے کیوں نکالتا ہے؟'' وہ جز بز ہو جاتی تھی اس کی تنفر بھری نظروں سے۔

''اپنی مرجی سے نہیں جاتی، تُو آپے چھوڑ کے آتا ہے۔ کسی دن نہ چھوڑنے جا پھر دیکھ چوہدری کیسے اپنے کتوں کے آگے ڈالتا ہے۔''

''ہونہہ...... اپنی مرجی سے نہیں جاتی۔'' لمبے لمبے ڈگ بھر کے اس سے ڈیڑھ دو گز آگے چلتا شوکا ایک دم رکا اور جھٹکے سے پیچھے مڑ کے اس طرح پھنکارا کہ کالی سرد رات کی ساری برفیلی ٹھنڈک مروفاں کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

''اپنے بیو پہ بھی تُو نے یہی احسان جتایا تھا کہ نہ مان چوہدری کی تڑی پھر بھگتنا آپے اور مجھے بھی یہی کہہ رہی ہے کہ جیسے ہر رات اُدر جا کے میری سات نسلوں پہ احسان کرتی ہے۔ اپنی مرضی سے نہیں جاتی مگر پہلاں اپنی مرضی سے ہی چوہدری کے ساتھ یارانے لگائے تھے اور چوہدری کے منہ کو ایک بار جو شے لگ جائے، وہ اسے چھوڑتا نہیں ہے۔''

ایک بار پھر وہ اس سے چند قدم آگے چلنے لگا۔

دور...... کافی دور......

بالکل ویسے جیسے مروفاں کے دل سے۔

ہر رات چوہدری کے منہ کا نوالہ بننے والی...... تین سالوں میں چوہدری کے دو ناجائز بچے پیدا کرنے والی مروفاں دل ہی دل میں شوکے کو چاہنے لگی تھی۔ اس شوکے کو جس نے اسے کبھی ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

شاید نفرت کی وجہ سے۔

یا کراہت کے کارن۔

یا پھر چوہدری کی امانت میں خیانت کرنا اسے نمک حرامی کے مترادف لگا کرتا تھا۔

اور پھر چوہدری کے اس نشے کا سرور ٹوٹنے لگا۔ ہفتے ہفتے بعد اسے بلاتے بلاتے پھر وہ مہینوں بلاوا نہ بھیجتا۔ جانے عمر زیادہ ہو گئی تھی یا کوئی نیا نشہ لگا لیا تھا اس نے۔ اس کی راتیں اب گھر میں گزرنے لگیں تو شوکے کا امتحان شروع ہوا۔ اس سے گھن کھانے والا چار ہاتھ کے فاصلے پہ لیٹی اس بارود بھری عورت کے لیے ہمکنے لگا پھر ایک رات وہ نفس کے آگے ہار گیا۔

اس صبح مروفاں بڑی شاد، بڑی پوری پوری نظر آ رہی تھی۔ شوکا اس سے نظر نہ ملا رہا تھا اور وہ اس کے آگے بچھتی جا رہی تھی۔ گرم گرم پراٹھے، دودھ پتی، ساگ، دیسی انڈا......

''لے کھاناں...... اور لے......'' وہ کسی پروانے کی طرح اس کے گرد منڈلا رہی تھی۔

اس کے بڑے والے بچے نے ماں کا پلو کھینچ کے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو اسے بھی دو چار لگا

دیں۔

''پراں مر...... کتے کے پلے...... جب دیکھو، چمٹا رہتا ہے۔ جا دفع ہو، جا کے اپنے بیو سے مانگ پراٹھے۔''

مگر جب تک وہ یہ سوال کر پاتا کہ اس کا باپ ہے کون، تب تک چوہدری کے مرنے کی خبر آ گئی۔ پراٹھے ساگ اور تلا انڈا وہیں پڑا رہ گیا۔ دودھ پتی کا پیالہ شوکے کے افراتفری میں اٹھنے کی وجہ سے پیر لگنے سے کچی مٹی پہ بہہ گیا۔ وہ کوارٹر سے جا چکا تھا اور مروفاں مٹی میں جذب ہوتے اس سیال کو دیکھتے سوچ رہی تھی کہ آج اس کے اور شوکے کے درمیان موجود سب سے بڑا کانٹا نکل گیا ہے اور رہ گئے یہ چھوٹے چھوٹے دو کانٹے۔

اس نے آٹھ سال کے تاجی اور تین سالہ اقبال کو دیکھا اور جی کڑا کر کے یہ بھی فیصلہ کر لیا۔

''جو شوکا کہے گا۔ اگر رکھتا ہے تو احسان ہوگا اس کا۔ نہیں تو نہ سہی۔ مائی کے پاس چھوڑ دوں گی۔ آخر دس سالوں سے چوہدری کی زن بن کے پیکہ پال رہی ہوں۔ جس کا کھا رہے ہیں اتنے سالوں سے اس کی اولاد نہیں پال سکتے۔''

مگر پانسہ الٹ گیا۔

وہ جو اپنے اور چوہدری کے تعلقات کی ان دو نشانیوں کو ماں باپ کے پاس بھیجنے اور پھر شوکے کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کرنے کا سوچ رہی تھی۔ خود ٹھڈے کھاتی واپس میکے آ گئی۔

''تیرا کام ختم جس کے لیے تُو اس کوارٹر میں رکھی گئی تھی، وہ نہیں رہا۔ اب میرے پہ کوئی فرض نہیں تجھے رکھنا۔''

''شوکے! بیوی ہوں تیری۔'' وہ سسکی۔

''یہ ڈرامے میرے سامنے نہ کر۔ نمک حلال ہوں۔ مرنے والے کی عزت کا خیال نہ ہوتا تو ابھی سارے پنڈ کے سامنے اس شادی کی اصلیت کھول دوں۔ چپ کر کے بیٹھی رہ۔ دو دفعہ طلاقن ہونے کا داغ پھر بھی کچھ نہیں کہے گا جو دس سالوں تک کی کالک پنڈ کے سامنے آ گئی تو سارے وٹے (پتھر) مار مار کے لہولہان کر دیں گے تجھے۔ جا...... دفع ہو۔''

اس نے دھکا دے کر اسے بھاگاں کی گود میں گرایا اور خود نکل گیا۔ بھاگاں زور زور سے سینہ پیٹنے لگی۔

''کالی بوتھی...... نکھٹی...... دو واری طلاق لے کر آ گئی۔''

''تجھے میری طلاق کا دکھ ہے یا اس بڈھے چوہدری کے مرنے کا جس کی حویلی سے ہر مہینے تیرے لیے خرچہ آتا تھا۔''

مروفاں چلائی اور گھبرا کے بھاگاں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سامنے سے آس پاس کی عورتیں شور سن کے آرہی تھیں۔

''کوٹھری میں بند کر اسے۔ پنڈ کے سامنے رولا نہ ڈال دے۔ چوہدری کے مرنے سے چپڑی روٹی سے تو گئے ہیں جو لولی لنگڑی عجت ہے وہ بھی نہ چلی جائے۔'' صدورے نے نکلتے نکلتے بھاگاں کو ہدایت کی۔

جوانی کی دہلیز پہ کھڑی الہڑسی گلابو نے اس بار کسی سے کوئی سوال نہ کیا۔ وقت نے سارے رموز اس پہ ایک ایک کر کے کھول دیئے تھے۔ ہر بار میکے آنے کے بعد مٹھی بھر روپے ماں کی جھولی میں پھینکتے ہوئے مروفاں جو زہر اگلا کرتی تھی، وہ بہت جلدی گلابو کے ذہن میں اُتر گیا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اس کی بہن کا دوسرا دولہا کون ہے۔

ان دس سالوں میں صرف ایک مروفاں کی زہر اگلتی زبان نہ بدلی تھی...... باقی سب کچھ بدلا تھا۔ صدورے کی جھگی پکی کوٹھڑی میں بدل گئی تھی۔ اب وہ اور اس کے تینوں لڑکے کوڑے کے ڈھیر سے کاٹھ کباڑ جمع نہیں کرتے تھے۔ نہ صدورے کو گاؤں کی تنگ و تاریک گلیوں میں آئے دن بند رہنے والی گندی نالیاں صاف کرنے کے لیے بلایا جاتا تھا، نہ ہی بھاگاں کو تیرے میرے گھر کی زچہ کی ٹانگیں دابنے اور بچے کے گندے پوتڑے دھونے کے لیے جانا پڑتا۔ صدورا دن بھر کوٹھڑی کے باہر چارپائی ڈالے حقہ گڑگڑایا کرتا۔ تینوں لڑکے چوبیس گھنٹے گلی میں فساد برپا رکھتے اور گلابو اسی طرح اماں جنتے کے گھر سبق پڑھنے جاتی اور واپس آنے کا نام نہ لیتی۔

مروفاں کے واپس آنے پہ اس معمول پہ خاصا فرق پڑا تھا۔ اب صدورے کو سارا دن چارپائی توڑنا وارے نہیں کھاتا تھا۔ ادھر دس سال کوڑے اور گندگی سے دور رہنے کی وجہ سے اب گٹر کے پاس جاتے ہی بدبو سے جی متلانے لگتا تھا۔ لڑکے ہڈ حرامی میں اس سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ اب انہیں محنت مزدوری پہ آمادہ کرنا اور بھی ناممکن تھا۔ خود بھاگاں کی ہڈیوں میں آرام طلبی اور مفت خوری اتر چکی تھی۔ ایسے میں سارا دن مروفاں کو کوسنے کے سوا دونوں میاں بیوی کو اور کوئی کام نہ تھا۔ گلابو سے بہن کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔

''بس کر مائی...... اس بے چاری کا کیا قصور ہے؟''

''اور کس کا ہے قصور؟ کسی تیسرے نے آ کے اس کی طلاقیں کرائی ہیں؟ دو بڈھے اور

دونوں ہی نہ سنبھالے گئے اس سے۔ اس چوہدری سے کچھ لکھوا لیتی شوہدی۔''

''لکھوا تو لائی بے چاری...... زندگی بھر کی ذلت اور رسوائی۔'' گلابو نے الٹیاں کر کر کے بے حال ہوتی مروفاں کی کمر سہلا کر کہا۔

''غلطی آپ لوگوں کی اور بھگتے یہ۔''

''نہ شہہ دیتی چوہدری منظور کو۔ پہلاں چھپ چھپ کر آپے ملتی تھی۔ پریتیں لگاتے دیلے نہ سوچا تھا یہ سب۔''

''ہاں ایک غلطی کی تھی میں نے، کی تھی۔'' مروفاں حلق پھاڑ کے چلائی۔

''اور کیا کرتی مائی! پٹواری نے میری دو سال کی محبت اور کھدمت کو کھوہ میں ڈالتے ہوئے ایسے گھر سے نکالا، جیسے کوئی ٹوٹا چھتر پیر سے نکالتا ہے۔ نہ تُو اور ابا چین سے جینے دیتا تھا گھر میں، جیسے طلاق میں نے ہنس کے مانگی ہو۔ نہ محلے گلی میں کوئی طعنہ دینے سے باز آتا تھا۔ چوہدری منظور نے ہمدردی میں لپیٹ کر دانہ ڈالا تو میں شوہدی مار کھا گئی، نہ اس کی بڈھی عمر دیکھی، نہ تین زنانیاں اور سات وڈے وڈے جوان پتر۔ پر مائی تُو تو سیانی بیانی تھی۔ ابا تو ہوش میں تھا۔ تم دونوں نے مجھے حرام کے منہ میں کیوں ڈالا؟ میں نے تو پیار کے دو بول سن کے دھوکا کھایا۔ تم دونوں نے تو جیتی جان کو دوزخ میں ڈالا اپنے سکھ کے لیے۔ اب میں کیا کروں ان دو جانوں کا۔ لوگ جسے ان کا پیو سمجھتے ہیں، وہ بھی جانتا ہے اور میں بھی کہ یہ کس کی اولاد ہیں مگر یہ...... ان کو کیا بتاؤں، وہ جو میرے کو پتہ ہے یا وہ جو لوگوں کو پتہ ہے۔''

اسے ان دونوں کی فکر تھی۔ اب تیسرے نے آنے کا بگل بجا دیا۔

''مائی...... شوکے کو بلا...... اسے بتا...... یہ اس کا بچہ ہے۔'' وہ نئے سرے سے آس میں مبتلا ہو گئی۔

''اس کا ہو پاویں (چاہے) کسے ہور کا۔ کیا فرق پڑتا ہے چھوری طلاق تے ہو گئی۔''

''میں نہیں جانتی طلاق کو۔'' وہ باغیانہ انداز میں چلائی۔

''ابھی تو شوکا میرا ہونے لگا تھا۔ ابھی ابھی تو میں اس کی بیوی بنی تھی۔ اتنی جلدی میں اس سے، وہ میرے سے غیر کیسے ہو سکتا ہے؟''

''رہن دے مائی...... جب رشتہ تھا...... تب کیا فرق پڑتا تھا۔ نکاح کے بول طلاق کے بولوں سے زیادہ اثر والے ہوتے ہیں پھر بھی اس کی نکاحی بیوی ہوتے ہوئے کسی اور کے ساتھ...... تو اس کی طلاقن ہونے کے بعد میں اس کے ساتھ کیوں نہیں رہ سکتی۔ طلاق کے بعد رہنے پہ گناہ ہوتا ہے تو دس سالوں میں کون سے ثواب کما رہی تھی میں۔ بس مجھے نہیں پتہ تُو

شوکے کو بلا کے لا، میں اسے بتاؤں گی۔ وہ بچے کی خاطر پھر میرے کو رکھ لے گا۔ جا مائی!''

وہ اس نئی خبر کے بعد بے حد اتاؤلی ہو رہی تھی جیسے اپنے بچے کے بارے میں جاننے کے بعد شوکا ناک رگڑتا اس کے پاس آ جائے گا۔ اس نے تو سرے سے مروفاں کے پیٹ میں پلتے اس وجود کو اپنا ماننے سے ہی انکار کر دیا۔

''میرا کاہے کو ہونے لگا۔ خصم تو وہ تھا اس کا جو مر کھپ گیا۔ وہ دو بھی اسی کے پیدا کیے تھے۔ یہ تیسرا بھی اسی کا ہوگا۔ میں تو چوکیدار تھا، چوکیدار۔''

اس صاف جواب پہ اسے چپ لگ گئی۔

وہ جو شوکے کو پانے کی چاہ میں یہ تک فراموش کر بیٹھی تھی کہ ان دونوں کے درمیان موجود وہ جائز اور مضبوط رشتہ کب کا ٹوٹ چکا ہے اور اب وہ اس بچے کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ اس کے تعلق پہ کوئی اثر نہیں پڑتا پھر بھی وہ اَن گنت سپنے سجا بیٹھی تھی۔

''پتہ ہے گلابو مائی شوکے کو لے کر آتی ہوگی۔ مرد ہے، روئے گا تو نہیں۔ پر اندر ہی اندر اتھرو گر رہے ہوں گے اس کے۔ میرے کو پتہ ہے، میرے پیر پکڑ لے گا۔ معافی مانگے گا۔ پچھتائے گا۔ بولے گا۔ اب کیا کروں مروفاں...... ہوگئی جلد باجی (بازی) میں نے تین لفج (لفظ) بول ڈالے۔ اب کیسے معافی ملے اور میں بولوں گی۔ دفع کر سارے سیاپے شوکے تُو، میں اور اپنا یہ کاکا۔ ہم تینوں کسی دوسرے پنڈ چلے جاتے ہیں۔ کسی بہت دور والے پنڈ۔ جدر کوئی ہمیں نہ جانتا ہو۔ کسی کو نہ پتہ ہو۔ کب ہمارا ویاہ ہوا اور کب طلاق۔''

''ایسے نہیں ہوتا مروفاں......'' گلابو نے چھوٹی ہونے کے باوجود سمجھانا چاہا۔

''گناہ ہوتا ہے۔ اماں جنتے کہتی ہے کہ......''

''پراں مر تُو اور مرے تیری اماں جنتے۔'' وہ تڑپ کے اسے دھکا دیتی۔

''بڑے کیدے (قاعدے) پڑھنے آتے ہیں نا تجھے۔ جب کوئی سبق نہ سنایا گیا تجھ سے، جب مائی اور ابا میرے گناہوں کے نوٹ وصولتے تھے۔ تیرے اور تیرے بھائیوں کے لیے کالک تھوپتی رہی دس سال، تب سارے راجی (راضی) تھے۔ اب اپنی کھوشی (خوشی) کے لیے جرا سی بے ایمانی کرنے لگی ہوں تو ساروں کو گناہ ثواب یاد آرہے ہیں۔''

مگر سارے گناہ...... سارے ثواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ شوکے نے سانس لیتے اس وجود کو تسلیم کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا۔

''یہ بچہ اسی کا ہے مائی! مجھے چنگی طرح پتہ ہے۔ قسم رب کی، یہ اسی کا ہے۔''

وہ یہی کہتے کہتے مرگئی۔

اور مرنے سے پہلے صدورے اور بھاگاں کا خون چوسنے کے لیے ایک اور بچہ چھوڑ گئی۔

☆======☆======☆

''تو پھر آگئی گلابو؟'' اماں جنتے نے چاشت کی نماز کے لیے مصلہ بچھاتے بچھاتے رک کر کہا۔ ان کے ماتھے پہ ہلکی شکن تھی۔

''پھر تمہاری اماں میرے دروازے پہ ہلا مچائے گی۔ جا شاباش میری بچی، جا گھر جا۔''

''اماں کو آپ سے نہیں، اس پڑھائی سے بیر ہے جو آپ کے طفیل مل جاتی ہے مجھے۔''

وہ بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی۔ ان کے پاس پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔

''میں تو پڑھ کے رہوں گی۔''

''اور کیا پڑھاؤں تجھے۔ میں خود آٹھویں پاس۔ جتنا آتا تھا، گھول کے پلا دیا اور کون سا سبق دوں؟ کتنا کہا تمہارے ماں باپ کو کہ لڑکی کا دماغ اچھا ہے، پڑھنے کا شوق بھی ہے، لگن بھی۔ اسے سکول داخل کرا دو مگر وہ نہ مانے۔''

''نہ مانیں......'' گلابو نے بے پروائی سے گردن جھٹکی۔

''سکول بھیج بھی دیتے تو کیا پڑھ لیتی؟ وہی جو آپ سے پڑھا ہے۔ شکیلہ، انجم، نیلی، ساری سکول پڑھی ہیں۔ پتہ نہیں کون سے چنے بھونتی رہی ہیں وہاں جا کے۔ ان سے اچھی طرح کتاب اور اخبار پڑھ کے سنا سکتی ہوں۔ لکھائی بھی میری ان سے زیادہ اچھی ہے۔ وہ نیلی دسویں کا امتحان دے کر بڑی خود کو توپ سمجھ رہی تھی۔ اس دن چھوٹے بھائی کی چھٹی کی درخواست تک لکھنی نہیں آرہی تھی اسے۔ میں نے لکھ کے دی۔''

''تم نے؟'' اماں جنتے نے تعجب سے کہا۔ ''لیکن وہ تو میں نے تمہیں نہیں سکھائی؟''

''اردو لکھنا تو سکھایا ہے نا۔ باقی عقل سے کام لے کر لکھ دیا کہ چھٹی کی درخواست میں کیا لکھا جا سکتا ہے۔''

''ہاں۔ عقل تو ماشاءاللہ......'' انہوں نے سر ہلایا۔

''نیلی کا ابا بھی پرچہ پڑھ کے حیران ہوا کہ میں نے اتنا اچھا لکھا ہے مگر......'' پھر اس کا فخریہ لہجہ ذرا سا مغموم ہوا۔

''کہنے لگا، نیلی! تیرے سے تو یہ چنگڑی اچھی رہی۔''

''حلوہ کھائے گی؟ کٹوری میں ڈھکا رکھا ہے۔''

شروع شروع میں اماں جنتے نے اس کی ایسی باتوں پہ بڑا سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ

لوگ جو مرضی کہتے پھریں۔ رب سوہنے کی نظر میں سارے بندے برابر ہیں۔ کوئی اونچا ہے تو اپنے کرموں کی وجہ سے، اپنے اعمال کی بدولت مگر وہ کوڑھ مغز نہ ہوتے ہوئے بھی بس اسی ایک بات کو سمجھ نہ پاتی تھی، اس لیے اب اس کا آسان حل انہوں نے یہ نکالا تھا کہ بات بدل دیتیں۔

”ہاں......کھاؤں گی......صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

وہ پھرتی سے اٹھ کے نعمت خانے کی جانب لپکی اور اماں جنتے نے نیت باندھ لی۔

سلام پھیرتے ہوئے انہوں نے کن اکھیوں سے اسے حلوہ لپالپ کھاتے دیکھا اور دھیرے سے مسکرا کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”یا اللہ! اس بچی پہ ہدایت کے دَر کھلے رکھنا۔ مٹی زرخیز ہے، کھاد بھی اچھی دینا۔“

انہوں نے دعا مانگ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو وہ لمبی سی سرخ زبان نکال کے کٹورا لپا لپ چاٹ رہی تھی۔

”اونہہ، بری بات۔ جانور کرتے ہیں ایسے۔“

”بڑی بھوک لگی تھی اماں جی!“

”کچھ نہیں پکا؟“ انہوں نے دل سوزی سے پوچھا۔ جانتی تھیں کہ مروفاں کی وفات بلکہ اس کی طلاق کے بعد سے ہی ان لوگوں کے حالات خاصے برے ہو رہے تھے۔

”وہ کون سی نئی بات ہے۔ ہفتے میں ایک آدھ بار ہی پکتا ہے کچھ۔ خیر اماں لائی تھی رات کو۔“

”اونہہ......“ انہوں نے ناگواری سے ٹوکا۔

”ہاں وہی......لائی تھیں۔“ اس نے تصحیح کی۔ یہ اماں جنتے کی تربیت تھی کہ وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی طرح ماں کو مائی کی بجائے اماں اور تُو تکار کی بجائے آپ جناب کہہ کر پکارتی۔ بھلے باقی گھر والے اس پہ مذاق ہی کیوں نہ اُڑاتے ہوں۔

”لائی تھیں نمبردار کے گھر سے چنوں والے چاول۔ آلو گوشت اور سوجی کے لڈو مگر آپ کو تو پتہ ہے میں کسی کے گھر سے آئی چیز نہیں کھاتی۔“

”میں تو کھا لیتی ہوں صبر شکر کر کے اور یہ حلوہ جو تم نے ابھی کھایا ہے، یہ بھی ماسٹرنی کے گھر سے آیا تھا۔“

”آپ کی اور بات ہے اماں جی! آپ کو لوگ عزت کی وجہ سے دے کر جاتے ہیں۔ ماسٹرنی جی نے حلوہ پکاتے ہی پہلے آپ کا حصہ نکالا ہوگا تاکہ برکت رہے اور ہمارے گھر تو

چیز تب بھیجی جاتی ہے جب بچ رہے، ضائع ہو رہی ہو یا پھر صدقے اور خیرات کی نیت سے۔ میں کیوں لوں کسی کا صدقہ۔“

”نہ بچے......! رزق جس طرح بھی آئے رزق ہی ہوتا ہے۔ ہر بندے کا رزق مولا نے الگ طرح کا لکھا ہوتا ہے۔ تمہاری اماں لوگوں کے گھر چھوٹے موٹے کئی کام کرتی ہے، تب ہی رزق کے یہ دانے اکٹھے کر کے لاتی ہے۔ بھیک نہیں مانگتی۔ یہ بھی تو مقامِ شکر ہے۔ اتنا تکبر بندے پہ جچتا نہیں ہے۔ میں تو زکوٰۃ بھی لیتی ہوں۔ جینے کا آسرا ہو جاتا ہے۔“

”بس اماں جی! دل نہیں مانتا۔“

وہ چپ ہو گئیں، جانتی تھیں جس بات پہ اس کا دل نہ مانے، وہ کبھی وہ کام نہیں کرے گی۔ چاہے وہ زور دے لیں۔ حالانکہ دنیا میں صرف وہی تھیں جن کی بات کو وہ اہمیت دیتی تھی۔ اسی طرح جس بات پہ دل اڑ جائے، اس سے ہٹتی بھی نہیں تھی۔ جیسے ماں باپ کے لاکھ منع کرنے پہ بھی وہ سالوں سے اپنے دن کا ایک بڑا حصہ اماں جنتے کے صحن میں گزارنے کی عادی تھی۔ اس صحن میں اس نے قرآن پاک کا پہلا سبق لیا، اسی صحن میں اس نے تختی پہ پہلا حرف لکھا۔

”ہا ہائے اماں جنتے......یہ چنگڑی بھی ہمارے بچوں کے ساتھ بٹھا دی۔“

پہلے پہل کسی عورت کے اعتراض کرنے پہ گلابو نے سہم کے اس لحیم شحیم عزت دار گھرانے کی بہو کو دیکھا۔

”یہ بھی دوسرے بچوں کی طرح علم لے رہی ہے۔ بچہ کوئی تمہارا، کوئی کسی اور کا مگر سبق تو ایک ہے اللہ کی کتاب کا۔“

”مگر چنگڑ اور پکھی واس (بنجارے) بے دین ہوتے ہیں۔“

”کس نے کہا ہے؟ صدورا اور اس کی گھر والی بھاگاں دونوں کلمہ گو مسلمان ہیں۔ ان کے آباؤاجداد ضرور پکھی واس تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرنے والے مگر یہ کنبہ سالوں سے ایک مٹی پہ آباد ہے۔ میرے سسر اللہ بخشے نے ان کا نکاح پڑھایا تھا۔ ان بچوں کے کان میں بھی اذان دی گئی تھی۔ خدا کا خوف کرو رضیہ! کسی مسلمان کو بے دین یا کافر کہنا بہت گناہ کی بات ہے۔“

عموماً اماں جنتے اتنی لمبی بات نہیں کیا کرتی تھیں، نہ کسی سے اتنی درشتی اور سختی سے پیش آتی تھیں مگر اس بات پہ وہ خاصی غضب ناک ہوئیں اور رضیہ نامی عورت کو تقریباً جھاڑ کے رکھ دیا تو سات آٹھ سالہ گلابو جو اپنی سہیلیوں کی دیکھا دیکھی ایسے ہی چاؤ میں آ کے دوپٹہ سر پہ

لیے یہاں بیٹھ گئی۔ وہیں اسی وقت اپنے دل میں اماں جنتے کے لیے عقیدت و محبت کے دیے جلا بیٹھی۔ رضیہ نے مارے غصے کے اپنے چاروں بچوں کو اماں جنتے کے پاس سے اٹھا کر گھر پہ مولوی لگا لیا، تب بھی اماں نے ہاتھ سے ایک معقول آمدنی جاتے دیکھ کر بھی گلابو کو یہاں سے ہٹانے والی بات نہ مانی۔

''جن سے ہدیہ لے کر علم دیتی ہوں، وہ تو مجھ بیوہ کی مالی مجبوری ہے مگر اس بچی کو چار حرف پڑھا دینے کا جو ثواب مجھے قبر میں ٹھنڈ پہنچانے والا ہے، اسے ہاتھ سے کیسے گنواؤں۔''

اور وہ وہیں اسی صحن میں سپارہ پڑھنے لگی پھر ساتھ ساتھ قاعدہ۔ ایک آدھ سال بعد اماں نے حساب اور انگریزی کے تصویری قاعدے بھی لے دیئے۔ اس سے اگلے سال وہ تختی اور قلم سے سیدھی کاپی پنسل پہ آ گئی۔ سپارہ پڑھنے والے تو ''آمین'' کے بعد دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرتے تھے اور وہ جیسے اماں کے صحن کی اینٹ بن کے گڑ گئی۔ آٹھویں پاس اماں نے دنیاوی علم تو اتنا ہی دیا جتنا وہ جانتی تھی مگر گلابو کے سیکھنے کی دھن نے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو کہاں کا کہاں پہنچا دیا تھا۔ اس کا خاندان سالوں سے کوڑا کرکٹ چننے کا کام کرتا تھا پھر کوڑے کے ڈھیر پہ بیٹھ کر سارا گند چھانا جاتا۔ کاغذ...... ٹین کے ڈبے...... پلاسٹک کی بوتلیں...... سب چیزیں الگ الگ کر کے کباڑیئے کو بیچی جاتیں۔ اس نے سدا اس کام سے نفرت کی تھی اور بچپن میں ہی اپنی برادری کی ان لڑکیوں سے قطع تعلق کر لیا تھا جو گلے سے کوڑا چننے والے تھیلے لٹکائے اسے لینے آتی تھیں مگر پڑھنے کا شوق اور جاننے کی لگن اسے کوڑے کے ڈھیر پہ بھی لے گئی۔ وہ گندگی میں سے چن چن کر کاغذ نکالتی۔ رسالوں سے پھٹے پھٹے صفحے، پرانے اخبار، کاپیوں، کتابوں کے ورق، سب کو سیدھا کر کے جھاڑ پونچھ کے اکٹھا کرتے ہوئے اسے کبھی گھن نہ آتی اور پھر رات کو لالٹین جلا کے وہ اپنا پڑھنے کا شوق پورا کرتی۔ اس شوق شوق میں اس نے جانے کیا کچھ پڑھ ڈالا تھا۔ بچوں کے رسالے میں چھپنے والی تک بند نظمیں بھی اور ساغر صدیقی کی غزلیں بھی۔ سستے اور بازاری قسم کی رومانویت پیش کرتے ناولوں کے اقتباسات بھی اور اخباروں میں شائع ہونے والے فکر انگیز کالم بھی۔ کھانا پکانے کی تراکیب سے لے کر روحانی اور طبی مسائل بھی۔

''پھر تو ماں سے جھگڑا نہیں کیا؟''

اماں جنتے نے اسے گھٹنوں میں دبوچا اور اس کے لانبے بالوں میں تیل انڈیلنے لگیں۔

''میں کب جھگڑتی ہوں...... وہی سارا دن......'' وہ بڑبڑائی۔

''پھر سے جوئیں پال لیں۔'' اماں نے اس کے کاندھے پہ دھپ لگائی۔

''جوؤں سے بھرے تکیے ہیں سارے کے سارے۔ میلے، چیکٹ، گندے......'' اس نے ناک چڑھائی۔ ''اور اماں کہتی ہیں۔ بھلا بستر بھی کوئی دھوتا ہے، اس پہ بھی آپ کا حکم کہ ماں سے بحث نہیں کرو۔''

''صفائی نصف ایمان ہے۔ بحث مت کرو مگر دھولو گی تو کون سا بھاگاں تمہیں مار ہی ڈالے گی اور بھی تو اتنے کام ایسے کرتی ہو جو اسے پسند نہیں جیسے میرے گھر آنا۔''

''اماں تو بس اس پہ راضی ہو گی، اگر میں اس کے ساتھ گھر گھر جا کر لیٹرینیں دھوؤں۔''

''کام کرنے میں کیا برائی ہے گلابو! ہاتھ سے کام کرنے والا اور اس کمائی سے رزق کمانے والا بندہ اللہ کا پسندیدہ ہے۔''

''کام بھی تو ڈھنگ کا ہو۔ میں ساری حویلی کے برتن مانجھ لوں گی، کالی پیلی دیگیں تک کھرچ کر چمکا دوں گی مگر پتہ ہے اماں! ہمیں تو کوئی برتنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا۔ صفائی میں میرا بڑا من لگتا ہے۔ دیکھا ہے نہ آپ نے۔ کیسے آپ کا صحن دھو کے ایک ایک اینٹ نئی نکور کر دیتی ہوں۔ کوئی جھاڑو، دھلائی کا کام ملے تو میں کر بھی لوں۔ تب بھی ملازمہ ہی بنوں گی پھر بھی منظور ہے مگر جمعدارنی نہیں۔'' اس نے قطعی انداز میں کہا۔

''لوگوں کی غلاظت نہیں دھوئی جائے گی میرے سے۔ بُو سے میرا دم اُلٹتا ہے۔ میں محنت سے نہیں گھبراتی اماں جی! مگر محنت کے ساتھ ساتھ عزت بھی تو ہو۔''

''بات تمہاری بھی ٹھیک ہے مگر بات بھاگاں کی بھی جائز ہے۔ باپ تمہارا ٹی بی کا مریض ہو گیا ہے۔ بھائی آوارہ اور نکمے۔ اس پہ مروفاں بھی تین بچے چھوڑ گئی۔ چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اکیلی بھاگاں بیس گھروں کی جمعداری کر کے بھی اتنا نہیں کما لیتی کہ سارے دو وقت کی روٹی کھا سکیں۔ ایسے میں وہ تم سے آس نہ لگائے تو کیا کرے غریب؟''

''لگتا ہے اماں آئی تھیں آپ کے پاس میرا دکھڑا رونے۔'' اس نے صحیح اندازہ لگایا۔

''اور آپ کی برین واشنگ کی ہو گی کہ مجھے کسی طرح منا لیں۔''

وہ غیر محسوس طریقے سے گفتگو میں انگریزی الفاظ کا برملا استعمال کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔

''اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔'' اس کے اندازے کی تائید یا تردید کرنے کے بجائے انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میری بھانجی مرید کے رہتی ہے، اس کے میاں کی اپنی فیکٹری ہے بچوں کے اونی کپڑے بنانے کی۔ قدسیہ...... یاد آیا......؟''

"ہاں جو پچھلی گرمیاں آئی بھی تھیں آپ سے ملنے۔ وہی والی......؟ وہ تو بڑے کھاتے پیتے گھر کی ہیں۔"

"ہاں، اللہ نے بڑی برکت دی ہے اس کے شوہر کے کاروبار میں۔ فیکٹری چھوٹی ہے مگر اتنا منافع دے جاتی ہے کہ خوش حالی نظر آ سکے۔ اگر تمہیں اعتراض نہیں تو میں وہاں لگوا دیتی ہوں تمہیں۔"

"وہاں......مرید کے......؟ مگر اماں جی ہمارے گاؤں سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ بس کا۔ روز کا آنا جانا مشکل نہیں ہوگا؟"

"ہوگا تو......مشکل بھی اور اکیلی جوان لڑکی کے لیے خطرناک بھی، اسی لیے میں اس سے بات کروں گی۔ اگر تمہاری رہائش کا بندوبست ہو سکے تو پھر ٹھیک ہے۔ چلو، ہفتے بعد چھٹی کا دن گھر آ کے گزار لیا کرنا۔ ویسے قدسیہ مان جائے گی۔ بڑے اچھے دل کی ہے۔ دوسروں کی مدد کر کے خوشی ہوتی ہے اسے۔ ایسے ہی تو اللہ نے اتنا نہیں نواز رکھا۔"

"پیسے کتنے ملیں گے؟" گلابو نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا

"معقول ہوں گے۔ یہ جو تم ابھی جھاڑو پونچھے اور برتن دھونے والے کام پہ راضی ہو رہی تھیں تو دو تین گھروں میں سارا دن کام کرنے کے بعد جو ملیں، اس کے برابر ہی ہوں گے مگر کام تمہاری پسند کا ہے، عزت والا اور پھر ہاتھ میں ہنر بھی آ جائے گا لیکن بھاگاں وہ شاید راضی نہ ہو تمہیں دور بھیجنے پر۔"

"کیوں؟" گلابو نے بڑے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔

اس چبھن کی تہہ تک اماں جنتے کبھی نہیں پہنچ سکتی تھیں کیونکہ لاکھ قربت اور اپنائیت کے باوجود گلابو نے ان کے آگے اپنے ماں باپ کا بھرم کبھی نہیں کھولا تھا اور مروفاں کے "دو دولہاؤں" کا راز، راز ہی رہنے دیا تھا۔

"ماں جو ہوئی، بیٹی کو نظر سے دور کیسے کرے گی؟"

"ماں......" وہ طنزیہ مسکرائی پھر سنبھل کے کہنے لگی۔

"ہو جائیں گی راضی۔ اگر پیسے مل رہے ہیں تو راضی ہو جائیں گی۔ مجھے چوبیس گھنٹے نظر کے سامنے رکھ کے ان کی بھوک تو نہیں مٹ سکتی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں تلخی اتر آئی۔

☆======☆======☆

"یہاں رہ لو گی؟"

قدسیہ نے کچن سے منسلک چھوٹے سے اسٹور کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں......؟" اس نے بنا کسی کھڑکی کے اس مختصر چار دیواری کو دیکھا جس کے سامنے والی دیوار پہ بنا ایک چھوٹا سا روشن دان پچھلی جانب والے صحن میں کھلتا تھا اور جو اپنے ملحقہ کچن سے بھی آدھی وسعت کا حامل تھا۔ حتیٰ کہ اس کی کچی پکی بنی کوٹھڑی بھی اس سٹور سے ذرا بڑی ہی ہوگی اور جو اناج کے بڑے سے جستی صندوق، چاول کی بوریوں اور دالوں، مسالوں کے ڈبوں سے بھرا پڑا تھا اور جس کی دو چھتی پہ سلور اسٹیل کے بڑے بڑے برتن، پراتیں اور سینیاں موجود تھیں۔

"چند دن گزارا کر لو، تمہیں تکلیف تو ہوگی مگر......" قدسیہ آپا نے قدرے شرمندگی سے کہنا چاہا۔

"نہیں نہیں آپا! تکلیف کیسی......؟ میں رہ لوں گی۔ بڑے آرام سے رہ لوں گی۔"

وہ تکلف سے کام نہیں لے رہی تھی، پورے دل سے کہہ رہی تھی۔ قدسیہ نے البتہ اسے تکلف اور مروت ہی سمجھا۔

"مسالوں کی بو اور سیلن سے بھی تمہیں پریشانی ہوگی لیکن کوارٹر میں تمہیں اسی لیے نہیں ٹھہرا رہی کہ وہ گھر سے ذرا الگ تھلگ بنے ہیں۔ دوسرا تینوں کوارٹر آباد ہیں۔ کسی کے ساتھ تو تمہیں ٹھہرا نہیں سکتی۔ آخر جوان جہان خوبصورت لڑکی ہو۔ خالہ جنتے نے بڑی ذمہ داری سونپی ہے مجھے۔ اوپر کی منزل میں بڑا والا اسٹور ہے۔ زیبا کے کمرے کے ساتھ۔" انہوں نے اپنی تیرہ سالہ بیٹی کا نام لیا۔ "میرے اور میری دیورانی کے جہیز کی پیٹیوں اور فالتو بستر وغیرہ سے بھرا ہے مگر ہے بہت بڑا۔ کچھ دنوں تک سامان اوپر تلے رکھوا دوں گی تو تمہارے لیے خاصی گنجائش ہو جائے گی اس میں اور اس کمرے کے ساتھ باتھ روم بھی ہے۔ بس چند دن گزارا کر لو۔"

بڑے معذرت خواہانہ انداز میں کہتی وہ وہاں سے نکلیں اور گلابو سوچتی رہ گئی کہ کیسے انہیں یقین دلائے، یہاں وہ محض گزارا نہیں کرے گی، اپنی زندگی کی سب سے آسودہ رات گزارے گی۔ یہ سٹور اس کوٹھڑی سے چھوٹا سہی مگر اس سے کشادہ لگ رہا تھا۔

صاف ستھری چونے سے لپی دیواریں جن سے نہ جالے لٹک رہے تھے نہ پان کی پیک کی چھینٹیں بجی نظر آ رہی تھیں۔ کچی مٹی کے فرش پہ تھوک اور بلغم کی ڈھیریوں کی بجائے پختہ چپس کا فرش تھا۔ صاف ستھرا، چکنا، چمکیلا۔ ماحول میں مسالوں اور اناج کی ملی جلی باس تھی۔ سبزیوں اور پھلوں کی کھٹی میٹھی کڑوی مہک بھی کیونکہ ایک جانب جالی دار ٹوکریاں ہفتے بھر کی

سبزی سے بھری رکھی تھیں مگر اس کوٹھڑی کی کثیف فضا سے بدرجہا بہتر لگ رہی تھی جس میں پسینے کی بدبو، کوڑے کے ڈھیر سے چن کر لائی سوغاتوں کے بھبکوں کے ساتھ مل کے اذیت ناک حد تک گھناؤنی ہو جایا کرتی تھی۔

اس نے وہیں کھڑے کھڑے منہ اونچا کر کے دو چار لمبے سانس لیے اور ہاتھ میں پکڑی گٹھڑی نیچے رکھی جس میں ایک جوڑا کپڑوں کا، ایک دو کاپیاں اور چند پھٹے پرانے رسالے تھے۔ اسی وقت قدسیہ کی ایک ملازمہ اندر آئی۔

''ابھی تک کھڑی ہو چوکی پہ بیٹھ جاتیں۔'' اس نے ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی اور تب گلابو نے دیوار کے ساتھ لگی چوکیوں کو دیکھا جن پر کڑھائی والے پوش چڑھے تھے۔ وہ جھجک سی گئی، ان دودھ جیسے اجلے کپڑوں پر بیٹھنے کے خیال سے۔

''لو کھاؤ۔'' وہ ایک بار پھر حیرت زدہ رہ گئی۔ بھاگاں دوسرے گھروں سے جو بچا کھچا لاتی تھی، وہ پلاسٹک کے شاپروں میں ڈالا گیا ہوتا تھا اور اسی وجہ سے ان کا ذائقہ پہچانا نہ جاتا تھا۔ چاول، سالن، سلاد، میٹھا سب اکٹھا ڈالا جاتا اور یہاں اسٹین لیس اسٹیل کی چمکتی کٹوری اور تھالی میں دال اور مٹر گوشت کا سالن تھا۔ روٹیاں خوان میں لپٹی تھیں۔ پانی کا گلاس بھرا ہوا تھا۔

''میرا نام رانی ہے۔ چار سال سے ادھر ہوں۔ چھوٹی باجی کے بچوں کے کپڑے دھونے اور استری کرنے کا کام کرتی ہوں۔ چھوٹی باجی زرینہ، بڑی باجی قدسیہ کی دیورانی۔''

اس کے بعد وہ بے تکلفی سے اس طرح باتیں بگھارنے بیٹھی کہ پہلا نوالہ بے حد جھجک کے توڑنے والی گلابو اب اطمینان سے کھا رہی تھی اور مسکراتے ہوئے اس اٹھارہ انیس سالہ باتونی لڑکی کی باتیں بھی سن رہی تھی جو کہنے کو تو اس تین منزلہ بڑے سے گھر کے آدھ درجن ملازموں میں سے ایک تھی مگر اسے خود سے بڑی معتبر، بڑی برتر لگ رہی تھی۔ لیلن کا دھلا دھلایا اچھا سلا ہوا جوڑا، صاف ستھرا چہرہ، تیل سے گندھی چوٹی اور سب سے بڑھ کر آسودہ سی مسکراہٹ۔

''سارے بڑے اچھے ہیں یہاں...... یہاں سے پہلے میں اپنی امی کے ساتھ کھلا کام کرتی تھی۔''

''کھلا؟''

''ہاں...... مطلب کسی ایک گھر کا نہیں۔ تین چار گھروں کو ایک دن میں نمٹاتے تھے۔ مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کہیں کے بچے بدتمیز، ہتھ چھٹ۔ کہیں باجیاں سخت اور بدزبان،

کہیں کے مرد بد نظرے۔ چار سال پہلے امی نے مجھے دن رات کے لیے ادھر چھوڑا۔ باجی زرینہ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ پہلا بچہ اور پھر وہ استانی بھی ہیں، اس لیے بچہ ہی سنبھالنا تھا پھر کیا تھا، ایسا دل لگا میرا۔ دونوں باجیاں تو اچھی ہیں۔ نہ ساس، نہ سسر پھر بھی دونوں کا آپس میں ایکا ہے۔ بچے بھی تمیز والے، بھائی جان بھی شریف ہیں، کبھی نظر اونچی کر کے نہیں دیکھا۔ بہن بیٹی کہہ کر بات کرتے ہیں۔ تم بھی خوش رہو گی ادھر۔''

''میں گھر کے نہیں، فیکٹری کے کام سے آئی ہوں۔''

''گھر رہ جاؤ گی تو مجھے سہیلی مل جائے گی۔ ہائے، بڑی باجی نے مجھے کہا تھا تمہیں کھانا دینے کے بعد بستر بھی دے آؤں۔ باتوں میں لگ کے مجھے یاد نہیں رہا اور بات سنو، برتن نہ دھونا۔''

اسے ٹرے اٹھاتے دیکھ کر جاتے جاتے رانی نے کہا تو وہ ٹھٹک گئی۔

''کیا یہاں بھی؟'' اس نے سوچا مگر اس کے خیال کی تردید فوراً ہو گئی۔

''ابھی تم مہمان ہو۔ ویسے بھی برتن دھونا خورشیداں کا کام ہے۔ ہاں تم نے چائے شائے پینی ہے تو میں بنا دیتی ہوں۔ تمہیں پتہ بھی چل جائے گا کون سی چیز کہاں ہے پھر چاہے خود بنا لیا کرنا۔ کام فیکٹری میں کرنا ہے، رہنا تو یہیں ہے۔''

''میں خود......'' گلابو کا حلق خشک ہو گیا۔

''ہاں...... ادھر فریج میں ہوتا ہے سارا کچھ۔ دودھ، آٹا، سالن، روک ٹوک کوئی نہیں ہے ادھر۔''

اور پھر نرم اون سے بھرے گدے پہ نیلے پھولوں والی سرمئی سوتی چادر بچھا کے صاف ستھرے گداز تکیے پہ سر رکھ کے ملتانی کھیس اوڑھنے کے بعد اس نے جی بھر کے اماں جنتے کے لیے دعائیں مانگیں جس کی وجہ سے آج اس کی زندگی میں یہ دن آیا تھا کہ ایسے برتنوں میں کھانا کھایا اور ایسے بستر پر سونا نصیب ہوا۔

☆======☆======☆

''اصلی نام بتاؤ۔'' صورت سے ہی کرخت نظر آنے والی بیگم عابدہ نے رجسٹر میں اس کا اندراج کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... یہی ہے میرا اصلی نام۔''

پہلی بار اسے اپنے نام پہ بھی شرمندگی ہوئی۔ اس سے پہلے اپنے آپ سے منسلک اور کتنی چیزوں پہ وہ جی بھر کے شرمندہ ہو چکی تھی۔

''فلمیں بہت دیکھتی تھی تمہاری ماں۔''

گلابو نے اس تبصرے پر کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ البتہ دل ہی دل میں وہ حیران ضرور ہوئی تھی۔ اس بظاہر نفیس اور سلجھی ہوئی نظر آنے والی تیس پینتیس سالہ عورت کی جاہلانہ گفتگو پہ۔

''باپ کا نام؟''

''صد......'' وہ بتاتے بتاتے رکی پھر پورے اعتماد سے کہا۔

''صدرالدین۔''

''تعلیم؟''

''دسویں تک پڑھا ہے مگر کسی وجہ سے امتحان نہیں دے سکی۔'' دوسرا جھوٹ بھی دھڑلے سے بول گئی۔

''دستخط کرو۔'' بیگم عابدہ نے رجسٹر اس کے آگے کیا اور ایک لائن میں کیے ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں، نظر آنے والے دستخطوں پہ اس نے ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بڑی نکھری لکھائی میں انگریزی میں اپنا نام لکھا۔

☆======☆======☆

''تم سے محبت نہ کرواسکی تو نام بدل دینا میرا۔''

ایک بار اس نے گال پہ گراتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بڑے چیلنج بھرے انداز میں کہا تھا۔

اور وہ دل کھول کے ہنسا تھا۔

''اور میرا کیا ہے۔ کہہ دوں گا ہاں ہوگئی ہے تم سے محبت بلکہ لو، ابھی کہہ دیتا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ میں تم سے یہ بات کہلواؤں گی۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے محبت کرواؤں گی۔ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔''

''اگر اس فرق کو جانتی ہو تو پھر یہ بھی جانتی ہوگی کہ محبت کرنے میں اور محبت کے ہونے میں بھی بہت فرق ہوتا ہے۔''

اس کے سنجیدگی سے کہنے پہ وہ سن ہو کر رہ گئی۔

آوارہ سی لٹ ایک بار پھر کان کے پیچھے سے نکل کر چہرے پہ رقصاں تھی جیسے کوئی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر ماتم کر رہا ہو۔

وہ جان گئی تھی۔ جان گئی تھی محبت کرنے اور محبت ہو جانے کا فرق۔

☆======☆======☆

دروازے کی ناب پہ رکھا اس کا ہاتھ ہلکا سا کپکپایا۔ جانے یہ ہیجان تھا یا سنسنی یا پھر آنے والے مسرت انگیز لمحات کی سرشاری۔

یا شاید کوئی انجانا سا خوف۔

اس نے ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوا۔

گلاب......موتیے، مہندی، ابٹن اور مختلف عطریات کی ملی جلی مہک سے بوجھل ہوتی کمرے کی فضا نے اس کی پلکوں میں خمار بھر دیا۔ بڑے مخمور انداز میں اس نے نگاہ اٹھا کے سامنے دیکھا۔

آبنوسی ملتانی طرز کے بڑے سے بیڈ پہ بچھی سنہری مخملیں چادر کے اوپر سرخ بھڑکیلے عروسی لباس میں ملبوس وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ جو اس کی طلب تھی۔

اپنی طلب کو پا لینے میں کیا سرور ہوتا ہے۔ وہ اس کی انتہا جاننا چاہتا تھا، اس لیے اس کے فاتحانہ قدم اس کی جانب بڑھنے لگے اور ستائشی نظریں اس کے صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں، والے بنے سنورے وجود پہ پھسل رہی تھیں۔ سرخ شراروں جیسے ملبوس سے اس کا کندن سا بدن جیسے لشکارے مار رہا تھا۔

نازک انگلیوں والا سفید برف ہاتھ حنائی رنگ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس نے گلے میں پڑا گلاب کے پھولوں والا ہار اتار کے ہاتھ میں پکڑا اور آگے بڑھتے بڑھتے دائیں جانب پڑے بھاری دیوان پہ پھینک دیا۔

اگلے قدم کے ساتھ وہ اپنی شیروانی کے گریبان کے پہلے دونوں بٹن کھول رہا تھا۔ اسے اس معطر فضا میں سانس گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

تیسرے قدم پہ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اوائل دسمبر کی رات تھی اور اس کے سر کے مساموں میں سے جیسے پھواریں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے پسینے کی نمی کو انگلیوں کی پوروں کی ہلکی سی گردش کے ساتھ بالوں میں سمونے کی کوشش کی۔

چوتھا قدم جو اسے بیڈ پہ سمٹے سکڑے، شرمائے وجود کے مقابل کھڑا کر رہا تھا۔ اس آخری قدم کے ساتھ اس نے اپنی دلہن کا جھکا سر کچھ اور نیچے جاتا محسوس کیا۔

وہ دھیرے سے اس کے پہلو میں بیٹھا ایک منفرد سی خوشبو اس کی روح کے اندر اتری جو آس پاس اودھم مچاتی خوشبوؤں پہ حاوی ہوگئی۔

یہ خوشبو اس کی دوشیزگی کی تھی۔

اس کی حیا کی تھی۔

اس کی وفا کی تھی۔

اس نے لرزتی کپکپاتی حنائی انگلیوں کو دھیرے سے چھوا۔ وہ چھوئی موئی کی طرح اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے رخساروں تک سایہ پھیلائے ہوئے گھونگھٹ کو اٹھایا۔ مکمل حُسن کا ایک شاہکار اس کے سامنے تھا۔ ایسا شاہکار جو صرف حُسن میں ہی یکتا نہ تھا بلکہ اس میں وہ سب تھا جو اس نے چاہا تھا جس کی تمنا کی تھی۔

وہی بانکپن، وہی سادگی، وہی معصومیت، وہی حیا...... وہی مشرقیت اور وہی پاکیزگی۔

اس نے چاہا کہ اس روپ کو آنکھوں میں سمو لے۔ آسودگی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے قریب ہونا چاہا کہ ایک سیاہ چادر پھڑ پھڑاتی ہوئی اس کے اور اس گلگوں چہرے کے درمیان حائل ہوگئی۔

☆======☆======☆

ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔

سیاہ چادر اب ایک دھجی کی طرح دور تک پھڑ پھڑاتے ہوئے نظر آ رہی تھی۔

وہ شاید اب تک پائیدان پہ کھڑی تھی۔

گردن موڑ کے اس نے پیچھے رہ جانے والے منظر کو دیکھا۔ سب کچھ بھیگا بھیگا نظر آ رہا تھا۔

اس نے ہتھیلی کی پشت سے پلکوں کو رگڑا۔

یہ بارش نہیں تھی، اوس بھی نہیں تھی، یہ اس کی پلکوں کی نمی تھی جو آس پاس کا سارا ماحول ڈوبا ڈوبا سا پیش کر رہی تھی۔ باہر سے آتی یخ بستہ ہواؤں نے اس کے ہاتھ کو شل کر دیا تھا۔ اسے لگا ایک منٹ بھی اور اس طرح کھڑی رہی تو شاید برف ہوتے ہاتھوں سے دروازے کی راڈ چھوٹ جائے گی یا سُن ہوتے پیر بدن کا بوجھ سہارنے سے معذور ہو جائیں گے۔ اس نے ٹھنڈے آہنی دروازے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھسلتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔

☆======☆======☆

''اے...... یہاں کیوں بیٹھی ہو؟''

یاسر دکان کا شٹر کھولنے آگے بڑھا تو کسی نسوانی وجود کو سر گود میں گرائے، گھٹنے پیٹ سے لگائے بیٹھے دیکھا۔ وہ جو بھی تھی بند دکان کے تھڑے پہ بیٹھی بڑے انہاک سے مٹی میں انگلی سے لکیریں کھینچ رہی تھی۔

پہلے وہ ٹھٹک کے رکا پھر کلائی پہ بندھی گھڑی پہ وقت دیکھا۔ صبح کے چھ بج رہے تھے مگر چونکہ سردیوں کی صبح تھی اور کھلا علاقہ، اس لیے سب کچھ دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ علاوہ علاقے کے خاکروب کے اور کوئی اس سڑک پہ نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ خاکروب بھی جھاڑو پھیر کے گرد اُڑانے کی بجائے فٹ پاتھ پہ کوڑے کے ڈھیر کو آگ لگائے ہاتھ سینک رہا تھا۔ کافی فاصلے پہ ایک تانگے والا تانگے میں گھوڑا جوت رہا تھا اور اس دکان کے آگے یہ عورت......

بے حد حیرت کے عالم میں قدم بڑھاتا وہ اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ رنگ اُڑا پھول دار ریشمی جوڑا۔ گھسا پٹا سویٹر جو انڈے سے لیے اور استعمال کرتے کئی برس بیت چکے ہوں گے۔ کہنیوں سے پھٹا ہوا تھا۔ سر اور کاندھوں سے لپٹی سیاہ چادر البتہ قدرے بہتر حالت میں نظر آ رہی تھی۔ پیروں میں سوفٹ چپل۔ وہ کپکپا کے رہ گیا۔ اتنی سرد صبح میں بغیر موزوں اور دستانے کے نکلنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ عورت...... بھکارن بھی نہیں لگتی پھر کون ہے؟

''اے...... یہاں کیوں بیٹھی ہو؟''

تحکمانہ انداز میں پوچھنے پر اس نے سر اٹھا کے تعجب سے دیکھا تو یاسر کو اپنی جرأت بلکہ بدتمیزی پہ افسوس ہوا۔ وہ کوئی عورت نہیں، ایک نوخیز لڑکی تھی۔ اپنے گئے گزرے حلیے کے برعکس اس کے چہرے پہ ایک عجیب سی تمکنت اور نظروں میں ایک الگ ہی شانِ بے نیازی تھی۔

''کیوں...... تمہیں کیا تکلیف ہے۔ تم کرایہ لیتے ہو یہاں بیٹھنے کا؟'' ماتھے پہ چتون لیے وہ اس سے مخاطب تھی۔

یاسر مسکرایا۔

''اگر میں کہوں، ہاں...... تو......؟''

''تو کیا...... اٹھ جاؤں گی۔'' وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھی۔ ''کہیں اور جا کے بیٹھ جاؤں گی، جہاں صرف بیٹھنے کا بھی کرایہ مانگنے والے کمینے نہ ملیں۔''

یاسر بھونچکا رہ گیا۔ بڑا بے باک اور توہین آمیز جواب تھا۔

''اے سنو...... میں مذاق کر رہا تھا۔''

اس کے آواز دینے پہ پلٹی۔ اس بار اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جلال تھا۔

"کیا میرے چہرے پہ لکھا ہے کہ جس کا دل چاہے وہ مجھ سے مذاق کرے۔ میں کچھ نہیں کہوں گی؟"

"شاید تم برا مان گئیں؟" اس نے دکان کے شٹر کا تالا کھولتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"دراصل اتنی صبح تمہیں اکیلے دیکھ کے حیرت ہوئی تھی۔ شاید تمہیں کچھ لینا تھا۔ دکان کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔"

یہ دکان ویگنوں کے اڈے کے پاس تھی اور ویگنوں کی آمد و رفت تو ہر وقت جاری رہتی تھی، اس لیے وہ صبح سویرے ہی آ کے دکان کھول لیتا تھا۔

"نہیں۔" وہ کچھ فاصلے پہ جا کے بیٹھ گئی اور پرانے شغل کو جاری رکھا۔ یعنی مٹی میں لکیریں کھینچنے کا عمل۔ یاسر کو خواہ مخواہ اس سے دلچسپی محسوس ہوئی۔

"ویگن کا انتظار ہے؟"

وہ چپ رہی۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے بھی ہار نہ مانی۔

"کام پہ۔"

"کہاں کام کرتی ہو؟"

"اکرم ہوزری میں۔"

"وہ سامنے گرے گیٹ والی فیکٹری...... وہ تو ساڑھے سات بجے کھلتی ہے، اتنی صبح کیا کر رہی ہو؟"

"دیکھ تو رہے ہو، گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہی ہوں۔"

یاسر کو وہ لڑکی سرپھری سی لگی۔

ویگنوں کے اڈے میں بنے چائے کے کھوکھے سے چھوٹا لپک کر آتا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کھوکھا رات بھر کھلا رہتا تھا مسافروں کے لیے اور یاسر دکان پہ آنے کے بعد سب سے پہلے چائے پینے کا عادی تھا، اس لیے چھوٹا اسے دیکھتے ہی یہاں آ رہا تھا۔

"چائے پیو گی؟" یاسر نے ایسے دوستانہ انداز میں پوچھا جیسے دونوں میں عرصے سے شناسائی ہو۔

"ہاں۔" گلابو نے لمحہ بھر رک کر سوچا اور پھر ہاں میں جواب دیتے ہوئے مٹی سے بھرے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے اتنی جلدی ہاں کہنے پہ یاسر حیران بھی ہوا اور کچھ کچھ مایوس بھی۔

پتہ نہیں کیوں پہلی نظر میں ہی وہ اسے اچھی لگی تھی۔

منفرد سی۔

پھٹے پرانے کپڑوں میں، عام سے حلیے اور نقوش کے ساتھ بھی ایک رعب اور دبدبہ رکھنے والی۔

ایک اسرار سا لپٹا ہوا نظر آ رہا تھا اس کی بے حد کھلی ڈلی سی شخصیت تھی۔

مگر وہ اسرار...... وہ کشش...... اس کی ایک "ہاں" نے زائل کر دیا۔

"یہ تو وہی ہے...... ایک کپ چائے کے لیے راضی ہو جانے والی۔ بے حد ارزاں...... بے حد آسان حصول والی سڑک چھاپ۔" اسے اس لڑکی کو چائے کی آفر کرنے پہ اب افسوس ہو رہا تھا۔ شاید وہ اکڑ کے "کیوں" پوچھتی۔ صاف انکار کر کے منہ پھیر کے چل دیتی۔ دو چار کڑوی سنا دیتی تو......"

خیر...... اب پوچھا تھا تو پلانی تو تھی۔

وہ بے تکلفی سے دکان میں داخل ہو گئی۔

لیکن نہ وہ خود جانتی تھی نہ یاسر کہ یہ قدم صرف دکان کے اندر نہیں پڑے تھے، یہ قدم بہت آگے، بہت اندر تک اترنے والے تھے۔

وہ دکان کے بیچوں بیچ کھڑی گردن اٹھا اٹھا کے، نظریں گھما گھما کے جائزہ لے رہی تھی، جیسے اسی کام کے لیے آئی ہو۔ یاسر نے اس کے پیچھے سست قدموں سے اندر آتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔

"یاسر پائی جان! آج بڑی جلدی۔"

چائے کے دو انچ اونچے چھوٹے چھوٹے کپ چھلکاتا چھوٹا جیسے ہی دکان کے اندر داخل ہوا اس کالی چادر والی لڑکی کو دیکھ کے ٹھٹک کے رک گیا۔

اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔

شاید وہ دکان کے پورے کھلے شٹر کے بارے میں استفسار کرنا چاہ رہا تھا۔ سردی کی وجہ سے یاسر دکان کھولنے کے بعد شٹر پورا نہیں اٹھاتا تھا۔ نو دس بجے تک آدھا کھلا، آدھا بند ہی وہ دکان کھلی ہونے کا اعلان کرتا تھا لیکن اس کے بے دھڑک اندر گھس آنے پہ کچھ سوچ کر یاسر نے شٹر پورا اٹھا دیا۔

"دو کپ رکھ دو۔"

یاسر کی آواز پہ اس کا کھلا منہ بند ہوا...... کپ رکھتے ہوئے چائے مزید کچھ چھلکی...... اور

دکان سے نکلتے...... دھند میں غائب ہوتے ہوئے اس نے کتنی ہی بار گردن گھما کے پیچھے مڑ کے دیکھا۔

''چائے لے لو۔''

''شکریہ......'' وہ چونکی اور چائے کا کپ ہونٹوں سے لگالیا۔

''کچھ کھاؤ گی؟'' اس کو بے حد گرم چائے کے...... بے تابی سے گھونٹ بھرتے دیکھ کر یاسر نے اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا۔

''کیا ہے؟'' وہاں خود اعتمادی کا وہی عالم تھا۔

''کیک رس...... بسکٹ......'' یاسر نے ہاروں کی طرح لٹکتے بسکٹ کے چھوٹے پیکٹوں میں سے ایک دو توڑ کے اس کے سامنے رکھے۔

''نہ...... یہ نہیں......'' اس نے کریم بسکٹ پیچھے کرتے ہوئے ایک اور جانب اشارہ کیا۔

''وہ دے دو...... ڈیڑھ روپے والے۔''

یاسر کو اس کی کفایت شعاری کے مظاہرے پہ ہنسی آ گئی۔ جیسے چار روپے والے بسکٹ کے بجائے ڈیڑھ روپے والا کھا کے وہ اس پہ بڑا احسان کرنے والی ہو۔

''دکان کتنی گندی رکھتے ہو تم۔ جالے لٹک رہے ہیں۔'' اب وہ دوبارہ تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہی تھی۔ بسکٹ اگرچہ چائے میں بھگو بھگو کے کھائے جا رہے تھے مگر اس انداز میں بھی ایک نفاست جھلک رہی تھی...... ہر ایک گھونٹ کے بعد وہ کالی چادر کے پلو سے ہونٹوں پہ لگے چائے کے قطرے تھپتھپا کے صاف کرتی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس سوال سے وہ خود کو باز نہ رکھ پایا۔ حالانکہ پکا کر رہا تھا خود کو کہ اس چیونگم ہو جانے والی سڑک چھاپ سی...... سستی سی لڑکی کو ذرا لفٹ نہیں کرانی...... جو ایک کپ چائے کے لالچ میں بے دھڑک ایک جوان غیر مرد کے ساتھ تنہائی میں گھس آئی تھی۔

''گلابو۔''

اس نے چائے کا خالی کپ پلاسٹک کی بے ڈھبی رنگ اڑی مختصر سی ٹرے میں رکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور چادر کے پلو میں لگی گرہ کھولنے لگی۔

''گلابو......'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ''بڑا فلمی...... سا نام ہے اور وہ بھی...... شاہد اور وحید مراد کے زمانے کی فلموں والا...... جب ڈاک بنگلے کے چوکیدار جو عموماً آغا طالش یا لالہ

سدھیر ہوا کرتے تھے کی جوان خوبصورت بیٹی پہ ہیرو کا دل آ جاتا تھا اور اس خوب صورت غریب پہاڑن دوشیزہ کا نام ہوا کرتا تھا...... گلابو...... ریشماں...... اور......''

''بس...... زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے اسے گھورا اور گرہ میں سے دو روپے نکالتے ہوئے اس کے سامنے دھرے۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ حیران ہوا۔

''بسکٹ کے پیسے کاٹ لو...... باقی چائے والے کو دے دینا۔''

''لیکن......'' اس نے کہنا چاہا مگر اس تیز تیز بولنے والی نے موقع نہ دیا۔

''پتا ہے...... پتا ہے...... چائے کا کپ ایک روپے کا ہے۔ باقی کل دے دوں گی۔ ابھی صرف واپسی کا کرایہ بچا ہے۔'' وہ دوبارہ گرہ باندھنے لگی۔

''لیکن......''

''مرے کیوں جا رہے ہو...... تمہاری دکان تو نہیں لٹ جائے گی جو ایک کپ چائے کے آدھے پیسے دے دو گے اسے۔ وہ غریب بندہ ہے، ہو سکتا ہے کل کے ادھار کا انتظار نہ کر سکے۔ ہارٹ فیل ہو جائے بے چارے کا...... تم تو صبر کر سکتے ہو۔''

''لیکن میں نے تو......''

''اب تو میرا یہاں سے روز کا گزرنا ہوگا۔ دے دوں گی کل۔'' وہ اسے ایک بھی فقرہ پورا کرنے کا موقع دیے بغیر چھم سے سامنے سے نکل گئی اور دھند میں گم ہو گئی۔

یاسر نے ہتھیلی پہ رکھے...... سکوں کو دیکھا...... اچھالا...... اور ایک بڑی آسودہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ٹھہر گئی۔

☆======☆======☆

ایک ہفتے کے اندر اندر وہ اس سارے ماحول اور روٹین میں رچ بس گئی۔ جیسے برسوں سے اسی میں جیتی آ رہی ہو۔

قدسیہ نے حسبِ وعدہ اسے کچن کے سٹور سے نکال کر اوپر کی منزل میں اپنی بیٹی زیبا کے کمرے کے ساتھ والے بڑے سے سٹور میں ٹھہرا دیا۔ تھا تو یہ بھی سامان سے بھرا ہوا۔ مگر اس قدر وسیع و عریض ہال نما...... سٹور تھا کہ وہ آدھ درجن جستی پیٹیوں اور ان پہ رکھے درجن بھر صندوقوں اور اٹیچی کیسوں کے علاوہ قدِ آدم الماریاں بھی دھری تھیں۔ اتنے بڑے خاندان اور آنے جانے والوں کے لیے بستروں، رضائیوں اور گدوں تکیوں سے بھری پنگھوڑیاں بھی...... مگر یہ سارا سامان دو دن لگا کے ملازماؤں نے کچھ اس طریقے سے سمیٹا تھا کہ سارا دو

طرف کی دیواروں کے ساتھ لگ گیا تھا...... اور آدھا ہال دوطرف کی دیواروں کے ساتھ خالی کر دیا گیا تھا۔ دروازے والی دیوار کے ساتھ ایک لوہے کی فولڈنگ چارپائی بستر لگا کے اس کے لیے تیار کر دی گئی۔ کسی پرانے بیڈ سیٹ کی سائیڈ ٹیبل ساتھ لگائی گئی تھی۔ جس کی پالش اتر چکی تھی۔ تین درازوں میں سے دو کے لاک بھی خراب تھے، مگر اس کے لیے یہ بھی کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

پوٹلیوں میں باندھ باندھ کے سامان رکھنے والی کو پہلی بار درازوں والی میز ملی تھی۔ وہ تو اپنا مختصر سا سامان اس کی ایک ہی دراز میں بھرنے کے بعد دیوانی سی ہو رہی تھی کہ باقی درازوں میں کیا رکھے...... تھا ہی کیا اس کے پاس۔ ایک پلاسٹک کی کنگھی۔ ایک پتا سر میں لگانے والی سادہ پنوں کا۔ سرسوں کے تیل کی شیشی اور ایک گھسی ہوئی لپ اسٹک۔ جس میں انگلی ڈال کے پہلے انگلی کے سرے کو لپ اسٹک سے بھرنا پڑتا تھا اور پھر اسی بھرے ہوئے انگلی کے سرے کو ہونٹوں پر پھیر کے شوق پورا کیا جاتا۔ ایک سرمے دانی۔ چند پرانے رسالے۔ ایک پنسل اور ایک تبت سنو کریم۔

ایک جوڑا کپڑوں کا تن پہ ڈال کے اور دوسرا گٹھڑی میں باندھ کے لائی تھی وہ۔ یہاں قدسیہ کی مہربانی سے ایک ہی ہفتے میں تین نئے جوڑے مل گئے۔ قدسیہ اور اس کی دیورانی نے ایک درزن گھر پہ رکھ چھوڑی تھی۔ ہفتے کے پانچ دن آتی۔ صبح سے شام تک اپنے لیے مخصوص کمرے میں بیٹھ کے کپڑے سیتی رہتی۔ اسی نے دو دن میں ہی قدسیہ کے نکالے اَن سلے جوڑے گلابو کے ناپ کے سی دیئے۔

”یہ لو...... روز کا جانا ہے فیکٹری میں...... کب تک ایک اتار، دوسرا دھو والا کام کرو گی۔ ویسے تو زرینہ کے کپڑے بھی تمہارے ناپ پہ ٹھیک بیٹھتے۔ تیسرے بچے کے بعد اس کے کتنے ہی نئے نکور جوڑے تنگ ہو جانے کی وجہ سے الماریوں، بکسوں میں بند پڑے رہ گئے ہیں مگر خالہ جنت نے بتایا تھا تم جھوٹن نہیں کھاتی ہو اور اترن نہیں پہنتی ہو۔“

گلابو نے گردن جھکا لی۔ جیسے جھوٹا کھانا اور اترن نہ پہننا کوئی قبیح عمل ہو۔ جس کی وہ مرتکب رہ چکی ہو۔

”خیر...... اللہ معاف کرے۔ جھوٹا تو ہم نے کبھی کسی کو کھلایا بھی نہیں۔ ہاں کپڑے شوق سے خود مانگ کے سب ہی لے لیتی ہیں۔ چلو...... تمہاری عادت نہیں، نہ سہی...... یہ نئے لے لو۔“

”ان کی کیا ضرورت تھی آپا! میں......“ اسے جھجک سی ہوئی۔

”ضرورت تو خیر ہے...... کل کو کمانے لگو گی تو اپنے پلے سے بنواتی رہنا۔ فی الحال احسان سمجھ کر نہیں، تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔ پہلی بار گھرانے کا تحفہ۔“

احسان اس نے کبھی کسی کا لیا نہیں تھا۔

اور تحفہ آج تک کبھی کسی نے دیا نہیں تھا۔

دونوں چیزیں ہی نئی تھیں اس کے لیے لیکن یہاں آنے کے بعد اتنا سب کچھ نیا ہو رہا تھا کہ وہ نئے پن کی عادی ہوتی چلی گئی۔

وہاں اپنے گاؤں میں اس کے پاس کرنے کو تھا ہی کیا؟ اپنی کوٹھڑی سے نکلی اور اماں جنتے کے صحن میں جا کے بیٹھ گئی۔ چند باتیں کیں...... چند سنیں...... ان کے اکا دکا کام نمٹائے حالانکہ وہ اکیلی جان، کام ہی کون سے تھے...... اور پھر گھر آ کے بھاگاں کی باتیں ڈھٹائی سے سنتے ہوئے جی کلسانے والی مسکراہٹ کا مسلسل مظاہرہ کرنا اور یہاں جیسے وہ کسی سوئی کی طرح گھنٹے کے ہندسوں پہ تھرکنے لگی۔ پہلے پہل تو ایسا چاؤ چڑھ رہا تھا کام پہ جانے کا کہ منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل گئی۔ فیکٹری کھلنے سے بھی گھنٹہ بھر پہلے اور جب زور کچھ تھما تب رانی کے ساتھ چھوٹے موٹے کام نمٹاتے...... گھر کا پھیلاوا سمیٹتے وقت گزارنے لگی۔

گھر کے کام کرنے کے لیے کسی نے کہا تو نہیں تھا، درجن بھر ملازم تھے۔ مگر وہ کرنے لگی تو کسی نے منع بھی نہیں کیا اسے، من کرتا تو کمر کس کر یہ لمبا چوڑا برآمدہ اور دالان دھو ڈالتی۔ کچن میں جا کے ماسی برکتے کو چوکی پہ بٹھا کے خود سوجی اور میدے کے دو ڈھائی درجن پراٹھے تل ڈالے اور سستی غالب آتی تو وہیں کمرے میں چارپائی پہ پڑے پڑے ناشتے کا انتظار کرتی رہتی، فیکٹری جانے کے لیے تیار ہونے میں بھی ایک الگ مزہ تھا...... خوب جما جما کے استری کرتی کپڑوں پہ...... منہ رگڑ رگڑ کے دھوتی۔ ایڑیاں کھرچ کر دودھ جیسی کر ڈالتی پھر چین پڑتا۔

کام بھی دنوں میں ہفتوں کا سیکھ لیا تھا۔ بیگم عابدہ جیسی نک چڑھی اور نکتہ چیں عورت کو بھی اب تک خاص اعتراض کا موقع نہ مل سکا تھا۔ البتہ فیکٹری مالکان کے ہاں اس کی رہائش ہونے کی اطلاع ملنے پہ اس کا رویہ بڑا عجیب و غریب ہو گیا تھا گلابو کے ساتھ۔ جیسے وہ اسے بڑا کچھ کہنا چاہتی ہو مگر جز بز ہو کے رہ جاتی ہو۔ جیسے قدسیہ کی اس پہ خاص عنایت اسے کلسا کے رکھ دیتی ہو، قدسیہ کے کہنے پہ ہی اسے ایک ہفتے کے بعد ہی پیشگی تنخواہ دے دی گئی۔

اٹھارہ سو روپے مٹھی میں دبا کے وہ جیسے ہوا میں معلق ہو گئی۔ نہ زمین پہ پیر تھے۔ نہ ہاتھ آسمان کو چھو پا رہے تھے۔ ایک پل کے لیے تو دل بے ایمان سا ہو گیا۔ سوچا کے اٹھارہ کے

اٹھارہ سو اپنے پاس رکھ لے، گھر پہ ایک آنہ بھی نہ بھیجے مگر اماں جنتے کی تاکید یاد آ گئی۔

"یہ نہ سوچا کر تجھے کیا ملا...... یہ دھیان رکھا کر کہ تُو نے کسی کو کیا دیا...... بدلہ لینے کی نہیں، بدلہ چکانے کی فکر کیا کر۔"

"کون سا بدلہ اماں؟" وہ تلخی سے سر جھٹک کے رہ گئی۔

"صرف پیدا کرنے کا ہی احسان کیا ہے انہوں نے...... نہ کرتے شاید پھر میں کسی ڈھنگ کے گھر پیدا ہو جاتی۔"

وہ خوش گمان ہوئی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اللہ انہیں تمہارے ماں باپ نہ بناتا، تو کسی بھکاری کے ہاں پیدا کر دیتا۔ جو تمہارے ہاتھ پیر ٹیڑھے کر کے کسی چوک پہ مانگنے بٹھا دیتے۔ یا شاید جانور بنا کے پیدا کر دیتا...... کتا، گیدڑ، گدھا، چیل۔"

"بس اماں جی۔" وہ گھبرا اٹھی۔

"آپ تو بندے کو ڈرا کے ہی رکھ دیتی ہیں۔" وہ سچ مچ تھرا اٹھی تھی۔

اماں جنتے دھیرے سے مسکرا اٹھیں۔

"ڈرتی ہو...... غنیمت ہے...... جس کے اندر ڈر باقی ہو اس کے اندر انسانیت بھی باقی رہتی ہے ورنہ تو نڈر آدمی بڑا گنہگار ہو جاتا ہے۔ بس ایسے ہی ڈرتی رہنا...... اور یہ سوچتی رہنا کہ میرے ماں باپ کا مجھ پر یہ احسان بھی بڑا ہے کہ انہوں نے تمہیں پیدا کیا۔ پالا پوسا...... اس احسان کا بدلہ تم کبھی چکا سکتی ہو۔ یہ خیال بھی دل میں مت آنے دینا۔ اول تو یہ احسان ایسا نہیں جو کبھی چکایا جا سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس احسان مندی کا بوجھ ہی ہے جو انسان کو ماں باپ کے آگے سر اٹھانے نہیں دیتا اور ماں باپ کے آگے جھکے ہوئے سر اللہ تعالیٰ کو بڑے پسند ہیں۔ احسان مت چکاؤ۔ صرف فرض نبھاؤ...... اللہ نے تمہیں یہ توفیق دی ہے کہ تم اپنی ذات سے انہیں کوئی فیض پہنچاؤ تو اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ اسے سعادت سمجھنا...... اس پر اترانا مت فخر اور غرور اچھے سے اچھے عمل پہ چھینٹ بن کر گر جاتا ہے۔"

اس نے تابعداری سے سر ہلا دیا تھا...... عمل کرنے کا اس کا کوئی خاص ارادہ نہ تھا۔ ماں باپ سے وابستہ عزت و تکریم اور خدمت کے فرائض سارے کے سارے ذرا سے مضحکہ خیز لگنے لگتے جب وہ صدورے کو باپ اور بھاگاں کو ماں کے روپ میں دیکھتی...... اسے ہنسی سی آنے لگتی یہ سوچ کر کہ اگر اماں جنتے کو پتہ چل جائے۔ یہ عظیم ماں باپ اس کی بہن مروفاں کو صرف پیدا کرنے کا ہی احسان نہیں کر چکے۔ بلکہ دو بار اس کی ذات سے منافع کمانے کی نیکی

بھی کر چکے ہیں تو کیا حال ہوگا ان کا...... یہ جاننے کے بعد وہ شاید اپنی ساری نصیحتیں اس سے واپس لے لیں گی۔ انہوں نے تو نصیحتیں واپس نہ لیں اس کے باوجود گلابو کے دل میں بے ایمانی آ گئی۔

"ماں باپ آڑے وقت کے لیے جوڑ کر رکھنے والے ہوں تو ان کو بھیجوں بھی...... ان کا کیا ہے۔ ابا حقہ بھروا لے گا۔ سگریٹ کی ڈبیا لے گا اور فلم دیکھنے چلا جائے گا۔ اماں سارے لڑکوں کو پانچ پانچ روپے دے کر لڈو پیٹھی والے کھانے بھیجے گی اور خود اکیلی بیٹھ کے مرغی بھون کر کھائے گی۔ جو پیسے بچ رہیں گے ان سے رات کو وی سی آر کرائے پر منگوا کے فلمیں دیکھی جائیں گی۔ اس سے اچھا ہے جو بچت کرنی ہے میں خود کر لوں۔ چھٹی پہ گھر جاؤں گی تو ان ہی پیسوں سے راشن ڈال دوں گی۔ چند دن گھر میں روٹی تو پک جائے گی۔ اماں ابا نے تو ہفتے دس دن کے خرچے کے ایک دن میں ہی عیش کر لینے ہیں۔"

پھر بھی شاید اماں جنتے کی تاکید کے لحاظ میں اس نے آٹھ سو روپے بھیج ہی دیئے، آٹھ سو بچت والے دراز میں رکھ کے تالا لگایا اور دو سو روپے خرچ کرنے کے لیے بازار چلی گئی۔

ریلوے کی پٹڑی کے ساتھ بنے اس سستے بازار میں لگی لنڈے کی ریڑھیوں سے وہ اپنے لیے سویٹر چھانٹ رہی تھی۔ جب ایک جانی پہچانی آواز پہ پلٹی۔

"اوہو...... شاپنگ۔"

"تم؟" وہ یاسر کو سامنے دیکھ کر حیران ہوئی۔

"کیوں؟ میں موجیں نہیں کر سکتا۔ میری جیب میں پیسے نہیں ہو سکتے؟" وہ باقاعدہ برا مانتے ہوئے ریڑھی سے گرم مفلر اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگا۔

"کرو موجیں...... جی بھر کے کرو...... میرے باپ کا تو لنڈا نہیں ہے۔ میں تو اس لیے پوچھ رہی تھی اس وقت تم دکان پر ہوتے ہو۔"

"آج چھٹی کی ہے بلکہ ضرورت نے کرائی ہے۔ سردی بڑی ہے یار! قلفی جم جاتی ہے اپنی تو...... سوچا آج دکان گرم رکھنے کے بجائے خود کو گرم رکھنے کا کوئی بندوبست کیا جائے۔"

"یہی طریقے رہے تو چل پڑی دکان۔" وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ "تم کبھی بھی اچھے بزنس مین نہیں بن سکتے۔ کیونکہ کاروبار کی پہلی شرط یہ ہے کہ پہلے خریدار کی ضرورت کا خیال رکھا جائے بعد میں اپنی تم نے سنا نہیں، موچی کے جوتے ہمیشہ ٹوٹے ہوئے اور درزی کے کپڑے ہمیشہ پھٹے ہوتے ہیں۔"

"مجھے کاروباری گر سیکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میں بزنس مین ہوں ہی نہیں۔"

مزدور پیشہ بندہ ہوں۔ تنخواہ لینے والا۔ اور اس پیشے سے وابستہ لوگوں کا ایک ہی اصول ہوتا ہے۔ تنخواہ وقت پہ ملنی چاہیے اور وہ بھی پوری...... باقی سب جائیں بھاڑ میں...... اپنی جگہ چائے والے چھوٹے کو بٹھا آیا ہوں، گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے میری طرف سے وہ کچھ بیچے یا خود کھائے۔ میری بلا سے۔ دکان کی بکری زیادہ ہونے پہ میری تنخواہ تو نہیں بڑھ جانی۔''

گلابو کے لیے یہ ایک انکشاف تھا۔

وہ تو اسے دکان کا مالک ہی سمجھتی رہی تھی، جب پہلے دو تین دن فیکٹری کے لیے جلدی گھر سے نکلتی رہی تھی تو آدھا آدھا گھنٹہ اس کے ساتھ بیٹھ کے چائے بھی پی...... اور اِدھر اُدھر کی بے تکی بھی ہانکیں اب پچھلے کچھ دنوں سے یہ معمول نہیں رہا تھا مگر آتے جاتے گزرتے ہوئے علیک سلیک ہو ہی جاتی تھی اور اس دوران اسے کبھی احساس نہ ہوا کہ بے داغ بے شکن لباس پہننے والا یہ شہزادوں کی سی آن والا...... اور درویشوں کی سی بے نیازی رکھنے والا شخص اس چھوٹی سی دکان کا مالک نہیں۔ ملازم بھی ہو سکتا ہے۔

''بیس روپے...... دماغ خراب ہے تمہارا؟''

اس نے کالے اور سرخ چیک کے مفلر کو غصے سے ریڑھی پر پٹخا۔ ''لنڈے میں بیٹھ کر قیمتیں پینوراما والی لگاتے ہو؟''

''یہ پینو راما کیا ہے؟'' گلابو نے اپنے خریدے سویٹر کی قیمت چکاتے ہوئے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''لاہور میں ہے۔ گئی ہو کبھی؟'' دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''اونہوں...... میں نے تو اپنے گاؤں کے بعد بس یہ مرید کے ہی دیکھا ہے۔''

''یعنی مرید کے ہی تمہارا دبئی ہے۔''

وہ ہنسا اور گلابو نے اس پہ سے نظر ہٹالی۔ خواہ مخواہ ہی گردن موڑ کے فٹ پاتھ پر پڑے کینو کے ڈھیر کو تکنے لگی۔

''ہنستے ہوئے کتنا...... کتنا......''

وہ اسے اس لمحے اچھا لگا تھا۔ بڑا اپنا اپنا سا اچھا...... مگر یہ تسلیم کرتے ہوئے وہ ہچکچا رہی تھی۔

اعتراف کے اس پل سے کترا کے نظر اور دماغ کو کسی اور جگہ بہلانے لگی۔

''یہ کینو کس طرح دے رہے ہو؟'' وہ جھک کر کینو دیکھنے لگی۔

''شاپر میں ڈال کر۔''

جواب یاسر کی جانب سے آیا۔

وہ بھنا کے پلٹی۔ ہنستے ہوئے جتنا اچھا لگا تھا۔ طنزیہ انداز میں مسکراتا۔ فقرہ چست کرتا اور بھی زہر لگا...... اسے سکون سا آنے لگا۔

''شکر ہے، زیادہ دیر اچھا نہیں لگا۔''

''میرا مطلب ہے کس طرح، یعنی کتنے روپے درجن دے رہے ہو؟'' اسے نظر انداز کر کے وہ کینو والے سے پوچھ رہی تھی۔

''چودہ روپے درجن۔''

''بارہ روپے درجن دے دو۔''

''نہیں بی بی! یہ اچھے والے ہیں رس بھرے۔ وہ آگے دس روپے درجن لگے ہیں۔ سوکھے سڑے کھٹے وہ لے لو۔''

''کیوں؟ میں کیوں لوں وہ سوکھے سڑے، کھٹے۔'' وہ تیز لہجے میں بولی۔

یاسر سینے پر بازو باندھے دلچسپی سے یہ تکرار سن رہا تھا۔

''یہی والے دے دو۔ بارہ روپے میں۔''

''اچھا بی بی! لے لو۔'' اس نے شاید جان چھڑائی۔ یا بکری سے مایوس ہو گیا۔

''کتنی درجن دوں؟''

''دو......'' وہ چادر کی گرہ کھولنے لگی۔ پھر اسے شاپر میں کینو گن گن کے ڈالتے دیکھ کر ہلکا سا چلائی۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ میں نے دو کہا ہے۔''

''دو ہی ڈال رہا ہوں بی بی! بعد میں گن کے تسلی کر لینا۔''

''میں نے کبھی گاہک کے ساتھ دھوکا نہیں کیا، پورے دو درجن نکلیں گے۔''

''دو درجن نہیں...... دو ایک اور ایک دو۔''

اس کے واضح کرنے پر یاسر کا قہقہہ چھوٹ گیا، جبکہ کینو والا محض گھور کے رہ گیا اور بھرے ہوئے شاپر میں ہاتھ ڈال کے دو کینو نکال کے آگے بڑھائے۔

''لینے دو ہیں اور دماغ کھا کھا کے پورا کر دیا ہے۔''

''بکواس نہیں کرو اور ہاتھ میں کیوں پکڑا رہے ہو۔ بھیک نہیں لے رہی ہوں میں۔ شاپر میں ڈال کے دو۔''

بے شک سودا وہ دو روپے کا لے رہی تھی مگر لہجے میں تحکم اور رعب ایسے ٹوٹ کر بھرا تھا

کہ وہ مزید بڑبڑ کرنے کی بجائے چپ چاپ شاپر میں ڈالنے لگا۔
''پڑیا میں نمک بھی ڈال کر دو۔''
اس نئے مطالبے پر یاسر منہ پھیر کے ہنسی چھپانے لگا۔
''لو......'' آگے بڑھتے ہوئے اس نے ایک کینو یاسر کی طرف بڑھایا۔
''مہربانی۔'' وہ چھیلنے لگا۔ ''میں ساتھ نہ ہوتا تو تم ایک ہی کینو لیتیں؟''
''ہاں تو اور کیا؟''
''مگر بچت اتنی ہی کرتی۔''
''اس میں غلط کیا ہے۔ بارہ روپے درجن قیمت کروائی ہے تو دو روپے کے دو ملے ہیں نا کھاؤ کھاؤ۔ میرے ساتھ رہو گے تو ایسے ہی عیش کرو گے۔''
وہ پھانک چوستے ہوئے نہ جانے کس دھن میں کہہ گئی۔ اسے تو احساس نہ ہوا مگر یاسر ٹھٹک کے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔
سنولاہٹ کو چھوتی ہلکی گندمی رنگت۔ کم عمری کی چھاپ لیے جہاں دیدہ سا چہرہ۔
بڑی گہری...... بڑی جھلمل...... بڑی ساحر آنکھیں......
چھوٹی سی خوبصورت ناک میں چمکتی چاندنی کی باریک سی تار۔
ہیرے کی تراش والا چہرہ اپنے حُسن سے یا تو انجان تھا یا بے حد معصوم۔
''تمہارے ساتھ......؟ عیش......؟'' وہ زیرلب دوہرانے لگا۔ ''وہ بھی لنڈے میں؟''
''تو کیا لنڈے میں انسان نہیں آتے؟''
''مگر تم تو اس دن بتا رہی تھیں اُترن نہیں پہنتی ہو اور یہاں تو اُترن ہی ہوتی ہے وہ بھی میموں کی۔''
''بے وقوف...... اُترن وہ ہوتی ہے جو کوئی اتار کے پھینک کر دے۔ جو خرید لی وہ کیسی اُترن؟ میں نے اپنی محنت کی کمائی سے خریدی ہے، میرے لیے تو نئی نکور ہے ویسی ہی جیسی تم اپنے پینوراما سے لاتے۔''
''حلوہ کھاؤ گی؟''
حلوائی کی دکان کے سامنے رکتے ہوئے یاسر نے پوچھا۔ وہ کچھ تذبذب میں پڑ گئی۔ یاسر ان گنتی کی چند ملاقاتوں کے بعد اسے جاننے کا اتنا دعویٰ تو کر سکتا تھا کہ اس ہچکچاہٹ کی وجہ بھانپ سکتا۔
نہ تو اسے اس کے ساتھ کھڑے ہو کر کچھ کھانے پر اعتراض تھا، نہ سڑک کے کنارے

کھڑے ہو کر کھانے پر اعتراض تھا۔
وہ خاصی کھلی ڈلی لڑکی تھی۔ اس کے اس کھلے پن کی وجہ سے ہی یاسر نے اس کے بارے میں پہلا تاثر جو قائم کیا، وہ کچھ خاص اچھا نہیں تھا۔ خیر وہ تو فوراً ہی واضح ہو گیا کہ یہ کھلا پن اور لاپروائی اس کی طبیعت کا خاصا ہے۔ یا پھر شاید حد سے بڑھی خود اعتمادی ورنہ کردار کی وہ ہلکی نہیں تھی۔
وہ شاید اس وقت اپنی چادر کے پلو میں بندھی رقم کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔
''میری ہی دکان میں بیٹھ کے میرے ہی ساتھ چائے پیتے ہوئے تم اپنے حصے کے پیسے دیتی ہو، میں نے کبھی کچھ کہا؟ لیکن اگر تم مجھے کینو کھلا سکتی ہو تو میں حلوہ کیوں نہیں؟''
اس نے گلابو کی مشکل آسان کی...... وہ مسکرا دی یہ اس کی رضامندی کا اظہار تھا۔
''ایک پاؤ گاجر کا حلوہ دینا۔''
''ایک پاؤ کیا کرو گے، آدھ پاؤ بڑا ہے...... میں بس دو چمچے لوں گی۔''
''اچھا بھئی...... آدھ پاؤ...... ساتھ تھوڑے نمک پارے۔''
''او بھائی! کھویا اتنا کم۔'' اس نے حلوائی کو ٹوکا اور پھر مسلسل نظر میں رکھتے ہوئے دوسرا اعتراض کیا۔
''ابلا انڈا تو ڈالا نہیں۔''
''بارہ روپے کا حلوہ اور اس پہ دو روپے کا انڈہ بھی ساتھ ڈال دوں؟'' وہ کینو والا نہیں تھا جو رعب میں آ جاتا الٹا منہ بگاڑ کے برسنے لگا۔
''سودا بارہ روپے کا ہو یا بارہ سو کا...... گاہک سب ایک سے ہوتے ہیں سب کی ایک سی عزت کرنی چاہیے۔''
''چھوڑو...... کیوں بحث کر رہی ہو؟'' یاسر گھبرا گیا تماشا لگنے کے خیال سے۔
''جاؤ جاؤ...... سمجھاؤ اسے۔ گراہکی خراب نہ کرے۔''
''اللہ کرے...... سارا دن بیٹھے رہو اور کوئی مکھی تک تمہارے حلوے پہ بیٹھنے نہ آئے...... سارا باسی سامان کوڑے میں ڈالو۔''
وہ بھی گلابو تھی...... نہ صبر تھا نہ برداشت...... اوپر سے اٹھارہ سو کمانے کا نیا نیا خمار...... وہ تو ایسے بدک اٹھی تھی جیسے کسی نے اس کی دُم پر پیر رکھ دیا ہو...... وہ ساری تذلیل نئے سرے سے تازہ ہو گئی جو اپنے گاؤں میں بھنگی کی، چوڑے کی، چنگڑ کی بیٹی ہونے کے ناطے اٹھاتی

رہی تھی۔

''او یہ پاگل ہے؟'' حلوائی بھڑک اٹھا۔

''کیا کر رہی ہو...... چلو یہاں سے......'' وہ اس کا بازو کھینچ کر آگے لے جانے لگا۔

''چھوڑو مجھے...... نہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ چربی پگھلا کے گھی بناتا ہے اور اس میں باسی سموسے تل کے بیچتا ہے یہ...... یہ کھویا دیکھو ذرا...... پیلا پڑ رہا ہے اور انڈے...... یہ مرغی کے لگ ہی نہیں رہے۔ کھوے کے اٹھا کے لایا ہے۔ اس کی مٹھائی نری بیماری ہے بیماری۔''

''میں لحاظ کر رہا ہوں اُلو کی پٹھی بکواس کرتی جا رہی ہے۔'' وہ صبح ہی صبح سارے راز کھلنے پر بلبلا اٹھا اور اس کے بعد مغلظات بکنے لگا۔ قریب تھا کہ گلابو بھی میدان میں اُتر آتی یاسر نے لپک کر حلوائی کا گریبان پکڑ لیا اور اسے گرا کر اس کی آگے کو نکلی توند پر بیٹھ کے دے دھڑا دھڑ اسے گھونسے مارے۔ اس کے گالیوں کے غبارے سے جیسے ساری ہوا نکل گئی۔

چند لوگوں نے بیچ میں پڑ کے یاسر کو مشکل سے اٹھایا گلابو حیرت زدہ سی یاسر کو دیکھتی رہی۔ جو غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے اس کی انگلیوں کی لرزش...... آنکھوں سے نکلتے شعلوں...... اور دھونکنی کی طرح چلتے سینے کو دیکھا اور حیران ہو کر خود سے سوال کیا۔

''کیا صرف میرے لیے؟ مجھے پڑنے والی گالی اسے آپے سے باہر کیوں کر گئی؟''

اس سوال کا جواب دل جو دے رہا تھا وہ بڑا خوش فہم تھا۔

☆======☆======☆

''ہے چھوری...... تیری تو جون ہی بدل گئی ہے...... چم چم کر رہی ہے تیری کھلڑی (جلد)۔''

یہاں آنے کے تیسرے ہفتے وہ اتوار سے پہلے دو چھٹیاں لے کر گھر گئی تو بھاگاں نے ہاتھ لگا لگا کے اسے دیکھا۔

''ناں دودھ ملائیاں چٹتی رہی ہے تُو۔''

''رہنے دے اماں! نظر نہ لگا دینا۔'' نہ جانے کیوں اسے بھاگاں کی رشک بھری نظروں سے جھلاہٹ ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان آنکھوں میں اس کے لیے رشک کے ساتھ ساتھ حسد بھی ہو۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں۔ تم کیوں، میں کیوں نہیں...... اور یہی احساس چبھ رہا تھا اسے بھلا کوئی ماں بھی بیٹی کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر رقابت میں مبتلا ہو سکتی ہے۔

''کیا پکایا ہے؟'' اس نے اس بے معنی سی سوچ کو جھٹکنا چاہا۔

''آلو کے چھلڑ'' (چھلکے) بھاگاں نے اس کے تھیلے میں سے مونگ پھلی کا لفافہ نکالا، جو اس نے راستے میں کھانے کے لیے لیا تھا اور باچھیں پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اور کوئی چیز نہیں تھی پکانے کے لیے؟''

اس کا دل جل گیا۔ یہ بھی پتہ تھا کہ آلو کے چھلکے بھی ضرور کسی کے باورچی خانے کی ٹوکری خالی کرتے ہوئے مالِ غنیمت کے طور پر ہاتھ لگے ہوں گے۔ مٹر کے چھلکے، ساگ، پالک اور میتھی کے بچے کھچے ڈنٹھل، آلو کے اور شلجم کے چھلکے، انہیں باریک کر کے ڈھیر سارا نمک مرچ ڈال کر پکانے میں ماہر تھی بھاگاں اور گلابو کے حلق سے تو وہ اترتے ہی نہ تھے اب قدسیہ کے ہاں سولہ، سترہ دن تک اچھا کھانے کے بعد اسے چھلکوں کی بھاجی کا سن کر ہی ابکائی آنے لگی۔

''میرے آنے کا سن کر ہی کچھ اچھا پکا لیا ہوتا اماں۔''

اس نے بڑی حسرت سے کہا۔ ہر حقیقت سے واقف ہونے کے بعد بھی نہ جانے کیوں اسے خوش فہمی سی ہو چکی تھی کہ اتنے دنوں کے بعد گھر واپسی پر اس کا بڑا گرم جوشی سے سواگت ہونے والا ہے۔ بھاگاں اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں کے گرد پڑنے والے حلقوں اور زرد رنگت پر تشویش کا اظہار کرنے والی ہے۔ صدورا سخت لہجے میں اسے کہنے والا ہے کہ بس بہت ہو گیا...... کوئی ضرورت نہیں گھر سے بے گھر ہونے کی...... آرام سے بیٹھ جا...... ہمیں نہیں ضرورت تیری کمائی کی اور بھاگاں اُسے ٹوکتے ہوئے کہے۔

''چل بس کر صدورے...... چنگی طراں پتہ ہے کہ تجھے ڈاہڈی فکر ہے چھوری کی۔ راتی (راتوں کو) نیندر نئیں پڑتی تجھے...... پر اب تو اسے آرام نال روٹی ٹکر کھا لینے دے۔ ہورے اُدر پردیس میں ویلے پہ روٹی نصیب ہوتی ہے شدائن کو کہ نئیں...... لے میری دھی! تیرے لئی گھیو میں گندھ کے پرونٹھے (پراٹھے) بنائے ہیں۔''

''ہور کی بناتی...... اور تجھے تو اور واہ واہ چنگا چوکھا کھانے کو ملتا ہو گا۔ پھر بھی بھک نہیں مرتی تیری...... اور پورا ٹبر روز چھلڑ کھا کے گزارا کرتا ہے۔ ناں ہور میں تیرے لیے اپنا ماس پکاتی...... گل کرتی ہے۔''

وہ بڑبڑ کرتی اس کے آگے تام چینی کی ٹیڑھی میڑھی سی پلیٹ پٹخ کے چلی گئی۔ جس میں کالے کالے چھلکوں کی بدنما سی بھجیا رکھی تھی۔ گلابو کا تصور اسے اس باورچی خانے میں لے گیا، جہاں بھاگاں آج کوڑا کرکٹ اٹھانے گئی ہو گی۔

''اے بھاگاں! ذرا باورچی خانے کا کوڑا دان بھی الٹ لے اپنے ٹوکرے میں۔''

اس گھر کی مالکن نے ناک چڑھا کے کہا ہوگا اور پھر بھاگاں نے الٹنے سے پہلے اسی کوڑے دان میں ہاتھ ڈال کے اچھی طرح ٹٹولا ہوگا۔ گلابو کے تخیل نے اسے آلو کے چھلکے نکال کر رکھتے ہوئے دیکھا اسے ابکائی سی آ گئی اور اس نے تھالی پرے دھکیل دی۔ سفر کی تھکان تو تھی مگر اس بدبودار کوٹھڑی میں تھکن اتارنے والے آرام کا کوئی احساس نہیں تھا۔ وہ وہاں سے اٹھی اور اماں جنتے کے ہاں آ گئی۔ نیم کے بڑے سے پیڑ کے نیچے بچھی نواڑی چارپائی پر چت لیٹے لیٹے وہ اسے سوچنے لگی۔

’’تم بڑی عجیب ہو۔‘‘ وہ اکثر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہتا تھا۔

’’صرف عجیب نہیں...... غریب بھی۔‘‘

’’نہیں......‘‘ وہ انکار میں سر ہلاتا۔

’’غریب تو کہیں سے نہیں لگتی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ جیسے کسی اچھے زمانے میں بادشاہ اور خلیفہ راتوں کو پرانے کپڑے پہن کر، بھیس بدل کر اپنی رعایا کا حال جاننے نکلتے تھے۔ تم بھی اسی پرانی سی سیاہ چادر کے اندر چھپی کوئی شہزادی لگتی ہو مجھے۔‘‘

’’تم اسی لالچ میں تو پیچھے نہیں ہو میرے۔‘‘

’’میں اور تمہارے پیچھے؟ میں تو یہ تک نہیں جانتا کہ تم کہاں سے آتی ہو کہاں جاتی ہو۔ تم آتی ہو میری دکان پر شاید میرے پیچھے۔‘‘ آخری الفاظ اس نے مسکراہٹ دبا کر کہے۔

’’اونہہ! منہ دھو رکھو۔ گلابو اور تمہارے جیسے کنگلے کے پیچھے۔ جس دکان کی روز کی بکری...... تین چار سو سے زیادہ نہ ہوتی ہو، اس دکان کے ملازم کو تنخواہ کتنی ملتی ہوگی۔‘‘

ایسا کہتے ہوئے وہ کتنی بے دردی سے اپنا دل کچلتی تھی۔ مگر کرنا پڑتا تھا۔ اس کے خواب تو بڑے اونچے تھے۔

ان خوابوں میں آنے والا کوئی ایرا غیرا، ایسا ویسا نہیں...... کوئی شہزادہ، کوئی نواب تھا۔

’’اور وہ...... یاسر! بے شک اس کے انداز...... طور طریقے...... اس کی بے نیازی...... اس کی اکڑفوں...... اس کا لب ولہجہ...... سب شاہانہ تھے۔ مگر وہ تھا تو ایک عام سا بندہ بے شک اس سے کچھ اچھی حیثیت کا ہی سہی لیکن اب انسان خواب بھی دیکھے تو ناپ تول کر دیکھے کیا؟

یہ وہ جانتی تھی، اس کی کوٹھڑی سے آگے کسی شہزادے یا نواب کی بارات نہیں آنے والی۔ یہ بھی پتہ تھا کہ کسی چنگڑ کی لڑکی کو رشتہ ملے گا تو یا تو اس کی ذات برادری سے یا پھر ویسا جیسا اس کی بہن مروفاں کو ملا۔ اس کی جہاں تک خواب دیکھنے کی بات تھی، تو وہاں لمبی

اڑاریاں ماری جاسکتی تھیں۔

’’شادی کا پتا نہیں ہونی ہے یا نہیں ہونی...... اور کس سے ہونی ہے۔ جو مقدر میں لکھا ہوگا، وہی ہوگا لیکن محبت مقدر تو نہیں جس کا لکھا قبول کرنا پڑے۔ شادی معیار سے کم والے سے کی جاسکتی ہے مگر محبت نہیں...... محبت میں کسی ایسے ویسے سے نہیں کروں گی۔ کم از کم عمر گزارنے کے بعد یہ فخر تو ہو میرے پاس...... کہ اور کچھ نہیں تو دل بڑی اونچی جگہ لگایا تھا۔‘‘

ایسے ارادے باندھنے والی یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت بھی تقدیر سے کم نہیں ہوتی۔

جیسے تقدیر کا لکھا اٹل...... ویسے محبت بھی لکھ کے مٹائی نہیں جاسکتی۔

جیسے تقدیر کے وار اندھے ویسے ہی محبت کے داؤ مہلک۔ وہ اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی مگر وہ تھا کہ خیالوں میں گھسا چلا آتا تھا۔

وہ اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی مگر قدم تھے کہ اس کی جانب اٹھتے چلے جاتے تھے۔

وہ اس سے بات نہ کرنا چاہتی تھی مگر......

اور اس ایک ’’مگر‘‘ کے آگے وہ بے بس تھی۔

جاڑوں کا کڑا دن تھا...... عرصے بعد دھوپ چمکی تھی...... اور اسے چارپائی پر آنکھیں موندے لیٹے، چہرے پر گرم نرم دھوپ کے تھپکے لیتے مزہ آ رہا تھا۔ جیسے وہ ہولے سے سہلا رہا ہو گالوں کو۔

’’افوہ...... کیا مصیبت ہے۔ ہر بات میں گھس آتا ہے۔‘‘

وہ جھنجھلا کے بیٹھ گئی۔

’’تمہیں چین کیوں نہیں پڑ رہا؟‘‘

اماں جنتے نے تسبیح کے دانے گراتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔

’’یہ تو میں آپ سے پوچھنے والی تھی۔ مجھے چین کیوں نہیں پڑ رہا؟‘‘

وہ بے بسی سے کہنے لگی۔

’’کچھ رکھ کے بھول گئی ہوگی کہیں۔‘‘ وہ سادگی سے کہتی آنکھیں موند کر پھر...... ذکر میں مشغول ہوگئیں۔

’’رکھ کر بھول گئی۔‘‘ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

’’ہاں...... شاید...... دل...... دل کہیں بھول آئی ہوں۔ خالی بت لیے پھر رہی ہوں۔ اس پر یہ طنطنہ کہ وہ ہوتا کون ہے میری محبت کا حقدار ہونے کا دعویٰ کرنے والا۔‘‘

وہ بے بسی سے اپنے اوپر ہنسی۔

"جاری گلابو...... اتنی جلدی ہار گئی...... بڑی اکڑ تھی...... رکھ دی اس کے قدموں میں؟"

"ہاں رکھ دی۔ کرلو جو کرنا ہے۔" اس کا دل ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتا تن کے کھڑا ہوا اور وہ اندر تک شانت ہو گئی۔ کئی دنوں سے جاری اپنے آپ سے وہ لڑائی ٹھنڈی پڑ گئی۔ کبھی کبھی ہتھیار ڈالنے میں بھی کتنی بڑی جیت ہے۔

"اماں جی! میں سویرے جا رہی ہوں۔"

"بس آج تو آئی ہے اور خود ہی تو بتا رہی تھی کہ تین دن رہے گی۔"

"میں تو رہ جاؤں مگر دل...... دل نہیں رہتا اور بنا دل کے کوئی رہتا ہے بھلا۔"

"کیا کہہ رہی ہے؟" ان کی سمجھ میں اس کی بڑبڑاہٹ ذرا نہ آئی۔ بلکہ آسمان کی جانب دیکھتی...... آپوں آپ مسکراتی وہ انہیں پاگل سی لگی۔ انہوں نے اندازہ لگایا کہ ضرور ماں سے کسی بات پر اَن بن ہوئی ہوگی۔

"کسی سے ناراض ہو کے جا رہی ہو۔"

"نہیں...... راضی ہو کر۔" اس کی مسکراہٹ کچھ اور پُراسرار ہوئی...... انہوں نے مزید سر کھپانے کی بجائے اٹھ کر آٹا گوندھنا شروع کر دیا۔ وہ تو کوئی کام کرنے کے موڈ میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

گلابو کو ان کے گدرائے ہاتھوں کی تھپکیاں آٹے پر پڑتی کتنی مدھر لگ رہی تھیں۔ تھپا تھپ...... تھپا تھپ...... تھپ تھپ تھپ...... جیسے کوئی لے...... کوئی سرگم۔

اس کے لب گنگنانے لگے۔

لیے پھرے ہے یار تیرا دیدار سجن
تھام کے مری مہار تیرا دیدار سجن
دل خود اپنے اندر جھانک کے کرتا ہے
اکھیوں کے اس پار تیرا دیدار سجن
جھلمل جھلمل لہرائے بینائی میں
شوخی کرے ہزار تیرا دیدار سجن

☆======☆======☆

"بڑی جلدی آ گئیں تم؟"

وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا کہہ کر تو یہی گئی تھی کہ کم از کم تین چار دن تو رہ کے لوٹے گی۔

"کل ہی آ گئی تھی۔" پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ جیسے اپنی بے تابی کی داد چاہتی ہو۔

"کرنے کیا گئی تھی پھر؟" وہ مڑ کے ریک میں پتی کے ڈبے سجانے لگا۔

"پتا نہیں...... شاید پتا ہی لگانے گئی تھی۔"

"کس کا؟" وہ یونہی بنا اسے دیکھے، اپنے کام میں مشغول سوال پر سوال کر رہا تھا۔

"تمہارا۔"

"میرا؟" وہ مڑا۔ "میں یہاں ہوں اور میرا پتہ کرنے تم اپنے گاؤں گئی تھیں۔ کیا کھا کے نکلی ہو صبح صبح؟ بھنگ کے پکوڑے؟"

"نہ جاتی تو پتہ کیسے چلتا کہ یہاں کیا بھول گئی تھی۔"

وہ محبت پاش نظروں سے اسے تکتے ہوئے سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی اور وہ اگر ایک بار یہ نظریں دیکھ لیتا تو اگلا سوال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہوتی اس کی نظریں اس پر واری صدقے جاتی دل کا سارا حال بیان کر رہی تھیں، مگر وہ ایک بار پھر لسٹ کی جانب متوجہ ہو چکا تھا اور نیچے زمین پر بندھا ہوا بنڈلوں کی صورت میں دھرا سامان بھی اس کی توجہ کا منتظر تھا۔

"اب کیا بھول گئی تھیں؟ یہاں کچھ نہیں ہے بھئی...... ہوتا تو میں سنبھال کے رکھ لیتا۔"

"دل۔"

ایسا لگا جیسے اس کے لبوں سے دو حرف نہیں ادا ہوئے تھے، پسلیوں میں دھڑ دھڑ کرتا دل خود ہونٹوں کے اوپر آ کے سج گیا تھا۔

وہ دم بخود اسے تکنے لگا۔ یہ ایک لفظی جواب سمجھ میں آنے والا نہ تھا۔ مگر صدرنگی داستانیں سناتا چہرہ سب سمجھ رہا تھا۔

"تم سے دور رہ کے ہی تو پتہ چلا کہ تم کتنے پاس ہو۔"

"پاگل ہوئی ہو؟" وہ ذرا سنبھلا...... کچھ کترایا...... اور نظر چرا کے کہنے لگا۔

"کوئی نئی فلم دیکھی ہوگی جس کے ڈائیلاگ دماغ کو چڑھ گئے ہیں۔"

"دماغ کیا...... دل پر بھی تم ہی تم چڑھے ہو۔"

وہ جتنا نظر چرا رہا تھا، گلابو کو اتنا ہی بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے سوچتی تھی کہ اظہار کرنا کتنا ارزاں کر دے گا اسے، مگر دل کی دل میں چھپا کے رکھنا وہ کام تھا جو اٹھارہ انیس سال کی زندگی میں اسے کرنا نہ آیا تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کہے یا میں۔"

یہ سوچ کر اس نے جھٹ سے دل نکال کے اس کے سامنے رکھ دیا اور اس کی جھجک دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

''یہ تو بالکل الٹا ہو گیا۔ یہ بات تمہیں کہنی چاہیے تھی اور شرمانے کی ادا مجھ پر جچتی۔''

''کون شرما رہا ہے؟'' وہ خود پر قابو پا کے اسے گھورنے لگا۔

''اور تمہیں کیا صبح صبح میں ہی ملا تھا مذاق کے لیے؟''

''میں مذاق نہیں کر رہی یاسر! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔''

''اچھا...... وہ کب سے۔''

صاف لگ رہا تھا وہ بات کو مذاق میں ٹال رہا ہے۔

''پتا نہیں...... شاید کل سے...... شاید پرسوں ہوئی ہو...... یا اس سے بھی کچھ پہلے۔''

''چلو...... محبت نہ ہوئی کالی کھانسی ہو گئی۔'' وہ بڑبڑایا۔

''تم جان بوجھ کر اسے مذاق میں ٹال رہے ہو یا میری محبت کو قبول نہیں کرنا چاہتے۔''

''اچھی زبردستی ہے۔'' وہ ایک بار پھر بڑبڑایا۔

''ادھر دیکھو...... ادھر...... میری طرف......''

وہ لپک کر اس کے مقابل آئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگی۔

''کیا تکلیف ہے تمہیں؟'' طیش کے مارے اس کے لب تھرتھرا رہے تھے۔

''جب میں کہہ رہی ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے، محبت ہے، محبت ہے تو تم مان کیوں نہیں لیتے؟''

یاسر نے چند لمحے حیرت سے اسے دیکھا پھر ہنس پڑا۔

''عجیب ہو تم...... ایسے بھی کوئی کرتا ہے کیا؟ اچھی دھونس ہے...... یہ تم اظہارِ محبت کر رہی ہو یا جگا ٹیکس مانگ رہی ہو؟''

''مجھے نہیں پتا...... کیسے کرتے ہیں محبت...... آ جائے گی خود بخود۔'' اس نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔ پھر مسکرا کر کہنے لگی۔

''تم سکھا دو۔'' ذرا سا قریب ہوئی۔

''پرے...... پرے......'' وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے کھسکا۔

''دکان ہے یہ...... اور وہ بھی ویگنوں کے اڈے پر...... کیوں حد نافذ کرانی ہے؟''

''دور ہٹ کے بات کرو...... ابھی چھاپہ پڑوا دے گا کوئی۔''

''یاسر! کیا ہے۔'' وہ جھنجلا کے پیر پٹخنے لگی اور اس سے زیادہ یاسر دل کو مار نہ سکا۔

اختیار کہہ اٹھا۔

''وہی جو تمہیں ہے۔''

''سچ؟'' ساری کوفت...... ساری جھنجلاہٹ ہوا ہو گئی۔ جھلمل آنکھوں کے ساتھ مسکراتی وہ اس لمحے اسے اتنی حسین لگی کہ اسے خود پر غصہ آنے لگا...... جو اتنی دیر سے اسے ستا رہا تھا۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں بھی مجھ سے محبت ہے؟''

بچوں جیسا معصومانہ اشتیاق لہجے میں بھر کے وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔

''کیا واقعی اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے؟''

مگر اندر ایک ہچکچاتی ہوئی خاموشی تھی۔

جواب نہ ہاں میں تھا نہ ناں میں۔

وہ اسے اچھی لگتی تھی...... پیاری سی...... انوکھی سی...... کبھی بڑی محترم...... کبھی بڑی سرپھری۔

اس کے ساتھ باتیں کرنا اسے اچھا لگتا تھا...... کبھی وہ کسی ایسے بچے کی طرح سوال کرتی، جو ابھی ابھی دنیا کو دیکھنے لگا ہو...... اور کبھی اس کی فلسفیانہ گفتگو سے یہ تاثر ملتا جیسے اس سے زیادہ دنیا کسی نے دیکھی ہی نہ رکھی ہو۔

وہ اس کی خودداری، اس کے غرور اس کے نازنخرے کو بھی پسند کرتا تھا۔ اس کی محنت اور آگے بڑھنے کی لگن کو بھی پسندیدگی سے دیکھتا تھا۔

اس کے علاوہ صنفِ مخالف کے لیے جو فطری کشش کھینچتی ہے وہ بھی اسے اس کے ساتھ گزارے تنہائی کے پلوں میں بارہا محسوس ہوتی تھی۔ اس کی ناک کی چاندی کی بالی...... اس کی ٹھوڑی کا ہلکا سا خم...... اس کے اَبرو کے پاس والا ننھا سا بھورا تل...... اس کی لانبی انگلیاں...... جن کے سرے پر قدرتی گلابی لیے ترشے ہوئے ناخن کتنے سادہ اور کتنے اچھے لگا کرتے تھے۔

''کیا یہی محبت ہے؟'' اس نے سوچا مگر کوئی واضح جواب پانے میں ناکام رہا۔

''بتاؤ نا...... ہے نا؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا۔''

''جھوٹے...... مکر رہے ہو اب......'' وہ ناراض نظر آنے لگی۔

''نہ سہی...... گلا بو مری نہیں جا رہی۔'' وہ بڑی آس کے ساتھ مڑی تھی کہ شاید وہ

پکارے۔شاید رو کے...... مگر تیسرے...... پھر چوتھے......حتیٰ کہ دکان سے باہر لے جاتے آٹھویں قدم پر بھی اس نے آواز نہ دی تو ''مری'' نہ جانے والی گلابو کی حالت واقعی مرجانے والی ہو گئی۔

☆======☆======☆

''کتنی عجیب لڑکی ہے۔''

وہ رات کو دیر تک اپنے صحن میں ٹہلتا دن میں ہوئے اس عجیب و غریب واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔

''دل......'' کانوں میں اب تک اس کی آواز سرسرا رہی تھی۔

''تم سے دور رہ کے ہی تو پتہ چلا کہ تم کتنے پاس ہو۔''

اس نے کہا تھا تو یاسر کو احساس ہوا کہ پچھلے دو دن وہ اسے کس بری طرح یاد آتی رہی۔ وہ روز نہیں ملتی تھی......مگر ان دونوں میں یہ احساس شدت سے ہوتا رہا اسے کہ وہ اس کے شہر میں نہیں ہے......اور اگلے دو دن تک اس کے اچانک حسبِ عادت بغیر بتائے آدھمکنے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔وہ شاید اس احساس کو دبا لیتا اندر ہی اندر......مگر گلابو کے اظہار نے اس احساس کو توانا کر کے اس کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔

''دماغ کیا......دل پر بھی تم ہی تم چڑھے ہو۔''

وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔یہی حال تو اس کا تھا۔جتنا وہ اس کے خیال سے لڑتا۔اتنا ہی بہانے بہانے سے بار بار اسی کو سوچتا۔کبھی جھنجلا کے کہہ اٹھتا۔''کیا مصیبت ہے۔دھیان کیوں نہیں لگتا کام میں۔'' اور کبھی سوچتا اس کے خیال میں کام کب ختم ہوتا ہے پتہ ہی نہیں چلتا۔

''میں مذاق نہیں کر رہی یاسر! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔''

وہ اسی وقت جان گیا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہی......مگر وہ اسے مذاق میں ٹال ضرور رہا تھا......کیوں؟ کیونکہ......

''تم جان بوجھ کر میری بات کو مذاق میں ٹال رہے ہو یا میری محبت کو قبول نہیں کرنا چاہتے؟''

وہ فوراً بھانپ گئی تھی۔مگر اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ جاننے سے قاصر تھی۔وہ کیسے بتاتا اسے کہ ہچکچاہٹ اسے اس سے محبت کے اعتراف سے نہ تھی۔قدم بے جھجک انداز سے خائف ہو کر اکھڑ رہے تھے۔پہلی ملاقات میں جس طرح اس نے ایک غلط تاثر چھوڑا اور پھر فوراً ہی

زائل کر دیا تھا۔ایسا بارہا ہوا تھا......کئی بار یاسر کو وہ کوئی بہروپ لگی......اور ہر بار نکھر کے سامنے آتی تھی......اور حسبِ سابق آج بھی اس کے بے دھڑک اظہارِ محبت نے اسے کھٹک میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ مرد ہو کر سوچتا ہی رہ گیا۔جانچتا پرکھتا ہی رہ گیا کہ دل میں بسنے والے اس جذبے کو کیا نام دے......اور وہ بتا بھی گئی، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جتا بھی گئی۔

''پہلی بار اظہار کے مرحلے سے گزرنا اتنا آسان تو نہیں ہوتا اور وہ بھی کسی عورت نہیں......کسی لڑکی کے لیے......تو پھر یہ؟'' یہ وسوسہ اسے بہکانے لگا۔

اور پھر وہ ناراض ہو کے چلی گئی تھی۔ادھر وہ نظروں سے دور ہوئی ادھر دل سے وہ دھڑکے، وہ اندیشے دور ہوئے جو ورغلا رہے تھے۔اب اندر سے گواہیاں ملنے لگیں۔

''وہ سچی ہے......سچے لوگ......نڈر ہوتے ہیں۔بے باک ہوتے ہیں......اس کی بے باکی اس کی بے حیائی نہیں ہے۔وہ ہے ہی ایسی......عجیب سی......سب سے الگ......الگ نہ ہوتی تو دل کو بھاتی کیوں؟''

اس نے گلابو کو منانے کا ارادہ کر لیا اور ایک گہری طمانیت بھری سانس بھر کے اوپر دیکھا۔

ستاروں بھرا آسمان اس کے فیصلے پر چراغاں کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

مگر اس کے گلابو کو منانے کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔اگلے دن دکان کھولنے پہنچا تو اسے پہلے روز کی طرح......بند دکان کے تھڑے پر بیٹھے، گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے سر جھکائے پایا۔

''اتنی صبح صبح؟ ساری رات سے بارش ہو رہی ہے، تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟''

وہ جلدی جلدی تالا کھول کر شٹر اٹھانے لگا۔ہلکی ہلکی بارش میں وہ بھیگ رہی تھی۔کپکپاہٹ یاسر کو ہونے لگی۔

''چلو اندر آؤ......میں انگیٹھی جلاتا ہوں۔کپڑے سکھا لو آ کے۔''

''ناں......'' وہ گیلی مٹی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سر ہلانے لگی۔

''بھیگ جاؤ گی۔بارش تیز ہونے والی ہے۔''

''میں نہیں آؤں گی اندر......میں ناراض ہوں تم سے۔''

یاسر نے مشکل سے ہنسی روکی۔

''ناراض ہو؟ تو پھر یہاں تک کیوں آئی ہو؟ فیکٹری تو تمہاری ساڑھے سات بجے کھ ہے۔ابھی پونے سات ہیں۔''

''میں نے سوچا...... تمہیں محبت کرنا نہیں آئی...... منانا بھی نہیں آتا ہوگا وقت لگے میری ناراضی ختم کرنے میں...... اس لیے گھنٹہ پہلے آ جاؤں۔'' معصومیت سے کہتی وہ ا کے سارے غلط مفروضے دھڑا دھڑ گرا کے ڈھیر کر رہی تھی۔

وہ خود بھی ڈھیر ہو گیا۔

اس کا نم ہاتھ...... یخ بستہ ہاتھ دھیرے سے تھام کر منت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔

''بیمار ہو جاؤ گی...... پلیز آؤ۔''

وہ اسے دیکھتے ہوئے بغیر کچھ کہے اٹھ گئی۔ بجلی کی انگیٹھی کے آگے قمیص کا دامن کے سکھانے لگی۔

''چائے منگواؤں؟''

''نہیں...... پہلے مناؤ۔''

''تم مان چکی ہو۔اب مانے ہوئے کو اور کیا مناؤں۔''

وہ مزہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''اچھا...... پھر بتاؤ...... محبت کرتے ہو مجھ سے؟''

''تمہاری چادر بھی بھیگ گئی ہے اور شاید بال بھی گیلے گیلے سے لگ رہے ہیں...... گئیں۔دو چار دن سے پہلے نزلہ زکام جان نہیں چھوڑنے والا۔''

''اوہو...... میں کیا پوچھ رہی ہوں؟'' وہ تنگ کے بولی تو وہ جیسے ہار مانتے ہوئے لمبا سانس بھر کے رہ گیا۔

''اگر میں کہوں...... نہیں...... تو؟''

''تو میں پوچھوں گی کیوں؟''

''کیا میں نے تم سے پوچھا کہ تم مجھ سے محبت کیوں کرتی ہو؟''

''تو پوچھو...... کسی نے روکا ہے؟''

''اچھا...... بتاؤ...... کیوں کرتی ہو محبت؟''

''میں......'' وہ فوراً بتانے لگی۔

''وہ......'' مگر ایک لفظ کے بعد ہی گنگ ہو گئی۔ خالی خالی نظریں خالی الذہنی کی کا اعلان کر رہی تھی۔ چند ہی لمحے کے بعد وہ بے بس نظر آنے لگی...... یاسر نے

مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

''نہیں بتا...... سکتیں نا! ایسے ہی میں بھی تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔''

''لیکن یاسر! تمہیں مجھ سے محبت ہو گی ضرور۔''

اس پر گویا کوئی وحی اتری تھی۔ یاسر سحر زدہ سا اس کے گندمی چہرے پر رقصاں تپش کو تکنے لگا۔ اتنا اعتماد چمک رہا تھا اس کے بے حد خاص تاثر والے عام سے چہرے پر...... کہ اسے اپنے باندھے سارے احتیاطی بند ڈھیتے ہوئے نظر آنے لگے۔

''دیکھ لینا...... ایک نہ ایک دن تو ہو ہی جائے گی۔''

اس نے اپنے گال پر گر آنے والی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا اور چیلنج بھرے انداز میں کہا۔

''تم سے محبت نہ کروا سکی تو نام بدل دینا میرا۔''

وہ ہنسنے لگا...... دل کھول کے ہنسنے لگا۔

''میرا کیا ہے...... کہہ دوں گا ہاں ہو گئی ہے تم سے محبت...... تو کیا تم سچ مچ نام بدل لو گی؟ اچھا ایسا کرنا گلابو سے بدل کے پیلو رکھ لینا۔ چلو...... میں ابھی کہہ دیتا ہوں...... میں تم سے محبت کرتا ہوں...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

یہ وہ الفاظ تھے جو وہ پوری جی جان سے سننا چاہ رہی تھی مگر جب وہ کہنے لگا تو اس نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

''بس...... میں نے یہ نہیں کہا کہ میں تم سے یہ بات کہلواؤں گی۔ محبت کے کرنے میں اور کہنے میں بڑا فرق ہوتا ہے یاسر!''

''اگر یہ فرق جانتی ہو تو پھر یہ بھی جانتی ہو گی کہ محبت کے ہونے میں اور محبت کے کرنے میں بھی بہت فرق ہوتا ہے۔''

اس کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ سن ہو کے رہ گئی۔

وہی آوارہ سی لٹ ایک بار پھر کان کے پیچھے سے نکل کر چہرے پر رقصاں تھی، جیسے کوئی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر ماتم کر رہا ہو۔

شاید وہ جان گئی تھی۔ جان گئی تھی محبت کرنے اور محبت کے ہو جانے کا فرق...... اس فرق نے اس میں اور کسی مردہ بت میں کوئی فرق نہ باقی رہنے دیا تھا۔

یاسر کا دل بے اختیار ہوا...... اس نے ہاتھ بڑھا کے اس کی ناک کی بالی سے الجھی لٹ کو انگلی کے گرد لپیٹا اور اس کے کان کے پیچھے قید کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں پتہ ہے......تم چپ ہوتی ہو تو کتنی اچھی لگتی ہو۔''

اور مردہ بت کے اندر کسی نے روح پھونک دی۔

محرومی اور تشنگی سے تڑختے خشک لبوں پر گلال دوڑ گیا۔

پھر پیا کے رہے قریب سجن
پھر قسمت ہوئی رقیب سجن
کچھ پوچھو نہیں ہوئے کتنے
ہم تیرے بنا غریب سجن
اے بھاگ ہماری جاگ کبھی
کبھی سونا چھوڑ نصیب سجن

''تمہیں پتہ ہے میں میٹرک کے پرچے دینے والی ہوں۔''

''پڑھتی کس وقت ہو......مرغ کی پہلی بانگ کے ساتھ تم دکان پر آ بیٹھتی ہو، ساڑھے سات سے لے کر تین بجے دوپہر تک فیکٹری۔ پھر تین بجے سے پانچ بجے تک دوبارہ میرا دماغ چاٹتی ہو۔''

''ہاں تو شام پانچ بجے سے لے کر صبح کے پانچ بجے تک کا وقت تو ہوتا ہے نا میرے پاس......میں نے ساری تیاری کر لی ہے۔''

''سوتی نہیں ہو تم؟''

''اوں ہوں......تم سونے ہی نہیں دیتے۔''

وہ اس کے نزدیک کھسک کر بازو تھام کے بیٹھ گئی۔

ایسے ہی کمزور لمحوں سے گھبراتا تھا وہ۔ ڈرتا تھا کہ کہیں گلابو کا دعویٰ سچ نہ ہو جائے۔ کہیں اسے سچ مچ اس سے محبت نہ ہو جائے۔ وہ ہونی کو اب تک انہونی سمجھ کے کترا رہا تھا۔

دریا نے گرنا تو سمندر میں ہی ہوتا ہے۔

لیکن یہ بات وہ اب تک سمجھ نہیں پایا تھا۔

''کیا کرو گی میٹرک پاس کہلوا کے......علامہ تو ہو پوری......وہ بھی بغیر دس جماعتیں پاس کیے......یہ نہ ہو سرٹیفکیٹ ہاتھ آتے ہی......''

''سرٹیفکیٹ ہاتھ آتے ہی مجھے فیکٹری میں مشین کے آگے نہیں بیٹھنا پڑے گا، قدسیہ آپا نے کہا ہے مجھ میں صرف ڈگری کی کمی ہے ورنہ میری جگہ وہ نہیں۔ بیگم عابدہ سے بھی آگے ہے......لیکن میں نے سوچ لیا ہے۔ وہ بیگم عابدہ سے بھی آگے، اس سے بھی اونچا عہدہ کیوں

نہ دیں مجھے......میں ایک بار......ایک بار تو بیگم عابدہ کو اس کی جگہ سے ہلا کے رہوں گی......زہر لگتی ہے وہ مجھے۔''

''کیوں کسی کی روزی روٹی کی دشمن ہو رہی ہو......ترقی سے پہلے ہی ایسے عزائم......؟ خدا کا خوف کرو لڑکی!''

''وہ کیوں نہیں کرتی خدا کا خوف......ایمان سے کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے وہ سارے لوگ جو مجھے برے لگتے ہیں۔ ربڑ سے گھس گھس کے انہیں ختم کر دوں۔ مٹا ڈالوں۔''

''محبت کی طرح تمہاری نفرت بھی طوفانی......پتہ ہے ایسے لوگوں کو کیا کہتے ہیں؟''

''کیا؟'' وہ اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی۔

''پاگل......'' کہہ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹا......بروقت اقدام تھا ورنہ اس کے تیز دھار ناخن چہرے پر کہیں نہ کہیں داغ چھوڑ جاتے۔

☆======☆======☆

''تاجی اور اقبال کہاں ہیں؟''

''رب جانے......کدر کی کھے (خاک) کھاتے پھرتے ہیں۔'' بھاگاں نے گھاگھرا اٹھا کر پنڈلی کھجاتے ہوئے کہا۔

''ان کو بھی راجے اور جونے نے عادت ڈال دی ہو گی آوارہ پھرنے کی۔''

اس نے اپنے بڑے دونوں بھائیوں کا نام لیا۔ منہ میں کڑواہٹ سی بھر آئی۔

''تاجی تو شوکے کے ساتھ ہٹی (دکان) پہ بیٹھنے لگا ہے، روز دیہاڑے چالی پنجا (چالیس پچاس) کما کے لاتا ہے۔ خیر نال آوارہ تے نہ ہوا۔''

''شوکا؟'' وہ بدک اٹھی۔ ''کون شوکا؟''

''وہی......مروفاں کا مرن جوگا خصم۔''

''وہ کہاں کا مرن جوگا ہوا......دندناتا پھرتا ہے ابھی تک......دھرتی کا بوجھ......مرن جوگی تو میری بہن ہو گئی تھی اس سے شادی کر کے اور نہ وہ اس کا شوہر تھا......پیروں میں لوٹ رہی تھی وہ مگر اس نے طلاق دے کر چھوڑ دی......اور میں پوچھتی ہوں کہ تاجی کو کس حساب میں اپنی دکان پر بٹھانے لگا ہے وہ؟''

''پیو ہے اس کا......اس نکھٹے کو نہ بٹھائے گا تو ہور گوانڈیوں کے منڈے کو بٹھائے گا۔''

''پیو؟......یہ اب یاد آیا ہے اسے؟ اور میں بھی جانتی ہوں اماں اور تم سب کو بھی پتہ ہے کہ تاجی کا اور اقبال کا باپ وہ نہیں ہے۔''

''ہولی......'' (آہستہ) بھاگاں نے گھر کا۔

''چھڑے کی طرحیو کھلتی جاتی ہے تیری جیب (زبان)...... سارے پنڈ کو پتہ ہے کہ مروفاں، شوکے کی ویاہی زن تھی...... اس کے تریہہ (تین) بچے جمے تھے اس نے، تُو بوہتے پرانے کھاتے نہ کھول۔''

''کھاتے تو شوکا کھول رہا ہے۔ اتنے سالوں بعد اسے خیال کیسے آیا ان تینوں کا؟''

''دوویاہ کیے تھے شوہدے نے مروفاں کے بعد۔ چوہا بھی نہیں جما کسی زن نے من جا کے قدر ہوئی ہے میری سودائن دھی کی...... اب اتھر و اتھر و روتا ہے۔ مکان، زمین، ہٹی...... سارا کج کس کا ہوا؟ انہی تریہوں (تینوں) کا...... کے تو نواں رولا ڈال رہی ہے...... چپ کر کے بہہ جا ارمان نال؟''

''میں تو چپ نہیں رہوں گی...... جا کے پوچھوں گی اس سے کہ اب دل میں اولاد کی طلب اور چاہ جاگی ہے، تب بڑھاپا یاد نہیں تھا جب بڑی اکڑ سے مروفاں کو دھتکار کے نکالا تھا...... جب اس کے بچے کو اپنانے سے انکار کیا تھا...... اور اب اگر اتنی ہی اولاد اور وارث کی محبت بھڑک اٹھی ہے اسے لے کر جائے جو اس کی اہل اولاد ہے۔ یعنی چھوٹا...... تاجی تو چودھری منظور کا......''

''چھوری۔'' صدورے نے اندر داخل ہوتے ہوئے گرج کر اس کی بات کاٹی۔

''اک لفظ (لفظ) وی ہور نکالا تے میں جیب (زبان) کٹ کے رکھ دوں گا۔ چار پیسے کمانے کا چج آ گیا ہے تو گلاں وی چار ہجار (ہزار) سنانی آ گیاں ہیں...... اپنے اٹھ سو ہجا کی تڑی نہ لگائیں میرے کو...... میں گت سے پھڑ کے سامنے کی کند (دیوار) سے دے مارنی ہے تیری کھوپڑی۔''

''ابا میں نے غلط بات نہیں کی...... وہی کہہ رہی ہوں...... جو تمہارا اور اماں کا ارادہ ہے۔ تم دونوں بھی تو یہی چاہتے ہو کہ شوکا...... جو بعد میں کی دو شادیوں کے بعد بھی اولاد پیدا نہیں کر سکا، اس کے گھر اور دوسری جائیداد کا وارث تمہارا دوترا (نواسا) بنے تو تاجی آگے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چھوٹا اس کا خون ہے۔ اسے اپنا لے۔ مروفاں کی روح بھی سکون ملے گا۔''

''کھوہ وچ جائے مروفاں کی روح۔''

بھاگاں نے منہ بنا کے حقارت سے ہاتھ ہلایا...... گلابو کے کلیجے میں گھونسا پڑا۔

''ہاں...... تم تو جیتی جانوں کو کھوہ میں ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہو۔ مرے ہوؤں کی

بساط۔'' وہ بڑبڑا کے رہ گئی۔

''چتر چتر بکواس کرنے کی جاچ ہے بس...... عقل ماشہ برابر ہی نہیں ہے نکھٹی کو......''

صدورا ذرا نرم پڑا اور اس کے نزدیک ہو کر سمجھانے لگا۔

''گل تیری یا میری نجر سے دیکھنے کی نہیں ہے تُو اپنی نجر سے دیکھے گی تو شوکے کا وارث چھوٹا ہی لگے گا۔ پر پنڈ والوں کی نجر سے دیکھو تو وڈا منڈا ہے مروفاں اور شوکے کا...... شوکا اب اس عمر میں اپنے جھاتے میں کھے تو ڈلوانے سے رہیا...... اور نہ میرے میں بے عجتی کھانے کی ہمت ساہ رہی ہے۔ کدر لوگاں کے سوالاں کے جواب دیتا پھراں گا کہ شوکا نکے منڈے کو تو چوم چاٹ کے لے گیا...... وڈے دونوں کو کیوں نہ لے کر گیا؟ گل ضرورت کی ہے، مجبوری کی ہے اور عجت بنا کے رکھنے کی ہے...... ضرورت اس کی وی ہے۔ ساڈی وی ہے۔ مجبوری وی سانجھی ہے اور عجت بنانے کا رونا بھی دونوں پاسے ہے۔ پرانیاں گلاں بھول جا کڑیئے۔''

''تیرا پیو سئی کہہ رہا ہے چھوری...... تیرے کو لوڑ نئیں ہے بک بک کرنے کی...... اسی تیرے وڈے سیانے بیٹھے ہیں نا چنگا مندا دیکھنے والے...... رب بھلی کرے گا...... تے اک گل ہور اے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں اس کے کان کے پاس جھکی۔

''چھوٹا ہالے (ابھی) چھوٹا ای ہے...... ذرا عقل چج نہیں، تاجی سیانا ہے۔ اسے جونے اور راجے کی صلاح بھی ملتی ہے۔ وہ شوکے کو منٹاں میں مٹھی میں کر لے گا۔ چھوٹے کو تو شوکے کی دونوں زنانیاں کٹ کے چٹنی بنا دیویں گی۔''

''پر حق تو اس کا ہے نا اماں!''

وہ پھر بھی کہنے سے باز نہ آئی۔

''ہک...... ہا......'' بھاگاں نے ماتھے پر ہاتھ مار کے ہنکارا بھرا۔

''عقلاں دی پوری...... نکھٹی...... کیڑاں کھا دی۔''

وہ منہ بھر کے کوسنے لگی اسے...... اور وہ چپ چاپ اٹھ کر اندر کوٹھڑی میں آ کے بیٹھ گئی۔ اپنے بیگ کی زپ کھول کر اس نے تینوں جوڑوں کے نیچے دبی چوڑیاں اور بندے نکالے...... وہ بوجھل ہوئے دل...... اور کثافت سے بھرے ماحول کو یاسر کی یادوں سے سبک بنانا چاہتی تھی۔

یہ سبز اور تیز سرخ رنگ کی دو درجن چوڑیاں۔ چاندی کے سرخ نگ لگے بندے یاسر نے اسے عید کے تحفے کے طور پر دے کر گویا اس کے وجود کو پَر لگا دیئے تھے۔

''میرے لیے؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا اور پھر اس کی جانب جتاتی ہوئی نظروں

سے دیکھا۔

''دیکھا...... میں نہ کہتی تھی۔'' وہ نظریں دعویٰ کر رہی تھیں اس سے اپنی محبت منوا لینے کا...... وہ چپ چاپ اسے دیکھ کر مسکراتا رہا، نہ اس دعوے کی تردید کی نہ تائید۔

''عید کرنے گھر جاؤ گی؟''

''تم کہو گے تو نہیں جاتی۔''

''جاؤ...... ضرور جاؤ...... عید اپنوں کے ساتھ ہوتی ہے اس بات کو مجھ سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے جس نے سارے اپنے کھو دیئے ہیں...... تم جاؤ...... تمہارے ماں باپ کی عید تمہارے بغیر ادھوری ہو گی۔''

''ماں باپ کی تو ایسی کی......'' وہ دل ہی دل میں تلملا کے رہ گئی...... سب کچھ کھول کے بتا دینے والی گلابو ماں باپ کے بارے میں چاہ کے بھی وہ سب کچھ نہیں بتا پائی تھی جو اسے ان سے متنفر کرنے کی وجہ بنا...... نہ اماں جنتے کو...... اور نہ یاسر کو...... نہ جانے کیوں ابھی بھی بظاہر اس نے یاسر کا مشورہ جانتے ہوئے خاموشی سے سر ہلا کر عید اپنے گاؤں...... اپنے خاندان والوں کے ساتھ کرنے کا عندیہ ظاہر کر دیا...... مگر حقیقت یہ تھی کہ اس نے بڑی کوشش کی تھی اس عید کی چھٹیوں میں جانا ٹل جائے...... فیکٹری میں چھٹیاں سہی مگر وہ یہاں تو رک سکتی ہے اور کچھ نہیں تو عید کی مصروفیت اور مہمانداری میں رانی اور دیگر ملازماؤں کا ہاتھ بٹانے کی نیت سے ہی سہی۔ گھر جانے کی مصیبت بھی ٹل جائے گی اور قدسیہ آپا پر احسان الگ...... مگر ہوا یہ کہ دونوں دیورانی، جٹھانی نے یہ عید اپنے اپنے میکے کرنے کی ٹھان لی...... اور اس کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جب گھر والے ہی گھر نہ ہوں تو وہ گھر رک کے کیا کرتی۔ بلکہ کس برتے پہ رکتی...... دل مسوس کر سامان باندھنا پڑا۔

عید کا جوڑا بھی قدسیہ آپا نے بنوا دیا...... عیدی کے نام پہ دو سو روپے الگ سے ملے...... تنخواہ کے ساتھ عید کا بونس تو تھا ہی...... مگر یہ سب بھی گھر جانے کی کلفت نہ دھو سکے۔

ہاں یہ ہری...... سبز چوڑیاں...... یہ چاندی کے جھمکے وہ ہتھیلی پہ نہ دھرتا تو شاید وہ گھر جانے سے بچنے کے لیے نہر میں ہی کود جاتی لیکن اس تحفے کے پانے کے بعد اسے سب اچھا...... نیا نیا سا لگنے لگا۔ وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے...... یہ خیال اتنا فرحت انگیز...... اتنا خوش کن تھا کہ اس خیال میں کھوئے کھوئے وہ جہنم میں بھی پہنچ جاتی تو اسے پتہ نہ چلتا۔

☆======☆======☆

''اماں! تمہیں کل پیسے دیئے تھے سامان لانے کو؟''

اس نے چولہے کے پاس رکھی لکڑی کی ٹوٹے دروازوں والی دو فٹ اونچی الماری کو چھانتے ہوئے پوچھا۔

''کہا بھی تھا کہ سویاں، گھی اور چینی لے آنا...... عید کا میٹھا بناؤں گی۔''

''لے...... جھلی! عید پر مٹھے کی کوئی تھوڑ اے...... میں الی عیداں ملنے جاؤں گی گھراں میں...... ساروں نے کولی کولی (پیالی) مٹھے کی پکڑا دینی ہے...... ہالے...... (ابھی) ست طراں کے مٹھے کا ڈھیر لگ جاوے گا۔''

''مجھے سات گھروں سے آیا میٹھے کا ڈھیر نہیں چاہیے مجھے خود سویاں پکانی ہیں۔'' وہ ہٹیلے پن سے بولی۔

دہلیز کے اندر قدم رکھتا وہ چونک کر دیکھنے لگا......

تولیے میں بال لپیٹے، ماتھے پر ناگوار سے بل لیے وہ لڑکی اس گندی سندی کوٹھڑی کا حصہ نہیں لگ رہی تھی۔

''ہائے ربا جی...... کیسی کوڑھی دھی اے...... پٹھی مت والی۔ مفت میں گھیو چپڑی چھڈے سکی کھانے کو ترستی ہے۔''

بھاگاں نے منہ اونچا کر کے مولا سے فریاد کی۔

''مجھے سوکھی بھاتی ہے اماں! اگر عزت سے ملی ہو...... خود کمائی ہو...... بھیک میں ملی یا کسی کی تھالی سے بچی گھی کی چپڑی میرے حلق سے نہیں اترتی...... کتنی بار بتایا ہے...... جا میرے لیے سویاں لے کر بازار سے...... میری عید نہ خراب کر۔''

''کون خراب کر رہا ہے عید؟''

اس نے دوسرا قدم بھی اٹھایا اور دہلیز پار کر کے اندر آتے ہوئے کھنکارا۔

گلابو نے چونک کر دیکھا۔ ملیشیے کے شلوار قمیص میں ملبوس چھ فٹ کے قریب قد والا وہ داڑھی مونچھ والا چالیس پینتالیس سالہ سانولا شخص بہت دیکھا بھالا لگ رہا تھا۔

''جی آیاں نوں...... آ جا شوکے...... لنگ آ۔''

''شوکا......'' اس نے غور سے دیکھا۔ وہ شوکا ہی تو تھا۔

برسوں گزر گئے تھے اسے دیکھے...... مگر اتنی زیادہ تبدیلی؟ وہ اور بھی غور سے اسے دیکھنے لگی۔

دراز قامتی وہی تھی...... مگر شانے ڈھلک گئے تھے، کمر میں بھی ویسی اکڑ نہیں تھی۔ داڑھی بڑھا لی تھی۔ نظر کے چشمے کا اضافہ بھی تھا...... ماتھے کے بال اُڑ چکے تھے...... اور جو تھے

ان میں سفیدی غالب تھی۔ مجموعی تاثر بڑا بدحال سا تھا...... گلابو نے نخوت سے ناک چڑھاتے ہوئے رخ پھیر لیا۔

''یہ لو سویاں...... میں یہی دینے آیا تھا...... گھر کا نکلا اصلی گھی...... چٹی شکر اور جھورے حلوائی کی بٹی سویاں اب اگر گلابو اپنے ہاتھ سے پکا کے کھلائے تو سواد آ جائے۔''

''کیوں؟ تمہاری دونوں بیویاں ٹنڈی ہیں کیا؟''

وہ تنک کر بولی تو بھاگاں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ شوکا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''بھئی واہ...... جواب کرارے دیتی ہے کڑی...... شہر دی کڑی جو ہوئی۔''

وہ مونچھوں پر بل دیتا اسے تکتا رہا اور وہ جو اپنے لیے چائے کا پانی رکھ چکی تھی۔ اندر ہی اندر تلملاتی اس کی جانب پیٹھ کیے برتن ادھر سے اُدھر پٹختی رہی۔

''چاہ بنواؤں شوکے؟''

''ضرور مائی...... ضرور۔''

''ہونہہ...... صحیح کہتے ہیں لوگ ہمیں کم ذات کم ذات ہی تو ہیں...... جس نے بیٹی کو دھتکار کے نکالا...... اپنی اولاد کو گالی دی۔ اسی کو سر آنکھوں پر بٹھا کے چائے پلائی جا رہی ہے جو بیٹی کی دلالی کرتا رہا...... اس کی میزبانی کی جا رہی ہے...... ڈوب کر مر جا اماں!''

وہ چمٹے کو زور زور سے راکھ میں مار کے چنگاریاں اڑاتی ہوئی دل کی کھولن نکال رہی تھی۔

''گلابو کو اب نہ جانے دینا مائی۔''

وہ خواہ مخواہ ہی مشورے دینے لگا۔ گلابو نے بڑی مشکل سے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھا۔ اسے ڈر تھا اب اس کے منہ سے کچھ نکلا تو وہ گالی ہو گی۔ وہ دانت پیستی پتی کو کھولتے پانی میں کلبلاتے دیکھتی رہی۔ پھر دودھ ڈالنے لگی۔

''لے...... میرا تے صدورے کا جی کب راضی ہے اسے پردیس بھیجنے کو۔ گریب کے لیے تو دھی کی عجت ہی بڑی گل ہوتی ہے۔ صدورے نے بھی کہیا...... چل کڑی ذات ہے، کر لینے دے چاء پورا۔''

''ہاں مگر گھر پر بھی تو اس کی ضرورت ہے۔ تمہاری ہڈیوں میں اب وہ زور کہاں رہا مائی اتنے بڑے ٹبر کو سنبھالنا تیرے اکیلی کے بس کی بات نہیں۔ پھر میرے بچے بھی تیرے ہی گل پڑے ہوئے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں گلابو نوکری چھوڑے اور گھر بیٹھ کر ان کو سنبھالے...... ماسی بھی ماں جئی ہوتی ہے۔''

مگ میں چائے...... الٹتی گلابو کا ہاتھ ذرا سا کپکپایا...... تھوڑی سی چائے باہر جا گری۔

''اسی واسطے تو میں کیندی آں...... اپنی اماناتاں لے جا اپنے گھر...... تو بھی خوش...... اسی بھی خوش۔''

بھاگاں نے فٹ اپنے مطلب کی کہی۔

جواب میں شوکا نے بھی مطلب نکالنے میں دیر نہ کی۔

''گھر؟ گھر میں ان کی ایک نہیں دو دو سوتیلی مائیں ہیں۔ پتروں کے لیے میں دو زنانیاں کیا زمانہ چھوڑ دوں۔ پر گھر سنبھالنے کے لیے زنانی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ کوئی ایسی ہووے جو گھر بھی سنبھالے اور میرے تینوں پتروں کو بھی سگی ماں بن کے دیکھے...... خیر گل بنتی نظر آتی ہے۔''

وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا مگ اٹھا کر اندر گئی گلابو کو دیکھ رہا تھا...... اور بھاگاں اس کی نظروں سے تعاقب میں دیکھتی اس کی بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

''کدھر جانا ہے؟''

''ہیں۔'' کنڈیکٹر کے سوال پر وہ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے اسے تکنے لگا۔

''او بھائی! کدھر جانا ہے؟ مانگے؟ سانگے؟ مرید کے؟''

''وہ...... مو......'' وہ شاید ذہن پر زور ڈال کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہاں جانا ہے۔

''یہ کس کے ساتھ ہے بھئی؟'' کنڈیکٹر نے ادھر اُدھر دوسرے مسافروں سے پوچھا۔ سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''بھائی......! جانا ہے تو جگہ بتاؤ اور ٹکٹ کے پیسے دو، ورنہ نیچے اترو شاباش۔''

''پیسے؟ ہاں پیسے تو ہیں میرے پاس۔''

گردن سے نیچے آتے گھنگھریالے الجھے بے ترتیب بالوں...... لمبوترے چہرے...... مڑی ہوئی ناک اور بے حد باہر کو ابلی وحشت زدہ آنکھوں والا بیس اکیس سال کا لڑکا پہلی نظر میں ہی نارمل نظر نہیں آ رہا تھا۔

''یہ دیکھو...... پیسے اتنے سارے۔''

وہ جیب سے مڑے تڑے نوٹ اور سکوں کا ڈھیر نکال کر دکھانے لگا۔

''سائیں ہے بے چارہ......'' کسی نے ترحم سے کہا۔

"رہنے دو...... جہاز ہے پورا......ٹن ہوا لگ رہا ہے۔"

کسی منفی سوچ والے نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے یہ کہاں سے تمہیں جہاز نظر آرہا ہے۔"

جواب میں وہ کھا جانے والے انداز میں بولا تو سب ہنسنے لگے۔ گلابو نے بھی ہونٹوں کے آگے انگلیوں کی اوٹ کر کے مسکراہٹ چھپائی۔

"یہ پیسے لے لو...... ٹکٹ دے دو میں چار ٹکٹیں لوں گا......"

"چار؟ باقی تین کون ہیں تمہارے ساتھ؟"

"کوئی نہیں...... میں اکیلا چار لوں گا...... مجھے نیند آرہی ہے چار سیٹوں پر لیٹوں گا۔"

"بے چارہ اللہ لوک ہے شاید راستہ بھول گیا ہے۔"

"چل چل کام کر اپنا راستہ بھول گیا ہے۔" وہ منہ ٹیڑھا کر کے اس کی نقل اتارنے لگا۔

"مجھے سارے راستے آتے ہیں۔ شاہ عالمی سے لے کر دلی دروازے تک مال روڈ سے لے کر باغبانپورے تک اور شادمان سے لے کر جلو تک......"

"یہ تو لاہور سے آیا ہے شاید...... وہاں کی جگہوں کے نام لے رہا ہے۔"

"لا یار! پیسے دے۔" کنڈیکٹر نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ "یہ تو بتا کہاں کی ٹکٹ کاٹوں؟"

"سرکس والے کدھر جا رہے ہیں؟"

"کون سی سرکس؟"

"وہ جو موت کے کنویں والی ہے۔ ممتاز بیگم والی اور نیولے والی۔ وہ سرکس۔"

"اچھا یہ پل کے پاس لگنے والی سرکس کے بارے میں پوچھ رہا ہے وہ تو ابھی نکلی ہے بس مرید کے کے لیے۔"

"ہاں تو مرید کے کی ٹکٹ دے دو...... میں مرید کے جاؤں گا سرکس دیکھوں گا...... لومڑی کے دھڑ والی ممتاز بیگم دیکھوں گا، گانے سنانے والا نیولا...... رسی پر چلنے والی میم...... موت کے کنویں میں دوڑنے والی موٹر...... مرنے......"

وہ چٹخارے لیتے ہوئے بولا جیسے سچ مچ کے مزے آرہے ہوں اور گلابو رشک سے اسے دیکھنے لگی۔

"کتنا خوش نصیب ہے یہ...... اللہ نے اسے بس اتنا ہی ذہن دیا ہے۔ محدود سوچ...... فکر کی پرواز اتنی ہی بلند ہوتی ہے جتنی یہ سہار سکے...... تب ہی تو مزے میں ہے۔"

اسے اپنے شانے سے کوئی ناگوار لمس ٹکراتا محسوس ہوا، اس نے پلٹ کر دیکھا...... وہ اول درجے کا پینڈو نظر آنے والا شخص جو تیز جامنی ریشمی شرٹ پہنے لمبے لمبے بدرنگ بالوں میں تیل جما کے اس کے پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا تھا...... اپنے پینڈو پن پر اتر آیا تھا، گلابو نے برا سا منہ بنایا اور سیٹ پر تھوڑا سا آگے کھسک گئی۔

لیکن پیروں میں رکھا وہ بڑا سا گٹھڑ اسے سہولت سے آگے بھی نہیں ہونے دے رہا تھا، جو برابر میں بیٹھی توانا خاتون نے ڈھیر کر رکھا تھا...... گھٹنے بری طرح دبے ہوئے تھے...... اوپر سے وہ ذلیل سستی سگریٹ کا بدبودار دھواں مسلسل اس پر اگلتے ہوئے نہ جانے اسے اپنی کون سی متاثر کن ادا سمجھ رہا تھا۔

"تکلیف کیا ہے تمہیں؟" وہ دانت کچکچاتے ہوئے پلٹ کر پوچھنے لگی۔

جواب میں وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر لوفرانہ انداز میں مسکرانے لگا...... اس کے ہونٹوں پر ایک موٹی سی گالی آتے آتے رہ گئی۔

اردگرد مرغیوں کی طرح ٹھونسے مسافروں کے خیال سے نہیں۔

کئی سو میل کے فاصلے پر بیٹھے یاسر کے خیال سے، جس نے سختی سے نہیں صرف ایک بار بہت محبت بھرے استحقاق کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر انگلی دھرتے ہوئے کہا تھا۔

"آج کے بعد ان ہونٹوں سے کوئی گالی نہ نکلے، سمجھیں؟"

اور وہ اچھی طرح سمجھ گئی۔ اس نے بات ہی ایسی کی تھی ورنہ اماں جتنے بھی کئی بار اسے اس لت پر ٹوک چکی تھیں مگر ان کا کہنا کچھ ایسا ہوتا تھا۔

"آج کے بعد میں تیرے منہ سے کوئی گالی نہ سنوں سمجھی۔"

اور وہ سمجھ گئی...... اسی لیے ہمیشہ محتاط رہی کہ ان کے سامنے کبھی اپنی اس صلاحیت کا مظاہرہ نہ کرے، یہی وجہ تھی کہ عرصہ ہوا انہوں نے گلابو کے منہ سے کبھی گالی نہیں سنی تھی...... اور یاسر...... یاسر نے تو بڑا کڑا حکم دیا تھا......

اسے لمحہ بھر کے لیے اس پابندی پر جھنجلاہٹ سی محسوس ہوئی۔

"کیا مصیبت ہے۔ اب بندہ دل کی بھڑاس بھی نہ نکالے۔" وہ جز بز ہوئی...... لیکن پھر اس خیال نے اسے سبک سا کر دیا کہ وہ یاسر کے کہنے پر، اس کے لیے، اس کی خوشی کی خاطر خود پر ضبط کر رہی ہے...... اب کی بار اسے یہ جبر برا نہیں لگا۔

"وے...... وے لمبیا۔ کیا پوستیوں کی طرح سو رہا ہے۔ تیری دادی کے برابر ہوں اور گھٹنے سے کھڑی ہوں۔ تُو اکیلا چار سیٹیں مل کے بیٹھا ہے۔"

تہبند میں ملبوس، لمبا سا سیاہ اور سبز خانوں والا کرتا پہنے، گھی، مکھن کی تازہ باس سے بھری وہ عمر رسیدہ عورت بلند آواز میں اسی نیم دیوانے کو جھنجھوڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کیا ہے؟'' وہ اٹھا اور اٹھتے ہی پھاڑ کھانے کو دوڑا۔ ''کیوں ہاتھ لگا رہی ہے مجھے بہانے بہانے سے؟ بٹوا اُڑائے گی کیا؟''

''وے، ذرا پاسے ہو...... مجھے بھی بیٹھنے دے۔''

''واہ میں نے پیسے بھرے ہیں ان ٹکٹوں کے۔''

''بے غیرتا، جوان جہان ہو کے لمبا پڑا ہوا ہے اور میں بڈھی کھڑی ہو کے سفر کر رہی ہوں۔''

''تو میں کیا کروں؟ میں نے کیا ہے تمہیں بوڑھا...... میرے کہنے پر سفر کر رہی ہو؟ جاؤ جا کے آرام کرو گھر پر...... مزے لوٹو مزے......'' لفظ ''مزے'' وہ بڑے خاص چٹخارے دار انداز میں ادا کرتا تھا۔ لب و لہجہ خاصا صاف اور رواں تھا، صاف ظاہر ہوتا تھا، اہلِ زباں گھرانے سے ہے۔

''بیٹا! بدتمیزی نہ کرو...... بوڑھی عورت ہے، بزرگ ہے۔'' کسی باریش شخص نے معقولیت جھاڑنی چاہی مگر وہ الٹا اسے جھاڑنے لگ گیا۔

''تم بھی بوڑھے ہو۔ یہ بھی بوڑھی۔ تم بھی بزرگ۔ یہ بھی بزرگ۔ مزے کرو مزے۔''

گلابو نے دوپٹے کا پلو منہ پر رکھ کر بے ساختہ امنڈتی ہنسی کو دبایا۔

''بدتمیز!'' باریش شخص غصے میں آ گیا۔

''نہ بابا جی نہ۔'' دوسرے شخص نے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہا، ایک مصلحت آمیز خوف اس کے لہجے سے چھلک رہا تھا۔ ''نہ جی اللہ لوک بندوں سے نہیں الجھنا چاہیے۔ کیا پتہ جلال میں آ جائے، بڑی بددعا لگتی ہے ان کی۔''

''کون سا اللہ لوک......'' وہ صاحب مزید غصے میں آ گئے۔ ''حد ہے جہالت اور ضعیف الاعتقادی کی...... جو بھی کھسکا ہوا نظر آئے اسے تم لوگ پہنچا ہو بنا دیتے ہو۔ یہ اور کچھ نہیں، ایمان کی کمزوری ہے۔ صرف ایمان کی کمزوری۔''

''توبہ توبہ۔'' گلابو کے برابر بیٹھی عورت بھی کلّے پیٹنے لگی۔ ''سفر پر نکلے ہیں ہم چاچا جی...... اللہ سے خیر مانگو اور اللہ والوں کو نہ چھیڑو، کیا پتا کب ان کے منہ سے کیا نکل جائے۔''

''لاحول ولا...... اللہ سے نہیں ڈرتے اور ان نام نہاد اللہ والوں سے ڈرتے ہو۔ یہ شخص جو حد سے زیادہ میلا کچیلا ہے اور طہارت کے اولین اصول پر ہی پورا نہیں اترتا، نماز، روزہ کیا

کرتا ہوگا اور جو کسی سرکس والے ہیجڑے کے پیچھے دیوانہ ہوا گھر سے بھاگا ہے اور جو انسانی ہمدردی کا پہلا سبق تک نہیں پڑھا ہوا، جسے اتنی تمیز تک نہیں کہ اس بزرگ عورت کی تکلیف کا خیال کر کے اسے ذرا سی جگہ دے، اسے تم لوگ زبردستی ولی بنانے پر تلے ہوئے ہو۔''

گلابو کو ان بزرگوار کی گفتگو کچھ کچھ قائل کرنے لگی۔

''کس کو ڈانٹے چلے جا رہے ہو بڑے میاں؟''

وہ چھالیہ چباتے ہوئے بے نیازی سے پوچھنے لگا اور بس کے مختلف کونوں سے امنڈنے والے قہقہے بزرگوار کو خفیف سا کر گئے۔

''اماں...... یہاں بیٹھ جاؤ۔''

اس بینگنی شرٹ والے پینڈو نے دوبارہ وہی نامعقول حرکت کی تو غیر ارادی طور پر اسے یہ کہنا پڑا...... اماں کو اپنی جگہ پر بٹھاتے ہوئے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈھیری سی گالیاں اس آوارہ بینگن کو دیں اور کھڑی ہو گئی۔ اگرچہ اس نے ڈنڈے کو زور سے تھام رکھا تھا مگر نہ جانے کس گہرے کھڈ سے ٹکرا کے بس اس زور سے اچھلی کہ اس کی مٹھی سے یہ سہارا چھوٹ گیا اور وہ لڑکھڑا کے دائیں طرف گری۔ شکر ہے کہ وہ نیم دیوانہ...... وہ بڑبڑ کرنے والا لڑکا اس وقت ان چاروں سیٹوں پر لیٹا ہوا نہیں تھا، اس لیے وہ خالی جگہ پر جا کے گری تھی۔

''مزے......'' وہ کھلکھلا کر ہنستے ہوئے تالیاں بجانے لگا اور خفت کے باوجود اسے اپنا مذاق بنا برا نہ لگا...... اس ہونق سے چہرے پر معصومیت ہی اتنی تھی...... وہ آہستہ سے مسکراتے ہوئے سنبھل کر وہیں بیٹھ گئی۔

''بیٹھ جاؤں میں یہاں؟ تمہاری سیٹ پر؟''

پھر بھی اس نے احتیاطاً اجازت طلب کر لی۔

''اوں......'' اس نے اپنے بڑے بڑے سفید ڈیلے گھماتے ہوئے لمحہ بھر غور کیا پھر فیاضی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''بیٹھ جاؤ۔ مزے ہیں تمہارے مزے......'' ایک اور چٹخارہ بھرا...... ''میں ہر کسی کو اپنے ساتھ نہیں بٹھاتا۔''

''لو دیکھ لو، اس کی ولایت کا ثبوت۔'' بزرگوار نے اس جانب اشارہ کیا۔

''بوڑھی عورت کو بٹھاتے ہوئے تکلیف ہو رہی تھی اور اب اس لڑکی کو کیسے خوشی خوشی ساتھ بٹھا رہا ہے۔''

کئی گردنیں مڑ کر اس نظارے کو دیکھنے لگیں...... کوئی اور لڑکی ہوتی تو گھبرا کر وہاں سے

اٹھ جاتی اور بقایا سفر بے شک کھڑے ہو کر کرتی مگر وہ گلابو تھی...... اپنے نام کی ایک...... گھورتی آنکھوں اور دبے دبے تبصروں پر لعنت بھیجتے ہوئے وہ اس آرام دہ نشست پر پھیل کر بیٹھ گئی اور اس کی ''مزے دار'' باتوں کے سہارے سفر کاٹنے لگی۔

☆======☆======☆

''تم بڑی اچھی ہو اور مجھے کوئی کوئی ہی اچھا لگتا ہے۔''

بس سے اترتے اترتے اس نے کوئی سترویں بار یہ کہا۔ وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

''اچھے تو تم بھی ہو۔''

''میں بھی کسی کسی کو ہی اچھا لگتا ہوں۔''

ایسا سچا جواب کسی دیوانے کی جانب سے ہی آسکتا تھا۔

''اچھا...... کس کس کو؟''

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی...... بس پٹرول پمپ پر رکی تھی اور تقریباً تمام ہی مسافر اتر کر تازہ ہوا لینے یا پانی وغیرہ پینے اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔

''آپا کو، چھوٹی اماں کو...... اور کچھ کچھ بڑی اماں کو بھی۔''

''کچھ کچھ؟''

''ہاں...... سوتا ہوں تو چٹا چٹ چومے جاتی ہے میرا منہ...... ساری نیند بھگا دیتی ہے...... لیکن جاگا مل جاؤں تو وہ لتے لیتی ہے کہ بس پوچھو ناں...... اور تائی اماں کو میں ذرا اچھا نہیں لگتا۔ بھائی میاں کو نہ اچھا لگتا ہوں نہ برا...... جیسے آپا...... وہ بھی انہیں نہ اچھی لگتی ہیں نہ بری۔''

''کون ہے یہ بھائی میاں...... جسے نہ کسی کو پسند کرنا آیا نہ ناپسند کرنا؟''

''آپا کے دولہا...... لیکن ایک بات ہے۔ بھائی میاں کی وجہ سے میرے مزے ہیں۔''

''کیسے مزے؟''

''پتا نہیں...... لیکن سب کہتے ہیں کہ یہ مزے ان کی وجہ سے ہیں۔ وہ جو تائی اماں ہیں، ہر وقت ایک ہی بات کہتی ہیں کہ میرا اصغیر احمد ہے تو تمہارے ٹھاٹ ہیں ورنہ لگے ہوتے کہیں مزدوری کرنے۔ او ہو ہو ہو...... نہ بابا نہ......'' وہ بھول کر کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

''مجھے مزدوری سے براڈر لگتا ہے بلکہ مجھے تو کوئی کام کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔''

''تمہیں صرف مزے کرنا اچھا لگتا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''ہاں......'' اس نے داد دینے کے انداز میں ہاتھ پر ہاتھ مارا جیسے اس کے درست

انداز ے پر خوش ہو گیا ہو۔

''مزدوری کروں گا تو سرکس دیکھنے کیسے جاؤں گا۔ تم نے دیکھا ہے سرکس۔''

''اوں ہوں۔''

''چل...... دکھلاتا ہوں۔ کیا یاد کرے گی؟''

''کیا کروں گی وہاں جاکے۔'' اس نے عذر تراشا۔

''نہیں نہیں...... تم نے کچھ نہیں کرنا سرکس میں کرتب دکھانے کے لیے اور بہتیرے لوگ ہوتے ہیں وہاں...... تم بس دیکھنا ان کو...... اور تالیاں بجانا...... ایسے۔''

وہ تالیاں بجانے لگا۔ اس کے گھنگریالے بالوں کی بے ترتیب الجھی لٹیں اس کے لبوترے زرد رو چہرے پر پھیل گئیں۔ گلابو نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

''کسی اچھے گھر کا لگ رہا ہے بے چارہ...... عقل کم ہے، بالکل ہی جھلا نہیں ہے ورنہ ایسے سفر نہ کر رہا ہوتا ایک شہر سے دوسرے شہر کا...... لوگ ڈھیلے مار رہے ہوتے اسے۔ شاید پاگل پنے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے رکھتے رک گیا ہے یا پھر عقل اور ہوش کی ساری سیڑھیاں اترتے اترتے باقی کی چند اترنا بھول گیا ہے۔''

وہ غور سے اسے دیکھتی سوچنے لگی۔

''پتہ ہے سرکس میں ممتاز بیگم بھی ہوتی ہے۔''

''وہ کیا کرتی ہے؟ ناچ دکھاتی ہے؟''

''نہیں، سالی ناچے گی کیا۔ اٹھتی بھی نہیں۔ ایک جگہ بیٹھی رہتی ہے مکر کر کے...... تھوبڑا عورت کا ہے اس کا اور نیچے دھڑ لومڑی کا۔''

''ہیں؟ سچی؟''

''لے اور کیا۔ دیکھی ہے کبھی ایسی عورت؟''

''واقعی نہیں...... ہاں، ایک ایسی عورت دیکھی ہے۔ جس کا دھڑ تو عورت والا ہے اور اوپر چہرہ لومڑی کا ہے۔''

وہ بیگم عابدہ کا تصور کر کے زور سے ہنس پڑی۔

''اچھا...... ممتاز بیگم کی بچھڑی بہن ہو گی وہ...... میں پوچھوں گا اس سے۔ بڑی یاری ہے۔ میری ممتاز بیگم سے۔''

''واہ...... تمہیں اور کوئی نہیں ملا یاری لگانے کے لیے۔''

''میں سرکس کے ہر شو میں جو جاتا ہوں اس سے ملنے اس لیے...... اچھا تم کرو گی مجھ

سے یاری۔"

اس نے اپنا لمبا سا سوکھا ہوا ہاتھ آگے پھیلایا، جس کی انگلیوں کے سرے پر میل بھرے ناخن بڑھے ہوئے تھے لیکن اس ہاتھ کو تھامتے ہوئے گلابو کو ذرا بھی گھن نہ آئی۔

☆======☆======☆

"میرا نام ممتاز بیگم ہے۔ آج سے دس سال پہلے چند ظالم انسان مجھے افریقہ کے جنگلات سے پکڑ کر لائے تھے۔ تب سے میں انسانوں کی قید میں ہوں۔"

اعصاب پہ بوجھ بن کر گرتی اس مکروہ آواز میں وہ رٹے رٹائے جملے کہہ رہی تھی...... کہہ رہا تھا۔ اور گلابو متجسس نگاہوں سے اس کی گردن کے نیچے عجیب اور بے جوڑ دھڑ کو تک رہی تھی۔

ٹیپو کا اصرار اتنا بڑھا...... اور کچھ سرکس کے کمالات اور خصوصاً ممتاز بیگم کی صفات کا ذکر اس نے کچھ اس طرح کیا کہ من موجی سی گلابو کا جی بھی وہاں جانے کو مچل گیا۔ زیادہ سوچ بچار کے بعد فیصلے کرنے کی اسے یوں بھی عادت نہیں تھی۔ جو دل چاہتا، اسی جانب مڑ جانے کی عادی تھی۔ اس لیے مرید کے کے بسوں کے اڈے سے ہی وہ ٹیپو کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر سرکس کی جانب چلی گئی۔

وہ اکیس بائیس برس کا بھرپور جوان تھا۔ استخوانی وجود کے ساتھ قد خوب لمبا اونچا تھا...... اس کے باوجود پہلی ہی ملاقات میں اس کے ساتھ یوں چل پڑتے ہوئے اسے ذرا بھی خوف یا عجیب پن محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اسے کسی پرانی سہیلی کی طرح لگ رہا تھا۔

سرکس میں داخل ہوتے ہی اس کی توجہ شیروں کے پنجرے اور پستہ قد جوکر نے کھینچ لی مگر وہ اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کسی اور جانب لے گیا۔

"وہاں چلو...... ممتاز بیگم ادھر ہے۔"

اُڑے ہوئے سرخ رنگ کے خیمے کے پردے گرے ہوئے تھے، ایک خطرناک حد تک سیاہ رنگت والا تھل تھل کرتے بدن کا آدمی باہر لوہے کی فولڈنگ کرسی پر بیٹھا سوٹے لگا رہا تھا۔

"اوئے آ گیا تُو پھر سے...... بھئی بڑی چیز۔"

اس نے ٹیپو پر کوئی پھبتی کستے کستے گلابو کو اچنبھے سے دیکھا۔

"بی بی! شو تین بجے ہوتا ہے۔"

"یہ میرے ساتھ ہے۔" ٹیپو نے اس کا ہاتھ زور سے تھام کر کہا اور پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں میں کتنی بار وہ یہ ہاتھ تھام چکا تھا مگر اسے ایک بار بھی جھنجلاہٹ محسوس ہوئی نہ

جھلاہٹ...... مگر اس سیاہ توے پر چمکتے سرخ بٹن جیسے دیدے اسے ہاتھ کھینچ کر چھڑانے پر مجبور کر گئے۔

"اور میرے لیے تو شو سارا دن ہوتا ہے۔ یار ہوں میں ممتاز بیگم کا، اس کا عاشق...... میرے تو مزے ہیں مزے۔"

"اچھا ٹھہرو...... دو منٹ صبر کرو...... ابھی مت جانا اندر۔" وہ خیمے کا پردہ اٹھا کے اندر گیا...... گلابو نے اچٹتی ہوئی نظر اندر ڈالی مگر دن کی روشنی میں بھی خیمے کے اندر گہری تاریکی کا عالم تھا۔ کوئی چھ سات منٹ بعد وہ دوبارہ نکلا اور انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"ممتاز...... او میری پیاری......" وہ بڑی بے تابی کے ساتھ پکارتا ہوا اندر داخل ہوا۔ جبکہ وہ ذرا ٹھہر ٹھہر کے اِدھر اُدھر تکتی اندر گھسی تھی۔ اب لائٹ آن تھی۔ ایک بے حد چھوٹے سے کمرے کے برابر اس خیمے کو جیل جیسی سلاخیں دو حصوں میں تقسیم کر رہی تھیں۔ سلاخوں کے اس جانب یہ تینوں کھڑے تھے اور دوسری جانب ایک اسٹیج سا بنا ہوا تھا جس پر ممتاز براجمان تھی۔ پہلی نگاہ ڈالتے ہی گلابو کا دل دھک سے رہ گیا۔ واقعی کسی عورت کے سر کے نیچے لومڑی کا دھڑ لگا تھا، ٹیپو تو جیسے تو گویا سلاخوں سے لپٹ گیا تھا۔

"تجھے چین نہیں ہے ممتاز بیگم...... کسی ایک جگہ ٹک کر کیوں نہیں بیٹھتی...... کبھی یہاں تو کبھی وہاں...... خوار ہوتا رہتا ہوں میں تیرے پیچھے۔"

اور گلابو نے ذرا تفصیل سے معائنہ کرنا شروع کیا۔

گہری سانولی رنگت میک اَپ کی تہہ کے اندر دبی ہونے کے باوجود جھلک رہی تھی۔ گھنی بھنویں تراشی گئی تھیں مگر آس پاس نمودار ہوتا سیاہ سخت رواں انہیں بدنما بنا رہا تھا، چھوٹی چھوٹی گول آنکھیں۔ سبز آئی شیڈ اور مسکارا سے بوجھل تھیں۔ پکوڑا سی ناک میں موٹی سی لونگ، پھیلا ہوا دہانہ...... پتلے پتلے ہونٹ جو گہری میرون لپ اسٹک سے لپے ہوئے تھے۔ گالوں پر غازہ، ماتھے پر اسٹیکر والی بندیا، درمیان میں مانگ نکال کر سلیقے سے جمائے بال اور ان پر رکھا گوٹے کناری سے سجا سرخ دوپٹہ...... یہاں تک تو ساری ملمع بازی سمجھ میں آتی تھی مگر گردن کے نیچے پیر سکوڑ کے بیٹھی لومڑی کا دھڑ اس کی عقل وفہم سے ذرا پرے تھا۔

"اے سنو...... یہ کیا تماشہ ہے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"بولنا آتا ہے تمہیں؟"

"لو...... ایسا ویسا......؟" جواب ٹیپو کی جانب سے آیا۔ "اتنا بولتی ہے میرے ساتھ بڑی میٹھی باتیں کرتی ہے۔"

"تو بتاؤ یہ ہے کیا چکر؟ نیچے لومڑی......اوپر نہ عورت نہ مرد۔"

جواب میں وہ کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح بجنے لگی۔

"میرا نام ممتاز بیگم ہے۔ آج سے دس سال پہلے چند ظالم انسان مجھے افریقہ کے جنگلات سے پکڑ کر لائے تھے۔ تب سے ہی انسانوں کی قید میں ہوں۔"

"اور جب تم جنگل میں تھیں۔ تب بھی ایسی تھیں؟"

"جی باجی جی......میں پیدائشی ایسی ہوں۔"

اس کے باجی کہنے پر گلابو کو تاؤ تو بڑا آیا۔

"ماں باپ کیسے تھے تمہارے؟ وہ بھی آدھے تیتر آدھے بٹیر تھے یا پھر۔"

"نہیں جی......یہ صفت اللہ نے صرف مجھ میں رکھی ہے۔"

"لیکن پھر بھی......وہ تھے کیا؟ مکمل انسان یا مکمل جانور؟"

"میری ماں لومڑی تھی اور باپ ایک انسان۔"

"لاحول ولا......" گلابو کو گھن آئی۔ "تمہاری ماں ٹہلتے ٹہلتے شہر چلی آئی تھی یا باپ راس بھول کے جنگل آنکلا تھا؟ اور بالفرض چلا بھی گیا تھا تو یہ تجربہ کرنے کی کیا ضرورت تھی اسے؟"

"میں ان دونوں کی محبت کی نشانی ہوں باجی!"

"تمہارے ماں باپ کی شادی کیسے ہوئی تھی ممتاز بیگم؟ نکاح پڑھایا تھا مولوی صاحب نے یا پھیرے لیے تھے اگنی کے؟"

اسے سوال پر سوال کرتے دیکھ کر ٹیپو کے دل میں بھی تجسس پیدا ہوا ورنہ اس سے پہا وہ ممتاز بیگم کے جلوے ہی دیکھ دیکھ کے جی بہلا لیا کرتا تھا۔ ان پے در پے سوالوں سے موٹی توند والا کالا سیاہ رکھوالا جز بز ہو رہا تھا۔

"نہیں میری جان!" لپ اسٹک سے لپے ہونٹ مسکرائے۔

اس طرز تخاطب پر گلابو نے ابرو اچکائے۔

"جنگل میں کیسا نکاح اور کیسے پھیرے؟"

"اچھا......تو تم ناجائز اولاد ہو۔" وہ دور کی کوڑی لایا۔

"یہ کیا باتیں شروع کر دی ہیں تم لوگوں نے۔ ممتاز بیگم ادھر بے کار کے سوال جوا کرنے نہیں بیٹھی...... پچاس روپے کے ٹکٹ میں اتنی دیر تک سر نہیں کھا سکتے تم اس کا...... نکلو اب۔"

مگر وہ رکھوالے کی ناگوار بڑبڑاہٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے تخیل کے سہارے

سین تخلیق کر رہا تھا۔

"اوہو......اب سمجھا......تمہاری ماں تو بڑا گڑگڑائی ہوگی اس شخص کے آگے۔ کہ نہ کرو مجھ پر اتنا "اتیاچار"......تمہارے باپ کی نشانی میرے پیٹ میں ہے۔"

گلابو کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"مگر وہ کیسے کہے گی۔ آدھی انسان آدھی لومڑی تو یہ ہے۔ اس کی ماں تو پوری کی پوری لومڑی تھی۔ وہ کیسے باتیں کرتی ہوگی؟"

"ارے ہاں......تم کتنی عقل والی ہو...... مجھے تو خیال ہی نہیں آیا۔"

"اچھا یہ بتاؤ، شہر آنے کے بعد تمہیں اپنا باپ ملا؟"

"وہ......وہ تو......" اس سوال کا جواب شاید اسے کبھی رٹایا ہی نہیں گیا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔ یہ تو ناجائز اولاد ہے، ناجائز اولاد تو بے چاری۔ چہ چہ" وہ سر ہلانے لگا۔ "ڈراموں میں دیکھا نہیں کبھی؟ ایسی اولاد کو باپ اپنا مانتے ہی نہیں۔ اور مجھے تو لگتا ہے اس کی ماں کا "بلات کار" ہوا تھا۔ ہے ناں؟"

ممتاز بیگم کے کرخت نقوش غصے سے بگڑنے لگے اور وہ رکھوالے کی گھوریاں نظر انداز کرتے ہوئے قل قل ہنسنے لگی۔

"چلو نکلو......پریشان نہ کرو اسے۔" وہ انہیں باقاعدہ ہانکنے لگا۔

"لیکن میں اپنی پیاری ممتاز بیگم کے پاس گھنٹہ گھنٹہ بیٹھتا ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔

"اتنی بک بک بھی تو نہیں کرتے تھے۔ چلو جاؤ شاباش......آرام کرنے دو اسے۔"

"آرام ہی تو کر رہی ہے۔ بیٹھی ہوئی ہے مزے سے۔"

"اس کا مطلب ہے، اس طرح بیٹھ بیٹھ کے تھک گئی ہوگی بے چاری۔" گلابو نے تصحیح کی "اب اسے ٹہلنا ہوگا۔ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بھی تو ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں۔ تو ممتاز بیگم، تم ہمارے سامنے ہی ٹہل لو۔ اس میں کیسی شرم۔"

"ہاں...... میں خود سیر کرا کے لاؤں گا تمہیں۔" وہ بھی مچل گیا۔

"نہیں۔ ممتاز بیگم خیمے سے باہر نہیں جاتی۔" رکھوالا درشتی سے بولا۔

"اوہ ہاں...... پردے دار خاتون ہیں۔" اس نے طنز کیا پھر ایک اور سوال داغا۔

"اچھا یہ بتاؤ ممتاز بیگم! یہ سر پر دوپٹہ لینا تم نے یہاں آ کر سیکھا ہے یا جنگل میں بھی ایسی تمیز والی بی بی تھیں؟"

"وہ......میں......یہاں آ کر۔"

"یہ تو اچھی بات ہے لیکن کپڑے پہننا بھی سیکھ لیتیں۔ آدھی ہی سہی......عورت تو ہو، ایسے کھلے بدن کے ساتھ بیٹھنا اچھی بات تو نہیں ہے۔"

"اوبی بی......جاتی ہو یا نہیں؟"

اس سے پہلے کہ وہ پاس پڑا ڈنڈا اٹھا کر اس پر پل پڑتا، وہ ٹیپو کا ہاتھ تھام کر خیمے سے نکل پڑی۔

کتنی دیر تک اس کی ہنسی نہ تھمی، البتہ ٹیپو کچھ ناراض ناراض سا لگ رہا تھا۔ شاید اپنی پیاری ممتاز بیگم کی دل آزاری کی وجہ سے۔

"تم ذرا اچھی نہیں ہو۔ ایسے ہی دوستی کر لی میں نے تم سے۔ سوچا تھا ذرا شہر کے تمہیں حلیم اور نان پکوڑے بھی کھلاؤں گا لیکن اب نہیں۔ کٹی میری تمہاری......جاؤ۔"

وہ اسے ہنستا چھوڑ کے دوسری جانب تیز تیز قدموں سے نکل گیا۔

☆======☆======☆

"تیاری کیسی جا رہی ہے؟"

قدسیہ نے چلتے چلتے رک کر اس سے پوچھا تھا۔ وہ ہفتے میں دو تین بار فیکٹری آتی تھی۔

"اے ون آپا......سارے پرچے اچھے ہو جائیں گے۔"

"کب ہے پہلا پیپر؟"

"پرسوں۔"

"اور تم یہاں مشین کے آگے بیٹھی ہو۔ جب تک پرچے نہیں ہو جاتے، گھر پہ رہ، پڑھائی کرو۔"

"میری ساری تیاری ہے آپا......آپ بالکل فکر نہ کریں۔ چھٹی کر بھی لوں گی تو؟ سے یاد سبق کو اور کتنا یاد کر لوں گی۔"

"پھر بھی......چلو ایسا کرو، جس دن پرچہ دے کر آؤ، اس دن یہاں آنے کی بجا سیدھی گھر چلی جایا کرو۔ چھٹی والے دن بے شک آ جایا کرنا......سینٹر کہاں بنا ہے؟"

"یہیں پاس میں......بھلے والے سٹاپ کے ساتھ جو سکول ہے......ادھر۔"

"چلو اچھا ہے۔ آنے جانے کی خجل خواری تو کم ہو گی۔"

وہ مہربان مسکراہٹ اچھالتی آگے بڑھ گئی اور کسی اور ورکر سے اس کے بچے کی طبیعت کے بارے میں استفسار کرنے لگی۔

"بعض لوگوں کو اللہ کتنا نوازتا ہے۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی کس چیز کی کمی

قدسیہ آپا میں......اتنی دولت، تعلیم، کاروبار، اچھا خاندان اور نام سب، شریف اور محبت کرنے والا شوہر......قدر کرنے والی سسرال۔ بچے اور سب سے بڑھ کر اتنی اچھی عادتیں اور سیرت، ہر کسی کے ساتھ بھلا کرتی ہیں اس لیے بدلے میں بھلائی ہی پاتی ہیں۔ کاش ان جیسے اور بھی لوگ ہو جائیں۔"

وہ دن بدن ان کی خوبیوں کی دل سے معترف ہوتی چلی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

وہ صبح سے لے کر سہ پہر تک فیکٹری میں ہوتی۔

امتحانات شروع ہوتے ہی اس نے وقت خود بخود تبدیل کر لیا۔ حالانکہ قدسیہ نے اسے یہ سہولت دے دی تھی کہ بے شک وہ سارے امتحانات کے دوران فیکٹری نہ آئے لیکن گلابو چوبیس گھنٹے ایک جگہ گزارنے والی بندی ہی نہ تھی۔

پیر ہمہ وقت گردش میں رہتے تو دھڑکنیں بھی اعتدال میں رہتی تھیں......بے شک قدسیہ کے بڑے سے گھر کا ماحول بے حد پُرسکون تھا اور وہ سدا سے ترسی ہوئی تھی ایسے ماحول کو، لیکن سارا دن گھر میں گزارنے کا تصور بھی خاص خوش کن نہ تھا۔ الگ اور صاف ستھرے کمرے کا خمار بھی چند دنوں میں ہی اتر گیا تھا......اب کمرے کی دیواریں چاروں طرف سے اسے خود پر گرتی محسوس ہوتی تھیں۔ صرف سونے کے لیے کمرے میں آتی تھی۔ ورنہ اسے کھلا آسمان بھاتا تھا۔

اسی لیے پرچہ دینے کے بعد گھر آتے ہی وہ بس کھانا کھاتی، کپڑے تبدیل کرتی اور دوبارہ سے فیکٹری چلی جاتی۔ سیکنڈ شفٹ میں کام کرنے۔ رات کے وقت وہ قدسیہ آپا یا ان کے شوہر کے ساتھ ہی گاڑی میں واپس آ جاتی۔

اس دن بھائی صاحب کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے اور قدسیہ تو ویسے ہی کسی کسی دن آتی تھی، اسے دیر تک فیکٹری میں کام کرتے ہوئے واپسی کا دھیان ہی نہ رہا۔ جب گھر جانے کے لیے نکلی تو اندھیرا دیکھ کر ذرا سی فکر مند ہوئی۔

"مصیبت......سیدھی بس بھی تو نہیں ملتی یہاں سے۔ دو بدل کے جانا پڑے گا۔"

پھر اسے ایک اچھوتا خیال آیا۔ وہ مڑی اور سیدھی یاسر کی دکان پر پہنچ گئی۔

"خیریت! اس وقت؟"

ڈھلتی شام کے اندھیرے میں وہ اسے دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر ذرا سا پریشان ہوا۔ وہ تو صبح سویرے کی مہمان تھی۔ اس وقت دکان پر رش بھی زیادہ تھا۔

"تم ابھی اسی وقت میرے ساتھ چل سکتے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے کورا جواب دیا۔ "یہ بکری کا وقت ہے، دیکھ نہیں رہی کتنا رش ہے۔"

"مجھے کچھ نہیں پتا بس چلو میرے ساتھ۔" وہ بازو پکڑ کر کھینچنے لگی تو وہ گھبرا گیا۔

"کیا کر رہی ہو۔ کتنے لوگ دیکھ رہے ہیں۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔"

"اگر ابھی میرے ساتھ نہ نکلے تو یہ لوگ اور بھی بہت کچھ دیکھ سکتے ہیں۔"

وہ دھمکی آمیز مسکراہٹ کے ساتھ غرائی۔

یاسر دانت پیس کر رہ گیا۔

"ڈائن ہو تم پوری۔ بلیک میلر۔"

"وہ تو میں ہوں...... چلتے ہو پھر؟"

"ہرگز نہیں۔ میں نے تمہیں کچھ زیادہ ہی سر چڑھا لیا ہے، اپنی نہیں تو میری عزت کا خیال کرو۔"

اس نے درشتی سے کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے چھڑایا۔

شکر ہے کہ دکان پر موجود چار کے چار لوگ اس وقت منہ اٹھا کر ذرا اونچائی پر رکھے ٹی وی کی جانب متوجہ تھے جہاں پاکستان اور بھارت کے مابین جاری ون ڈے کرکٹ میچ آخری اور فیصلہ کن سنسنی خیز مرحلے پر تھا۔ ایک لڑکی کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ سارے کے سارے لمحہ بھر کے لیے اس جانب متوجہ ضرور ہوئے تھے مگر یاسر کو اسے مخاطب کرتے دیکھ کر کوئی کسٹمر کے بجائے دکاندار کی فیملی ممبر یا جاننے والی سمجھ کر انہوں نے اس سے توجہ ہٹالی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بازو کھینچنے اور چھڑانے کے تماشے کی دید سے محروم رہ گئے۔ ورنہ وہ چٹپٹی خبریں پھیلاتیں کہ بس۔

"یاسر...... تم......" مارے صدمے کے اس کے لب پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ آنسوؤں سے رندھا گلا اگلا لفظ نہ اگل سکا۔

"تم اب جاؤ یہاں سے۔"

اس کے آنسوؤں سے لبالب بھرے نین کٹورے یاسر کے دل کو پسیجنے لگے...... لیکن یہ حرکت اس کی برداشت سے بہت آگے کی چیز تھی۔ اس لیے اس نے منہ پھیر لیا کہ کہیں دل کی مٹی آنسوؤں کی نمی سے نرم نہ پڑ جائے۔

"میں اکیلی تھی آج...... سوچا تھا، تم گھر تک چھوڑ آؤ گے۔"

آنسو پیتے ہوئے اس نے مدھم آواز میں کہا۔

"یہی بات، اسی طرح بتا دیتی پہلے تو کیا تھا؟"

اس کا لہجہ اور تیور بھی پہلے کی نسبت دھیمے ہوئے مگر وہ جواب دیئے بغیر پلٹ گئی۔

"سنو......" یاسر نے پکارنا چاہا مگر اسی لمحے کسی بچے نے طوفان کی طرح داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان...... یہ دال کنکر والی نکل آئی ہے، تبدیل کر دو۔" وہ طوعاً و کرہاً اس کی جانب متوجہ ہوا اور اتنی دیر میں وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

☆======☆======☆

"آخر میرا قصور کیا ہے، کیوں مجھ میں کوئی نہ کوئی ایسی خامی نکل آتی ہے جس سے وہ مجھ سے بدک جاتا ہے۔ بددل ہو جاتا ہے۔ کیوں نہیں میں ایسی بن پاتی...... جیسا وہ چاہتا ہے...... لیکن وہ چاہتا کیا ہے......؟ بتاتا بھی تو نہیں۔"

فٹ پاتھ پر سر جھکائے...... سست قدموں کے ساتھ چلتی وہ سوچے جا رہی تھی۔

"اسے میرا نام تک تو پسند نہیں...... اتنے دنوں میں ایک بار بھی اس نے مجھے میرے نام سے نہیں پکارا۔ اسے میری زبان پسند نہیں۔ کہتا ہے اس پر کانٹے اُگے ہیں۔ نوکیلے اور زہریلے۔ اسے میری چال پسند نہیں، کہتا ہے ایسے چلتی ہو جیسے ابھی سامنے والے سے جا ٹکراؤ گی...... یا کسی کے اوپر چڑھ جاؤ گی...... میں کتنا بدلوں خود کو؟ کیا کیا بدلوں اس کے لیے...... اور یہ بھی تو نہیں پتہ کہ بدلوں کیسے؟ اسے کیسے چلنا، کیسے بولنا پسند ہے؟ کبھی بتائے تو سہی...... اور اگر کبھی میں نے اسے یہ بتا دیا کہ یہ زبان...... یہ چال...... کس ماحول کی دین ہے تو تب؟ تب وہ کیا کرے گا؟"

اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔

نگاہیں کسی غیر مرئی نکتے پر مرکوز ہو گئیں۔

"تب تو شاید میں اس کی چاہ پانے کی خواہش سے بھی محروم ہو جاؤں گی۔"

قدم ایک بار پھر ڈھیلے اور بے ربط انداز میں اٹھنے لگے۔

"اے...... سنو...... رکو...... اے بات سنو۔"

ہانپتی ہوئی آواز اسے اپنے تعاقب میں سنائی دی تو اس کی تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹی۔

"یاسر......"

مگر اسے پکارتے ہوئے بھاگتا وہ یاسر نہیں...... ٹیپو تھا۔ اس کے شانے پھر سے کسی

بھاری بوجھ تلے دب کر ڈھلک گئے۔

''سنتی ہی نہیں۔ کب سے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔''

پاس آ کر بریک لگاتے ہوئے وہ پھولی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہو
کہہ رہا تھا۔

گلابو نے حیرت سے اسے دیکھا...... اتنے مصروف معمول کے ساتھ بھاگتے دوڑ
دن سے رات کرتے وہ اس شخص کو تقریباً بھول ہی چکی تھی جو زیادہ نہیں، یہی کوئی اٹھارہ
دن پہلے اس سے اتفاقیہ ٹکرایا تھا۔

''تم...... یہاں......؟''

''ہاں...... میں...... یہاں۔'' وہ فخر سے مسکرایا۔ کچھ شرمایا۔

گلابو نے غور سے دیکھا۔ وہ اب تک وہی لباس پہنے ہوا تھا۔ وہ شلوار قمیص جو کبھی
رہی ہو گی، پہلی ملاقات میں کہیں سے سرمئی اور کہیں سے بادامی ہو رہی تھی مگر اب مکمل
چیکٹ ہو کر اپنی اصل رنگت کھو چکی تھی۔ کئی بٹن غائب تھے، کف سے اور چاک سے قمیص
تک ادھڑی ہوئی تھی۔ بال پہلے سے کہیں زیادہ الجھے ہوئے اور گرد و غبار سے اَٹے ہو
تھے۔ چہرہ بھی شاید ہفتے بھر سے پانی کی ایک چھینٹ تک سے محروم رہا تھا اور ہاں......
سب سے سوا...... ایک اور عجیب سا احساس۔ آج اس کی پھیلی ہوئی حیران حیران آنکھوں
وہ معصوم سی چمک نہیں تھی۔ اس کی مجذوبانہ مسکراہٹ میں وہ زندگی سے بھرپور دمک
تھی...... اور آواز میں وہ قلندرانہ کھنک نہیں تھی۔

بجھی بجھی سی رنگت۔

بجھی بجھی سی آنکھیں۔

بجھی بجھی سی آواز۔

وہ اس کا کچھ نہیں لگتا تھا، اس کے باوجود گلابو کا دل اس کے لیے بھر آیا...... نہ ج
کیوں۔

''تم ابھی تک یہاں ہو؟ سرکس لگا ہے کیا ابھی تک؟''

''کہاں؟ وہ تو کب کے تمبو اکھاڑ کے لے گئے۔ آخری دن سارا وقت میں وہ
کسی...... نے منہ سے پھوٹا تک نہیں کہ صبح سویرے وہ جانے والے ہیں ورنہ میں بھی ان
کسی ٹرک پر لد جاتا دوسرے سامان کے ساتھ اور تو اور وہ منحوس ممتاز بیگم...... اس نے
سے بھاپ تک نہیں نکالی۔ کمینی کو میں نے کتنا تباہی کا تحفہ دیا تھا۔ سونے کا کنگن تھا......

کا۔''

''سونے کا کنگن۔''

''ہاں...... چھوٹی اماں کا...... قسم سے بڑی مشکل سے اترا...... چھوٹی اماں بھی تو اللہ
معاف کرے کھا کھا کے پھٹنے والی ہو رہی ہے۔ کلائی نہیں قسم سے صوفے کا پائیدان لگتی ہے،
صابن لگا لگا کرا تارا تھا۔'' پھر وہ ہنسنے لگا۔ تھکی ماندی سی ہنسی...... جیسے بڑی دقت کے ساتھ
ہنسنے کا شغل کر رہا ہو۔

''صبح اٹھ کے دیکھتی ہو گی، یہ رات کو میرے ہاتھ کون دھو گیا صابن سے...... جھاگوں
جھاگ ہو رہے ہیں، مزے......''

''جھاگ پہ تو بعد میں نظر گئی ہو گی۔ پہلے اس نے اپنے کنگن نہ ڈھونڈے ہوں گے؟
کتنی بری بات ہے، تم اپنی اماں کے کنگن چرا کے اس ہیجڑے کو دے آئے اس فراڈ کو۔''

''میرے پاس تو اور پیسے بھی نہیں تھے کہ ٹکٹ لے کر ان کے پیچھے چلا جاؤں۔''

''پیسے ختم ہو گئے؟''

''ہاں...... کب کے...... آج تیسرا دن ہے، پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ کل سے چنے تک
نہیں پھانکے ایمان سے۔''

''اوہ...... تم بھوکے ہو...... کل سے۔'' گلابو کی سمجھ میں اس کی تھکی اور بجھی بجھی ہنسی
اور بوجھل آواز کے راز اتر گئے۔

''چلو میرے ساتھ میں دلاتی ہوں۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کے مڑی۔

''ٹکٹ؟'' اس نے پیلے پیلے دانت نکال کر خوشی ظاہر کی۔

''نہیں...... کھانا...... چلو۔ ابھی بھی سرکس کے پیچھے جانے کا بھوت سوار ہے تمہارے
سر پر۔''

بڑے رعب سے پڑی ڈانٹ پر وہ مؤدب سا ہو کر اس کے پیچھے سر جھکا کے چلنے لگا۔

☆======☆======☆

''تم اتنے دنوں سے گھر سے غائب ہو، وہاں کسی کو فکر نہیں ہو گی؟'' بس سٹاپ کے ذرا
پرے بنے اس تھرڈ کلاس سے ہوٹل کی بینچ پر بٹھا کے اسے نان کباب کھلاتے ہوئے گلابو نے
پوچھا۔

''ہو گی...... میری بلا سے۔'' وہ بڑے بڑے لقمے بغیر چبائے نگل رہا تھا۔

''لاہور میں رہتے ہوناں تم......؟ کھانے کے بعد میں تمہیں ٹرین میں بٹھا دیتی ہوں۔ سیدھے گھر جاؤ سمجھے۔''
''میں، میں ممتاز بیگم کے پاس جاؤں گا۔''
''پھر وہی رٹ......تمہارے سونے کے کنگن لینے کے بعد وہ اب ہاتھ نہیں آنے والی۔ اسی لیے تو چپ چپاتے نکلی ہے کہ کہیں تمہارے گھر والے واپس لینے نہ آ جائیں۔ بھول جاؤ اسے......کبھی دوبارہ تمہارے متھے بھی لگی یا لگا تو تمہیں پہچانے گی بھی نہیں۔''
''لو......ایسے ہی......میں نے تو اتنے ڈھیر سارے گہنے دینے ہیں ابھی اسے......مگر بیاہ کے بعد۔''
گلابو نے سر ہتھیلی پر گرا لیا۔
''چلو......چھٹی......بیاہ۔''
''تمہیں اور کوئی نہیں ملا بیاہ کرنے کے لیے، یہی ہیجڑا رہ گیا تھا کیا؟''
''پتا ہے جب میں نے پہلی بار ممتاز بیگم کو دیکھا تھا اور گھر آ کے بتایا تھا تو وہ جو تائی اماں ہے ناں، بڑا منہ بنا کے بولی تھی۔ جاجا کے بیاہ کر لے اپنی اس ممتاز بیگم سے اور ویسے تو تائی اماں کی ہر بات زہر لگتی ہے مجھے......زہر......مگر یہ بات کھٹ سے دل میں بیٹھ گئی۔ میں نے بھی منہ پہ ہاتھ پھیر کے کہا کہ تائی اماں، دیکھ لینا، ایک نہ ایک دن ممتاز بیگم کو اپنی دلہن بنا کے اس گھر میں لاؤں گا، تم سمجھتی کیا ہو مجھے......کیا صرف تمہارا لاڈلا، وہ بھائی میاں ہی بیاہ کر سکتا ہے، وہ آپا سے تو لاکھ درجے اچھی ہے۔ بھلے دھڑ لومڑی کا ہے مگر چہرہ تو اچھا ہے اور ایک آپا ہے، آخ تھو......مُردے جیسی شکل ہے۔''
''تم اپنی بہن کے بارے میں کہہ رہے ہو؟ تمیز نہیں ہے؟''
''نہیں۔'' وہ رائتے کی پیالی منہ سے لگا کے پینے لگا۔
''پیار بھی نہیں ہے اس سے؟''
''ہاں......وہ تو ہے۔'' اس نے ادھڑے ہوئے کف سے منہ رگڑ کے صاف کیا۔
''بہت ہے، اس کے لیے ہی تو جاتا ہوں گھر ورنہ منحوس گھر میں رکھا کیا ہے۔ تین بک بک کرنے والی بُڑھیاں۔''
گلابو مسکرا دی۔ واقعی نیم دیوانگی ہی تو ہے یہ......کہ جس سے اتنا پیار ہو، اس کے ہر عیب برملا گنوا دیئے جائیں ورنہ ہوش اور شعور سب سے پہلے محبوب ہستی کے عیب ڈھکنے کے حیلے ڈھونڈتا ہے۔

''کھانا کھا لیا؟ اب ایک کام کی بات سنو......یہ جو تمہاری ممتاز بیگم ہے ناں۔''
وہ آگے جھک کر بڑی تفصیل سے اسے اس شعبدہ باز کی اصلیت سے آگاہ کرنے لگی۔
ارد گرد بیٹھے رکشہ اور ویگن ڈرائیور......مزدور پیشہ لوگ بڑی حیرت سے، بظاہر نک سک سے درست، اچھے گھرانے کی نظر آنے والی اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو گرد و پیش سے بے خبر ایک مجہول سے لڑکے کے ساتھ ایک قطعی ''مردانہ'' جگہ پر بیٹھی گفتگو فرما رہی تھی۔

☆======☆======☆

''بس؟ اتنی ہی اکڑ تھی؟''
وہ کمر پر ہاتھ رکھے تاؤ دلاتی مسکراہٹ کے ساتھ یاسر سے پوچھ رہی تھی۔
دونوں اس وقت علاقے کے واحد مختصر سے پارک میں کھڑے تھے۔ چھوٹے کے ہاتھ یاسر نے یہاں ملنے کا یہ پیغام بھیجا تھا اور وہ پرچے کے وقت سے گھنٹہ بھر پہلے نکل آئی تھی۔
یاسر نے اس بار ناراضی ختم کرنے میں پہل کا مظاہرہ کر کے اس کا مان بڑھا دیا تھا۔
''پہلے دل توڑتے ہی کیوں ہو جو بعد میں منانے کے لیے پیغام بھیجنے پڑیں؟'' وہ شوخی سے پوچھ رہی تھی، جب کہ یاسر سرد نگاہوں سے اسے گھورے چلا جا رہا تھا۔
''واہ......تیور دیکھو......آئے ہیں جناب منانے کے لیے اور گھوریاں ایسے ڈال رہے ہیں جیسے......''
''تم کل تکہ کباب والی دکان پر کس لڑکے کے ساتھ بیٹھی تھیں؟'' اس کے اچانک سوال پہ گلابو کا سارا چونچال پن رخصت ہو گیا۔ فوری طور پر وہ کچھ جواب تک نہ دے سکی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اس واقعے کی خبر اسے بھی ہو سکتی ہے اور وہ اسے اپنے انداز میں لے سکتا ہے۔ اتنا دور تک سوچنے کی عادت ہی کہاں تھی اسے۔
''چھوٹے نے دیکھا تھا تمہیں، اس لیے مکرنے کی ضرورت نہیں۔''
''اس کمینے نے چائے پانی کا کام چھوڑ کر جاسوسی کب سے شروع کر دی ہے۔ اس کی تو میں۔'' وہ تلملا کے کہنے لگی۔
''میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو......کون تھا وہ؟ رشتے دار تھا تمہارا؟''
''نہیں۔''
''ظاہر ہے، ہو بھی نہیں سکتا......کوئی چچا زاد، پھوپھی زاد بھائی ہوتا تو اپنی رشتے دار کو ایسے فضول مقام پر پچاس مردوں کے درمیان تو نہیں بٹھا سکتا۔''
''چھوٹا تمہیں وہاں بیٹھے مردوں کی صحیح تعداد گن کے بتا سکتا ہے، یہ نہیں بتا سکتا کہ

میرے ساتھ بیٹھا ہوا کوئی مرد نہیں، سائیں تھا...... اللہ لوک...... معصوم بندہ۔''

''تمہارے ساتھ کیا کر رہا تھا؟'' اس نے بدستور ''تمہارے'' پر زور دیتے ہوئے سوال دہرایا۔

''روٹی ٹھونس رہا تھا اور کیا مجھے ناچ کے دکھا رہا تھا۔'' وہ چڑ کے بولی۔ ''بے چارہ بھوکا تھا تین دنوں سے...... میں نے سوچا، کسی غریب کی دعائیں ہی لے لوں...... شاید کوئی ایک آدھ لگ جائے۔''

''دعائیں لینے کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ اتنا ہی خدمت خلق کا شوق چرایا ہے تو کھانے کے پیسے دے دیتیں، ہاتھ سے نوالے بنا کے منہ میں ڈالنے ضروری تھے؟''

''ہائے...... ہاتھ سے بنا کے نوالے۔'' وہ کچھ سوچ کر مسکرائی۔

''خواہش تو بڑی شدید ہے مگر تمہارے منہ میں ڈالنے کی۔''

''بکومت ...... سیدھی بات بتاؤ مجھے، کون تھا وہ۔''

''بتا تو رہی ہوں...... اعتبار نہیں ہے میرا؟''

''نہیں ہے۔''

اس جواب پر وہ ثانیہ بھر کے لیے ساکت سی ہوگئی۔

یاسر نے اس کے بے روح، بے تاثر چہرے کو دیکھا اور یکا یک اس کا دل تاسف سے بھر گیا۔ اسے اپنے کہے الفاظ پر ندامت سی محسوس ہونے لگی مگر اس سے پہلے کہ وہ معذرت پیش کرتا...... وہ بے روح، بے تاثر چہرہ تڑخ تڑخ کر کے ساری دراڑیں بھرتا کھلکھلا کے ہنس پڑا۔ وہ حیرت سے تکتا رہ گیا۔

''کہتے رہو...... اب مجھے تمہاری کسی بات پر دکھ نہیں ہوتا۔''

''ڈھیٹ جو ہوئی۔'' وہ جو چند لمحے پہلے اس کے اتنا اثر لینے پر گداز ہو رہا تھا، اس بے وجہ کی ہنسی سے چڑا تھا۔

''کیونکہ مجھے پتا ہے تم جو کہتے ہو، اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔''

''یعنی؟''

''اب دیکھو نا، کہتے تو تم یہ بھی ہو کہ مجھ سے محبت نہیں کرتے لیکن بغیر محبت کے کون کسی کی اتنی پرواہ کرتا ہے...... جن سے تعلق ہو نہ واسطہ...... بھلے بھاڑ میں جائیں...... جس کے ساتھ مرضی جئیں مریں لیکن تمہیں پرواہ ہے کہ میں کس کے ساتھ تھی اور کیوں تھی...... یعنی تمہیں مجھ سے محبت ہے اسی لیے تو اس بے چارے پاگل سے جل رہے ہو۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے جلنے کی...... میں تو......''

یاسر کو خود ہی اپنے لہجے کے کھوکھلے اور بودے پن کا احساس ہوا تو چپ کر گیا۔

گلابو نے اس کی خاموشی سے بڑے خوش فہم جواب اخذ کیے اور طمانیت سے مسکرا دی۔

''سچی یاسر...... وہ ایک پاگل تھا، مسافر...... اچھے گھر کا تھا مگر راستہ بھول گیا تھا اور رقم بھی خرچ کر چکا تھا۔ میں نے صرف اسے ہمدردی کی وجہ سے کھانا کھلایا اور واپسی کی ٹکٹ خرید کر دی۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ جیسے ہار مان گیا۔ ''مگر ہمدردی کا یہ مظاہرہ اس طرح کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹکٹ خریدنے اور کھانا کھلانے کی بجائے تم اسے پیسے دے دیتیں۔ وہ خود ہی۔''

''لیکن یاسر! وہ کیسے کرتا...... دوبارہ گم کر دیتا...... پاگل جو تھا۔''

''پاگل وہ نہیں تم ہو۔'' یاسر پھٹ پڑا۔ ''تم سمجھتی کیوں نہیں ہو، تم ایک لڑکی ہو۔ تمہاری ذرا سی بے احتیاطی تم پر لوگوں کی انگلیاں اٹھانے کا سبب بن جائے گی۔ کل بھی تم اتنے لوگوں کی موجودگی میں میرا بازو پکڑ رہی تھیں۔''

''اب تو کوئی نہیں ہے...... اب پکڑ لوں؟''

وہ اتنی معصومیت سے پلکیں جھپکتے ہوئے پوچھنے لگی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی یاسر ہنس پڑا۔

''تمہارا کوئی علاج نہیں ہے۔''

''ہے ناں...... یہی...... تمہاری ہنسی۔'' وہ اس کی دلکش مسکراہٹ پہ نثار ہوتی نظریں نچھاور کر رہی تھی۔

''ایک بات کہوں؟'' وہ سنجیدہ ہوا۔

''ہوں۔'' وہ نظروں کا ارتکاز ٹوٹنے نہ دے رہی تھی، جیسے اس کا نظارہ کرنا بھی کوئی عبادت ہو، جس میں پلک جھپکنے سے بھی خلل پڑنے کا اندیشہ ہو۔

''مجھے اتنا ٹوٹ کر مت چاہو۔''

''کیوں؟''

''ورنہ میں بھی ٹوٹنے لگوں گا...... محبت کر بیٹھوں گا تم سے۔''

''تم محبت سے اتنا ڈرتے کیوں ہو؟''

''میں تم سے ڈرتا ہوں۔''

''مجھ سے؟''

''ہاں...... میرے اتنے بند باندھنے کے باوجود تم کسی منہ زور ندی کی طرح چڑھتی رہی ہو...... اگر میرے اندر ایک بھی دراڑ پیدا ہوئی تو تم تو میرے اندر تک گھس جاؤ گی۔ مجھے اس دن سے ڈر لگتا ہے گل جس دن تم میرے اندر حکمرانی کرنے لگو گی۔''

''کیا کہا تم نے؟'' اس نے ''گل'' کے آگے جیسے کچھ بھی نہ سنا۔ ''گل...... میں......؟''

''ہاں......اچھا نہیں لگا۔''

''اونہوں......صرف اچھا نہیں۔ بہت اچھا۔'' اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''مجھے اپنا آپ اتنا پیارا، اتنا اچھا...... اتنا پاک کبھی بھی نہیں لگا۔ تم مجھے ہمیشہ اسی نا[م] سے پکارنا۔''

''ایک شرط پر...... تم ہمیشہ ''گل'' ہی رہنا۔ ''گل'' بن کے رہنا۔'' اس نے مشروط بنیا[د] پر اسے یہ نام دے دیا۔

☆======☆======☆

''پان کھائیں سیاں ہمارو......
بھولی صورتیا...... ہونٹ لال لال......
ہائے ہائے ململ کا کرتا......
ململ کے کرتے پہ چھینٹ لال لال......
پان کھائیں سیاں ہمارو......

''اے آپاں...... یہ موا پان ہی تو لے ڈوبا تھا تمہارے سیاں کو...... پھر بھی اسی کے گن گاتی جا رہی ہو۔''

خورشید نے اچھا بھلا لہک لہک کے گنگناتی جنت بیگم کو ٹوک دیا۔ جنت بیگم کے نازک نازک سفید سفید ہاتھ پان کی گلوری بناتے ہوئے تھم گئے۔

''سویرے سویرے میرے منہ متی لگیو...... کہے دیتی ہوں۔''

''ہاں ہاں...... سویرے سویرے تُو نے پان جو منہ سے لگانا ہوتا ہے۔ میرے ذرا سا سرخی پوڈر لگا لینے پہ تو طعنے مار مار کے کلیجہ ساڑ دیتی ہے اور خود پان کے بہانے منہ لال کر کے بیٹھی رہتی ہے۔''

''چل چل...... کام لگوا اپنے...... مجھ سے متی الجھو...... یہ پان صرف شوق نہیں ہے میرا...... یہ تو میرے بہشتی سرتاج کی نشانی ہے۔''

''ہونہہ...... جیتے جی تو بہشتی سرتاج کو منہ نہ لگایا، اب نشانیاں سنبھال کے بیٹھی ہے۔''

وہ جنت بیگم کے پاس ہی بیٹھ کے پان دان میں سے چھالیہ ٹونگنے لگی۔

دونوں عورتیں پچپاس کے پیٹے میں تھیں۔

جنت بیگم قدرے پستہ قامت، دھان پان سی روئی کے پھائے جیسی نازک اور مختصر...... سفید رنگت...... سفید بے داغ ساڑھی یا کرتہ پاجامہ معمول کا لباس ہوتا...... سر کے بال مہندی رنگے اور بے حد ہلکے اور چھدرے...... پتلی سی چوٹی شانوں پر جھولتی رہتی۔ بڑی نفاست پسند اور اہل زبان خاتون...... پچھلے تیس پینتیس سالوں سے لاہور جیسے شہر میں رہنے کے باوجود ان کی ڈھلی ڈھلائی لکھنوی زبان پہ دیسی تڑکا نہ لگا تھا۔ بیس سالوں سے بیوگی کا دکھ لیے ہوئے تھیں۔

اور خورشید...... جیسا نام مردانہ اور جلالی سا...... ایسی ہی لحیم شحیم خود تھی...... گٹھا ہوا جسم...... چوڑے کھلے ہاتھ پیر...... لمبا قد...... سانولی رنگت۔ موٹے موٹے نین نقش...... مگر اس کے باوجود اس کے چہرے بشرے سے کرختگی نہیں جھلکتی تھی۔ موٹے بھدے ہونٹوں پر گیلی گیلی میٹھی سی مسکراہٹ ہمیشہ جھلکتی رہتی۔ پاٹ دار آواز بھی سماعت پر گراں نہیں گزرتی تھی کیونکہ بول محبت میں ڈوبے ہوتے تھے۔ ہر وقت ایک بے فکری کا سا سماں...... ٹھٹھے لگانے کی...... ہر غم کو ہنسی میں اڑانے کی عادت......

دونوں اس وقت ''صغیر منزل'' کے کھلے سے سرخ اینٹوں والے آنگن میں بیٹھی تھیں۔

مال روڈ سے متصل اس ذیلی سڑک پہ انگریزوں کے دور کے بنے مکانوں میں سے باقی بچے اکادکا مکانات میں سے ایک تھا یہ ڈھائی کنال پہ پھیلا بڑا سا گھر۔

سال خوردہ چر چر کرتا پھاٹک...... جس کی پھولی ہوئی نم لکڑی پہ ہر تیسرے مہینے کھمبیاں پھوٹ آتی تھیں...... اور جو برسات کے دنوں میں پھول کر ایسا کپا ہو جاتا تھا کہ بند ہی نہ ہوتا تھا...... اس پھاٹک کو پار کرنے کے بعد پتھروں کی بنی روش کے دونوں جانب سفیدے، جامن اور آم کے پیڑ تھے...... بے تکی جھاڑ جھنکار اور گھاس تھی۔ جسے سال میں ایک آدھ بار پڑوسیوں کے مالی کی منت ترلے کرنے کے بعد تب کٹوایا جاتا جب چلنے پھرنے تک میں دشواری ہونے لگتی۔ روش کے پتھر تقریباً ایک صدی پرانے ہونے کی وجہ سے گھس کے چکنے اور چپٹے ہو چکے تھے۔ پیر رکھتے ہی پھسلنے لگتا تھا اور پتھر ایک دوسرے سے اتنا ہٹ چکے تھے کہ درمیان میں انچوں برابر شگاف تھے۔ نمو کی ایڑی والی سینڈل تو پھنس پھنس جاتی تھی اور پچھلے سال جو موچ آئی تب سے وہ سینڈل ہاتھ میں پکڑ کے یہ روش پار کرتی تھی۔

روش کے آخری سرے پہ چار سیڑھیاں اونچا برآمدہ تھا...... سرخ ستونوں والا...... سفید اور سرخ چپس کے فرش سے سجا برآمدہ جس میں اندر موجود سارے کمروں کے روشن دان اور کھڑکیاں کھلتی تھیں۔

ستون عجیب ننگے بچے سے تھے...... نمو نے کتنا چاہا کہ اوروں کی طرح ان کے ستون سے بھی کوئی عشق پیچاں کی بیل لپٹ کر پروان چڑھے مگر آس پاس کی ساری مٹی کائی زدہ تھی۔ کوئی ڈنٹھل تک نہ پھوٹتی تھی۔ ہاں ذرا پرے خوب زرخیزی تھی۔ گھٹنوں تک آتی گھاس اس کا ثبوت تھی۔ لمبے سے برآمدے میں فقط دو پلاسٹک کی کرسیاں اور ان کے آگے ایک پرانی سی لکڑی کی میز دھری تھی جس کی پالش اکھڑ چکی تھی۔ چھت پہ پنکھا تو نہ تھا البتہ خاصے فاصلے پہ دو بلب ضرور لگے تھے۔ ایک برآمدے کے اس کونے میں...... دوسرا دوسرے کونے میں۔

برآمدے کے عین درمیان میں جالی کا دروازہ تھا...... جو ہمیشہ مقفل رہتا تھا...... البتہ اس کے ساتھ لگا لکڑی کا دروازہ دن بھر کھلا رہنے دیا جاتا تا کہ جالی کے ذریعے تازہ ہوا اندر آتی رہے۔ رات کو یہ بھی مقفل کر دیا جاتا۔

ان دروازوں سے پرے مختصر سی راہ داری تھی، جس میں ڈرائنگ روم اور سٹور کے دروازے کھلتے تھے، راہ داری کے اختتام پر نیم گولائی میں بنا ایک اور برآمدہ تھا، جس میں آٹھ کے آٹھ کمروں کے دروازے کھلتے تھے...... اور برآمدے کے نیچے بڑا سا یہ صحن...... گھر کا یہ حصہ زندگی سے بھرپور اور رنگا رنگ تھا۔

صحن کو جنت بیگم اور خورشید آباد کیے رہتیں اور برآمدے میں کمروں میں آنے جانے والوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ اس پرانی طرز کے بڑے سے گھر کا یوں تو مرکزی داخلی راستہ وہ سال خوردہ گیٹ تھا مگر وہ بڑی مصروف شاہراہ پہ کھلتا تھا اور آنے جانے کے لیے کم ہی استعمال ہوتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس لان کی صفائی ستھرائی پہ بھی خاص توجہ نہ دی جاتی تھی البتہ یہ صحن خوب چم چم کر رہا ہوتا اور اس صحن کے دونوں اطراف لگی کیاریاں بھی ہری بھری مہکتی ہوئی تھیں، صحن کے پرے دو پٹ کا لوہے کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور یہ گلی متوسط طبقے کی ایک کالونی کی تھی۔ بڑی ہلچل اور ہنگامے والی گلی تھی۔ اس گلی کی تقریباً ساری عورتوں کا یہاں آنا جانا تھا، ان کے دو دو ڈربہ نما کمروں والے کوارٹروں کے آگے تو یہ ڈھائی کنال کا مکان گویا محل تھا۔ اس ایک فرق کے سوا اس گھر کے مکینوں اور اس گھر کے پچھلی جانب والی کالونی کے باسیوں کی معاشی حیثیت میں خاص فرق نہ تھا۔ وہاں بھی اکا دکا کے پاس کوئی سیکنڈ ہینڈ گاڑی تھی یا پھر اکثریت کے پاس موٹر سائیکل۔ ''صغیر منزل'' کے بھی کم استعمال میں رہنے والے

گیٹ کے پاس بنے ٹین کی چھت والے گیراج کے نیچے ایک پرانی سی موٹر ضرور ترپال سے ڈھکی کھڑی رہتی تھی...... مگر پچھلے دروازے سے صغیر احمد کی آمد اور روانگی اسی ہلکے سبز رنگ کے سکوٹر سے ہوتی تھی۔

''اے آپاں......'' جنت بیگم کی چپت کھانے کے بعد خورشید نے اپنا ہاتھ چھالیے سے روکا۔

''تجھے پتہ ہے، آج کیا ہے؟''

''سوموار......'' بڑی نفاست سے پان منہ میں دبا کے جواب دیا گیا۔

''اوہو...... وہ تو ہے مگر آج کے دن خاص بات کیا ہے؟''

''آج......'' وہ سوچنے لگیں پھر بڑبڑا اٹھیں۔ ''شان کی نئی فلم لگی ہے؟''

فلم بینی کا شوق وہی پرانا تھا ان کا...... البتہ پسندیدہ ہیرو بدلتے رہے تھے۔ سنتوش کمار سے وحید مراد، وحید مراد سے جاوید شیخ اور اب شان۔

''آئے ہائے...... چاہ تو دیکھو آپا کے...... خصم کی برسی ہے اور اسے شان کے خواب آ رہے ہیں۔''

''اے میرے مالک......'' انہوں نے پان چھوڑ سینہ پکڑ لیا۔ ''سرتاج بہشتی کی آج برسی ہے؟''

''ہور کی...... بجائے ختم شتم دلانے کے تُو فلماں دیکھنے کے پروگرام بنا رہی ہے...... ئی بڑی بے دید دنیا ہے۔''

''چل چل...... باتیں نہ بنا...... ہٹا اسے۔'' وہ پان دان بند کر کے تخت سے اترنے لیں۔ ''خدانخواستہ...... بیرسٹر صاحب کی برسی ایسے کیوں گزرنے لگی...... نیاز تو دوں ل...... آخر میں ابھی زندہ ہوں۔''

''اور میں بھی......'' خورشید نے قہقہہ لگایا۔ ''اور جس کی دو دو بیوائیں زندہ ہوں...... س کی برسی پہ رونق نہ لگے...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''ہٹ مردار...... بدبخت...... بکے جا رہی ہے۔''

جنت بیگم اپنی سوتن اور سہیلی کو دھپ لگاتے ہوئے ہنسی چھپانے کی اپنی سی کوشش میں گئیں۔

اپنے کمرے سے نکل کر برآمدہ اور صحن پار کر کے بڑے سارے باورچی خانے کی نب جاتی جہاں آرا بیگم نے نخوت اور بے زاری سے ناک چڑھا کے اپنی ان دونوں

دیورانیوں کو دیکھا، جو اتفاق سے ان کی سمدھنیں بھی کہلاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں پالک سے بھری ٹوکری دیکھ کے جنت بیگم نے آواز لگائی۔

''بھابھی...... یہ پالک رہنے دیجیو...... آج کے دن تو یہ گھاس پھونس نہ پکائیو...... آج بیرسٹر صاحب کی برسی ہے۔ آج تو ختم شریف پڑھا جائے گا۔ مسجد میں کھانا بھیجوں گی۔''

''مسجد میں کھانا بعد میں بھیجنا جنت...... پہلے باورچی خانے میں قدم رنجہ فرما کے اس کھانے کو پکانے کی زحمت بھی کر لینا۔''

جہاں آرا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ اپنی ان دونوں سمدھنوں سے وہ ناک تک عاجز تھیں۔ دونوں ایک سے بڑھ کے ایک باتونی اور کام چور...... بس سارا دن یہ تخت تھا اور یہ دونوں سوکنیں...... سارے گھر کا بوجھ بس جہاں آرا بیگم کے شانوں پہ تھا۔ یہ دونوں صرف سمدھنیں ہوتیں تو جہاں آرا بیگم کاہے کو برداشت کرتیں۔ ایک دن بھی ان کے بے مصرف وجود...... مگر بدقسمتی سے وہ دیورانیاں بھی تھیں، ان کے مرحوم شوہر بیرسٹر صاحب اور جہاں آرا کے مرحوم شوہر سگے بھائی تھے اور اس مکان کے دونوں برابر کے مالک تھے، اس لحاظ سے دونوں کی بیوائیں اور اولادیں بھی برابر کی حق دار...... سب ایک دوسرے کو مجبوراً جھیل رہے تھے۔

''ہاں ہاں پکا لوں گی...... ویسے بھی بیرسٹر صاحب بہشتی اچھا کھانے کے عادی تھے بے دلی سے ریندھا گوندھا ہوا کھانا تو وہ پکانے والے کے منہ پر الٹ دیا کرتے تھے۔ اس کے لیے تو کھانا میں ہی پکاؤں گی...... کوفتے...... پلاؤ...... آلو گوشت...... اور ہاں فیرنی...... سب ان کے پسندیدہ پکوان۔''

''صغیر احمد نے ابھی تک بجلی کا بل نہیں بھرا...... پہلے ہی پریشان ہے وہ۔''

''آئے ہائے بھابھی...... تمہارا مطلب ہے، میں داماد کے روپے پیسے کی محتاج ہوں منہ نہ کھلوائیو میرا...... سب جانتے ہیں کہ اس مکان کی ایک ایک اینٹ تلے میرا زیور دبا ہے میں نے ہی اپنے گہنے بیچ بیچ کر یہ چھت کھڑی کی ہے۔''

''اور کی؟'' خورشید نے لقمہ دیا۔

''جوائی پتر جیسا ہوتا ہے اور صغیر احمد کوئی بیرسٹر صاحب کا نرا جوائی ہی تو نہیں ہے سگا بھتیجا بھی ہے...... چاچے کا رتبہ پیو سے کم نہیں ہوتا۔ کیا فرق پڑتا ہے اگر وہ چار پیسے کے برسی کے ختم پر لگا دے...... ثواب ہی ہوگا۔''

''توبہ...... تم دونوں کے ساتھ بحث کرنا تو نرا وقت کا ضیاع......''

وہ بڑبڑاتی آگے بڑھ گئیں۔ دونوں سوکنیں آپس میں بھلے دن میں کئی بار چونچ لڑاتی ہوں مگر جٹھانی کے خلاف دونوں میں بڑا ایکا تھا۔ مل کے پل پڑتیں بے چاری پہ۔

باورچی خانے میں جا کے جہاں آرا بیگم نے غصے سے سبزی کی ٹوکری زمین پہ پٹخی۔

''کیسے نصیب ہیں میرے...... تیرہ برس کی بیاہی اس عذاب میں پھنسی میں...... تیرہ برس کی عمر سے پہلے کا ایک دن بھی یاد نہیں مجھے...... ورنہ کسی اچھے دن کی خوشگوار یاد کے سہارے ہی خوش ہو لیتی۔ ایسا جونک نما سسرال ملا ہے کہ جان چھوٹتی ہی نہیں...... ساس گئی...... نند گئی...... میاں گئے...... پھر بھی یہ دونوں رہ گئیں سدا کے لیے چھاتی پہ مونگ دلنے۔''

''حلیمہ...... او حلیمہ......'' ان پہ بس نہ چلا تو بہو کو پکارنے لگیں۔

''جی اماں جان......'' آواز بالکل نزدیک سے ابھری۔ گھوم کے دیکھا تو حلیمہ وہیں باورچی خانے میں ایک کونے سے لگی بیٹھی تھی۔ آٹے سے بھری پرات سامنے دھری تھی اور ایک تھالی میں گولی برابر سائز کے پیڑے ڈھیر لگا رکھے تھے۔

''تم یہاں مراقبے میں بیٹھی ہو...... ناشتہ کون بنائے گا صغیر میاں کا؟''

''میں اماں جان......'' حلیمہ نے فخر سے سینے پہ ہاتھ مارا۔ ''روز میں بناتی ہوں۔''

''ہاں، اور روز ہی بے چارہ آدھے پیٹ اٹھ کر جاتا ہے۔'' وہ بڑبڑا کے رہ گئیں اور حلیمہ سوچنے لگی کہ کب اس نے میاں کو آدھے پیٹ کے ساتھ دیکھا ہے، پیٹ تو سب کا پورا ہوتا ہے، آدھا ہو تو بندہ مر نہ جائے...... اور پیٹ آدھا ہوتا کیسے ہے بھلا؟ کاٹ کر؟ ویسے دیکھنا چاہیے صغیر صاحب واقعی دکان پہ آدھا پیٹ لے کر جاتے ہیں یا اماں جان گپ ہانک رہی ہیں...... اور...... اور باقی کا آدھا والا پیٹ وہ کہاں رکھ کے جاتے ہوں گے۔

اس سے پہلے کہ واقعی اپنے میاں کا کرتہ اٹھا کے پیٹ چیک کرنے کے ارادے باندھنے لگتی...... جہاں آرا نے پھر سے ٹوک دیا۔

''لو...... یہ تو گئی پھر سے مراقبے میں...... نہ جانے کیا بیماری ہے اس علامہ کو...... منٹ بعد سر جھکا کے غور و فکر میں ڈوب جاتی ہے۔ کون سے مسئلے حل کرنے ہوتے ہیں اس نے کائنات کے...... ایک ذرا سی گھرہستی تو سنبھالی نہیں جاتی۔''

''اماں! یہ گولیاں مرغیوں کو ڈال کے آتی ہوں۔''

وہ تھالی اٹھا کے کھڑی ہوئی۔

''رکھ...... رکھ اسے۔'' جہاں آرا لپکیں۔ ''میاں ابھی تک بھوکا بیٹھا ناشتے کے انتظار

میں ہے کہ کب ملے اور کب وہ کام پہ جائے، اسے مرغیوں کی پڑی ہے...... اور مرغیاں بھی بخت بڑھتی جا رہی ہیں...... بڑھتی جا رہی ہیں۔''

انہیں سخت گلہ تھا اس گھر کے حیوان اور حشرات آبادی بڑھانے میں زوروں پہ تھے۔ چھپکلیاں...... لال بیگ...... چیونٹیاں...... حلیمہ کی چہیتی مرغیاں اور تو اور خورشید کی وہ گو بلی...... جو سال کے سال اکٹھے چھ سات بلونگڑے پیدا کرتی تھی...... اور ویسے ایسا قحط تھا کا کہ وہ دونوں سوکنیں کل ملا کے دو بچوں کی مائیں تھیں...... اور بچے بھی یہ...... کسی نہ کسی کے...... اور وہ خود شادی شدہ زندگی کے بائیس برسوں میں صرف صغیر احمد کو پیدا کرنے کا کارنامہ سرانجام دے سکیں...... اور صغیر احمد کون سا بڑا تیر مار سکا۔ اس اٹھارہ سالہ نمو کے علاوہ کوئی دوسرا پھول نہ کھل سکا حلیمہ کی گود میں...... اور یہ مرغیاں، چھپکلیاں اور بلیاں...... دے بچے پہ بچہ...... دے بچے پہ بچہ...... یہ حال رہا تو انسانوں سے زیادہ حیوان راج کرتے نظر آئیں گے اس گھر میں۔

''چل، سیدھی طرح پراٹھے بنا...... خاموشی سے۔''

''لیکن اماں جان......'' حلیمہ بولنے سے نہ رہ سکی۔ ''پراٹھے خاموشی سے نہیں بنتے۔''

''کیوں؟ پراٹھوں کو ملہار سنانا پڑتا ہے، تب جا کے بنتے ہیں؟'' وہ بری طرح کا گئیں۔

''نہیں وہ......'' ساس کو اس موڈ میں دیکھ کے بے چاری کے ہاتھ پیر پھولے جا تھے...... لیکن ذہن میں آیا خیال اُگلے بغیر بھی چارہ نہیں تھا۔

''وہ...... وہ میری کلائی میں چوڑیاں ہیں ناں...... تو چھن چھن چھن......'' حلیمہ شرمیلے جھجکتے انداز میں ساس کی آنکھوں کے سامنے کلائی لہرائی...... اس ادا پہ جہاں آرا سر سے پاؤں تک سلگ اٹھیں اور بھنا کے اسے شانوں سے دھکا دیا۔

''ہٹ پرے...... میں خود بنا لیتی ہوں۔ نگوڑی کی رنگ بازیاں ہی نہیں ختم ہوتیں۔''

حلیمہ لڑکھڑا کے دیوار کے ساتھ جا لگی۔

☆======☆======☆

سفید شلوار قمیص اور سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کی موتی سی رنگت دمک رہی تھی...... اور مومی انگلیوں میں دبی موتیے کی منہ بند کلیاں بھی اس دلکشی کے سامنے ہاری ہوئی لگ رہی تھیں۔

ہتھیلیوں میں ڈھیر ساری کلیاں جمع کرنے کے بعد وہ پلٹی اور برآمدے کا رخ کیا۔

''یہ لیجیے...... مگر آپ......''

صغیر احمد جنت بیگم کی جانب چند نوٹ بڑھاتے ہوئے کچھ کہنے جا رہا تھا کہ آہٹ پہ رکا...... ہاتھ بے ساختہ واپس پہلو کی جانب گیا مگر نرمین کو آتے دیکھ کر اس کے چہرے پہ قدرے طمانیت نظر آئی۔ اس نے نوٹ دوبارہ جنت بیگم کی جانب بڑھا دیئے۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ساس کے مطالبے پہ اسے رقم دے تو رہا ہے مگر ماں سے خائف بھی ہے۔

ساس کے حوالے سے دیکھا جائے تو جنت بیگم اور خورشید دونوں ہی اس کے لیے خاص قابل قدر اور معزز نہ تھیں، خصوصاً حلیمہ جیسی کوڑھ مغز بیٹی پیدا کر کے اس بے چارے کی زندگی برباد کر دینے کا جرم ہی اتنا بڑا تھا کہ وہ ساری عمر ان سے بے رخی اختیار کرنے میں حق بہ جانب سمجھتا تھا خود کو...... لیکن وہ چچی بھی تھیں...... بزرگ بھی تھیں...... ان کے حقوق سے آنکھیں بھی نہیں پھیری جا سکتی تھیں۔

''نانی اماں...... کلیاں......'' نرمین نے ہتھیلیوں کا کلیوں سے بھرا پیالہ سامنے کیا۔

''نہیں...... آج نہیں...... آج مجھے فرصت کہاں ہار بُندے بنانے کی...... تمہارے نانا کی برسی ہے نا۔''

''چھوٹی نانی بھی تو نہیں بناتیں۔'' نرمین نے منہ بسورا۔

''اس ہڑ بونگی سے کاہے ہونے لگیں ایسے کام...... اس کو تو تم بس کچھ بگاڑنے کو دے

دو...... ہونہہ...... گجرے بنائیں گی یہ......'' جنت بیگم نے دانت کچکچائے جیسے خورشید منہ کے اندر ہی تو چھپ کے بیٹھی ہو۔

''میں دادی اماں سے کہتی ہوں۔'' وہ پلٹی تو رومال تہ کر کے جیب میں رکھتا صغیر احمد چونکا۔

''نمو...... سنو......'' کچھ تذبذب کے عالم میں وہ جو کہنا چاہ رہا تھا، وہ بغیر سنے سمجھ گئی...... بیٹی جو ہوئی۔

''نہیں بتاتی۔'' فقط اتنا کہہ کے اس نے باپ کو ہلکا پھلکا کر دیا مگر خود ایک بوجھ سا لے کر کمرے سے نکلی۔

اس نے ہمیشہ اپنے باپ کو اسی طرح دیکھا تھا۔

اپنی ماں کے آگے دبا ہوا...... سہا ہوا۔

بیوی کے سامنے جھنجلایا ہوا، بے بس...... جیسے بہت کچھ سنانا چاہ رہا ہو مگر سنا نہ پا رہا ہو...... اندر کی کھولن اندر تک ہی رکھنے پر مجبور۔

چچیوں کے سامنے شرمندہ شرمندہ...... ان کے سارے فرائض بھی کسی اَن چاہے بوجھ کی طرح ادا کرتے ہوئے...... اور بیٹی کے سامنے مشکور ممنون انداز میں مسکراتا ہوا، جیسے اس کا شکر گزار ہو کہ وہ ان سب میں سے کسی ایک کی بھی فطرت و مزاج لے کر نہیں پیدا ہوئی۔ نہ حلیمہ جیسی تھی نہ جہاں آرا جیسی...... نہ ہی جنت بیگم جیسی...... شاید اسی لیے اسے اتنی عزیز تھی۔

موتیے کی کلیاں لیے وہ باورچی خانے میں داخل ہوئی تو جہاں آرا زمانے بھر کی بے زاری چہرے پہ لیے بڑبڑاتے ہوئے پراٹھے تل رہی تھیں اور حلیمہ دروازے کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ گرنے کے انداز میں بیٹھی کہنی سہلا رہی تھی۔

''کیا ہوا امی؟''

''گر گئی تھی۔'' حلیمہ کھوکھلی ہنسی ہنس کے بولی جیسے اس سے مزے دار کوئی بات ہی نہ ہو۔

''کیسے......؟'' وہ تشویش سے اس کے نزدیک ہوئی۔

''وہ...... اماں نے دھکا دیا تھا۔''

حلیمہ نے دوپٹے کا کونہ دانتوں میں دبا کے بڑے شرمیلے اور فخریہ انداز میں مسکرا کے کہا۔

نزمین کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے ساکت نظروں سے دادی کی جانب دیکھا۔

''دھکا تو مجھے دیا تھا، صغیر احمد کے ابا جنت مکانی نے، اس ہولا جبطا کو بہو بنانے کا فیصلہ کر کے۔''

☆======☆======☆

وہ آنکھیں پھاڑے مداری کے کرتب دیکھ رہا تھا۔ کیسے وہ بندر کو ڈگڈگی پہ نچا رہا تھا۔ ایک عجیب سی سرشار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ مستقل پھیلی ہوئی تھی۔ محویت کے عالم میں ایک جانب سے رال بہہ کے ٹھوڑی پہ بڑھے بالوں میں جذب ہو رہی تھی۔ کتنے ہفتوں سے وہ نہ نہایا تھا نہ منہ ہاتھ دھویا تھا...... شیو بنانا تو بہت دور کی بات تھی۔

پچھلے تین گھنٹوں سے وہ اس مداری کے پیچھے پیچھے تھا۔ جہاں وہ جاتا...... ٹیپو بھی پیچھے پیچھے۔

جس بس پہ وہ بندر سمیت چڑھا، یہ بھی چڑھ گیا۔

جن جن راستوں سے وہ پیدل گزرا، یہ بھی چلتا رہا۔

جہاں جہاں رک کر اس نے ڈگڈگی بجائی...... ہر بار جمع ہوئے تماشائیوں میں ٹیپو شامل ہوتا۔

گوشت سبزی خرید کے رکشے کی تلاش میں مین روڈ تک آتی خورشید نے سرسری انداز میں اس بھیڑ کی جانب نظر اٹھائی...... اور ڈھیر سارے بچوں کے درمیان لمبے تڑنگے بکھرے گھنگریالے بالوں والے ٹیپو کو دور سے پہچان لیا۔ ہاتھ میں پکڑی چاٹ مسالے والی ادھ کھائی گاجر وہیں پھینک کر وہ لمبے لمبے زقند بھرتی وہاں پہنچیں۔

''وے ٹیپو...... تیرا ککھ نہ رہے۔''

ٹیپو کی محویت ٹوٹی۔ اس نے بدمزگی سے آواز دینے والی کو دیکھا اور منہ بنا کے ٹھینگا دکھاتے ہوئے وہاں سے بھاگ لیا۔

☆======☆======☆

''میرے لیے......؟ سچی......''

وہ پہلی بار اس کے لیے کوئی تحفہ لایا تھا۔ گلابو کو یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

''پسند آیا تمہیں؟'' یاسر کو ہر بار اس سے ملنے کے بعد اس کی محبت پہ یقین گہرے سے گہرا ہوتا جاتا تھا۔

''ہاں...... بہت...... مگر بلیو اور ریڈ کلر کے سوٹ کے ساتھ دوپٹہ بلیک؟''

"دو پٹہ نہیں، شال ہے۔ تمہیں پہلی بار میں نے اسی رنگ کی چادر میں دیکھا تھا۔ بہ
اچھی لگتی ہو تم اس میں۔"

"اچھا...... پھر تو میں ہمیشہ یہی پہنوں گی...... مرتے ہوئے وصیت کر جاؤں گی کہ کف
بھلے سفید ہو، اوپر چادر کالی اوڑھا دینا۔"

"تم پھر بکواس پہ اُتر آئیں؟"

"اچھا بابا، نہیں کرتی۔"

"اور وعدہ کرو جیسا میٹرک کا رزلٹ آیا ہے ویسا ہی ہر بار آئے گا۔ پڑھائی کا سلس
چھوڑنا مت۔"

"اگر ہر بار پاس ہونے پہ ایسے ہی تحفے ملیں گے تو ضرور۔"

"وعدہ...... تحفہ ہر بار پہلے سے اچھا ملے گا...... چاہے میں خود دوں چاہے بھجوا دوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ کھٹکی، پہلے ہی یاسر کے انداز کچھ بدلے بدلے لگ رہے تھے، جی
وہ کچھ چھپا بھی رہا ہو اور کچھ بتانا بھی چاہ رہا ہو۔

"میں، میں کویت جا رہا ہوں مگر۔"

"کویت؟" اس کے لب پھڑپھڑائے۔

"ہاں اور میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ قسمت ایسے مہربان ہو گی مجھ پہ...... میں یہ مو
کھونا نہیں چاہتا گل۔"

اس کی نظروں نے گویا گل کی منت کی کہ مجھے روکنا مت، ورنہ میں جا نہ پاؤں گا۔

"میں بھی یہ نہیں چاہتی کہ تم یہ موقع کھو دو۔"

کچھ چھن جانے کا احساس بس چند لمحے کے لیے ہی اسے بے چین کر گیا۔ وہ پھر
مسکرادی تھی یہ سوچ کر کہ جو جا رہا ہے، اسے لوٹنا تو ہے ہی اور وہ بھی میرے ہی پاس۔

"تم روکو گی نہیں مجھے؟" یاسر متحیر تھا کیونکہ اس کی جانب سے تو شدید ہنگامہ آرائی
توقع تھی اسے۔

"میں نے تم سے محبت کی ہے یاسر...... تمہارا نفع ہی سوچوں گی...... گھاٹا نہیں۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ محبت نفع نقصان نہیں جانتی۔"

"گل سب سے الگ ہے۔ اس کی محبت بھی سب سے الگ۔" وہ مسکرائی۔ "میں تمہ
روک سکتی ہوں مگر روکوں گی نہیں۔ میں نے ہمیشہ تمہارے اندر ایک شہزادہ دیکھا ہے!
گدڑی میں چھپا شہزادہ۔ یہ معمولی دکان داری تمہیں جچتی نہیں ہے۔ کاش میں سونے کی

ہوتی اپنی بوٹی بوٹی تلوا کے تمہیں مالا مال کر دیتی لیکن میں اور کسی طرح تو تمہاری مدد کر نہیں
سکتی۔ اتنا تو کر سکتی ہوں کہ تمہارا راستہ کھوٹا نہ کروں۔ تم جاؤ یاسر! مجھے اندر سے اشارہ ہو رہا
ہے کہ وہاں جا کے تمہاری زندگی بدلنے والی ہے۔"

"ہاں...... کہیں کی ولی ہوناں تم۔" وہ ہنسا۔

"دیکھ لینا...... مان جاؤ گے تم بھی...... بس یہ ہے کہ مجھے جلد سے جلد اپنے پاس بلا
لینا۔"

اس مطالبے پہ وہ حیران رہ گیا...... وہ سمجھ رہا تھا، وہ کہے گی، جلد سے جلد واپس
لوٹنا۔

"تمہیں بلا لوں...... مگر کس رشتے سے؟ تمہیں میں صرف ایک ہی رشتے سے اپنے
پاس بلا سکتا ہوں اور اس رشتے میں تمہیں باندھنے کے لیے مجھے خود واپس آنا ہو گا۔ تمہارے
پاس۔"

یاسر نے دھیرے سے اس کی ننھی سی ناک کی نوک کو چھوا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

"اور اگر میں بیوی بچوں سمیت واپس آیا تو پھر؟" اسے شرارت سوجھی۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ پورے وثوق سے بولی تو یاسر کو ڈر لگنے لگا۔ (پتہ نہیں میں
اس اعتماد پہ پورا بھی اتروں گا یا نہیں)

"تم میرے لیے لوٹو گے...... اور میں تمہاری منتظر رہوں گی۔ وعدہ۔"

یاسر نے اس کی شفاف گداز ہتھیلی اپنے ہاتھوں میں دبا لی اور نم ہوتی پلکوں سے لگا
لی۔

بڑے ہاتھ پیر مارے تھے اس نے بڑا ٹالا تھا دل کو مگر وہ خود کو اس سے محبت کرنے سے
روک نہ پایا تھا۔ حتیٰ کہ تب بھی نہیں، جب اس نے اپنا آپ اس پہ پوری طرح کھول کے رکھ
دیا تھا۔ سب کچھ بتا دیا تھا اپنے بارے میں۔ اپنا ماضی اپنا حال، اپنا خاندان سب کچھ تب بھی
وہ نہ بدلا۔ کیونکہ تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، وہ اتنا آگے جا چکا تھا کہ اب واپس لوٹنا ناممکن سی
بات تھی۔

"مجھے خط لکھو گی؟"

"ہاں...... مگر تم مجھے خط نہ لکھنا...... فون کرنا۔ مجھے تمہارے لکھے لفظوں سے تسلی نہیں
ہونے والی...... میں تمہاری آواز سنتے رہنا چاہتی ہوں۔"

اور بہت سے وعدے لے کر...... بہت سے وعدے کر کے وہ چلا گیا۔

☆======☆======☆

اب دور ہی رہ یا مل سجناں
تجھے سونپ دیا ہے دل سجناں
اب خوشبو ہر سُو پھیلے گی
اک زخم گیا ہے کھل سجناں
ہر رات تیرے بن ، سینے پر
ہے دھری ہوئی اک سِل سجناں

کثیف سی فضا میں سوکھی جلتی لکڑیوں کی کڑوی بو...... ساگ کے پکنے کی بھاری مہک...... جبس کی ناگواریت اور سیلے سیلے پرانی اون والے لحافوں کی باس......

ان سب کو چیر کر اپنا راستہ بناتی گلابو کی آواز بھاگاں کو حیران کرنے لگی...... گھٹنوں میں دبوچا، چھوٹے کا سر اس نے ویسا ہی جوؤں سے ابلتا رہنے دیا اور کوٹھڑی کے اندر لپکی۔

وہ ڈھیلی بان والی چارپائی پہ اوندھی گری...... ایک بازو نیچے لٹکائے انگلی سے کچی مٹی میں کچھ کریدتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔

تم بن درد ہزار وے ڈھولا
دوری سے نہ مار وے ڈھولا
تُو منزل ، تُو در ، تُو رستہ
تیری ذات کا پھیل گیا ہے
چاروں سمت حصار وے ڈھولا
تم بن درد ہزار وے ڈھولا
آتش سی کوئی بھری لہو میں
سینہ کر گئی دھواں دھواں
تم بھی درد ہزار وے ڈھولا

"ہے چھور...... تیری واج تو گھنی سریلی ہووے ہے۔"

وہ بڑے اشتیاق سے اس کے قریب جُڑ کے بیٹھی...... گلابو نے اس اَن چاہی مداخلت پہ ناگواری محسوس کی اور ذرا سا پرے سرکی۔ اس وقت وہ صرف اور صرف یاسر کی یاد کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

"جب سے آئی ہے، کلی کلی پڑی رہوے ہے، نہ گل...... نہ بات...... نہ روٹی ٹکر جی سے کرتی ہے، نہ اماں کے گھر جھاتی مار کے تکا ہے، نی کڑیے...... کدرے شہر میں کسی سے آنکھ مٹکا تے نہیں لگا آئی؟"

اس کے تیر جیسے انداز سے ہی گلابو بدک ہی اٹھی اگر کچے اعصاب کی ہوتی...... سینے کے اندر دل ایک بار زور سے پھڑپھڑایا ضرور مگر اس نے شکل سے ظاہر نہ ہونے دیا اور یونہی ٹھس پڑی مٹی پہ لکیریں کھینچتی رہی۔

"دس وی......" (بتا بھی)...... اب کے بھاگاں نے اسے ٹھوکا دیا۔

"ہاں...... لگا آئی ہوں...... پھر؟" اس نے نہ جانے چڑ کے یا پھر شاید ماں کا ردِعمل ٹٹولنے کی غرض سے سچ بک دیا۔

"اشکے...... توں تے عاشقی......؟"

بھاگاں نے ٹھٹھا لگایا......

"کیکر تنے بہاراں......" وہ بے ہنگم طریقے سے ہنستی ہوئی اٹھ گئی...... جیسے اس اعتراف کو ذرا بھی اہمیت نہ دے رہی ہو، گلابو کو یہ اپنے عشق کی سراسر توہین لگی۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں......" وہ گلا پھاڑ کے چلائی تو اس کی جانب پشت کر کے سر کھجاتی باہر نکلتی بھاگاں ششدر ہو کے وہیں جم گئی...... پلٹ کے اسے دیکھا۔

"کون اے شوہدا؟" وہ پھنکاری......

"ہے کوئی...... تمہیں کیا؟"

"لے مینوں نئیں تے اور آنڈی گوانڈی کو ہوئے گا...... نی...... بول...... کس کے نال یاری لگائی اے...... کی گل کھلا کے آئی اے، بلاواں دائی نوں؟"

وہ تشویش سے اس کا پیٹ ٹٹولنے لگی تو گلابو کو جیسے ہزاروں ڈنک لگ گئے۔

"پرے...... پرے کرو اپنے ہاتھ...... کیا کر رہی ہو اماں۔" اسے سخت گھن محسوس ہوئی...... ماں کے ہاتھوں سے بھی اور اس کی سوچ سے بھی۔

"سَئی سَئی (صحیح) بتا کڑیے...... کتنی چیر (دیر) ہوئی اے یہ سیاپا ڈالے...... بوتا ویلا نئیں ہویا تے میں آپے کاڑھا پکا کے پلا دیتی ہوں تجھے...... ورنہ فیر دائی کے ہتھے ہی چڑھے گی۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اماں۔" اس نے کراہیت سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

"کردا کی اے؟...... کوئی کم دھندا؟...... کوئی کاروبار؟ کوئی زمین مکان؟"

"ہونہہ...... کاروبار اور زمین مکان کے بارے میں تو ایسے پوچھ رہی ہو، جیسے زمینوں

جائیدادوں والے تو ہمارے خاندان کے بارے میں کچھ نہیں پوچھیں گے......'' وہ بڑبڑائی پھر بے زاری سے بولی۔

''جیسا بھی ہے، ہم سے تو اچھے حالوں میں ہے۔ عزت کی کماتا ہے اور عزت کی ہی کھلائے گا مجھے بھی۔''

''ہور سانوں؟'' (اور ہمیں؟)...... بھاگاں کے بے دھڑک سوال پہ وہ چونک اٹھی۔

''کیا مطلب؟''

''مطبل ایہہ کہ دینے دلانے جوگا ہے کہ نئیں؟''

گلابو کے تو وہ آگ لگی کہ رواں رواں بھسم ہوا تھا......

جی چاہا بالکل اپنی ماں کے ہی انداز میں ہاتھ اونچے کر کے اپنی ہی پچھلی سات نسلوں کو اس طرح کوسے کہ اندر کی ساری آگ ٹھنڈی پڑ جائے...... لیکن یہ وقت جوش سے کام لے کر معاملہ بگاڑنے کا نہیں تھا۔

اس نے ہوش سے کام لیا اور بمشکل خود پہ قابو پاتے ہوئے کھوکھلے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔

''کیڑے جوگی...... قبراں ماری...... مخول کرتی اے......''

بھاگاں اس بے وقت کی ہنسی سے خجل سی ہو اٹھی۔

''جا اماں...... تُو بھی سچ ہی سمجھ لیتی ہے، میری بکواس کو......''

اس بات پہ بھاگاں نے فوراً ہی یقین کر لیا۔

''دفع......'' وہ پنڈلی پہ سے دھوتی اٹھا کے کوئی چیونٹی ٹٹولتے ہوئے بولی۔

''میں تاں پہلے ہی حیران سی کہ تیری نجراں میں کون جچ گیا...... وڈی نخریلی......''

چیونٹی کو مسل کے پرے پھینکتی وہ چند قدم آگے بڑھی پھر کچھ یاد آنے پہ رکی اور بڑی سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''گل سن چھوری...... مخول اپنی جگہ...... پر اک گل صاف اے...... یہ یاریاں، عاشقیاں اسی غریبوں کو نئیں جچتی۔ نہ ہی چوڑوں چنگڑوں کے گھراں میں سوہنی، ہیر یا صاحباں جمتی (پیدا) ہیں۔ جے تُو نے کسی کو پھنسانا ای اے اپنی اکھاں کے جنگل میں تے فیر سودا کھرا ہونا چاہیدا اے قیدے والا......''

''اماں!'' گلابو چارپائی سے اتر کر آہستہ مگر مضبوط قدموں کے ساتھ چلتی اس کے پاس آئی اور اس کے مقابل کھڑے ہو کر پوچھنے لگی۔

''ایک بات تو بتاؤ؟''

اس نے اپنی نوکیلی آنکھیں ماں کی آنکھوں میں گاڑتے ہوئے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا۔

''ہم چوڑے، چنگڑ، چمار ہی ہیں ناں......؟ یا پھر نئے نئے کنجر بنے ہیں؟''

بھاگاں کا منہ پہلے تو کھلا...... پھر کوئی ایسی گالی جو اس کی گستاخی کا مزہ چکھا پاتی، نہ سوجھنے پہ بند ہوا...... اور وہ تلملاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

گلابو کے ہونٹوں پہ ایک زہر خند مسکراہٹ آئی۔ وہ سکون سے چلتی ہوئی دوبارہ چارپائی پہ آ گئی۔

''اب تمہاری یاد سے بھی بہت چھپ چھپ کر ملنا ہو گا یاسر......''

وہ مٹی پہ کھینچی لکیروں کو ہتھیلی سے مٹانے لگی جو یاسر کا نام ظاہر کر رہی تھیں...... اگرچہ یہاں کوئی حرفوں سے شد بد رکھنے والا نہیں تھا...... اس کے سوا...... پھر بھی اس نے ماں کے عزائم سامنے آنے پہ احتیاط کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

نیندیں شب بھر پاس نہ آئیں
دھڑکن دھڑکن بوجھ نرالا
کر بیٹھے ہیں پیار وے ڈھولا
تم بن درد ہزار وے ڈھولا

اس بار اس کی کوک اس کے ہونٹوں کے بجائے اس کی رگوں میں گنگناتی پھر رہی تھی......

☆======☆======☆

''آ...... آ...... آ......''

حلیمہ صحن میں چوکی پہ بیٹھی گود میں رکھے مٹی کے پیالے میں سے روٹی کے بھیگے نوالے توڑ توڑ کے چڑیوں کو ڈالنے کے ساتھ ساتھ پکارے بھی جا رہی تھی۔

''آ......'' رفتہ رفتہ اس کی آواز مدھم ہوتی چلی گئی...... منہ آدھ کھلا...... پلکیں نیم خوابیدہ...... نظریں کسی غیر مرئی نکتے پہ مرکوز...... یہ اس کا کسی گہرے خیال میں کھو جانے کا مخصوص انداز تھا...... کبھی کبھی تو وہ اچھی بھلی گفتگو درمیان میں چھوڑ کے یہ شغل پورا کیا کرتی تھی...... سامنے والا چاہے چلاتا رہے مگر حلیمہ سننے، کہنے کی صلاحیت منجمد کیے اپنے دھیان میں مگن رہتی۔ کبھی اس کے ادھ کھلے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل جاتی...... کبھی نیم وا آنکھوں میں

آنسو جھلملانے لگتے......اس وقت اس میں اور ٹیپو میں خاص فرق نہ محسوس ہوتا تھا۔ ورنہ سب ہی جانتے تھے کہ اگر ٹیپو آدھا پاگل ہے تو حلیمہ اس آدھے کے آدھے حصے سے بھی کچھ کم... بلکہ پاگل بھی کیا......سر پھری......غبی اور کند ذہن تھی......کوئی ڈھیلے تھوڑا ہی مارتی پھرتی تھی......نہ ہی ٹیپو دیوانے کی طرح گلیوں کی خاک چھانتی پھرتی تھی......بیس سال سے بیاہی تھی......بیس سال......بڑا عرصہ ہوتے ہیں۔

بیاہ کے وقت اس کی عمر ہو گی کوئی پندرہ سولہ برس......اگرچہ بیس سال پہلے تک کے زمانے میں بھی اتنی کم عمری کی شادی کا ایسا خاص رواج نہ رہا تھا مگر حلیمہ کی بات اور تھی۔ اس کے ابا بیرسٹر صاحب اپنے بڑے بھائی کے بڑے چہیتے تھے اور ذہنی اعتبار سے کم تر اولاد کا دکھ انہیں اور قابل رحم بنا رہا تھا، اس لیے چھوٹے بھائی کا بوجھ کم کرنے کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں ہی اپنے انیس سالہ نوجوان اور قابل خوبرو بیٹے صغیر احمد سے حلیمہ کا نکاح پڑھا دیا جو عمر کے پندرہویں سال میں بھی ذرا ذرا ضد کے لیے تین سال کی بچی کی طرح آنگن میں لیٹ کر ایڑیاں رگڑ کے بلکا کرتی تھی......اور جو جنت بیگم کے ہزار منع کرنے پہ بھی لوٹھا کی لوٹھا ہونے کے باوجود باوا اور تایا کے کاندھوں سے جھول جایا کرتی تھی۔ جہاں آرا بیگم نے اس شادی کو روکنے کے لیے بڑے جتن کیے......زہر تک پھانک لینے کی دھمکی دی جسے یہ کہہ کر ہوا میں اُڑا دیا گیا۔

''شوق سے کھائیے زہر......ہم شادی کی تاریخ ایک ہفتہ آگے بڑھا دیں گے......گھر میں فوتگی ہوئی تو جشن منانا اچھا نہیں لگتا......ہم آپ کے احترام میں اکلوتے بیٹے کی شادی سادگی سے کر لیں گے۔''

وہ اندر ہی اندر کلس کے رہ گئیں......صغیر احمد کے ابا تو اپنی من مانی کرنے کے بعد جلد ہی رخصت ہو گئے......حلیمہ کے ابا نے بھی ان کے پیچھے پیچھے راہ لی......بعد میں جہاں آرا بیگم نے حلیمہ کو سدھارنے کی انتھک کوششیں کیں......ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آج حلیمہ بی بی نمو جیسی بیٹی کی ماں تھی......مارا باندھا گھر بار بھی چلا رہی تھی......کھینچ تان کے ہی سہی مگر بیاہتا بال بچے دار عورت ہونے کا نشہ بھی پورا کر لیتی تھی......بس کبھی کبھی پرانی جون میں آ جاتی......خصوصاً ٹیپو کے ساتھ ہوتی تو دونوں ایسی ایسی واہی تباہی حرکتیں کرتے کہ کوئی یقین نہ کر کے دیتا کہ یہ عورت پچھلے بیس سال سے کسی کی بیوی ہے، ایک اٹھارہ سالہ لڑکی کی ماں ہے۔

''حلیمہ!'' جہاں آرا کی آواز صحن میں گونجی......مگر حلیمہ کے ساکت وجود کے گنبد سے

ٹکرا کے رہ گئی......

''ارے او حلیمہ......'' ان کی جان جل کے رہ گئی......وہ اپنے اسی منحوس انداز میں منہ کھولے بیٹھی تھی، جس سے انہیں چڑ تھی......

تیز تیز قدموں سے اس کے پاس جاتے ہوئے وہ زور سے چلائیں۔

''سنتی ہے کہ بہری ہو گئی ہے؟''

اس بار جہاں آرا کی آواز نے اسے جھنجھوڑنے کا کام کیا۔ وہ بری طرح بدک کر کھڑی ہوئی۔ گود میں رکھا، مٹی کا پیالہ نیچے گر کے کرچی کرچی ہو گیا۔ جہاں آرا ماتھے پہ ہاتھ مار کے رہ گئیں۔

''تم سے نہ کبھی کوئی کام سنورا۔''

حلیمہ اس تعریفی سند پہ ہونق پن سے مسکرانے لگی، وہی مسکراہٹ......جس سے انہیں چڑ تھی۔

''کانوں میں تیل ڈالے بیٹھی تھیں کیا؟''

''کانوں میں......؟'' حلیمہ نے پریشانی سے پہلے کانوں میں انگلی کا خلال کیا......پھر سر پہ ہاتھ پھیر کے طمانیت سے مسکرا دی۔

''نہیں تو......سر میں ڈالا تھا......آملے کا۔''

''ہائے......برے نصیب میرے......پتھر سے ماتھا پھوڑنا لکھا ہے میری قسمت میں......اے میں پوچھتی ہوں کب سے آوازیں دیئے جا رہی ہوں، سنائی نہیں دیتا کچھ؟''

''نہیں اماں......سب سنائی دیتا ہے۔ یہ چوں چوں چڑیوں کی چہچہاہٹ۔''

''ہاں چڑیوں کی چوں چوں......مکھیوں کی بھن بھن، کوؤں کی کائیں کائیں......سب سنائی دیتا ہے۔ بس ایک دکھیا ساس کی فریاد نہیں سنائی دیتی۔ اری ہڑ بونگی......دودھ ابل ابل کے کھویا بن گیا ہے یہاں بیٹھی کس شغل میں گم تھی؟''

''ماں، رات کو پوری ڈیڑھ روٹی بچ گئی تھی نا......میں نے مٹی کے پیالے میں بھگو دی تھی۔ وہی ڈال رہی تھی چڑیوں کو......اب وہ کھا کے دعائیں دیں گی۔''

''ہاں بس چرند پرند کی دعائیں سمیٹتی رہنا......بھلے سارا گھر بددعائیں اور کوسنے دے رہا ہو منہ بھر بھر کے۔ جاؤ جا کے باورچی خانے کی خبر لو۔''

حلیمہ منہ لٹکائے پلٹ گئی......جہاں آرا نے زمین پہ ٹوٹے پیالے کی کرچیاں اور روٹی کے ٹکڑے دیکھے اور سرد آہ بھر کے کہا۔

''کوئی کل سیدھی نہیں ہے اس غبی عورت کی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ اپنی ان سکھی سہیلیوں کی تواضع کرنا ہو تو چھت پہ روٹی ڈالا کر۔ مگر یہ جب پھیلائے گی آنگن میں گند پھیلائے گی۔ چڑیاں آئیں نہ آئیں...... کیڑے مکوڑے پل میں یلغار بول دیں گے۔''

وہ جھاڑو سے سب ایک طرف لگاتے ہوئے بڑبڑاتی رہی۔

''انسان کسی چوپائے کو کسی ڈھور ڈنگر کو بھی اتنے سال سکھائے تو وہ سیکھ جائے مگر ہماری بہو صاحبہ......''

پھر کسی خیال کے تحت نرمین کو پکارنے لگیں۔

''سنمو...... نمو بیٹی۔''

کالج یونیفارم میں ملبوس وہ پلک جھپکتے میں سامنے تھی۔

''تمہارا وہ نکما ماموں تو آج پھر غائب ہے، کالج کس کے ساتھ جاؤ گی؟ اپنے بابا کے؟''

''نہیں، ابا کو بہت لمبا چکر پڑتا ہے پھر اپنے سٹور پہ جانے کے لیے۔''

''ہاں یہ تو ہے مگر اس غریب کا احساس کسے ہے۔ کولہو کا بیل بنا ہوا ہے میرا اکلوتا لختِ جگر...... بیوہ ماں، جوان بیٹی اور پھوہڑ بیوی کے ساتھ ساتھ اس کا خبطی میکہ بھی سنبھالے بیٹھا ہے مگر ذرا جو کسی کو احساس ہو۔ نہ تمہاری نانی کے پان کا چسکہ پورا پڑتا ہے نہ تمہارے ماموں کے سگریٹوں کی لت ختم ہوتی ہے۔ ارے اور کچھ نہیں تو تلوا ہی ٹکا لے گھر میں...... کم از کم میرے صغیر احمد کو گھر کے کاموں اور ذمہ داریوں سے تو نجات ملے مگر نہیں۔ بغیر بتائے کئی کئی روز گھر سے غائب رہتا ہے۔''

''دادی جان...... آپ کو پتا تو ہے۔ ماموں......'' وہ دبے انداز میں کہنے جا رہی تھی مگر جہاں آرا نے تنفر سے ہاتھ جھٹکا۔

''ارے رہنے دو...... ساری عقل ہے یونہی دیوانہ بنا گھومتا پھرتا ہے کہ کہیں کام دام نہ کرنا پڑے۔ اے میاں! نہ کرو...... مفت کی مل تو رہی ہے...... وہ بھی چپڑی...... مگر بہنوئی کی اتنی مدد تو کر دو کہ وقت بے وقت گھر پہ موجود رہو۔ اب بولو بھلا کس کے ساتھ جاؤ گی تم کالج۔ اکیلی تو میں نہیں جانے دوں گی۔''

''چھنو آتی ہو گی۔''

''اس کے ساتھ تو ہرگز نہیں۔ ایک نمبر کی حرافہ ہے گھنی۔''

''چھٹی نہیں کر سکتی دادی جان...... ٹیسٹ ہے میرا۔''

''مجھے یہ لونڈیا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ تم نے ابھی پاؤں جمانا نہیں سیکھا تھا اور یہ محلے بھر میں کدکڑے لگاتی پھرتی تھی۔ چھتیں پھلانگتی پکڑی جاتی تھی۔ بھلا کوئی جوڑ ہے تمہاری اس کی دوستی کا۔ آٹھ، دس سال بڑی ہے تم سے۔ نگوڑی پتا نہیں کالج میں کیا کر رہی ہے۔ اب تک۔''

''اچھی دادی جان۔'' نمو نے منت کی۔

''بس آج...... مجبوری ہے نا۔''

''اچھا ٹھیک ہے، مگر راستے میں اس کے ساتھ ہنسی ٹھٹھول مت کرتی جانا، وہ تو ہے ہی بدذات...... چھچھوری...... سر جھکا کے جانا، سر جھکا کے آنا۔''

''جی۔'' اس نے سعادت سے سر ہلا دیا...... وہ اس ہدایت پہ عمل کرنے کا جتنا بھی پکا ارادہ کرتی۔ چھنو کے ہوتے اس ارادے کا قائم رہنا ذرا مشکوک تھا۔ وہ بے چینی سے دادی کو جھاڑو سے پیالے کی کرچیاں کیاری کے ساتھ لگاتے دیکھتی رہی۔

''رہنے دیں نا دادی جان...... شکورن آ کے کر لے گی۔''

''وہ کب آتی ہے بارہ بجے سے پہلے...... نگوڑی کے پچھلے سکھ تھے شاید...... ایک ہی شبھ مہورت رکھا ہے اس نے کام کے آغاز کا۔''

نمو کھڑی انگلیاں مسلتی رہی...... اللہ اللہ کر کے جہاں آرا فارغ ہوئیں اور اندر سدھاریں تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

''شکر ہے ان کے سامنے چھنو نہیں آئی۔''

اس نے ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ ساتھ ہی آنگن کے اس کونے والے لوہے کے دروازے پہ لگا کنڈا کھڑکا...... اس نے لپک کر دروازہ کھولا اور حسبِ عادت چھنو قہقہہ لگاتے ہوئے اندر آئی۔

''اتنی دیر؟''

''پہلے دو پیریڈ تو فری ہیں نا...... فکر کا ہے کی۔''

''تمہارے ہوں گے...... میرے تو نہیں۔''

نمو نے تنقیدی نظر اس پہ ڈالی...... وہی سفید یونیفارم مگر قمیص پسلیوں اور کمر سے چپکی پڑی تھی...... آدھی آستینوں سے سانولے بازو سڈول پن ظاہر کر رہے تھے۔ کاندھوں تک آتے چھلکا سے بال اگرچہ بڑے سے کلپ میں مقید تھے مگر کئی لٹیں چہرے پہ جان بوجھ کے آوارہ چھوڑی گئی تھیں۔ میرون لپ لائنر کے اندر چمکتی نیچرل کلر کی لپ اسٹک...... یہ اس کا ہونٹوں کو سجانے کا خاص انداز تھا جس سے جنت بیگم کو خاص چڑ تھی۔

"موا کیا نقشہ بنا رکھتی ہے ہونٹوں کا...... دو رنگ کا...... جیسے ہونٹوں کے کنارے پک کے کالے پڑ گئے ہوں۔"

کانوں میں جھولتے آویزے...... لمبے لمبے رنگین ناخن...... ٹخنے دکھاتی اونچی شلوار...... لمبے چاک...... نمو نے گھبرا کے اس کا بازو کھینچا۔

"چلو...... دیر ہو رہی ہے۔"

"ارے...... سلام تو کرنے دو۔"

"چھوٹی نانو نہیں ہیں، جن کو سلام کرنے کا تمہیں شوق ہے۔" اس نے کھینچ کر اسے دروازے تک لے جانا چاہا لیکن کہاں دھان پان سی نمو...... کہاں پانچ فٹ چھ انچ قد کے ساتھ ساٹھ کلو وزن والی چھنو۔

"ہاں یہ تو ہے...... پورے گھر میں ایک تمہاری سوتیلی نانی کام کی عورت ہے...... ہائے بڑی زبردست خوشبو آ رہی ہے۔"

وہ ناک اٹھا کے سونگھنے لگی۔

"پراٹھے بن رہے ہیں؟"

"ہاں اور دادی جان بنا رہی ہیں۔"

"چلو...... چھٹی...... وہ تو ایک نوالہ تک نہ دیں۔ بھئی بڑی مشکل قسم کی دادی ہے تمہاری...... دو نانیاں ایک طرف اور اکیلی دادی ایک طرف۔"

"چلو بھی...... تم نے پھر لپ اسٹک لگائی ہے دادی جان نے دیکھ لی تو...... شامت میری آ جائے گی۔"

"واہ...... ہونٹ میرے...... لپ اسٹک میری۔ شامت تمہاری کیسے آئے گی...... سنو...... وہ کہاں ہیں؟"

اس نے دروازے کی جانب رخ موڑا تو نمو کی جان میں جان آئی۔

"وہ کون؟"

"وہی...... تمہارے ہینڈسم ماموں!" چھنو نے قہقہہ لگایا۔

"پتہ نہیں...... کب سے نہیں آئے۔"

"وہ ہوں تو ذرا شغل رہتا ہے...... نہیں؟"

وہ مزے لے لے کر کہہ رہی تھی۔

☆======☆======☆

جنت بیگم باورچی خانے کے فرش پہ بڑا سا پیڑھا رکھے براجمان تھیں۔ سامنے تھال میں کٹے ہوئے پیاز، کترے ہوئے دھنیے، چھلے ہوئے لہسن ادرک کا ڈھیر لگا تھا...... اور وہ مسلسل بڑبڑاتے ہوئے خورشید کو کوس رہی تھیں۔ جو کئی گھنٹوں سے لاپتہ تھی۔ خود بیوگی کے بعد ان کا باہر نکلنا نہ نکلنے کے برابر تھا۔ خورشید البتہ بھاگ دوڑ کر لیتی تھی۔ ابھی بھی نیاز کا سامان لینے اسی کو بھیجا تھا اور وہ بھی اس قدر تاکیدوں کے ساتھ۔

"یاد رکھو...... بھول نہ جائیو کچھ......"

"ہاں ہاں ہاں...... فکر نہ کرو۔"

"گوشت ران کا تلوا کے لانا...... بیرسٹر صاحب کو بس ران کا گوشت ہی پسند تھا اور خربوزے چھانٹ کے لانا...... پھیکے نہ ہوں۔"

اور اس اہتمام کی بھنک جہاں آرا کے کان میں پڑی تو پاس سے گزرتے گزرتے دل جلا سا تبصرہ کرنے سے باز نہ آئیں۔

"ہونہہ...... مالِ مفت...... دلِ بے رحم۔"

جنت بیگم تو آج کے دن کے لحاظ میں چپ کر گئیں مگر خورشید اور لحاظ...... کہاں...... پھٹ پڑیں۔

"اے بھابھی...... اپنا اردو کا قاعدہ سنبھال کے رکھو کون سا مال، کیسا مال؟ تمہارے پلے سے نہیں آ رہا کچھ بھی۔"

"اچھا تو تمہاری کیا پنشن آتی ہے۔ مجھے کیا پتا نہیں کہ یہ رقمیں کہاں سے کھینچی گئی ہیں۔"

"ہاں تو کیا ہو گیا۔ چاچا باپ برابر ہوتا ہے۔ بھائی آج چاچے کے لیے ثواب کمائے گا تو کل باپ کی قبر پہ پڑھی فاتحہ قبول ہو گی۔"

"توبہ...... تمہارے مقابلے پہ کون آئے......" جہاں آرا نے جنت بیگم کو خورشید کی پیٹھ تھپکتے دیکھا تو وہاں سے کھسکنے لگیں۔ کیونکہ حوصلہ فزائی کے بعد ہی تو خورشید کے اصل جوہر سامنے آتے تھے لیکن جاتے جاتے تیلی جلا کے بھس میں پھینکنے سے نہ چوکیں۔

"پھونکو...... پھونکو میرے بچے کی کمائیاں...... اسی کا تو فرض ہے چچا کی برسی پہ ثواب کمانے کا...... اور وہ جو سگی اولاد ہے نہ جانے کہاں دھت پڑا ہو گا۔"

اس طعنے کا جواب ان دونوں کے پاس نہیں تھا، اس لیے چپکی رہیں ان کے نکلتے ہی خورشید نے تشویش سے کہا۔

"ٹیپو کو زیادہ دن نہیں ہو گئے؟"

"کون سی نئی بات ہے......" جنت بیگم نے لاپروائی ظاہر کرنا چاہی حالانکہ دن وہ تڑپ کے گزارتی تھیں۔

"ایسی کڑاکے کی گرمی ہے جانے کدھر خوار ہوتا پھر رہا ہوگا۔" خورشید ان کے برعکس اظہار کے معاملے میں بڑی کھلی ڈلی تھیں۔

"اے ہاں...... گرمی بہت ہے...... جائیو...... جلدی کرلو...... دھوپ زیادہ کھل گئی پھل گلا سڑا ملے گا۔"

"تجھے پھل فروٹ کی پڑی ہے آپاں...... بیٹے کی پرواہ نہیں، کیسی ماں ہے؟" خورشید بگڑ گئیں۔

"جیسی بھی ہوں...... ماں تو ہوں...... مجھے اچھی طرح پتا ہے اولاد کی پرواہ کیسے کرتے ہیں، مجھے زیادہ سبق نہ پڑھائیو...... ہاں نہیں تو۔"

"لے...... میں نے کیا کہا ہے آپاں...... کاٹنے کو دوڑ رہی ہو۔"

"پھر آپاں...... کتنی بار کہا ہے، یہ مگرمچھ سا منہ کھول کے مجھے آپاں مت پکاریو...... گر باز نہیں آتیں۔"

"رشتے میں بڑی ہو، اس لیے آپاں کہتی ہوں ورنہ عزت کروانے والے گن تو نہیں ہیں تم میں۔"

"بڑی آئی گنوں والی...... رشتے میں بڑی ہونے کی خوب کہی تم نے...... میں برس کی تھی، جب بیاہ کے......"

"چودہ سال...... چودہ سال......" خورشید نے ہاتھ لہرائے۔

"کان پک گئے ہیں سن سن کر...... ہر وقت یہی رونا...... چودہ سال کی تھی جب کے آئی...... آئی ہوگی...... میری جوتی سے...... مگر اب اس بات کو بھی تو چوالیس سال گزر ہیں۔ ساٹھ کے قریب تو آگئی ہو۔"

"ابھی کہاں...... اور میری تو شادی کو چوالیس سال ہوئے ہیں تم تو پچیس برس کی جب بیاہ کے آئیں تب بھی پچاس کے قریب تھیں پتا نہیں بیرسٹر صاحب کو بھی کیا سوجھی بڑھاپا خوار کرنے کی۔ سوت لانا ہی تھی تو میری ٹکر کی لاتے...... نہ جانے کس کوہ قاف جنات کی نورچشمی کو اٹھا لائے۔"

"آئے ہائے...... کچھ تو دیکھا ہوگا جو ملتان سے بیاہ کر لائے۔ ایسی ہی تم حور

ہوتیں، چودہ سال کی کچی کلی...... تو خصم صبر شکر کر کے بیٹھتا۔ ملتان تک دوسری جورو ڈھونڈنے نہ نکلتا۔"

"یہی تو رونا ہے......" جنت بیگم چھکوں پھکوں رونے لگیں۔

"نہ وہ اس شہر جاتے...... نہ تمہارے جیسی کالک ماتھے پہ ملتے...... سوت نہیں میرے سہاگ کی قضا آئی تھی اس گھر میں۔ ادھر تمہارا قدم پڑا، اُدھر بیرسٹر صاحب کو بیماریوں نے گھیرا...... تمہارے قدم جمتے گئے۔ بیرسٹر صاحب کی سانسیں اکھڑتی گئیں۔"

"چلو...... یہ کارنامہ بھی میرے سر...... اچھا ٹھیک ہے...... میں نے ہی مارا بیرسٹر صاحب کو...... پھر تو تجھے میرا احسان مند ہونا چاہیے آپاں...... چودہ سال کی عمر سے ٹھڈے کھا رہی تھی ان کے۔ نہ میں آتی...... نہ وہ اوپر جاتے...... اور تُو اب تک پٹ رہی ہوتی......"

"پٹیں میرے دشمن...... بیرسٹر صاحب نے مجھے کبھی پھول کی چھڑی سے بھی نہ چھوا تھا۔"

اور فریج کھول کر کھٹر پٹر چیزیں ادھر اُدھر کرتی جہاں آرا کے ہونٹوں پہ کمینی سی مسکراہٹ آگئی۔

"چلو...... ہو چکی نیاز...... ولا دیا ختم انہوں نے...... لڑنے سے فرصت ملے تو......"

مگر ابھی وہ یہاں تک ہی سوچ پائی تھیں کہ اس جانب سے خورشید کی آواز ابھری۔

"ہاں ہاں، پھول کی چھڑی سے کیوں چھوتے۔ بید کی رکھی ہوئی تھی، کڑوے تیل سے بھگو کے۔" جنت بیگم کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"بہت ہی کمینی ہے تُو خورشید۔"

اور پھر دونوں کی ہنسی کے سُر ملتے سن کر جہاں آرا پھر سے جل بھن گئیں۔

"توبہ...... ابھی لڑائی...... ابھی ہنسی ٹھٹھول...... نری نوٹنکی......" اور زور سے فریج کا دروازہ بند کیا تھا۔

اندر باورچی خانے تک آواز آئی تھی ان دونوں کو...... کلیجوں میں برف سی اتر آئی تھی...... تب کتنی مسرور ہو کر نکلی تھی خورشید...... اور تب سے لے کر اب تک جنت بیگم کتنے ہی کام نمٹا چکی تھیں مگر خورشید تھی کہ آنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔

☆======☆======☆

"وے ٹیپو!"

ہانپتے کانپتے بالآخر خورشید نے اسے جا ہی لیا...... ہاتھ سیدھا اس کی قمیص کے دامن پہ

جا پڑا تھا...... وہیں سے پکڑ کے زور سے کھینچا...... دور تک قمیص ادھڑتی گئی...... ٹیپو اسی کی وجہ سے ٹھنک کے رکا اور اپنی قمیص کو مڑ کے دیکھنے لگا تو خورشید نے اس کی گردن دبوچ لی ورنہ بھاگتا تو اس کے ہاتھ میں تو قمیص کی ایک دھجی ہی باقی رہ گئی تھی۔

''وے...... کدھر دفع ہو گیا تھا تُو مر جانے۔''

اس نے ایک زور کی دھپ اس کی گدی پہ رسید کی۔

''کیا ہے؟ تمیز سے رہو۔'' ٹیپو نے بدتمیزی سے للکارا۔

''اچھا...... میں تمیز سے رہوں...... بے ہدایت...... ماں سے ایسے بات کرتے ہیں۔''

''ایک تو مائیں تھوک کے بھاؤ ملی ہیں مجھے...... چھوٹی ماں...... بڑی ماں...... درمیانی ماں۔''

''گھر چل تو ذرا...... تجھے پھینٹی لگاتی ہوں میں۔''

''میں نہیں جاتا گھر ور......'' وہ خود کو چھڑانے لگا۔

''تیرا تو باپ بھی جائے گا......'' اس نے گرفت مضبوط کی۔

''ہاں تو لے جاؤ باپ کو...... اور دونوں سہیلیاں مزے کرو مزے۔''

''ہا...... ہائے ذرا حیا نہیں تجھے...... ماں تو ماں، مرے باپ کا بھی لحاظ نہیں۔'' وہ ایک تھپڑ لگاتے لگاتے رہ گئی۔ پھر مصلحتاً لہجے کو نرم کر کے پچکارا۔

''ٹیپو...... میرے بچے...... گھر چل...... تیرے ابے کی برسی ہے آج۔''

''اونہوں......'' ٹیپو نے بیزاری سے ناک سکوڑی۔

''ایک تو برسیاں جی بھر کے ہوتی ہیں اس گھر میں...... کبھی میرے ابا کی، کبھی اس کے ابا، کی کبھی اس کے ابا کی...... بس ہیپی برتھ ڈے کبھی نہیں ہوتی۔''

''ماں صدقے...... میں کرتی ہوں تیری ہیپی برتھ ڈے...... تُو گھر تو چل......'' اسے بازو سے پکڑ کے کھینچتے کھینچتے وہ واقعی ہلکان ہو رہی تھی...... دوسرے ہاتھ میں پھل، گوشت وغیرہ سے بھری ٹوکری بھی تھی۔

''میں نہیں جاتا...... تم مارو گی۔''

وہ قربانی کے بکرے کی طرح خود کو پیچھے پیچھے گھسیٹتا رہا تھا۔

''نہیں مارتی...... تُو چل تو سہی۔''

''تم باہر نکلیں کیوں؟'' وہ زچ ہوا تھا۔

''بتایا تو ہے تیرے ابے کی برسی ہے۔'' وہ رکشے والے کو ہاتھ دے کر روک رہی تھی۔

''سودا لینے نکلی ہوں۔ پلاؤ بنے گا، زردہ...... آلو گوشت، کوفتے۔''

''مزے...... بڑے دنوں سے کوفتے نہیں کھائے۔''

''ماں صدقے...... میں کھلاؤں گی۔''

اس نے ٹیپو کے لمبے تڑنگے وجود کو باقاعدہ دھکا دے کر رکشے کے اندر گھسیڑا۔

☆======☆======☆

جہاں آرا تنگ آ کے باورچی خانے میں داخل ہوئیں، ورنہ کبھی بھولے بھٹکے سمدھنوں میں سے کوئی وہاں ہوتا تو قدم تک نہ دھرتیں مگر اب یہ وقت ہونے کو آیا تھا اور کچھ پکنے کا نام نہ تھا۔ اندر جنت بیگم چوکی پہ بیٹھی سل پہ چٹنی پیس رہی تھیں۔

''لگتا ہے خورشید سے کچھ زیادہ ہی مایوس ہو گئی ہو۔ چٹنی پہ ختم دلانے کا ارادہ ہے۔''

''چٹنی پہ ختم دلاؤں گی میں اپنی سوتن کی میا کا میں تو تیاریاں کر کے رکھ رہی تھی...... کوفتوں کا مسالا...... پلاؤ کا بگھار۔''

''بگھار بگھار ہی رہ جائے گا...... مجھے تو لگتا ہے خورشید بی بی کو مل گئی ہو گی کوئی سہیلی...... پیسے اُڑا کے ہی آئے گی۔ میری مانو تو کوفتوں کے اس مسالے میں یہ آلو بڑیاں ڈال دو۔''

''غضب خدا کا...... بیرسٹر صاحب کی برسی پہ میں آلو بڑیوں کا سالن بناؤں گی؟ مرحوم نے ایسی کون سی برائی کی تھی میرے ساتھ، علاوہ خورشید کو سوتن بنا کے لانے کے، پتا بھی ہے کہ انہیں آلوؤں سے کتنی خار تھی۔''

''تو پھر ہٹو چولہے کے آگے سے مجھے تو پکانے دو...... نمو کالج سے بھوکی پیاسی آتی ہو گی۔ صغیر احمد کی دکان پہ بھی کھانا بھیجنا ہے۔ تمہارے کوفتوں اور پلاؤ کے انتظار میں سارا گھر بھوکا نہیں بیٹھا رہ سکتا۔ اٹھو یہاں سے۔''

جہاں آرا کے انداز میں ایک محسوس کیا جانے والا تحکم اور احساسِ ملکیت تھا جو یقیناً انہیں صغیر احمد کی ماں ہونے کے زور نے عطا کیا تھا۔

''اوئی میا...... کاہے ہٹوں میں؟ جہیز میں لائی تھی یہ چوکی اور باورچی خانہ؟ قبضہ ہی جما بیٹھی ہو بھابھی...... مت بھولو کہ یہ گھر تمہارا اکیلی کا نہیں...... بیرسٹر صاحب کا اور ان کی اولاد کا بھی برابر کا حق ہے۔ ہائے ہم تو بیٹی دے کر ہلکے ہو گئے...... تنکے سے بھی ہلکے۔'' وہ بلکنے لگیں اور جہاں آرا کی بے زاری سوا ہو گئی۔

''لو...... شروع ہو گئے ڈرامے۔''

"چل آجا...... چل بھی۔" خورشید کی لٹھ مار آواز نے دونوں کو چونکایا۔

"لو آ گئی...... ساتھ پتا نہیں کسے اٹھا لائی ہے۔" جہاں آرا کے بڑبڑانے پہ جنت بیگم نے بھی ساری ناراضی اس پہ انڈیلنا چاہی جو باورچی خانے کے دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

"گھوم آئیں سارا شہر شتابہ؟ ایک تمہاری وجہ سے مجھے لوگوں کی ٹکے ٹکے کی باتیں سننی پڑیں۔"

"لوگوں سے نپٹنا مجھے آتا ہے آپاں......! پہلے تُو اسے سنبھال۔"

اس نے ٹیپو کو پکڑ کے اندر دھکیلا...... وہ لڑکھڑاتا ہوا جنت بیگم کے پیروں کے پاس آ گرا اور انہوں نے ایسا پکڑا کہ صبح تک چھوڑنے کا نام نہ لیا۔

"نامراد...... نگوڑا...... سو کیڑوں بھرا کباب...... نہ نگلا جائے نہ پھینکا جائے۔"

وہ چپل اس کی چرخ کمر پہ مارتی جاتی اور بھڑاس نکالتی جاتی تھیں اور وہ تھا کہ ڈھیٹ بنا میلی پنڈلیاں کھجاتا جا رہا تھا۔

"آئے ہائے آپاں......" خورشید بھاگتی ہوئی آئی اور ان کے ہاتھ سے چپل لے کر پرے پھینکی۔ "مت ماری گئی ہے کیا؟"

چپل ہاتھوں سے گئی تو جنت بیگم نے خالی ہاتھوں سے ہی اسے پیٹنا اور کوسنا شروع کر دیا۔

"مت ہی تو مار کے رکھ دی ہے اس اولاد نے۔ کوئی سکھ نہیں۔ نہ بیٹی کا نہ بیٹے کا۔"

"کیسی ناشکری کی باتیں کر رہی ہے آپاں......! اس سے پوچھ جس کی اولاد نہیں۔"

اب کے خورشید نے ہاتھ پکڑ لیے سارے ہتھیار ضبط ہوتے دیکھ کر جنت بیگم ہار کے بیٹھ گئیں۔

"ہاں...... ہاں...... اس سے پوچھو بے چاری سے۔"

ٹیپو نے تمسخر بھرے انداز میں خورشید کی جانب اشارہ کیا۔

"دیکھا...... دیکھا...... کیسا بے فیض ہے یہ کبھی چار دن میرے ہاتھ رہے، تو دیکھو کیسے تیر کی طرح سیدھا کرتی ہوں میں۔"

وہ پھر سے بے قابو ہو کر اسے دو ہتڑوں سے نوازنے لگیں۔

"واہ...... مزے۔" ٹیپو منہ اونچا کر کے چٹخارے بھرنے لگا۔

"ابا کی برسی کا کھانا کھا رہا ہوں۔ پلاؤ...... کوفتے...... زردہ...... آہا مزے۔"

"دیکھا اس ڈھیٹ کو۔" اب کے جنت بیگم نے پکی پکی ہار مان لی اور سست قدموں سے

ایک جانب سرک گئیں۔

"ذرا جو اثر ہو بے غیرت کو۔"

خورشید اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو سے ٹیپو کا پسینہ خشک کرنے لگی۔

"ذرا تو ہتھ ہولا رکھ کے مارا کر آپاں...... ویسے بھی مارتے وقت ویلا دیکھ لیا کر...... ڈیگر کے بعد مارنا اچھا نہیں ہوتا...... دونوں ویلے مل رہے ہوتے ہیں۔"

"سن لو اماں...... مارنے کا وقت مقرر کر لو...... وہ کیا کہتے ہیں ڈراموں میں...... شبھ مہورت...... ارے ہاں اماں...... گُم گُم کا کیا بنا؟"

"اچار۔" جنت پھاڑ کھانے کو دوڑیں۔

"آہا...... اچار...... وہ بھی گُم گُم کا اچار...... کیا مزے ہوں گے۔"

"ایسے چٹخارے لینے کا پتا ہے اسے۔ ویسے باؤلا بنا پھرتا ہے۔"

"بس اماں!" وہ غصے میں بپھر کے اٹھا۔

"جب دیکھو...... رشیدے کا تندور سمجھ کے مجھے روٹیاں لگاتی رہتی ہو۔ اسی لیے نہیں آتا میں یہاں۔"

"بتاتا کیوں نہیں۔ کہاں دفعان رہتا ہے۔"

"جہاں بھی ہوتا ہوں، مزے کرتا ہوں مزے۔"

"صدیقہ بتا رہی تھی تُو مرید کے کے پاس کسی پنڈ گیا ہوا تھا۔" خورشید کی سی آئی ڈی بڑی تیز تھی۔

"اس کے بیٹے نے تجھے دیکھا تھا کسی میلے ٹھیلے میں۔"

"ہاں گیا تھا میلہ دیکھنے۔"

"جانے کیا شوق ہے اسے میلے ٹھیلے دیکھنے کا...... بچپن سے لت پڑ گئی تھی میلوں والوں کے ساتھ گاؤں گاؤں پھرنے...... قصبہ قصبہ گھومنے کی...... میں کہے دیتی ہوں تُو خود کسی میلے نوٹنکی میں کام کیوں نہیں کر لیتا، چار پیسے ہی ہاتھ آئیں گے۔"

"بس خورشید، زیادہ شہ نہ دیجیو اسے...... ہاں......"

"اور میں بھی کہہ رہا ہوں مجھے دوبارہ نہ مارنا...... اب کے گیا تو لوٹ کے نہ آؤں گا۔"

"ہاں وہاں میا بیٹھی ہے نا تیری۔"

"تمہیں کیا پتہ اماں...... کون کون بیٹھا ہے تمہارے بیٹے کی راہوں میں پلکیں

بچھائے۔" وہ مسکرایا۔

"لو...... باتیں......سنو ذرا اس مسٹنڈے کی......کوئی مانے گا یہ باؤلا ہے۔"

"بتاؤ......کون ہے؟" خورشید کے اندر اشتیاق جاگا۔

"بڑی بڑی حوریں فدا ہیں میرے پہ۔"

وہ باچھوں سے بہتی رال کلائی سے رگڑ کے صاف کرتے ہوئے شیخی مار رہا تھا۔

"اے میں بھی تو دیکھوں کون سی دیدہ ہوائی حوریں ہیں جو گھاس چر گئی ہیں۔" جنت بیگم کلس کے رہ گئیں۔

☆======☆======☆

اوکھائی کے پان بنارس والا
کھل جائے بند عقل کا تالا
پھر تو ایسا کرے کمال
سیدھی کر دے سب کی چال

وہ بے سُری بے ہنگم آواز میں گنگناتا اضطرابی کیفیت میں ٹانگیں ہلاتا۔ چت پڑا تھا۔ اوپر ستاروں بھرا آسمان اس کے چونچال پن کو بڑھا رہا تھا۔ پھر اس کی نظر برآمدے سے نیچے آنگن میں اتری حلیمہ پر پڑی، جس کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

"آپا......اوں......مزے......"

اور گردن اونچی کر کے پلیٹ میں جھانکا۔

"ملائی والا زردہ۔ خالی زردے کا ذرا مزہ نہیں آتا تھا۔"

"مجھے پتہ ہے تجھے پسند ہے اس لیے اماں سے چھپ کر نکال لیا تھا کیسا؟"

حلیمہ نے داد لینے کے انداز میں ہتھیلی آگے کی، جس پہ ٹیپو نے پُر جوش انداز میں ہا مارا۔ پھر تکیے کے نیچے سے کچھ نکالا۔

"میں بھی لایا ہوں تمہارے لیے کچھ۔"

"ہائے......میٹھی گولیاں......کھٹی اصلی......" وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"ایمان سے آپا۔ تمہارے لیے آتا ہوں اس منحوس گھر میں ورنہ ایک ایک سے خا مجھے۔ بس تم سے جمتی ہے۔"

"میرا دل بھی تیرے سوا اور کس سے لگتا ہے بھلا؟" وہ املی چوستے ہوئے دل میں سے دبا کے رکھی باتیں کھولنے لگی۔ "یہاں کوئی میری بات سمجھتا ہی نہیں۔"

"دفع کرو۔ سب کو......اُلو ہیں سارے کے سارے کم عقل۔"

اور دھڑ دھڑ ہاتھوں سے کھانے لگا۔ حلیمہ چند سیکنڈ اسے پیار سے دیکھتی رہی پھر پوچھنے لگی۔

"تُو جاتا کیوں ہے؟ نہ جایا کرا تنے روز کے لیے۔"

"کیوں نہ جاؤں؟ یہاں کیا رکھا ہے؟" اس نے کھا کر پلیٹ نیچے پھینکی۔

"آرام سے......" وہ ڈر گئی۔ "اماں جاگ جائیں گی......اچھا سن! اس بار کہاں گئے تھے؟"

"ہے ایک جگہ...... بڑی دور......نہیں اتنی دور بھی نہیں۔ بس پہ جاؤ تو دو گھنٹے لگتے ہیں۔ وہاں گیا تھا میلے میں۔"

"مزا آیا ہوگا۔ وہاں وہ تھا؟ جوکر؟"

"وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے آپا......وہاں اور بڑا کچھ تھا......ناچ گانا۔"

"ناچ گانا؟ فلموں والا؟"

"اور کیا؟ ڈرامے والی عورتیں ساری کی ساری بالکل اسٹار پلس کے ڈراموں جیسی۔"

"اچھا؟" حلیمہ کا اشتیاق بڑھا۔

"ہاں......ویسی کی ویسی لمبی پتلی......ویسی ہی کالی۔ اونچے اونچے جُوڑے بنائے۔"

حلیمہ خوش ہو کر ہنسنے لگی پھر باقی کی گولیاں دوپٹے کے پلو سے باندھنے لگی۔

"یہ میں نمو کے لیے رکھ دیتی ہوں، اسے بھی پسند ہیں۔"

"ہے کہاں نمو......نظر نہیں آئی؟"

"ناراض ہے تجھ سے۔"

"وہ بھی......؟"

"تُو نہیں ہوتا تو اسے کالج آنے جانے میں مشکل ہوتی ہے اس کے ابا فارغ نہیں ہوتے، اماں اکیلے نہیں جانے دیتیں۔"

"تو نہ جائے......کیا رکھا ہے کالج میں خرانٹ استانیوں کے علاوہ......خیر منا لوں گا میں......چوڑیاں لایا ہوں اس کے لیے۔"

"سچی......مگر تجھے کیا پتہ لڑکیوں کی پسند کا......نہ جانے کیسی چوڑیاں اٹھا لایا ہوگا۔"

"میں نے کب خریدیں؟ اسی نے پسند کی تھیں۔"

"کس نے......؟" حلیمہ مزید ہونق ہوئی۔

"ہے ایک......لڑکی......" وہ شرمایا......ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔

"ڈرامے والی؟ ناچ گانا کرتی ہے؟"

"نہیں آپا......وہاں ملی تھی......وہیں رہتی تھی......ہائے......بڑی پیاری تھی آپا۔"

وہ لہک لہک کے اسے اپنی اور گلابو کی ملاقات کی روداد سنانے لگا۔ حلیمہ ایسی مگن ہوئی کہ نہ صغیر احمد کے سکوٹر کا مریل سا ہارن سنائی دیا نہ دروازہ کھلنے کی آہٹ پہ سر اٹھا کے دیکھا۔

صغیر احمد نے دیوار کے ساتھ سکوٹر لگاتے ہوئے ایک نظر سامنے دیکھا......دونوں چارپائی پہ آلتی پالتی مارے بیٹھے ایک دوسرے کے ہاتھوں پہ ہاتھ مارتے قہقہے لگا رہے تھے۔ پھر حلیمہ کی نظر اس پہ پڑی......اس کی ہنسی وہیں تھم گئی۔ چند لمحے غائب دماغی کی کیفیت میں اسے تکتے رہنے کے بعد ہڑبڑا کے اٹھی۔

"السلام علیکم جی۔"

صغیر احمد منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے جواب دیتے ہوئے پاس سے گزرنے لگا۔ حلیمہ نے ٹیپو کو کہنی ماری......بادل نخواستہ وہ بھی کہہ اٹھا۔

"سلاں ماں لیکم بھائی میاں۔"

صغیر احمد سست قدموں سے برآمدے کی جانب بڑھ گیا اور دونوں پھر سے کھسر پھسر کرنے لگے۔ اپنے کمرے کے دروازے پہ رک کر اس نے مڑ کے حلیمہ پہ ایک گہری نظر ڈالی اور ایک بے بس سی سانس بھر کے اندر آ گیا......الماری کھولی......بے ترتیبی سے ٹھونسے گئے کپڑوں میں سے ایک قمیص شلوار نکالی جو سلوٹوں سے پُر تھی۔ بھنا کے اسے بیڈ پہ پھینکا۔ وال کلاک پہ ٹائم دیکھا رات کے سوا گیارہ ہو رہے تھے۔ وہ سائیڈ ٹیبل سے جگ اٹھا کے گلاس میں پانی انڈیلنے لگا مگر پہلا گھونٹ بھرنے سے پہلے ہی رک گیا......پانی کی سطح پہ ایک مچھر پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ گلاس پٹخ کے اٹھا۔

حلیمہ اور ٹیپو ابھی تک باتیں بگھار رہے تھے۔

"ایمان سے؟ کھا میرے سر کی قسم؟"

"ذلیل......کمینہ......" وہ اسے دھمو کے جڑنے لگی۔

"حلیمہ!" صغیر احمد نے برآمدے کی پہلی سیڑھی پہ کھڑے ہو کر سرد لہجے میں پکارا۔ مڑ کے دیکھتے ہی سہم سی گئی۔

"شب بخیر آپا......" ٹیپو نے منہ تک چادر تان لی۔ وہ ٹپٹا کے دائیں پیر کی چپل سے بایاں پیر پھنسانے لگی۔

"حلیمہ! تمہیں پتا ہے وقت کیا ہو رہا ہے۔"

پہلے تو اس نے بے ساختگی سے گردن اِدھر اُدھر گھمائی، پھر جیسے صغیر احمد کی سادگی پہ مسکرائی۔

"یہاں تو گھڑی ہی نہیں لگی......کیسے پتا چلتا کیا وقت ہے؟"

"ساڑھے گیارہ۔"

"اچھا......ہاں بہت دیر ہو گئی۔"

اب کے وہ چپل اتار کے درست طریقے سے اپنے آگے رکھنے لگی۔

"سونا چاہیے۔" چپل پہن کے وہ اس کے پاس آنے لگی۔

"حلیمہ، میں نے اب تک رات کا کھانا نہیں کھایا۔"

صغیر احمد نے تحمل سے اسے مطلع کرنا چاہا۔

"اچھا......نہیں کھایا؟"

"تمہیں احساس بھی ہے حلیمہ کہ میں سارے دن کے بعد تھکا ہارا گھر آیا ہوں، آدھی رات ہونے والی ہے اور تم بجائے مجھے کھانا پوچھنے یا میرے لیے کپڑے نکالنے کے یہاں بیٹھی گپیں ہانک رہی ہو۔ مجھے پانی کا ایک گلاس تک پلانے والا کوئی نہیں۔" وہ پھٹ پڑا۔

"ہاں......واقعی......" وہ جی بھر کے شرمندہ ہونے لگی۔

"یہ تو ہے......پانی پلانے والا تو کوئی ہونا چاہیے۔"

"تم کس مٹی کی بنی ہو حلیمہ۔" وہ جھنجلا اٹھا۔

حلیمہ اپنے بازو ٹٹولنے لگی جیسے مٹی چیک کر رہی ہو۔

"مم......مجھے......مجھے دھیان ہی......نہیں رہا......میں تو......میں تو روز آپ کو......"

اسے بدستور خفا خفا دیکھ کے وہ رونے لگی۔

"بس ذرا ٹیپو سے باتیں......بڑے دنوں بعد آیا ہے نا۔" صغیر احمد آسمان کی جانب منہ اٹھا کے سانسیں بھرنے لگا۔

"ابا......کھانا کھا لیں۔" عقب سے نرمین کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کے دیکھا، وہ ٹرے لے کر کچن سے نکل رہی تھی۔ ایک بوجھ سا سینے سے ہٹتا محسوس ہوا۔ وہ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر آہستہ سے گویا ہوا۔

"پہلے میں سوچتا تھا کہ میں نے ایسا بھی کیا گناہ کیا تھا جو قسمت نے مجھے یہ سزا دی۔ اب سوچتا ہوں نہ جانے کون سی نیکی کام آئی ہے جو تمہارے جیسی بیٹی ملی ہے۔"

ان دونوں کے اندر چلے جانے پہ حلیمہ نے مڑ کر ٹیپو کو دیکھا۔ وہ غشی کی نیند سو رہا تھا۔ وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی اور دوپٹے کے پلو کو کھول کر میٹھی گولیاں نکال کر منہ میں ڈال لیں۔ انہیں چوستے ہوئے وہ پھر سے کہیں کھو گئی۔

پوری ''صغیر منزل'' پہ وہی عالم تھا...... وہی معمول...... صغیر احمد، نرمین کے وجود، ازالے تلاش رہا تھا۔

جہاں آرا کروٹیں بدلتے ہوئے اپنی سمدھنوں اور دیورانیوں کے قصے نمٹ جانے کی دعائیں یا بددعائیں مانگ رہی تھیں۔

ٹیپو خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔

اور جنت بیگم اور خورشید کے کمرے کی وہی گہما گہمی...... جنت کچھ گنگناتے ہوئے پاندان صاف کر رہی تھیں۔

''بلے...... آج تو بڑے موڈ میں ہے آپاں......''

''کتنی بار کہا ہے مجھے آپاں نی پکاریو...... خدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی بارہ پندرہ برس ہو گی مجھ سے......''

اس دعوے کو خورشید نے ایک قہقہے میں اُڑایا۔

''دل ہونا چاہیدا جوان...... عمراں وچ کی رکھیا......'' وہ گنگنانے لگی۔

''ہونہہ...... جیسی خود بے ڈھنگی...... ویسے ہی اوباشوں والے گیت۔''

''ہاں اور خود تو جیسے بڑے جگن بی بیوں والے گیت ہوتے ہیں۔ وہ کل کیا گا رہی تھیں پان چباتے ہوئے...... ہاں موئے درزی نے بٹن کہاں ٹانکا۔''

''میرے منہ مت لگیو۔''

''پاندان مانجھ رہی ہو؟ لاؤ میں لیموں رگڑ کے چمکاتی ہوں۔''

خورشید نے آگے بڑھ کے پاندان لینا چاہا مگر جنت بیگم نے فوراً اس کا ہاتھ جھٹکا۔

''ہاتھ مت لگائیو...... ہاں ابھی ابھی اسی ہاتھ کی انگلیوں سے ناک میں خلال کر رہی تھی، وہی غلیظ انگلیاں میرے پاندان سے چھو دیں۔''

''وڈی آئی صاف ستھری...... دل تو تیرا کالا ہے۔ میل سے بھرا...... پہلے اسے مانجھ۔''

''چل ہٹ......''

''ہٹ جاتی ہوں...... مجھے کون سا شوق ہے بارود کے ڈھیر پہ بیٹھنے کا...... ریموٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ تم ہی ہمیشہ گھٹنے کے نیچے دبا کے بیٹھتی ہو۔''

''اے ہٹو...... ٹی وی لگاؤ گی اتنی رات کو...... کوئی سنے گا تو کیا کہے گا کہ سرتاج کی برسی ہے اور......''

''ہائے آپاں...... رہن دے...... جھاٹا کھول کے سیاپا ڈالنے بیٹھ جاؤں؟ نہ جی...... ہم سے نہیں ہوتے یہ ڈرامے...... اور وہ بھی اتنے سالوں کے بعد، رولیا جتنا رونا تھا۔''

☆======☆======☆

''کیا ہے؟''

اس نے کمر پہ ہاتھ رکھ کے نخوت سے پوچھا اور شوکا جس نے مروفاں سمیت اپنی موجودہ دونوں بیویوں میں سے کسی ایک کے ماتھے پہ ہلکی سی شکن بھی کبھی برداشت نہیں کی تھی...... کجا یہ تیور، مگر ابھی وہ اس کی چڑھی تیوریاں دیکھ دیکھ کے مسرور ہو رہا تھا۔

''اپنے گھر آنے کے لیے کوئی گل ہونی ضروری تو نہیں۔'' وہ مونچھوں کو بل دیتا خواہ مخواہ مسکرا رہا تھا۔

''تمہارا گھر کہاں سے ہو گیا یہ......؟''

''سوہرے کا گھر اپنا ہی ہوتا ہے۔''

''دیکھ شوکے! مجھے نہ زیادہ بک بک کرنے کی عادت ہے نہ زیادہ بکواس سننے کی ہمت...... میرے سامنے، ایسی باتیں کر کے مجھے مروفاں کی یاد نہ دلایا کر۔''

''مروفاں کی یاد تو مجھے آتی ہے۔ جب تجھے دیکھتا ہوں۔''

''مجھے مروفاں جیسی سمجھنے کی غلطی نہ کرنا۔ میں لحاظ نہیں کرتی کسی بندے کا۔ تیری اگلی پچھلی ساری نسلیں ہاتھ جوڑ کے معافی مانگتی پھریں گی۔ میرے سامنے۔'' وہ پھنکاری۔

''اشکے...... لگی ہے ناٹیارن......'' وہ کھل کے ہنسا۔ ''چھوٹا کہاں ہے؟''

''سکول......'' رکھائی سے جواب دے کر وہ اندر مڑنے لگی یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے وہ مزید کسی سوال کا جواب دینے کے موڈ میں نہیں لیکن وہ پیچھے پیچھے ہی چلا آیا۔

''اچھا...... سکول تُو نے ڈالا ہو گا؟''

''کوئی اعتراض؟''

''نہ جی...... میں کون اعتراض کرنے والا چھوٹے پہ، تاجی پہ، تینوں کے تینوں منڈوں پہ سب سے زیادہ حق تیرا...... ماسی جو ہوئی تُو...... کہتے ہیں نا، ماں مرے، ماسی جیے۔''

اس کی بات کے چھپے مفہوم کو جاننے کے بجائے وہ اس کے اندر تک چلے آنے پہ جھنجھلا

رہی تھی۔

''کیا ہے......؟ اندر کیوں گھسے آرہے ہو......؟ بتایا ہے نا، کوئی نہیں ہے گھر پہ...... یہاں سے۔''

''مجھ سے پوچھ...... یہاں کیا ہے؟'' وہ بڑبڑایا۔

''ماں دبی ہوئی ہے تیری۔'' وہ بدلحاظی سے بولی تو شوکا خجل ہو کر قہقہہ لگانے لگا۔

☆======☆======☆

''سب کچھ ہے یہاں...... وہ سب کچھ جو میں سوچتا تھا۔ عزت، مقام...... آگے بڑ کے مواقع، محنت کی قدر...... اچھا معاوضہ...... بس ایک چیز کی کمی ہے۔''

اس سطر کے بعد گلابو کا دل زور سے سکڑا...... بس نہ چلا کہ اڑ کے جائے اور وہ کمی پو کر آئے۔

''صرف تم نہیں ہو۔''

اگلی سطر پڑھتے ہی وہ طمانیت سے مسکرادی اور یاسر کا خط دونوں مٹھیوں میں بھینچ کر سے لگالیا۔

رزلٹ آنے پہ پاس ہونے کی خوشی میں قدسیہ آپا نے اسے زبردستی چار چھٹیاں دے گھر بھیجا تھا...... حالانکہ اس نے لاکھ نہ جانے کے بہانے تراشے...... کھل کے تو نہیں بتا تھی کہ وہاں جا کر خوشی بانٹی نہیں جاتی، الٹا رنگ میں بھنگ ڈالے گا اور جیسے تیسے چار تکلیف دن گزار کے وہ واپس آئی تو رانی نے اسے چپکے سے خط پکڑایا۔

''کسی کو پتا تو نہیں چلا......؟'' وہ اپنی دھڑکنیں اعتدال پہ لاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کسی کو بھی نہیں...... مگر ہے کس کا؟ اسی کریانے والے کا؟''

''اوں ہوں...... اب نہ کہنا اسے کریانے والا۔ میرا یاسر اب سچ مچ کا شہزادہ بنے ہے۔''

وہ خط لے کر کمرے میں گھس گئی۔ بارہ سطروں کا خط...... ابھی نظر ڈالی اور ابھی ختم اس کی تشنگی دور نہ ہو پا رہی تھی...... وہ بار بار ان ہی بارہ سطروں کا وظیفہ پڑھنے لگی۔

''ابھی تو قدم بھی نہیں جمائے ڈھنگ سے اس لیے، تمہارے اس سوال کا کیا جواب دوں کہ کب واپس آؤں گا؟ ہاں یہ تسلی دے سکتا ہوں کہ آؤں گا ضرور...... ان شاء اللہ صرف اور صرف تمہارے لیے۔ تم بھی میرا انتظار کرنا، مایوس مت ہونا، ہمت کبھی مت ہار

☆======☆======☆

صغیر احمد بیڈ پہ بیٹھا سامنے رکھے رجسٹر پہ کچھ لکھ رہا تھا۔ جب حلیمہ ناشتے کی ٹرے اٹھائے اندر آئی...... اس نے نظر اٹھا کے دیکھا اور دوبارہ انہماک سے کام شروع کر دیا۔ حلیمہ نے کسی معمول کی طرح ٹرے اس کے سامنے رکھے رجسٹر پہ رکھنا چاہی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' اس نے سٹپٹا کے ٹرے پکڑی۔ ''اتنے ضروری کاغذات ہیں، ابھی خراب ہو جاتے۔''

اور رجسٹر میں سے چند دستاویزات نما کاغذات اٹھا کے تہہ کرتا کھڑا ہو گیا۔

''ناشتہ نہیں کریں گے؟''

''کرتا ہوں، پہلے یہ سنبھال لوں...... کل بینک لے کر جانے ہیں۔''

''لائیں...... میں رکھ دیتی ہوں۔'' وہ مستعدی سے آگے بڑھی۔ صغیر احمد نے قدرے اطمینان سے اسے دیکھا، جو آج جون میں نظر آرہی تھی اور بیڈ پہ ہی آلتی پالتی مار کے ناشتہ کرنے لگا۔ پیپرز سنبھال کے رکھنے کے بعد وہ سامنے بیٹھ گئی اور چائے کے کپ میں چینی گھولنے لگی۔ ایک کے بعد دوسرا...... دوسرے کے بعد تیسرا، حتیٰ کہ پانچواں لقمہ توڑتے توڑتے صغیر احمد کی صبر کی حد ختم ہو گئی۔ کپ میں چلتے چمچے کی مسلسل آواز سے اس کے اعصاب پر کوفت سوار ہو رہی تھی، اس نے لقمہ چباتے ہوئے حلیمہ کو دیکھا وہ دیوار پہ نظریں جمائے غائب دماغی سے چمچہ ہلائے جا رہی تھی۔

''بس کرو حلیمہ......'' بادل نخواستہ اسے مخاطب کرنا پڑا۔ وہ ہڑبڑا کے چونکی۔ صغیر احمد کے چہرے کے بیزار تاثرات اسے خوف زدہ کر گئے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کپ آگے کیا۔

''چائے......''

کپکپاتی انگلیاں...... اور ان انگلیوں میں دبا کپکپاتا کپ...... صغیر احمد نے نظر اونچی کی...... پلکیں اور لب بھی مرتعش تھے۔ وہ نرم پڑ گیا۔ اس کے ہاتھ سے کپ لے کر ہاتھ اپنی گرفت میں نرمی سے دبالیا۔

''حلیمہ......!''

''ج...... جی......'' اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی...... صغیر احمد کے ہاتھوں سے اس کا برف ٹھنڈا ہاتھ خود بخود پھسل گیا۔ وہ سر جھٹک کے چائے کا گھونٹ بھرنے لگا۔

''چینی کتنی ڈالی ہے؟'' اس نے منہ بنایا۔

''دو چمچے۔''

''حلیمہ! میں کب سے تمہیں بتا رہا ہوں کہ ڈاکٹر نے مجھے میٹھا کم کرنے کا مشورہ دیا ہے، اس لیے اب مجھے صرف ایک چمچہ چینی دیا کرو اور تم روز دو چمچے ڈال دیتی ہو۔''

''وہ......میں......'' وہ اٹک اٹک کے وضاحت دینے لگی۔

''بس......اتنے سالوں سے دو ڈال رہی ہوں نا چمچے تو عادت......یاد ہی نہیں رہا۔''

صغیر احمد بے بسی سے مسکرا دیا۔

''میں دو چمچے چینی لیتا ہوں، یہ بات یاد کرنے کے لیے تمہیں سات آٹھ سال لگ گئے، اب میں ایک چمچہ لوں گا یہ بات تمہیں ایک ہفتے میں کیسے یاد ہو سکتی ہے۔''

''وہی تو......'' حلیمہ نے جلدی سے کہا اور مسکرانے لگی۔

☆======☆======☆

''صدورے! شوکا منڈے واپس لے جانے کی گل کر رہا تھا۔'' بھاگاں نے اطلاع دی۔

''جان دے......نری مصیبتیں......مسٹنڈے......'' وہ ویسے ہی عاجز تھا ان سے، بڑی ہی مشکل سے برداشت کیے تھے، اب اولاد کی اولاد کہاں تک پالتا۔

''لے......ایسے ہی جان دے۔'' بھاگاں برا مان گئی۔

''اساں بڈھے ویلے خالی ہاتھ ہو جائیں؟''

''نا، وہ تینوں بڑا تجھے نوٹ کما کما کے دیندے ہیں۔ ہڈ حرام......مردار خور......''

''مروفاں نے بھی جے تے تریہہ (تین) کے تریہہ منڈے، اک اپنے ورگی کڑی لیتی تو ساڈا بڑھاپا پار لگ جاندا۔''

''ہوں......'' صدورے نے کچھ سوچتے ہوئے گنجے چپکے ہوئے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

''اپنی اک ہے تے سہی......پر کسی کم کی نہیں۔''

''ایویں نہ بڑبڑ کر......'' صدورے نے جھڑکا۔

''کم (کام) کی کیسے بنانا ہے، یہ گل تو مجھ پہ چھڈ دے۔''

اس کا مطلب پرست دماغ دور کی کوڑی لا رہا تھا۔

☆======☆======☆

''چار لفظ بس چار لفظ......یہی تھا میرے چار ہفتوں کے انتظار کا حاصل؟''

اس کا قلم سفید کاغذ پر گلے شکوؤں کے گل کھلا رہا تھا۔

''میرے بارہ خطوں کے جواب میں ایک خط......اور وہ بھی ایسا کہ پڑھنے کے بعد

کو تسلی ملنے کے بجائے ہڑک اور جاگ گئی ہے۔ بڑے ظالم، بڑے بے پرواہ ہو تم یاسر......جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔''

اتنا لکھ کے وہ رکی۔

پین کا سرا لبوں میں دبا کے ہلکا سا مسکرائی اور دوبارہ لکھنا شروع کیا۔

''ہاں......نہیں بولتی......صرف میرے خط بولیں گے۔ یہ تم سے روٹھیں گے۔ تمہیں منائیں گے۔ تمہیں میرے دل کی ساری باتیں سنائیں گے۔ تم سے سارے وعدے کریں گے اور تم سے بہت سے وعدے لیں گے۔ جلدی واپس لوٹنے کا وعدہ۔ کچھ بن کر آنے کا وعدہ......اور میرے، صرف میرے بن کر رہنے کا وعدہ......''

اس کے لبوں پہ پھیلی مدھر مسکراہٹ خط کے ورق پہ محبت کی اوس برسا رہی تھی۔

''اچھا اور یہ تم نے کیا لکھا ہے......مجھے کوئی تحفہ نہیں چاہیے، کم از کم ابھی تو نہیں۔ جو لینا ہے وہ ایک بار ہی لوں گی تم سے۔ ابھی تم یہ فکریں چھوڑو اور زیادہ سے زیادہ پیسے اکٹھے کرنے کا سوچو۔ میں بھی یہی کر رہی ہوں۔ تمہیں پتا تو ہے کہ امتحانات کی تیاری کے ساتھ ساتھ بھی میں فیکٹری کا کام کتنی جانفشانی سے کر رہی تھی، اب بالکل فراغت ملنے کی وجہ سے اور کچھ تمہارے جانے کے بعد دھیان بٹانے کی غرض سے میں نے کام کے دورانیہ میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں چاہتی ہوں ہم دونوں جلد از جلد ایک گھر کی بنیاد رکھنے کے قابل ہو جائیں۔ وقت کم ہے......ہاں حوصلہ زیادہ ہے۔ اور طلب اس سے بھی بڑھ کے۔ صرف بنیاد رکھنے کے قابل ہی تو ہونا ہے، پھر چھت ڈالنے اور ایک ایک اینٹ رکھنے کا کام ہم مل کے ہی کر سکتے ہیں۔ اپنا خیال رکھنا۔ تم امانت ہو میری......سمجھے۔''

اپنا نام لکھنے کے بعد اس نے خط کی پیشانی پہ لکھا یاسر کا نام پہلے انگلیوں سے چھوا اور پھر اس پہ لب رکھ دیئے۔

☆======☆======☆

''پاگل ہے یہ۔'' یاسر خط پڑھنے کے بعد سر جھٹکتے ہوئے مسکرایا۔

یہاں آنے کے بعد وہ ہر دوسرے تیسرے دن اس کا خط وصول کر رہا تھا۔ اتنی محبت......اتنی بے قراری......اتنا والہانہ پن۔ اس کے حرف حرف سے ٹپکتا تھا کہ کبھی وہ خود پہ نازاں ہونے لگتا۔ کبھی مغرور ہو جاتا اور کبھی کبھی گھبرا جاتا۔

''یہ شدتیں کہیں مجھے بہا کے نہ لے جائیں۔''

وہ فطرتاً ٹھنڈے مزاج کا اور معتدل جذبات رکھنے والا انسان تھا۔ گل اسے اچھی لگتی

تھی۔اس کا ساتھ دل کو بھاتا تھا۔اس کے ساتھ آئندہ زندگی گزارنے کا خواب اس نے دیکھا تھا۔اور اپنے ارادے میں وہ گل کی طرح ہی ثابت قدم اور جذبوں میں اس کی طرح مخلص تھا۔مگر اتنا تند نہیں تھا۔گل کی بلاخیزی اسے کبھی کبھی خوف زدہ کردیتی تھی۔

☆======☆======☆

''دھیان سے رجو! توڑ نہ دیجیو کہیں۔''

جنت بیگم صحن میں بچھے تخت پہ بیٹھی کام والی ماسی سے اپنا گھڑا دھلوا رہی تھیں۔برابر چارپائی پہ ٹیپو منہ تک چادر تانے سو رہا تھا۔دن کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

''آپ بھی عجیب ہیں بی بی!'' رجو نے گھڑے کے منہ کے اندر ہاتھ ڈال کے مانجھتے ہوئے بےزاری سے کہا۔

''آج کل بھلا کون پیتا ہے گھڑے کا پانی اور پھر اللہ رکھے آپ کے ہاں تو سب ہی کچھ ہے۔فریج،فریزر،کولر......''

''مجھ سے نہ پیا جائے ہے موئی پلاسٹک کی بوتلوں کا پانی۔''

رجو نے منہ بنا کے سر جھٹکا اور گھڑا صاف پانی سے کھنگالنے لگی۔جنت بیگم نے ٹیپو کی خبر لی۔

''ٹیپو......اے ٹیپو بچے اٹھ جا۔سورج سر پہ آگیا ہے۔ہڈیاں بھنوائے گا کیا اپنی؟''

رجو منہ پہ دوپٹے کا گولہ رکھ کے ہنسنے لگی۔

''بی بی آپ باتیں بڑی مزے کی کرتی ہو۔کراری۔''

''دانت پردے میں کر۔'' جنت بیگم برا مان گئیں۔

''نگوڑے دانت ہیں کہ پھاوڑا۔پل میں تان لیتی ہے۔''

''توبہ بی بی!'' رجو نے تیوری چڑھا کے دھلا دھلایا گھڑا بھر کے ان کے ہاتھ میں تھمایا۔جنت بیگم سرہانے رکھا موتیے کا گجرا گھڑے کے منہ پہ سجانے لگیں۔عین اس وقت برابر کی چھت سے ایک موٹا تازہ پتھر آکے سیدھا گھڑے پہ لگا اور جھر جھر پانی بہہ کر جنت بیگم کے کرتے کو بھگو گیا۔

''توڑ ڈالا میرا گھڑا۔ستیاناس جائے اس لپاڑن کا......نگوڑی،سڑن،بدذات۔''

وہ چھنو کی چھت کی جانب منہ کر کے واویلا مچانے لگیں۔منڈیر کے پار گھڑی بھر کو چھنو کی کھوپڑی نظر آئی پھر غائب ہوگئی۔

''بی بی! کس کو کوسنے دے رہی ہیں؟'' رجو نے پوچھا۔

''تیرے ہوتوں سوتوں کو۔'' وہ اسی پہ الٹ پڑیں۔

''اری نامراد۔اسی منہ زور سانڈنی سے کہہ رہی ہوں،جس نے پتھر مار کے میرا گھڑا توڑا ہے۔اس مہینے میں یہ تیسرا گھڑا ہے۔میں پوچھتی ہوں تیرے باوا نے میرا وظیفہ باندھ رکھا ہے جو دے خرچے پہ خرچا کروائے جارہی ہے۔''

''چھنو تو کام دکھا کے غائب ہوچکی تھی۔ماسی بھی سارا زلزلہ خود پہ گرتے دیکھ کر ادھر اُدھر ہوئی۔مگر جنت بیگم کی کھولن تھی کہ کم ہی نہ ہورہی تھی۔آؤ دیکھا نہ تاؤ اور چادر تلے سوئے ٹیپو کی دونوں ہاتھوں سے اندھا دھند پٹائی شروع کردی۔

''اس ہڈحرام کی وجہ سے ہے سب۔اسی کو کھینچ کھینچ کر نشانے باندھے جارہی ہے۔موا ذرا شکل وصورت کا اچھا ہوتا تو عقل وقل ہوتی تو نہ جانے اینٹیں آن آن گرتیں آنگن میں۔ اس بےڈھنگ پن کے ساتھ یہ حال ہے تو......''

ٹیپو اس ناگہانی افتاد پہ چادر پرے پھینک کر گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور گہرے گہرے سانس لیتا،ادھ کھلی آنکھوں سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا اماں؟ صبح ہوئی ہے یا شام؟''

جنت بیگم نے بھنا کے ایک اور چپت رسید کی۔

''کیسا دھت پڑا ہے یہ تک خبر نہیں کہ رات میں سویا تھا کہ دوپہر میں۔صبح ہونے اور شام ہونے کا بھی پتا نہیں چل رہا۔''

''مارتی رہتی ہے ہر وقت......سوتیلی نہ ہو تو۔''

''ہاں میں سوتیلی ہوگئی۔تُو تو جیسے میری سوت کا جنا ہے نا۔کاش میں سوتیلی ہی ہوتی اور تُو اس خورشید کلموہی کا جنا ہوتا۔کم از کم تجھے زہر دے کر کلیجہ تو ٹھنڈا کرتی اپنا۔''

''اوہوں......نری نحوست صبح سویرے۔''

جہاں آرا بیگم کی تسبیح میں خلل پڑ رہا تھا۔جو اندر اپنے کمرے میں بیٹھی تھیں مگر اس شور سے بچ نہ پارہی تھیں اور نمو کب سے ان کی پائنتی بیٹھی منت سماجت کررہی تھی۔

''پلیز دادی جان۔''

''نہیں،ایک بار کہہ دیا نا۔''

''سب لڑکیاں جاتی ہیں بازار۔'' اس نے منہ بسورا۔

''جاتی ہوں گی۔'' جہاں آرا نے سختی سے کہا۔''مگر ہمارے گھرانے کا یہ دستور نہیں ہے، جو چاہیے لکھ دو،صغیر احمد سے منگا دوں گی۔''

"مجھے نہیں چاہیے کچھ بھی۔" وہ ناراضی سے اٹھ گئی۔

"نمو! یہاں آؤ۔"

دادی کے تحکم بھرے لہجے پہ وہ بادل نخواستہ رکی۔ مگر یونہی خفا خفا سی کھڑی رہی۔

"تمہاری ایسی کون سی ضرورت ہے جو پوری نہیں ہوتی۔ بڑھیا سے بڑھیا کپڑا، عمدہ سے عمدہ چپل۔ چوڑیاں، بُندے، کون سا شوق ہے جو باپ پورا نہیں کرتا اور تمہیں کیا چاہیے گھر بیٹھے سب مل تو رہا ہے۔ بیٹی! بازاروں کی خاک چھاننے والی لڑکیوں کے چہرے پہ پھٹکار برستی ہے جیسے اس چھنو کے چہرے پہ ہے۔"

"دادی! ابا کو کیا پتا آج کل کے فیشن کا۔ بس اٹھا لاتے ہیں کچھ بھی۔ صرف مہنگا ہونے سے کیا ہوتا ہے اور آپ بھی درزن سے سلوا دیتی ہیں انیس سو ساٹھ کے زمانے کے جھولے۔ کالج میں سب مذاق اڑاتے ہیں میرا۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"ایک تو کالج نرا عذاب مول لے لیا ہے تم نے۔ پہلے چنگی بھلی تھیں۔ اب نئے نئے نخرے سوجھ رہے ہیں۔ باپ دادی کے لائے کپڑے معیار پہ پورے نہیں اُتر رہے۔"

"اور...... اور پھر دادی جان۔ ضرورت کی چیز تو میں ابا سے منگوا بھی نہیں سکتی۔ یہ بھی تو سوچیں۔"

اس بات پر جہاں آرا ذرا سوچ میں پڑیں۔ پھر ایک مفاہمت بھری سانس کے ساتھ بولیں۔

"ٹھیک ہے، مگر چھنو بدذات کے ساتھ تو ہرگز نہیں۔"

"اچھا۔ تو آپ چلی چلیں۔" وہ بے دلی سے بولی۔

"مجھے کہاں بڑھاپے میں خوار کراؤ گی۔ اپنی ماں کو لے جاؤ۔ اسے بھی کسی ذمہ داری کا احساس ہو۔"

"امی کو؟ مگر انہیں تو کسی بازار مارکیٹ کا راستہ تک نہیں آتا۔"

"دماغ مت کھاؤ میرا...... عبادت کرنی دوبھر کر دی ہے۔"

جہاں آرا اکتا سی گئیں مسلسل بحث سے۔

"ٹھیک ہے پھر...... امی کے ساتھ چلی جاتی ہوں مگر چھنو کو ساتھ ضرور لے کر جاؤں گی۔" نمو نے دبے دبے انداز میں کہا۔ "اسے سارے بازاروں کا پتا ہے۔"

"ہاں، اسے نہیں پتا ہوگا تو کسے پتا ہوگا بازاروں کا...... سارے لچھن ہی......"

اس نے کمرے سے نکلتے نکلتے دادی کے الفاظ سنے مگر نظر انداز کر دیئے۔ سال [illegible]

ایک آدھ بار ہی تو موقع ملتا تھا گھر سے اس طرح نکلنے کا۔

"یا اللہ...... اے پروردگار" جہاں آرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ "میری سیدھی سادی معصوم بچی کو اس چھنو کے شر سے محفوظ رکھنا۔ اس کے سائے سے بچانا۔" وہ ہل ہل کر دعا کر رہی تھیں۔

☆======☆======☆

"گلابو! تمہارے لیے فون ہے۔"

رانی نے دبے دبے جوش سے اسے بتایا تو وہ سوئی میں دھاگہ ڈالتے ہوئے رک سی گئی۔

"میرے لیے؟"

"ہاں۔ اسی کا۔" رانی نے شرارت سے آنکھیں نچائیں۔

"سچی؟" اسے یقین نہ آ رہا تھا مگر آزمانے کے لیے فوراً باہر لپکی۔

"شکر ہے اس وقت کوئی اور گھر میں نہیں ہے۔ فون میں نے ہی اٹھایا تھا ورنہ سو سو سوال ہوتے۔" رانی نے اپنی اہمیت جتائی۔

اس گھر کا نمبر گلابو نے یاسر کو بھی دے دیا تھا۔ جب وہ باہر جا رہا تھا مگر کتنے اصرار کے باوجود وہ کرتا نہیں تھا۔ ہر بار یہی لکھتا۔

"تمہاری عزت مجھے جان سے پیاری ہے۔ میں نہیں چاہتا جہاں تم اتنے مان اور بھروسے سے سر چھپا کے بیٹھی ہو، وہاں بے اعتبار ہو جاؤ۔ میرا وہاں فون کرنا تمہیں ان لوگوں کی نظروں سے گرا سکتا ہے جو تم پہ اندھا اعتماد کرتے ہیں۔"

گلابو کو یہ فلسفہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ وہ جواب میں لکھ دیتی۔

"بھاڑ میں جائیں سارے اور ان کا اعتماد۔ بس تمہاری آواز سن کر دل کو جو سکون ملے گا اس کے بدلے جو مرضی ہو، کسے پرواہ۔"

اور اب جب اس کا فون آیا تھا تو وہ بجائے خوش ہونے کے فکر مند ہو رہی تھی کہ نہ جانے ایسی کون سی بات ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنا اصول توڑنے پہ مجبور ہوا۔

"ہیلو! گل میری بات دھیان سے سنو۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

یہی ہوا۔ اس کے اندیشوں کی تصدیق یاسر کے گھبرائے گھبرائے انداز نے کر دی۔

"کیا ہوا یاسر؟" وہ سینے پہ ہاتھ رکھتی لڑکھڑا سی گئی۔

"مجھ سے ایک ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

''تم ٹھیک تو ہو؟'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں اور رونا دھونا بند کرو پلیز۔غور سے سنو۔'' وہ بہت جلدی میں لگ رہا تھا۔اور بے حد پریشان بھی۔

''جانی نقصان تو کوئی نہیں ہوا ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ یہاں کے قانون سخت ہیں البتہ مالکوں کی گاڑی پوری طرح برباد ہوگئی ہے۔ ہرجانے کے طور پہ یا تو میں کئی ماہ تک ان کے پاس بغیر تنخواہ کے ڈرائیوری کروں گا۔ یا پھر مجھے فوری طور پہ رقم کا بندوبست کرنا ہوگا۔بغیر تنخواہ کے کام کرنا بہت مشکل ہے۔ پردیس ہے سو ضرورت پڑتی ہے اس لیے سوچا کچھ رقم ادھار لے کر ان کا ہرجانہ بھر دوں۔ پھر پارٹ ٹائم کوئی مزدوری ڈھونڈ کے قرضہ چکا دوں۔ کچھ روپے میرے پاس ہیں۔ کچھ کا انتظام کرنا ہے۔''

''یاسر! تم فکر مت کرو۔میرے پاس پورے ساڑھے سات ہزار ہیں۔''

یاسر پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔

''اور...... اور پچھلے مہینے بونس سے ایک چین بھی بنوائی تھی۔تین ہزار کی وہ بک جائے گی۔''

''گل! تم سمجھ نہیں رہیں۔رقم بہت بڑی ہے۔تم انتظام نہیں کر سکتی ہو۔نہ میں تم سے کہہ رہا ہوں۔بس کئی پاکستانی ہیں۔میں جس کی دکان میں ملازم تھا، ان حاجی صاحب کو کال سے فون کر رہا ہوں مگر شاید فون خراب ہے۔تم ذرا پتا کرو اور میرا پیغام ان تک پہنچا دو۔ میری مدد ضرور کریں گے اور کچھ نہیں تو میرے ان مالکوں سے نرمی کی درخواست ہی کر دیں گے۔ان کے جاننے والے ہیں۔''

''ہاں...... میں کرواتی ہوں پتا۔ابھی جاتی ہوں۔''

''جلدی گل! صرف دو دن کا وقت ہے میرے پاس۔''

☆======☆======☆

''نمو! تیرے ابا نے ڈرائیور تو بڑا اسمارٹ رکھا ہے۔''

پارکنگ میں کھڑی گاڑی سے نکلتے ہوئے چھنو نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ حلیمہ چند قدم آگے تھی۔

''ڈرائیور نہیں ہے بدتمیز۔'' نمو نے جوابی سرگوشی کی۔

''ابا کہاں رکھتے ہیں ڈرائیور! رکھ لیں تو کتنا مزہ آئے۔ کالج آنے جانے کا مسئلہ تو حل ہو۔مگر دادی نہیں مانتیں کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ہمارے گھر کی لڑکیاں کسی غیر مرد کے

ڈرائیور کے ساتھ اکیلی آئیں جائیں۔''

''تو یہ؟'' چھنو نے تجسس سے گردن گھما کے پیچھے دیکھا۔

''ان کے سٹور پہ کام کرتا ہے، امی ساتھ ہیں اس لیے بھیج دیا۔''

''ہائے اللہ۔ پہلے کیوں نہیں بتایا کم بخت کب سے لائن مار رہا تھا۔اور میں ڈرائیور سمجھ کے لفٹ نہیں کروا رہی تھی۔''

اسے افسوس ہونے لگا پھر ایک بار اور پیچھے مڑ کے دیکھتے ہوئے خود کو تسلی دی۔

''چلو واپسی پہ سہی۔''

''ذرا دائرے میں رہنا چھنو! ابا کو بتا دیا اس نے تو نہ تمہاری خیر ہے نہ میری۔''

''نہیں بتاتا۔کیونکہ اسے خود بھی اپنی خیر عزیز ہے۔''

باتیں کرتے کرتے دونوں حلیمہ سے ذرا آگے نکل گئیں۔

''نمو!'' حلیمہ بوکھلا کے پکار رہی تھی۔''میرے ساتھ ساتھ رہنا۔ میں کھو گئی تو۔''

''لو، خالہ ہماری حفاظت کے لیے ساتھ آئی ہیں یا ہم ان کی رکھوالی کے لیے؟'' چھنو نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

نرمین نے ماں کے ہونق چہرے اور اُڑی اُڑی رنگت پہ خجالت محسوس کرنے کے باوجود چھنو کی بات پہ بھی ناگواری محسوس کی۔ چپکے سے ماں کا ہاتھ زور سے اپنے ہاتھ میں دبا کے اسے اپنے ساتھ کر لیا جو ٹریفک اور بھیڑ کو دیکھ کے گھبرا رہی تھی۔

چھنو فٹ سے سامنے والی بڑی سی جیولری شاپ میں گھس گئی۔ نمو بھی نہ چاہتے ہوئے حلیمہ کا ہاتھ تھام کے اندر چلی آئی۔ چھنو تو ایسے بے تکلف ہو کر سیلز مین سے گپیں جھاڑنے لگی جیسے برسوں کا یارانہ ہو۔ نمو نے خفت محسوس کرتے ہوئے کن اکھیوں سے ماں کو دیکھنا چاہا مگر حلیمہ چہرے پہ بچوں کی سی معصومیت اور اشتیاق لیے شیشے کے شوکیس میں سجی چیزیں دیکھ رہی تھی۔

''نہ...... تین سو تو بہت زیادہ ہیں۔'' چھنو نے نزاکت سے ناک سکوڑ کے کہا۔

''چلیں آپ کے لیے دو سو پچھتر۔''

''اوہو...... بڑی رعایت کی ہے۔''

''چلیں آپ ہی بتا دیں۔'' اس کی نگاہیں بے باکی سے چھنو کے سانولے مگر چکنے چہرے اور سانچے میں ڈھلے سراپے پہ پھسل رہی تھیں۔

''بتا دوں؟'' چھنو نے اس کی نگاہوں کو مزید کھلی چھٹی دینے کا اشارہ کیا۔

"بتادیں......"

"پھر نہ کہنا......"

اس وارننگ پہ وہ نثار ہونے والی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے لگا۔

"پچاس روپے؟"

"کیا؟" حیرت میں ڈوبا یہ لفظ سیلز مین کے منہ سے نہیں، زرمین کے لبوں سے آزاد تھا۔

"پچاس روپے میں یہ سیٹ آپ کو کہیں سے نہیں ملے گا مس۔"

"یہاں سے مل جائے گا اور وہ بھی ایک نہیں دو۔"

"آپ مذاق کر رہی ہیں؟"

"میں سیریس ہوں۔" وہ تھوڑا اور پاس ہوئی اور سرگوشی میں کہا۔

"آپ بھی ہو جایئے...... سیریس۔"

زرمین دونوں کو ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ کر گھبرائی......! الگ چھوٹے جا رہے تھے۔

"پھر پچاس روپے بھی کیوں؟ آپ ایسے ہی لے جائیں۔"

"چلو چھنو۔" اب کے اس سے برداشت نہ ہوا تو اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ اب میں سیریس ہوا تو آپ بھاگ رہی ہیں۔"

"کوئی کہیں نہیں جا رہا۔ آپ دو سیٹ پیک کریں۔"

چھنو نے اپنا ہاتھ چھڑایا۔ "ایک میرے لیے، ایک اس کے لیے۔"

"نن نہیں...... مجھے نہیں چاہیے۔" وہ ہکلائی۔

"کیا ہے تمہیں؟ چپ رہو۔" چھنو نے گھرکا۔

"ان کا تو میں پیک کر دیتا ہوں مگر آپ کا......" سیلز مین نے چھنو کو عاشقانہ نظروں دیکھتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"میرا؟" چھنو نے بات پوری کروانا چاہی۔

"ایک بات ہم نے آپ کی مانی...... ایک آپ ہماری مان لیں۔ نہ تین سو...... سو...... مفت میں دے رہا ہوں۔ مفت کی چیز کو تحفہ کہتے ہیں اور تحفہ اپنے ہاتھوں سے جائے تو اچھا لگتا ہے۔"

چھنو خواہ مخواہ ہنسنے لگی...... مگر زرمین کو وہ زہر لگ رہی تھی۔ سیلز مین نے ہاتھ آگے

کے اس کے ہاتھ کو تھاما اور سیٹ میں سے انگوٹھی نکال کر اسے پہنانے لگا۔

تپتے رخساروں کے ساتھ زرمین نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ حلیمہ اب بھی کسی شوکیس میں جھانکتے ہوئے غائب دماغی کی کیفیت میں تھی۔

"میں کولڈ ڈرنک لاتا ہوں آپ کے لیے۔"

سیلز مین کے نکلتے ہی زرمین نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"دادی جان صحیح کہتی ہیں، ایک نمبر کی لفنگی ہے تُو۔"

چھنو ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔

"شرم تو نہیں آتی...... اتنا لحاظ تک نہیں کہ امی ساتھ ہیں۔ وہ کیا سوچیں گی۔"

"تمہاری امی سوچتی بھی ہیں؟" چھنو کھلکھلائی۔

"چھوڑو یار۔ خالہ بے چاری سے کیا شرمانا...... اور کیا گھبرانا۔ انہیں کیا پتہ چلتا ہے کچھ۔"

زرمین کے اندر عجیب سا احساس جاگا۔ اس نے پلٹ کر ماں کو دیکھا...... جس کے ادھ کھلے منہ کے پاس ایک مکھی بھنبھنا رہی تھی۔

☆======☆======☆

"یاسر! وہ حاجی صاحب تو دکان بیچ کر چلے گئے۔" گل نے اگلے ہی دن اسے فون کر کے بتایا۔

"کیا......؟ کب؟ کہاں؟" وہ بری طرح بوکھلا گیا۔

"پتہ نہیں...... سنا ہے ان کے داماد کی ایکسیڈنٹ میں وفات ہو گئی۔ اکلوتی بیٹی تھی اس لیے دکان مکان سب بیچ کر اس کے پاس چلے گئے۔"

"بیٹی تو کراچی میں بیاہی تھی۔ اگر وہاں گئے ہیں تو کیسے ڈھونڈوں گا انہیں، کیسے رابطہ ہوگا...... کوئی نمبر نہیں ملا؟"

"نہیں...... چھوٹے سے کہا تھا...... کہہ رہا تھا چار چھ روز تک لا دے گا...... وہ بھی اگر مل سکا تو۔"

"چار چھ روز...... اور میرے پاس آج کا آدھا دن ہے اور کل کا آخری۔"

"کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے یاسر؟"

"ہاں ہے۔"

"کیا؟" وہ بے تابی سے بولی۔ اس کا خیال تھا تیسرا راستہ وطن واپسی ہو گی...... وہ بھی

خالی ہاتھ۔ یہ بھی منظور تھا اگر اس کے بدلے یاسر کی گلو خلاصی ہو جاتی۔

"جیل۔"

مگر اس کا بتایا تیسرا راستہ ہرگز قابل قبول نہ تھا۔

"نہیں......" وہ پھپھک کے رو پڑی۔

"تمہارے آنسوؤں سے میری پریشانی کم نہیں ہو سکتی۔" وہ چڑ گیا صورتِ حال ہی ایسی تھی۔ خود پہ سے کنٹرول ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"یاسر...... میں ایک کوشش اور کرتی ہوں تم مایوس......"

مگر دوسری جانب فون رکھا جا چکا تھا۔

☆======☆======☆

"آپا! وہ مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے۔"

بہت سوچنے کے بعد اس نے قدسیہ آپا سے مدد مانگنے کا سوچا اور کوئی نظر میں تھا بھی نہیں۔

"اچھا...... کتنے؟" بالوں میں تیل لگاتے لگاتے رک کر وہ فوراً ہی سائیڈ پہ پڑا پرس اٹھا کے کھولنے لگیں۔

"تھوڑے تھوڑے کر کے چکا دوں گی آپا!"

"اچھا بھئی......" وہ مسکرائیں۔ اتنے مہینوں کے قیام میں گلابو نے پہلی بار تنخواہ کے علاوہ کچھ مانگا تھا۔

"یا آپ تنخواہ میں سے کاٹتی رہیے گا۔"

"وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا تم بتاؤ کتنے چاہئیں۔"

وہ بیگ کے اندر ہی ہاتھ ڈالے نوٹ گنتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"دو...... دو لاکھ روپے۔"

"کیا؟" قدسیہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھنے لگیں جہاں مذاق کی ہلکی سی رمق بھی نہ تھی۔ اس کے برعکس زردی کھنڈی ہوئی تھی جو بہت سے سوال جگا رہی تھی۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔"

"نہیں...... وقت خراب ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"دو لاکھ روپے...... وہ بھی اکٹھے اوپر سے کہہ رہی ہو کہ تنخواہ میں سے کاٹ لوں...... کتنی ہے تمہاری تنخواہ آج کل۔"

"ساڑھے چار ہزار روپے۔" وہ منمنائی۔

"کتنے سالوں تک کٹواؤ گی......؟ اور تمہیں لاکھوں کی ایسی ضرورت کیا آن پڑی؟"

پہلی بار وہ اتنی درشتی سے بات کر رہی تھیں، جیسے دو لاکھ کا مطالبہ کرنا اتنی ہی بڑی گستاخی ہو۔

"وہ ابا بہت بیمار ہے۔ اس کے علاج کے لیے۔"

اس سوال کے لیے وہ ذہنی طور پہ تیار تھی اس لیے جواب رٹ رکھا تھا۔ مگر قدسیہ نے اس رٹے رٹائے جواب کو پورا سننے کی زحمت ہی نہیں کی...... تو متاثر کیا ہوتیں۔

"ایسی بھی کون سی بیماری ہے۔ یہاں لے آؤ...... نہیں تو لاہور لے جاؤ۔ کتنے ہی خیراتی ہسپتال ہیں جہاں غریبوں کا مفت علاج ہوتا ہے۔ میرا خالہ زاد بھائی لاہور کے ایک بڑے علاقے کا ناظم ہے۔ کسی بھی ہسپتال سے مفت علاج، آپریشن وغیرہ کرا دے گا۔ بڑے بڑے رحم دل نیک لوگ ایسے ہسپتال بنا کے بیٹھے ہیں۔ کینسر کا علاج، گردوں کا علاج...... آنکھوں کے آپریشن...... سب ہوتے ہیں ایک پیسہ نہیں لگتا۔ ہاں وقت لگتا ہے، لائنوں میں لگنا پڑتا ہے باری کا انتظار کرنے کے لیے لیکن سفارش ہو تو یہ بھی نہیں...... میں اپنے بھائی کو فون کر دیتی ہوں تمہیں جتنی چھٹی لینی ہے، لے لو اپنے اماں ابا کو بلا لو، یہاں سے کوئی آدمی ساتھ کر دیتی ہوں۔ ساتھ رہائش کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

قدسیہ نے اپنے طور پر سارا انتظام کر دیا مگر اس وقت کھٹک سی گئیں، جب بجائے ممنونیت یا خوشی کے گلابو کے چہرے پہ مایوسی اور کوفت دیکھی۔

"جی اچھا......" وہ بے دلی سے کہہ کر مڑ گئی تو قدسیہ کچھ سوچنے لگیں۔

"رانی......" پھر زوردار آواز لگائی۔

"جی بی بی جی!" وہ بھاگتے ہوئے آئی۔

"ذرا فون لانا تو...... ماسی جنتے کا نمبر ملاؤں۔"

قدسیہ کے دل میں ہزار وسوسے جاگ رہے تھے۔

☆======☆======☆

"کیا سوچ رہی ہو قدسیہ؟"

بڑے ملک نے اپنی ذہین سمجھ دار اور قابل بیوی قدسیہ سے پوچھا۔ جو فیکٹری کا آدھے سے زیادہ انتظام نہایت خوبی سے سنبھالے ہوئے تھیں۔

"وہ گلابو نہیں ہے؟"

"گلابو؟"

"وہی جو ماسی جنتے کے توسط سے آئی ہے۔"

"ہاں وہ لڑکی، جو گھر میں بھی رہ رہی ہے۔ ہاں کیا ہوا اسے؟"

"مجھے کچھ کھٹک سے رہے ہیں اس کے اطوار۔"

"تم تو بڑی تعریفیں کر رہی تھیں کہ بڑی تیز ہے۔ سالوں کا کام ہفتوں میں سیکھ لیا ہے ذہین بھی ہے اور طور طریقے، تعلیم والی بھی۔"

"وہ سب تو ہے لیکن پتہ ہے۔ آج اس نے مجھ سے پورے دو لاکھ روپے قرض مانگے۔"

"اور تم نے دے دیئے؟" بڑے ملک نے تیوری چڑھائی۔

"اب ایسی بھی فدا نہیں ہوں میں اس پہ۔ کہہ رہی تھی کہ باپ کا علاج کرانا ہے جب میں نے باپ کو بلانے اور لاہور میں مفت کا علاج کرانے کی پیش کش کی تو بجائے خوش ہونے کے منہ اُتر گیا اس کا۔"

"ہوں......"

"جیسے باپ کی بیماری سے سروکار نہ ہو......بس دو لاکھ سے مطلب ہو۔"

"پھر؟"

"پھر کیا......میں نے ماسی کو فون ملایا۔ وہ اتنے قریبی تعلقات ہونے اور ساتھ رہنے کے باوجود اس کے باپ کی بیماری سے لاعلم ہیں۔"

"یعنی اس نے جھوٹ بولا ہے۔"

"بالکل......اور یہی سوچ رہی ہوں میں کہ کیا وجہ ہوگی جو وہ جھوٹ بول رہی ہے اور اتنی بڑی رقم کا بھی مطالبہ کر رہی ہے۔ میں نے رانی سے اگلوانے کی کوشش کی ہے۔ بڑی ہے وہ بھی......سہیلا پے کا لحاظ کر کے منہ نہیں کھول رہی لیکن مجھے دوسرے ملازموں سے اُڑتی اُڑتی خبر ملی ہے کہ کسی لونڈے کے فون آتے ہیں گلابو کے لیے اور رانی اس کی راز دار بنی ہوئی ہے۔"

"چھوڑو بھی یہ ملازموں کے قصے......" ملک نے بیزاری ظاہر کی۔ "اب مجھے کوئی کام نہیں رہ گیا جو تمہاری دو ٹکے کی نوکرانیوں کے معاشقوں کی رُوداد سنوں۔"

شوہر کا مزاج گرم ہوتے دیکھ کر قدسیہ فوراً سنبھلیں۔ اس گھر کے مردوں کا یہی وتیرہ تھا......کاروبار کے علاوہ دوسری کسی فکر یا ٹینشن کو سر پہ سوار کرنے کے روادار نہیں تھے، چاہے بیوی بچوں کے حوالے سے ہی ہو۔

"میں تو بس یونہی۔" پھر انہوں نے فوراً موضوع بدل دیا۔

☆======☆======☆

کام میں دل تو کیا لگتا......دھیان تک نہیں لگ رہا تھا۔ صبح سے یہ تیسرا فریم غلط چڑھایا تھا۔ نظر بچا کے دوبارہ شروع کیا مگر پھر سارا ڈیزائن غلط ہو گیا۔

وہ سخت الجھی ہوئی تھی......یاسر پردیس میں تھا......مشکل میں تھا، وہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی......یہ سوچ کر ہی دل ڈوبا جا رہا تھا بس نہیں چل رہا تھا کسی طرح پنکھ لگ جائیں اور وہ اُڑ کے جائے......یاسر کو سب کی نظروں سے بچا کے لے آئے۔

"سنو تم، گلابو ہے نام تمہارا؟"

بڑے ملک نے اس کے قریب رک کے زور سے پکارا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

"جی......" وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔ بڑے ملک اور چھوٹے ملک کا فیکٹری سے برائے نام ناتا تھا۔ وہ دوسرے کاموں میں مصروف رہتے۔ کوئی ایک کاروبار تھوڑا ہی تھا۔ یہ کام چونکہ قدسیہ نے بخوبی سنبھال رکھا تھا اسی لیے دونوں بھائی اس طرف سے بے نیاز تھے۔

"میرے دفتر میں آنا۔ بات کرنی ہے۔"

وہ چند منٹ بیٹھی الجھتی رہی۔

"جی......فرمایئے۔" کچھ دیر بعد وہ اس کے روبرو تھی۔

"سنا ہے تمہیں دو لاکھ روپے کی ضرورت ہے۔"

"جی؟"

"کسی نے بتا دیا ہوگا کہ یہ لفظ تمہارے منہ سے اچھا لگتا ہے۔" وہ عجیب انداز میں مسکرایا۔

"اسی لیے ہر بات میں جی، جی کر رہی ہو۔"

اس بار گل نے اگلا "جی" ہونٹوں تک آنے سے بمشکل روکا۔

"ویسے بھی مجھے جی، جی کرنے والی لڑکیاں پسند ہیں۔"

پھر قدرے سنجیدہ ہوا۔

"بتایا نہیں تم نے، کس لیے ضرورت ہے اتنی بڑی رقم کی۔"

"بس......ہے ضرورت......ذاتی مسئلہ ہے۔"

اب کے اس نے ابا کی بیماری کی داستان سنانے سے پرہیز کیا......کیا پتہ یہ بھی مفت علاج کے لارے دینے لگتا۔

"چلو...... ہوگا۔ مجھے عادت نہیں زیادہ کرید کی...... میں صرف مدد کرتا ہوں...... چھا
بین اور تفتیش نہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے ٹیبل کی دراز کھولی اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر لہرائی۔

"پورے دو لاکھ ہیں۔"

گل کے سینے میں دل پھڑ پھڑا کے رہ گیا۔

"تمہارے ذاتی مسئلے کے حل کے لیے۔"

گڈی اس نے ٹیبل پہ رکھ دی۔

"نہ قرضہ ہے نہ تنخواہ میں کٹوتی۔ صرف اور صرف امداد۔ خدا ترسی اور ہمدردی کے نا
پہ۔"

گل نہ اتنی سادہ تھی نہ زمانے کے چلن سے انجان کہ واقعی اسے صرف اور صرف خ
ترسی اور ہمدردی سمجھ لیتی لیکن مصلحت کا تقاضا تھا کہ اسی بیان کو سچ مان لیا جاتا۔

"صاحب! میں آپ کا یہ احسان......"

اس نے گڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر بڑے ملک نے دوبارہ اٹھالی تھی۔

"احسان کیسا...... یہ لین دین تو چلتا رہتا ہے۔ عورتیں ہوتی ہیں کچھ تھڑ دلی۔ قدر
سے مانگنے کی ضرورت کیا ہے، اب جب بھی کچھ چاہیے ہو جتنا بھی چاہیے ہو، مجھ سے لے لیا
کرو۔"

"کس حساب میں؟" اس نے چتون تیکھے کیے۔

میسنی صورت اور دبے دبے نقوش والا یہ مرد ہزار بار کا دیکھا ہوا تھا لیکن آج کافی ے
بھی زیادہ بدلا بدلا لگ رہا تھا۔

"حساب کتاب کیسا؟ کیسی غیروں والی بات کر رہی ہو؟"

"پھر بھی......" گل نے اسے کھلنے پہ آمادہ کرنے کے لیے مسکراہٹ کا سہارا لیا۔ تدبیر
کارگر ٹھہری...... ملک کا حوصلہ بڑھ گیا۔

"کچھ خاص نہیں...... تمہاری بڑی بی بی ہفتے بعد جب میکے کا پھیرا لگاتی ہے تو کمرہ خال
ہوتا ہے، سُونا سا...... چند سیڑھیاں ہی تو اترنی ہیں تم کو۔"

ادھر لب سے مدعا آزاد ہوا، ادھر نوٹوں کی گڈی دوبارہ آگے کی گئی...... جسے گل نے
مضبوطی سے تھاما۔

"تم میری امانت ہو گل...... اپنا غرور، اپنا طنطنہ کھونے نہ دینا...... مجھے تمہارے اس

اٹھے ہوئے سر سے محبت ہے۔"

یاسر کی سرگوشی آس پاس گونجی تھی اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔

"کیا کرنے جا رہی ہوں میں...... بے شک یاسر کے لیے...... یاسر کی ہی خاطر......
لیکن یاسر کے جذبات کو کچل کر میں یہ نہیں کر سکتی۔"

اس کی نوٹوں پہ گرفت ڈھیلی پڑی۔

"کتنی خود غرض ہو تم...... صرف یہ ڈر ہے کہ یاسر سب جان گیا تو تم پہ تھوکے گا بھی
نہیں، تم اس کی محبت سے ہاتھ دھو لو گی۔ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب ادھورا رہ
جائے گا۔ لیکن یہ فکر نہیں ہے کہ یاسر کا کیا بنے گا۔ اس مشکل وقت میں اس کی مدد کرنا سب
سے زیادہ ضروری ہے۔ چاہے تمہارے اپنے خواب ٹوٹیں یا بکھریں۔ اپنی ذات سے بالاتر
ہو کر مجھے صرف اس کے بارے میں سوچنا ہے۔"

اس نے گڈی دوبارہ جکڑ لی۔

"اور اس کی ذات کے بارے میں سوچا؟ اس پہ کیا گزرے گی جب وہ یہ حقیقت
جانے گا۔ تمہاری قربانی تمہیں اس کی نظروں میں عظیم نہیں بنائے گی، نظروں سے گرا دے
گی...... وہ اس طرح ٹوٹ جائے گا کہ پھر کبھی نہیں سنبھلے گا۔ اس مشکل سے تو شاید وہ ڈوب
کے ابھر بھی جائے مگر تمہارے ارزاں ہونے، بک جانے کے دکھ سے وہ کبھی باہر نہیں آ
سکے گا۔"

اور اگلے ہی لمحے اس نے پوری طاقت سے گڈی بڑے ملک کے منہ پہ اچھال دی......
اس کے چہرے سے لگ کر نوٹ چاروں اطراف بکھر گئے۔ وہ بڑبڑا کے رہ گیا مگر اس کے کچھ
کہنے سے قبل ہی وہ وہاں سے نکل چکی تھی۔

☆======☆======☆

صغیر احمد پریشانی کے عالم میں الماری کی چیزیں الٹ پلٹ کر رہا تھا۔ کونے میں حلیمہ
کھڑی ناخن چبا رہی تھی۔

"آخر کہاں رکھ دیئے میرے کاغذات؟ میں نے کہا بھی تھا کہ یہ بہت ضروری ہیں؟"

"وہ پتہ نہیں...... یہیں تو رکھے تھے۔"

"یہیں رکھے تھے تو مل جاتے۔ اور لاکر میں کیوں نہیں رکھے جبکہ میں نے وہیں رکھنے
کو کہا تھا۔"

اس بات کا جواب حلیمہ کے پاس نہیں تھا...... دوسرے بہت سے جوابوں کی طرح۔

"ملے؟" جہاں آرا اندر داخل ہوئیں اور آتے ہی تفتیشی انداز میں سوال داغا۔

صغیر احمد نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔

"تمہیں کسی حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ اس عورت پہ بھروسہ کرو۔ اپنے ہاتھوں سے ر میاں۔"

"کیا کروں میں...... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" وہ سر پکڑ کے نڈھال سا بیٹھ گیا۔

"اور تم چھپکلی کی طرح دیوار سے چپکی کیوں کھڑی ہو بے چارہ صغیر احمد بوکھلا کے ر ہے۔ کچھ ہاتھ پیر تم بھی ہلاؤ۔"

انہوں نے حلیمہ کا بازو پکڑ کے جھنجھوڑا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ صغیر احمد کا شکنوں سے اٹ گیا۔

"لو بھلا......" جہاں آرا نے ناک پہ انگلی رکھ کے حیرت کا اظہار کیا۔

"ایسا کون سا بھالا کھینچ مارا میں نے۔ بہت نازک پری بن رہی ہو۔" حلیمہ کی آواز احمد کے پہلے سے تنے اعصاب پہ ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔

"چپ کرو حلیمہ!" وہ کراہا۔

"نحوست پھیلا رکھی ہے اس سارے خاندان نے ماں ہے تو بد زبانی میں ماہر، ہے تو آوارگی میں اول نمبر اور سب سے ناکارہ وجود...... ہمارے مقدر میں، نہ جانے کیا اولاد پیدا کی ہے جنت بیگم نے۔ کوڑھ مغز اور کند ذہن۔"

حلیمہ اور زور زور سے رونے لگی۔

صغیر احمد کو خود پہ بھی ترس آیا اور اس پہ بھی۔

"بس بھی کریں اماں! بات کوئی اور ہے آپ کوئی اور مسئلہ چھیڑ بیٹھی ہیں۔"

"سب تمہاری شہ ہے۔ یہ ٹسوے بہا لیتی ہے تم موم ہو جاتے ہو۔ ابھی تو نہ شکل عقل اس پہ یہ عالم ہے کہ شوہر کو کاٹھ کا اُلو بنا رکھا ہے۔ اگر ذرا جو شکل وصورت کے دماغ والی بھی ہوتی تو بیچ کھاتی تمہیں۔"

صغیر احمد کا یوں بیوی کی دبی دبی سی حمایت کرنا انہیں ذرا نہ بھایا اور وہ بڑبڑ کرتی سے نکل گئیں۔

صغیر احمد نے بے بسی سے حلیمہ کو دیکھا وہ...... سسکیاں بھر رہی تھی۔

وہ اٹھا اور اس کے پاس آ کے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"بس...... روؤ مت حلیمہ! اماں کی بات کا کیا برا ماننا۔ ان کی عادت ہی ایسی ہے۔"

"میں اماں کی بات کا نہیں......" وہ سسکی۔

"مل جائیں گے کاغذات بھی۔" صغیر احمد نے دلاسا دیا۔ "رکھے تو تم نے اسی کمرے میں تھے۔ بس اب چپ ہو جاؤ۔"

"میں اس وجہ سے بھی نہیں رو رہی۔" حلیمہ نے کرتے کی آستین سے آنسو صاف کرتے ہوئے بتایا۔

"میں تو...... میں تو نمو کی وجہ سے رو رہی ہوں۔ اس کا آج کا پرچہ رہ جائے گا۔ چھنو جلدی چلی گئی ہے اپنے بھائی کے ساتھ۔ اب نمو کس کے ساتھ کالج جائے گی۔"

"ٹیپو کہاں ہے؟"

"وہ تو کل سے......" بتاتے بتاتے رک گئی۔

"پھر غائب ہے؟" جواب نہ ملنے پہ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "جاؤ...... نمو سے کہو، میں چھوڑ آتا ہوں اسے۔"

"آپ؟ تو پھر کاغذ کون ڈھونڈے گا؟"

"نہیں چاہئیں مجھے کوئی کاغذات......" اکتاہٹ سے کہتا وہ باہر نکل گیا۔

"نہیں چاہئیں؟ لو بھلا پھر ڈھونڈ کیوں رہے تھے اتنی دیر سے؟" وہ حیران پریشان سوچتی رہ گئی۔

☆======☆======☆

بڑے ملک کی رہ رہ کے یاد آتی باتیں اسے رہ رہ کے تاؤ دلا رہی تھیں۔

"کمینے مرد...... تنگ دلے ایک رات کے لیے بیوی کمرہ خالی چھوڑ جائے تو انہیں سُونا سُونا لگنے لگتا ہے، بستر کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے اور خود جب مہینہ مہینہ زمینوں سے واپس نہیں آتے تب بیویوں کو کیا یہ خالی پن...... یہ تنہائی نہیں ستاتی ہو گی۔"

اسے حیرت بھی ہو رہی تھی کہ اتنے مہینوں سے یہاں رہنے کے باوجود اب تک اس شخص کی اصلیت اس پہ کھلی کیوں نہیں تھی۔ اس سے پہلے بڑے ملک نے اسے کبھی نظر بھر کے بھی نہ دیکھا تھا وہ تو اسے اچھا خاصا شریف مرد اور نیک شوہر سمجھے ہوئے تھی...... شاید مجبور عورت سب سے تر نوالہ اور آسان شکار نظر آتی ہے۔

اس سے پہلے میری کوئی مجبوری بھی تو اس کے علم میں نہ تھی۔

"چند سیڑھیاں ہی تو اترنا ہیں تم کو۔" یہ آفریاد آتے ہی وہ نئے سرے سے سلگ اٹھی۔

"چند سیڑھیاں؟ نہیں کوئی کیا جانے یہ کتنی ہزار سیڑھیاں ہیں جو مجھے نیچے...... بہت

نیچے پہنچا دیں گی۔"

اس نے صاف انکار کر تو دیا تھا۔ ملک کے منہ پہ اس کی دی ہوئی رقم بھی مار آئی تھی قرار نہ آ رہا تھا پھر اس نے قدسیہ کو سب کچھ بتانے کا فیصلہ کیا۔

"ذرا بڑے ملک کو بھی تو پتہ چلے..... قدسیہ آپا ایسی سیدھی بھی نہیں..... جینا نہ حرام دیا مردود کا تو نام بدل دینا۔"

وہ منہ پہ ہاتھ پھیرتی نئے عزم کے ساتھ قدسیہ کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

"کون ہے؟" دستک کے جواب میں بڑے ملک کی آواز پہ وہ جم کے رہ گئی۔

"یہ..... اس وقت گھر پہ؟"

اس سے پہلے کہ وہ جواب دیئے بغیر چپکے سے وہاں سے کھسک جاتی، دروازہ چوپٹ کھل گیا..... ملک سامنے تھا۔

"تم..... ؟ اس وقت؟" وہ مکروہ انداز میں مسکرایا۔

"اتنی بے قراری..... ابھی تو چڑھتا سورج ہے میری جان، ذرا رات تو ڈھلنے دو۔"

گل کوئی کرارا سا جواب دیتے دیتے رک گئی اور صرف ایک نفرت سے بھرپور نظر اس پہ ڈال کے پلٹنے لگی۔

"سنو....." بڑے ملک کی سرگوشی میں تحکم بھی تھا اور عجیب سی سرسراہٹ بھی جس اسے تھم جانے پہ مجبور کیا۔

"میری شکایت لگانے آئی تھیں اپنی بی بی سے؟"

"کیوں، ڈرتے ہو بیوی سے؟" وہ پھنکاری۔

"ڈرنا تو تمہیں چاہیے تمہاری وہ رازدار سہیلی سارے بھید کھول چکی ہے تمہارے۔"

گل بری طرح چونکی۔

"رانی..... یہی نام ہے ناں اس کا؟ تمہارے یارانے کے بارے میں وہ سب اگل چکی ہے۔"

"اس نے سب کچھ کہہ دیا آپا سے؟" وہ حیرت سے بڑبڑائی۔

"نہیں..... فی الحال تو بات مجھ تک ہی ہے لیکن اگر تم نے مجھے غصہ دلا دیا تو میں بات قدسیہ تک بھی پہنچا سکتا ہوں۔ وہ بالکل پسند نہیں کرے گی کہ جس غریب اور مجبور لڑکی پر ترس کھا کے اور اعتماد کرتے ہوئے اس نے اپنے گھر میں پناہ دی، روزگار دیا۔ وہ اس کی آنکھ کے نیچے ایسے کھیل کھیلے۔ ایک منٹ میں نکال باہر کرے گی وہ تمہیں۔ نوکری سے بھی اور گھر

سے بھی۔"

واپس اس جھگی میں جانے کا تصور بھی گل کو کراہیت آمیز احساس سے دوچار کر رہا تھا۔

وہ کشمکش میں کھڑی ملک کے بگڑتے نقوش دیکھتی رہی۔

"پتا ہے..... آج جمعرات ہے۔" وہ اس کے کان کے قریب سرگوشی کر رہا تھا۔

وہ بدک کر پرے ہٹی۔

"تمہاری آپا کے میکے جاکے رہنے کی رات اور میرے لیے مرادوں والی رات، آ جاؤ گی تو تمہاری مرادیں بھی پوری ہو جائیں گی۔"

وہ کسی ٹرانس کے عالم میں چلتی وہاں سے ہٹ گئی۔

دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔

دل میں قیامت کا شور بپا تھا۔

مگر وجود جیسے نیند کے عالم میں حرکت میں تھا۔

"گلابو!" قدسیہ کی آواز پہ وہ اس بھنور سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگی۔

"فیکٹری نہیں گئیں اب تک؟" وہ سٹور میں سے نکلتی پوچھ رہی تھیں ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔

"بس..... جانے والی تھی۔" اس وقت اس کے چہرے پہ ایسی مردنی چھائی تھی کہ اس کی جانب سے بدگمان اور مشکوک ہوئی قدسیہ کو بھی ترس سا آ گیا۔

"اچھا..... ذرا میرے ساتھ بچوں کا سامان پیک کرانا۔"

وہ بچوں کے کمرے کی جانب مڑ گئیں..... تو گل کو بھی پیچھے پیچھے جانا پڑا۔

"ایک رات کے لیے جانا ہے مگر بچوں کی سو طرح کی چیزیں رکھنی ہوتی ہیں۔" وہ الماری کھول کے کھڑی ہو گئیں۔

"بہت ضروری ہے جانا؟" اس کا دل چاہا، قدسیہ کو جانے سے روک لے۔

"ہاں ضروری بھی ہے..... ویسے تو ہر جمعرات کو جاتی ہوں جمعے کی شام کو واپس آتی ہوں مگر آج رات میرے چاچا کے بیٹے کی بات بھی پکی ہونی ہے۔ برادری میں ہی ہو رہی ہے لیکن خاصا بڑا فنکشن ہے۔ ملک صاحب تو جا نہیں رہے۔ وہ کم ہی ایسی تقریبات میں جاتے ہیں۔ شادی پہ پھر بھی جانا پڑ جائے گھڑی دو گھڑی کے لیے تو دوسری بات مگر منگنی، سالگرہ یا بات پکی ہونے جیسے فنکشن..... توبہ کرو۔ کہتے ہیں ہر طرف عورتوں کو دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔"

"گھبراہٹ یا کھجلی......؟" گل نے بمشکل زبان تک آتا فقرہ روکا۔

"میرا جانا تو ضروری ہے......اسی کی تیاری کر رہی ہوں...... دیکھو ذرا کتنا سامان ہے......فنکشن پہ پہننے والے جوڑے الگ...... رات میں پہننے والے الگ......کل دن پہننے والے الگ......ایک ایک مزید احتیاطاً رکھ لیا ہے، کہیں گھومنے پھرنے یا ملنے ملا پروگرام ہی بن جاتا ہے بچوں کا ساتھ ہوتے، چپلیں، جیولری، میک اَپ الگ۔ ارے میں ذرا ہیئر ڈرائیر تو رکھ لوں...... وہاں یہ ہے تو مگر استعمال کرنے والے بھی درجن بھر کس کے ہاتھ آنا ہے۔"

وہ یونہی سامان پھیلاتے ہوئے باہر کو گئیں اور گل بے دلی سے ان کے بچوں کے کپڑے تہہ لگا لگا کے بیگ میں رکھنے لگی۔

"جو تمہیں ایک بار بھی پتا چل جائے کہ جس وقت تم یہ سولہ ہزار کی ساڑھی، چار پا لاکھ کا زیور پہن کے، بارہ ہزار کا میک اَپ کروا کے فنکشن میں دوسری عورتوں سے ا خوبصورتی اور فٹ نیس کی داد وصول کر رہی ہوتی ہو تو عین اسی وقت تمہارے ہی کمرے تمہارا ہی شوہر تمہاری ہی کسی ملازمہ کو جو تمہاری ہی اترن پہن کر تمہارے ہی بستر پہ بیٹھی ہے، اس کے حُسن کو خراج تحسین پیش کر رہا ہوتا ہے، تب کیا گزرے گی تم پہ...... ساڑھی کے پُرزے پُرزے کر دو گی اور یہ زیور گہنے ایک ایک کر کے پھینک......"

زہریلے انداز میں سوچتے سوچتے اسے جیسے ڈنک سا لگا۔ وہ بے یقینی سے بیڈ پہ ر زیورات کے کھلے ہوئے ڈبے دیکھنے لگی جو تعداد میں آٹھ تھے...... ابھی ابھی اس کے سا قدسیہ نے بات کرتے کرتے نکال کے باہر رکھے تھے اور گل کو پورا یقین تھا، اسے نہ تو یہ یا گا کہ اس نے کون کون سا زیور نکالا ہے نہ یہ یاد ہو گا کہ کتنے ڈبے نکالے ہیں۔ چند سیکنڈ ہی اس کے تیز دماغ نے ساری پلاننگ کر لی۔

وہ پھرتی سے اٹھی اور ایک ایک کر کے ڈبے کھولے...... ایک ملتانی کڑوں کا سیٹ تھا...... پورے چھ بھاری بھاری کنگن...... سائیڈوں کے دو ذرا زیادہ بھاری اور درمیان چار نسبتاً ہلکے، اس نے درمیانی چار میں سے دو نکالے، دوسرے ڈبے میں دبئی سے آئی درجن سونے کی نفیس چوڑیاں تھیں، چار پانچ یہاں سے پار کیں...... اسی طرح باقی کے ڈبے میں سے بھی کسی میں سے انگوٹھی...... کسی سے بُندے نکالے، کہیں جھومر اُڑا لیا...... یہ احتیاط صرف اس لیے تھی کہ پہلی نظر میں قدسیہ کو کسی گڑبڑ کا احساس نہ ہو...... اور دوسری نظر نظر میں تو وہ ویسے بھی اس کی پہنچ سے دور ہونے والی تھی۔

قدسیہ کے کمرے میں دوبارہ آنے سے پہلے پہلے اس نے ایک پرانے دوپٹے کی پوٹلی سی بنا کے اسے تیزی سے بیڈ کے نیچے ڈال دیا اور خود دوبارہ بیگ تیار کرنے لگی۔

"یہ ڈرائیر بھی رکھ دینا میک اَپ کے بیگ میں۔" قدسیہ آئیں اور اسے ڈرائیر پکڑانے کے بعد خود زیورات والے ڈبے چرمی بیگ میں ٹھونسنے لگیں۔ گل خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ قدسیہ نے اچٹتی سی ایک نظر اس پہ ڈالی۔

"بہت چپ چپ ہو؟"

"نہیں......بس ایسے ہی وہ ابا یاد آ رہا تھا۔"

گل نہیں جانتی تھی کہ قدسیہ اماں جنتے کی وساطت سے اس کے ابا کی خیریت دریافت کر چکی ہیں۔

"اچھا......" قدسیہ کو لگا جیسے وہ غلطی پہ ہوں...... شاید اماں جنتے کو زیادہ پتہ نہ ہو اور بے چاری کا باپ واقعی بیمار ہو۔

"ہو کیوں نہیں آتیں وہاں سے۔" قدسیہ نے گل کی مشکل آسان کر دی۔

"آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی...... میں یہی کہنے والی تھی مگر جھجک رہی تھی کہ ابھی تو لی تھیں چھٹیاں۔"

"کوئی بات نہیں...... ہو آؤ...... بلکہ ابا کو لے آنا۔ ساری بات بتا دینا علاج والی...... میں اپنے بھائی کو فون کر دوں گی۔"

"جی...... مہربانی۔" وہ ممنون سی ہو کر اٹھی اور قدسیہ ملازمہ کو آوازیں دینے لگیں، سامان اٹھوا کے گاڑی میں رکھوانے کے لیے۔

"تم ذرا میرا کمرہ اپنی نگرانی میں صاف کروا کے بند کر دینا۔"

"جی اچھا۔" وہ مسکرائی اور کیوں نہ مسکراتی سب کام اس کی مرضی کے مطابق ہو رہے تھے اور خود بخود۔

☆======☆======☆

"تم نے اتنی بڑی رقم کا انتظام کہاں سے کیا؟" یاسر نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

جواب اس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

"اپنی بی بی جی سے قرضہ لیا ہے؟"

"اتنا بڑا قرضہ؟" وہ بے یقین تھا۔

"قرضہ تو وہ میرے دل کی تسلی کے لیے کہہ رہی ہیں۔ ورنہ بہت دینے دلانے والی خدا

ترس خاتون ہیں، لاکھ دو لاکھ کی امداد کرنا ان کے لیے بڑی بات نہیں۔"

"مجھے کسی کی خیرات نہیں چاہیے۔" یاسر کی اکڑ جاگی۔

"نہ جانے صدقہ نکالا ہے یا زکوٰۃ۔"

"صدقہ ہو یا زکوٰۃ اس وقت ہماری جو پوزیشن ہے اس میں یہ بھی جائز ہے۔" وہ تپ لہجے میں بولی۔ "تم اپنا فلسفہ مت جھاڑو، مجھے صرف یہ بتاؤ یہ رقم تم تک پہنچانی کیسے ہے؟"

اور یاسر اسے طریقہ کار سمجھانے لگا۔

☆======☆======☆

"چھوری...... تُو فیر آ گئی؟"

بھاگاں نے اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"کیوں؟ پابندی ہے کوئی؟" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی...... کہاں کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا۔ اس کی مرضی کے عین مطابق اور کہاں پلاننگ کے اس موڑ پہ سب گڑبڑ ہو گئی۔

زیور بیچنے اور یاسر تک رقم ٹرانسفر کرنے کے فوراً بعد اس کا ارادہ تھا فیصل آباد کے لیے نکل جانے کا...... اسی فیکٹری میں ایک خاتون کا آنا جانا تھا...... بوتیک کا کام کرتی تھی، اس نے کئی بار قدسیہ سے چھپ کر گل کو آفر کی تھی اپنے ہاں ملازمت کی لیکن ایک تو گل چند سو کے فرق کے پیچھے اتنا اچھا ٹھکانا چھوڑ کے انجان شہر میں جانے کا رسک لینے پہ تیار نہیں تھی۔ دوسرا یاسر کی اس شہر میں موجودگی اسے باندھے ہوئے تھی۔ اب جب یاسر بھی یہاں نہیں تھا اور اس کا مزید رکنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کا سوچا...... مگر شومئی قسمت کہ بوتیک والی خاتون کا نمبر ان کے شوہر نے ریسیو کیا اور یہ اطلاع دی کہ وہ دس دن بعد عمرے سے واپس لوٹیں گی۔ گل کے تو ہاتھ پیر پھول گئے...... قدسیہ کے ساتھ اتنا ہاتھ کر دینے کے بعد اب اس میں قطعاً یہ حوصلہ نہ تھا کہ وہ یہاں رکتی...... فیصل آباد جانا بھی بے کار تھا۔ ایک ہی حوالہ تھا اس کے پاس اور وہ عورت اگلے تین دن اسے ملنے والی نہیں تھی۔ ناچار اسے یہاں آنا پڑا۔

"نوکری سے جواب تے نئیں مل گیا؟"

"ہاں...... مل گیا ہے۔"

"لے کر لے گل۔" بھاگاں نے افسوس سے دونوں ہاتھ ملے۔

"اتنا تتا مزاج ہے تیرا...... میں تاں پہلاں ہی کہتی تھی کہ تُو نوکری کرنے والی وا نئیں، کر آئی ہوگی پھڈا۔"

"تم فکر مت کرو مفت کی روٹیاں نہیں توڑوں گی۔ ایک آدھ دن میں ہی بندوبست کر لوں گی اپنا۔"

"لے کون کہتا ہے تجھے۔" صدورا اندر آتے ہوئے لہجے سے شیرینی ٹپکاتے ہوئے بولا۔

"میرے کو کیا تیری روٹیاں بھاری لگے ہیں۔ تُو تو میری اکورانی دھی ہے شالا جوانیاں مانے...... میں تاں اب واپس ہی نہ جانے دوں گا۔"

گل کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اپنی اس مختصر سی زندگی میں اس نے باپ کی جانب سے پہلے کبھی اس شفقت و محبت کا مظاہرہ نہ دیکھا تھا۔

"نی بھاگاں...... مر جانیے کوئی پرونٹھے تل میری شہزادی کے لیے۔"

وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی...... جب باپ کے ایک حکم پہ ماں اٹھی اور پرات بھر کے آٹا گوندھنے لگی۔

☆======☆======☆

"اے...... ٹیپو! شش......"

وہ کبوتروں کو دانہ ڈال رہا تھا جب برابر کی چھت سے چھنو نے اسے آواز دی۔

"کیا ہے؟" وہ بدتمیزی سے چلایا۔

"شش...... آہستہ۔" چھنو نے ذرا ڈرتے ہوئے ہونٹوں پہ انگلی رکھی۔

"آ جاتی ہے بڑے دیدوں والی...... کالی بوتھی والی...... اور ڈانٹ ہمیشہ مجھے کھانی پڑتی ہے...... ذلیل کمینی۔"

وہ چھت سے کنکر اٹھا اٹھا کے غصے سے اس پہ مارنے لگا۔

"کیا کر رہے ہو؟ پاگل ہو سچ مچ کے۔"

چھنو نے دونوں ہاتھ آگے کر کے خود کو بچایا۔

"تُو ہوگی پاگل...... شکل بھی پاگلوں والی ہے...... دیدے باہر کو ابلے ہوئے جیسے مری ہوئی مینڈکی اور رنگ دیکھا ہے اپنا جیسے چھپکلی کا پیٹ...... اوں غوں۔"

گندی گندی مثالیں دے کر اس کا اپنا ہی جی متلانے لگا۔

"دفع...... اپنی شکل دیکھی ہے، خود جیسے بڑے حسن کے پیپے ہو...... گز بھر کا لمبا منہ...... وہ بھی سوکھے اچھور جیسا، چھ فٹ کا چھوہارا ہے تُو۔" جلی بھنی چھنو نے دل کی بھڑاس نکالی۔

"ذرا لفٹ کیا دیتی ہوں، بکواس ہی کیے جاتا ہے۔"

"نی......" خورشید نے اوپر آتے ہوئے للکارا۔

"کیا کہانیاں ڈال کے بیٹھی ہے تُو؟"

چھنو نے جو کیم شحیم خورشید کو ہانپتے ہوئے اپنی جانب لپکتے دیکھا تو جھٹ اُڑن
گئی۔

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہہ رہی تھی حُسن کا پیاسا ہوں میں اور لفٹ دے دیتی ہوں اور پتہ نہیں کیا کیا......

"ڈورے ڈال رہی تھی تجھ پہ؟" خورشید نے ٹیپو کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"واہ...... میں لحاف ہوں جو مجھ میں ڈورے ڈالے گی۔"

"جھلے...... وہ والے ڈورے نہیں دوجے والے۔"

"اچھا وہ...... وہ تو اس نے تم سے لیے ہوں گے۔ اماں کہتی ہیں تم نے بھی ابا پہ
ڈورے ڈالے تھے۔"

"ایک تو آپاں کی زبان دن بدن کھلتی جا رہی ہے...... میرے خلاف تیرے دل
میل بھر رہی ہے۔"

"دل میں بھی؟" ٹیپو نے افسوس سے سر ہلایا۔

"کتنا نہاؤں میں...... پچھلے ہفتے تو نہایا تھا لال صابن مل کے کالا کر دیا تھا
میل...... کانوں میں میل...... دانتوں پہ میل، گردن پہ میل اور اب دل میں بھی......"

☆======☆======☆

"گلابو ولد صدورا یہیں رہتی ہے؟"

لیڈی کانسٹیبل نے جھگی کے باہر کھڑے ہو کر کڑک دار آواز میں تصدیق چاہی
گوندھتی گل کا دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی تو ایک رات گزری تھی صرف...... اتنی جلد
چل گیا قدسیہ آپا کو......

"ہاں پر۔" صدورا خوف زدہ بھی تھا اور متذبذب بھی۔

"تم کون ہو؟"

"صدورا...... گلابو کا پیو۔"

"نکالو اپنی لڑکی کو باہر۔"

"کی اے تھانیدار نیے...... کیوں رولا پا رہی ہے؟"

بھاگاں کمر پہ ہاتھ رکھے اس کے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی۔

"کیوں نکالوں میں اپنی چھوری کو...... کیا کیا ہے اس نے؟"

"ڈاکہ ڈالا ہے...... رپورٹ درج ہوئی ہے اس کے خلاف۔ جہاں جا کے زیور بیچا
ہے، اس جگہ کا بھی پتہ چل گیا ہے۔ جیولر نے تصویر دیکھ کر گواہی دی ہے کہ اس لڑکی نے اس
کے پاس دو لاکھ سولہ ہزار مالیت کا زیور بیچا ہے۔"

"دو لکھ......" صدورا چکرا کے رہ گیا۔

بھاگاں کے بھی ہوش اُڑ گئے۔ کبھی وہ لیڈی کانسٹیبل اور سپاہیوں کو دیکھنے لگتی...... کبھی
گردن موڑ کے اپنی جھگی کی جانب ٹکر ٹکر تکنے لگتی جہاں گل موجود تھی۔

"بلاؤ اسے باہر ورنہ ہمیں اندر جا کے گھسیٹ کر نکالنا ہو گا۔"

"گلابو...... اے چھوری۔"

بھاگاں کی کپکپاتی لرزتی صدا بلند ہوئی۔

اندر دبک کر بیٹھی گل کا رنگ اُڑ گیا۔

کتنی بھی جی دار سہی...... کتنے ہی بڑے رسک ہنستے کھیلتے لے لینے والی...... ہر کام میں
بلا جھجک اور بنا انجام سوچے ہاتھ ڈال لینے والی مگر تھی تو ایک انیس سالہ لڑکی......
پولیس تھانے کے خوف سے اس کی رنگت زرد پڑ رہی تھی۔

"نہیں آتی...... لگتا ہے ٹھڈے مار کے، بال گھسیٹ کر لانا پڑے گا۔" لیڈی کانسٹیبل
دھڑلے سے آگے بڑھی۔

"ٹھہرو......"

ایک گونج دار آواز پہ وہ رکی۔

اندر بیٹھی گل کے حواس بھی جھنجھنا اٹھے۔

"کوئی ہاتھ نہ لگائے گلابو کو۔"

☆======☆======☆

"ہمت دیکھو اس کی...... کیسے لاکھوں کا زیور لے اُڑی...... ایک آدھ انگوٹھی کھسکائی
ہوتی...... بٹوے سے ہزار کا نوٹ نکالا ہوتا تو میں چھوڑ بھی دیتی۔ ایسی چھوٹی موٹی چوری
چکاری ساری نوکرانیاں کرتی ہیں...... کس کا داؤ نہیں چلتا...... مگر یہ...... یہ تو پیشہ ور لگتی ہے۔
لگتا ہے ماسی جنتے نے زبردست دھوکا کھایا ہے۔"

قدسیہ کھول رہی تھیں...... اور بڑا ملک مونچھوں کو تاؤ دیتا گم صم تھا۔

"وہاں جاتے ہی جو میں نے تیار ہونے کے لیے ڈبے کھولے تو میرا ماتھا ٹھنکا......

چالاک ایسی کہ پورا سیٹ کوئی بھی نہ اڑایا...... سب میں تھوڑا تھوڑا ہاتھ صاف کیا اور پر
لے کر گھر بھی جانے کا پروگرام بنالیا۔ میں نے بھی سوچنے میں وقت ضائع نہ کیا اور فوراً
کو فون کر دیا...... دو دن چھتر کھاتی رہے گی تھانے میں تو اگلی پچھلی ساری وارداتیں اگل
گی۔“

”ہوسکتا ہے اس کی پہلی غلطی ہو۔“

ملک نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ اسے اپنے لپیٹ میں آنے کا خوف ستا رہا تھا۔

”لگتا تو نہیں...... ایسی صفائی سے اور اعتماد سے کیا ہے اس نے یہ سب کہ جیسے یہ
پیدا ہوئی ہے اور وہ جو فون وغیرہ آتے تھے اسے کسی مرد کے، مجھے لگتا ہے عاشق معشوق
نہیں۔ اس کے ٹولے کا ساتھی ہوگا۔ دیکھ لینا۔ ابھی پتہ چل جائے گا کہ کس گروہ سے تعلق
اس کا۔ بخشوں گی تو نہیں میں۔“

☆======☆======☆

”خبردار جو کسی نے اندر قدم بھی رکھا۔“

شوکے نے للکارتے ہوئے سپاہیوں کو جھگی میں جانے سے روکا۔

”تم کون ہو؟“ ایک حولدار نے تیوری چڑھا کے پوچھا۔

”میرا جوائی۔“ صدورا جلدی سے آگے بڑھا۔ شوکے کو آتے دیکھ کر اس کا حوصلہ
تھا۔ چوہدری منظور کے ساتھ اتنے سال رہنے کی وجہ سے اس کے بڑے تعلقات تھے۔

”اچھا، تو شادی شدہ ہے ملزمہ؟ اوئے تم بیوی کے کرتوتوں سے واقف ہو یا ہم
کے ساجھے دار؟“

”ناں جی...... گلابو تے کنواری آں...... ایہہ میرا وڈا جوائی...... وڈی کا مرد۔“ بھا
نے وضاحت کی۔

”کس نے درج کرائی ہے رپورٹ؟ کون ہے وہ سورما...... سامنے تے آئے ذ
شوکے نے للکارا۔

جواباً لیڈی کانسٹیبل نے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

”گل بات کراؤ میری اس پارٹی سے۔ دیکھتے ہیں کتنے میں معاملہ مکتا ہے۔“

”دو لاکھ کا معاملہ ہے...... وہ لوگ آرام سے نہیں بیٹھنے والے۔“

”اوئے شوکے کو بڑے بڑے بٹھانے آتے ہیں...... نہ بیٹھے تو لٹا دے گا شوکا“
نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

لیڈی کانسٹیبل ذرا دب سی گئی۔

”ٹھیک ہے مگر یہ سب باتیں بعد کی ہیں۔ ابھی تو کارروائی ہر حال میں پوری کرنی
ہے۔ لڑکی کو تھانے لے کر جانا ہی ہے۔ پھر جو وہ لوگ چاہیں۔“

”گلابو تھانے نہیں جائے گی، تے نہیں جائے گی۔“ شوکے نے حتمی انداز میں کہہ دیا۔

باہر سے آتی آوازیں سنتی گل کے اندر نیا حوصلہ جاگ رہا تھا۔

”کیوں؟ تمہارے پاس قبل از گرفتاری ضمانت ہے۔“

”اوئے شوکا یہ بکواس نہیں جانتا...... بس اکو گل جانتا ہے کہ ساڈی کڑی تھانے نہیں
جائے گی...... ہے کسی مائی کے لال میں دم تے آگے ہو اور ہاتھ لگا کے دکھا۔“ وہ زور سے
گرجا۔

اس بار صدورے نے بھی اپنی اندر دھنسی چندانچ کی گردن باہر نکال لی اور مدبر سا نظر
آنے کی کوشش کرنے لگا۔

”قانونی کارروائی میں خلل ڈالا تو تمہیں بھی ساتھ ڈال لیں گے جیپ میں۔“

”اوئے کوئی لینے والی گل کر...... کتنے میں گل نمٹانی اے۔“ شوکے نے جیب میں ہاتھ
ڈالا اور لیڈی کانسٹیبل اور سپاہیوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا۔

☆======☆======☆

”چھوری...... گھنی، کرتوتوں والی نکلی تُو تو......“ بھاگاں اس کے سر پر پہنچی کچوکے لگا
رہی تھی۔ ”دو لکھ دا زیور...... کدھر چھپا کے رکھا ہے؟“

”مائی...... میرے منہ نہ لگ......“ گل نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”بھلا...... پلس بوئے (دروازے) پہ ہے اور اس کے نخرے......“ بھاگاں نے اس
کے بازو پہ زور کی چٹکی بھری...... وہ بلک اٹھی۔

”جلدی دس (بتا) کدر رکھا ہے زیور......؟“

”بیچ دیا ہے۔ بتایا تو ہے پولیس نے۔“ وہ بازو سہلاتے ہوئے ناگواری سے بولی۔

شوکے کے آجانے سے اور پولیس کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو جانے سے ذرا حوصلہ
ملا تھا اسے۔ جب ہی بات کر پا رہی تھی ورنہ کچھ دیر قبل تک تو گھگھی بندھی جا رہی تھی۔

”ہے...... چھوری......“ بھاگاں نے انگلی ناک کی موٹی کیل پہ رکھتے بھرپور حیرت کا
اظہار کیا۔

”مطلب کہ تُو نے سچی میں چوری کی ہے......؟ میں نے سمجھا کہ پلس جیاستی (زیادتی)

بات کر رہی ہے۔''

''ہاں کی ہے میں نے چوری...... کون سا بٹہ لگا دیا ہے تمہارے اعلیٰ نسب خاندان پہ...... کون سی اگلی پچھلی سات نسلوں کے منہ پہ کالک تھوپ دی ہے۔'' وہ پھاڑ کھانے دوڑی۔

''بوہتی بکواس نہ بک...... پیسے نکال۔''

بھاگاں نے بھی آنکھیں دکھائیں...... گل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

اسے اپنے ماں باپ کے بارے میں قطعاً کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ جانتی تھی وہ حد سے زیادہ لالچی، موقع پرست اور طوطا چشم ہیں لیکن یہ دھچکا پھر بھی لگا کہ اس وقت جب کہ کوٹھڑی سے چند قدم کے فاصلے پہ پولیس کھڑی ہے اسے تھانے گھسیٹنے کی بات ہو رہی ہے تو اس نازک موقع پہ بھی وہ اس کی فکر کرنے یا اسے بچانے کا سوچنے کے بجائے رقم کا مطالبہ کریں گے۔

''میرے پاس کوئی پیسہ نہیں ہے۔''

''لے...... گل کرتی ہے۔ پیسہ نہیں ہے۔ دو لکھ کا زیور بیچا ہے تو کدر گیا پیسہ......؟''

''خرچ ہو گیا۔''

''بک بک بند کر۔ مرونڈا لے کر کھا گئی ہے دو لکھ کا۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں، میرے پاس دو ہزار بھی نہیں ہے۔ وہ زیور میں نے چرایا ضرور تھا مگر تم لوگوں پہ سے وارنے کے لیے نہیں۔ جس کام کے لیے لیا تھا، وہی کام پورا کیا ہے اور اب میں خالی ہاتھ ہوں۔''

''تیرے خالی ہتھاں میں لگیں گی اب ہتھکڑیاں۔ بتا کون سے یار کو دے کر آئی ہے پیسہ۔''

''ہاں...... یار کو دے کر آئی ہوں۔ کرلو جو کرنا ہے۔''

''میں کی کرنا...... کرے گی تو اب پلس...... تیری ہڈیاں سینکے گی تھانے میں، تب سواد آئے گا تجھے اکیلے پیسہ ہضم کرنے کا خصماں کھانی۔''

''یہ کیا شور مچایا ہوا ہے ماسی؟''

ہمیشہ دستک دے کر یا کھنکھار کر اندر آنے والا شوکا اس بار بے دھڑک اندر گھس آیا اور بھاگاں کے ہاتھ میں گل کی چٹیا دیکھ کر بڑھک ماری۔

''پھڑ (پکڑ) اس کی بانہہ...... اور دے پلس کے ہتھ میں۔''

بھاگاں نے گل کی کمر میں دھموکا جڑ کے اسے آگے کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کے گرنے کو تھی

کہ شوکے نے لپک کر اسے سنبھال لیا۔

''دماغ خراب ہے ماسی؟ اپنی لڑکی کو پلس کے ہتھ دے رہی ہے۔''

''یہ میری کڑی نہیں، ساک (دشمن) ہے میری۔ شریکے میں سے ہے۔'' بھاگاں غصے سے بے قابو ہو رہی تھی۔ صدورا بھی اندر چلا آیا۔

''کی (کیا) کھپ اے؟''

''تیری اولاد کا سیاپا رو رہی ہوں۔ یہ خصماں نوں کھانی دو لکھ کلے کلے (اکیلے) ڈکار گئی ہے اوپر سے کہتی ہے یار کو دے آئی ہوں۔ نہ تیرا کون سا یار ہونا ہے۔ تُو پیو کی سگی نہ بن سکی تو کس کی بنے گی۔''

''اچھا یعنی ڈاکے مار مار کے تیری جھولی حرام کی کمائی ڈالتی رہوں تو تب سگی...... یا پھر مروفاں کی طرح بے غیرتی کی زندگی جیتی رہوں تب سگی؟''

مروفاں کے ذکر پہ شوکے کے منہ کا ذائقہ تلخ ہو گیا۔

''چلو بس کرو رولا (شور) ایسا نہ ہو میں نے پلس کی جیب گرم کر کے واپس بھیجا ہے، وہ مڑ (پلٹ) آئے۔

''چلی گئی پولیس!'' گل نے بے یقینی سے پوچھا۔

''کیسے نہ جاتی۔ میرے ہوتے کوئی ہتھ لگا سکتا ہے تجھے۔''

شوکے نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سرمے سے بھری آنکھیں بڑے عاشقانہ انداز میں اس پہ گاڑ کے کہا۔

''پورے دو لکھ اسی ہزار پہ گل مکی ہے۔''

صدورا کے لہجے میں ملال گھلا تھا...... جیسے گل کے بدلے یہ ساری رقم اس کی جیب سے جا رہی ہو۔

''دو لکھ بیس ہزار روپیہ ان بخیل لوگوں کے منہ پہ مارنے کے لیے اور ساٹھ ہزار پلس کی جیب میں۔''

شوکے نے فخریہ انداز میں اپنی کارکردگی جتائی۔

''اب کوئی مائی کا لال ہتھ تو لگا کے دکھائے میری عورت کو۔''

گل سر سے پیر تک کانپ گئی۔ اس نے تڑپ کے ماں کو دیکھا، وہ خود منہ پھاڑے کبھی شوکے کو تو کبھی صدورے کو دیکھ رہی تھی جو تھکے ہارے انداز میں پیروں کے بل کچی زمین پہ بیٹھا تھا۔

داسی ڈھولن یار دی

"اب میں چلا ذرا ہٹی (دکان) پہ، نمانے (بچے) کدر سنبھال پاتے ہیں۔ دھیان رکھنا پڑتا ہے کاروبار کا اور پھر ابھی دو لکھ اسّی ہزار روپے کا ٹیکا لگا ہے، یہ تو بھی پورا کرنا ہے۔ چنگا فیر...... رب راکھا۔"

وہ ہکا بکا کھڑی گل کو دیکھ کر ایک مسکراہٹ اچھالتا نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی بھاگاں نے اپنی چھاتی پیٹ ڈالی۔

"میری دوجی (دوسری) کڑی بھی ڈکار گیا سنپولیا۔ کانی اکھ والا اور صدورے نوں چاپ سنتا رہا جب وہ گلابو کو اپنی زنانی آکھ (کہہ) رہا تھا۔"

"جس نے دو لکھ اسّی ہزار دے کر چھڑائی ہے، زنانی اسی کی۔" صدورا چلایا اور خونخوار نظروں سے گل کو گھورنے لگا۔

"کی کی (کیا کیا) سوچیا تھا اس...... کے بارے میں۔ ایہو ای (یہی) تین لکھ آپ شوکے کے کھیسے (جیب) سے نکلواتا تو سواد بھی تھا۔ پیسہ بھی اُڑ (بہہ) گیا اور کڑی ہتھ سے گئی۔ ساڈے (ہمارے) ہتھے کی رہیا۔ ککھ وی نئیں۔"

اور بھاگاں نے اٹھ کے تابڑ توڑ اسے پیٹنا شروع کر دیا جو اب تک سکتے کے عالم میں تھی۔

"گھاٹے دی اولاد...... جونک...... ہور کج نئیں تے او ہی دو لکھ دے جا جو زیور کھرے کیے تھے۔ کج تے سکھ دے جا ماں پیو کو۔"

گلابو نے نہ ماں کے تابڑ توڑ برستے ہاتھ روکے...... نہ منہ سے سسکی نکالی۔ دم چاپ پٹتی رہی اور قسمت کے اس اچانک پلٹے کے بارے میں حیران ہوتی رہی۔ اس حال کے بارے میں تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا، نمٹتی کیسے۔ یہاں سے یاسر کو فون بھی نہیں کر سکتا تھا۔ خط وہاں تک پہنچنے میں ہی کتنے دن لگ جاتے اور شوکا...... وہ تو ایسی ناگہانی تھا جو کسی بھی وقت اس پہ ٹوٹ سکتا تھا۔

اور ایسا ہی ہوا...... اس کی جانب سے ایک گھنٹے بعد ہی پیغام آ گیا کہ شام کو نکاح کے لیے تیار رہے۔ وہ مولوی لے کر آ رہا ہے اور یہ پیغام لانے والی کوئی اور نہیں، شوکے کی تیسری بیوی رفیعہ تھی جو ایسے کھا جانے والے تیوروں کے ساتھ گل کو گھورے جا رہی تھی اس کے ہاتھ آنے پہ پرزہ پرزہ ہی تو الگ کر کے رکھ دے گی۔

"شام...... اور شام میں دیر ہی کتنی ہے۔"

گل نے ظہر کی اذان کو گونجتے سنا اور اپنی دھڑکن ڈوبتے ہوئے محسوس کی۔ الا

اس تاریک بوسیدہ متعفن کوٹھری میں سوگ کا عالم تھا۔ بھاگاں اسے رونے پیٹنے اور کوسنے کے بعد نڈھال سی ایک جانب پڑی تھی۔ نہ جانے سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی۔ صدورا جلتا کڑھتا باہر کی خاک چھاننے نکل پڑا تھا۔ ظاہر ہے، تقریباً تین لاکھ کا گھاٹا ہوا تھا اسے۔ گل کے بدلے یہ تین لاکھ وہ آسانی سے شوکے سے ہتھیا سکتا تھا۔ لیکن اب اسے کچھ نہیں ملنے والا تھا۔ شوکا جتنے پیسے ایک عورت کے لیے خرچ کر سکتا تھا وہ کر چکا تھا، اس کی بلا سے یہ پیسے گل کے ماں باپ کے پاس جاتے یا ان لوگوں کے پاس جن سے اس نے گل کی گلو خلاصی کرائی تھی۔ وہ اسے جیت چکا تھا۔ خرید چکا تھا اور اب کچھ ہی دیر میں اپنی جیت کا جشن منانے آنے والا تھا۔

گل نے اپنے سامنے پڑے آتشی گلابی کامدار جوڑے کو کراہیت آمیز نظروں سے دیکھا، جس میں سے اب تک کسی کے پسینے کی بدبو آ رہی تھی۔ نہ جانے شوکے کی دوسری بیوی کی اترن تھا یا تیسری کی۔ خریدی ہوئی عورت پہ کون اتنی فیاضی دکھائے کہ اسے نئے گہنے لتے لے کر دے، پہلے ہی وہ اسے خاصی مہنگی پڑی تھی۔ اس لیے نکاح کے لیے آیا سب ہی سامان استعمال شدہ تھا۔ سلوٹوں سے پُر کریپ کا کامدار آتشی گلابی جوڑا، کامدار دوپٹہ...... جو جگہ جگہ سے مسلا ہوا تھا اور جس کا دبکا مدھم پڑ رہا تھا۔ سونے کا گلوبند جو شاید کسی کی گردن کی ساری میل اتار کے سیاہی مائل ہو رہا تھا۔

اور...... شوکا...... جو خود کئی بار...... کئی عورتوں کا استعمال شدہ تھا...... گل کو گھن کے مارے ابکائی آنے لگی۔ اس نے پیر مار کے پاس پڑے سامان کو چارپائی سے نیچے گرایا۔ خود چپل پیروں میں اڑسی اور سیدھی اماں جنتے کے پاس جا پہنچی۔

"اماں! مجھے بچا لو۔ مجھے شوکے کے ہتھے نہیں چڑھنا۔"

اس نے کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت اور بے تاثر بیٹھی اماں جنتے کے پیر تھام کے دہائی دی۔

"اماں......! مجھے نہیں بکنا...... مجھے نہیں رہنا ایسے مرد کے ساتھ جو میری بہن کی دلالی کرتا رہا ہو۔"

"وہ بھی تو ایسی عورت کو نکاح کر کے اپنے ساتھ رکھنے جا رہا ہے گلابو! جس کے نام پہ چوری کا بٹہ لگ چکا ہے۔"

آخر اماں جنتے کے منہ سے الفاظ نکلے بھی تو وہ...... جو اسے گنگ کر گئے۔ وہ ویران نگاہوں سے انہیں تکتی گئی۔ البتہ اس کے ہاتھ جو اماں جنتے کے سفید جھریوں والے پیروں پہ

جمے تھے، سرد پڑتے گئے۔

"گلابو.....! تُو نے چوری کی تھی؟"

اس باران کے لہجے میں ایک آس تھی جیسے وہ جلد از جلد اس کا جواب سننا چاہتی ہو اور وہ جواب ہر حال میں انکار میں ہو۔

"بتا میری بچی! یہ جھوٹ ہے...... بہتان ہے...... ہے ناں......؟ بول......"

جیسے جیسے اس کی خاموشی کا دورانیہ طویل ہوتا گیا، ویسے ویسے ان کی بے تابی اضطراب بڑھتا گیا۔

وہ چپ رہی...... کہنے کو کچھ نہ تھا۔

سچ سننے کی ان میں تاب نہ تھی۔

جھوٹ بولنے کی اس کی ہمت نہ تھی۔

پھر اس نے اماں جنتے کی آنکھوں میں وہی سناٹا اترتے دیکھا جو اس کی ذات کو وہ میں لیے ہوئے تھا۔

ان کا صرف ایک نظر دیکھنا...... گل کو نظریں چرا لینے پہ مجبور کر گیا۔ کیونکہ اس ایک میں پچھلے دس گیارہ سالوں کی تربیت اور علم کے صلے کا مطالبہ تھا اور وہ یہ صلہ ادا کرنے اب قابل نہ رہی تھی۔

اس نے نظر چرائی اور اماں جنتے نے ایک جھٹکے سے اپنے پیر اس کے ہاتھوں سے لیے۔

"اماں......" وہ ہراساں ہو اٹھی۔ یہ آخری سہارا بھی کھونے کو تھا۔

"مجھے یہ ناپاک ہاتھ نہ لگا گلابو...... تُو جانتی ہے، نبی سوہنے صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم مطابق یہ ہاتھ اب کٹیں گے تو تیرا وجود پاک ہوگا۔ مجھے یہ ہاتھ نہ لگا۔ یہ ہاتھ اللہ اور اس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق سزا کے حق دار ہیں۔ مجھے گناہ گار نہ کر ناپاک نہ کر...... جا تُو یہاں سے......" وہ سرد لہجے میں کہتی وہاں سے اٹھ گئیں۔

"اماں......! یہاں سے نکل کر میں کہاں جاؤں۔ یہی تو میرا ٹھکانہ ہے۔ آپ کو ہے میں یہاں......" اس نے نہ جانے کیا یاد دلانا چاہا تھا مگر وہ سننے پہ تیار نہ تھیں۔

"اتنے سالوں اس صحن میں بیٹھ کر تُو نے کیا پایا گلابو! جواب پائے گی۔ مجھے تو خو افسوس ہو رہا ہے کہ میں تجھے اتنے عرصے میں کچھ نہ بنا سکی۔ نہ اچھی انسان مسلمان......"

وہ اس کی جانب پیٹھ کر کے وضو کرنے لگیں اور گلابو من من ہوتے قدموں کو گھسیٹتے ہوئے وہاں سے نکلنے لگی۔

دروازے کی چوکھٹ پہ کھڑے ہو کر اس نے ایک آخری نظر اس چند فٹ چوڑے، لال اینٹوں والے صحن پہ ڈالی۔

اس ایک نظر میں وہ سارے منظر سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ اس کونے میں اس نے اماں جنتے کو پہلی بار بیٹھا دیکھا تھا وہ ہلکے گلابی ململ کے بڑے سے دوپٹے کی بکل مارے محلے کے بچوں کو قاعدہ پڑھا رہی تھیں۔ تب وہ اتنی کمزور نہیں تھیں۔ چہرہ بھرا بھرا سا تھا بال بھی سفید ہونے ابھی شروع ہی ہوئے تھے۔ اسے ابھی تک یاد تھا یہی وہ پہلا چہرہ تھا جس پہ اسے دیکھ کر مسکراہٹ ابھری تھی بڑی ملائم...... بڑی شفیق سی مسکراہٹ۔

اور پھر اس دن صرف گلابو کی خاطر...... ایک کمی کی لڑکی...... ایک چنگڑ کی بیٹی کی خاطر انہوں نے گاؤں کے متمول گھرانے کی بہو کو ناراض کیا تھا، اس کے بچوں کو جو معاوضہ دے کر پڑھتے تھے، واپس بھجوانا گوارا کر لیا مگر اس فاقوں کی ماری کو گھٹنے کے ساتھ لگا کر بٹھا لیا، جس کے گھر والے ان کے مشکور ہونے کے بجائے الٹا آ آ کے باتیں سنانے لگے اپنی بچی کو ناکارہ بنانے کے الزامات کے ساتھ۔

اور وہ سیڑھیوں کے نیچے بنا مختصر سا باورچی خانہ...... وہ چولہا، جس پہ گارے کا لیپ بھی گل نے ہی کیا تھا پچھلی بار...... اسی چولہے کے پاس بیٹھ کر اس نے اماں جنتے سے ہی پہلی بار کچھ پکانا سکھا تھا۔

سوجی کا حلوہ......

اور وہ چوکی جس پہ بیٹھ کر وہ اماں سے اپنا جوؤں سے بھرا سر صاف کروایا کرتی تھی، جب وہ تنگ آ جاتیں یا بیٹھے بیٹھے کمر تھک جایا کرتی تو اکتا کے اس کے سر پہ چپت لگانے لگتیں۔

"کیا اب اس صحن...... اس چولہے...... اس چوکی پہ میرا کوئی حق نہیں رہا؟"

اس نے خود سے سوال کیا۔ وہ جب بھی یہاں سے جایا کرتی تھی، خالی دامن نہیں جاتی تھی۔ پلو سے ڈھیر ساری دعائیں اور نصیحتیں باندھ کے لے جاتی تھی اور جاتے جاتے بھی آخری سے جب مڑ کر دیکھا کرتی تو ان کے ہونٹ ہل رہے ہوتے۔ پتا نہیں کون سی آیت کا ورد کرنے کے بعد وہ اس کی جانب پھونکا کرتیں اور وہ سرشاری سی چل دیا کرتی لیکن آج وہ لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

"نہیں......کوئی حق نہیں رہا۔ آج یہ چوکھٹ آخری بار پار کرلے۔ بس......بس ا…
کے بعد تیری ایڑیاں ان پاک اینٹوں کو چھو بھی نہیں سکیں گی۔" اس کے دل نے اسے حدِ م…
کر کے سنادی۔

"اماں جی......!ایک بار......ایک بار میری بھی تو سن لیں۔"

اس نے شدت کے ساتھ چلا کر کہنا چاہا مگر لب پھڑ پھڑا کے رہ گئے۔ وہ جانتی تھی
اصل بات تو وہ مر کے بھی نہ بتا پائے گی اماں کو۔ اگر اس نے واقعی یہ رقم اپنے ماں یا باپ…
علاج کی خاطر چرائی ہوتی تو شاید وہ معاف بھی کر دیتیں لیکن یاسر......اس کا نام وہ ان…
سامنے لبوں پہ نہیں لا سکتی تھی۔ اس لیے اس نے دل کو پتھر کرتے ہوئے وہ چوکھٹ پار کرلی۔

☆======☆======☆

"اے آپاں......"

خورشید نے بڑے لاڈ میں آکر بڑے ہی چاؤ کے ساتھ اس کے پاس کھسکتے ہو…
تھا مگر وہ سنتے ہی منہ میں بھری پان کی پیک سنبھالتی جلدی سے بولیں۔

"پرے ہٹ......آپاں کی کچھ لگتی تُو......بداطوار......بدزبان۔"

"آئے ہائے آپاں......! تمہارا نام اتنا برا ہے کہ زبان پہ آتے ہی میں بدزبان…
گئی؟" خورشید نے کمال بھول پن سے پوچھا تو انہیں اور آگ لگ گئی۔

"میں کہے دیتی ہوں خورشید، میرے منہ نہ لگیو۔"

"نہیں لگتی۔ مجھے شوق بھی نہیں ہے پان کے گتاوے میں منہ لتھڑنے کا......میں تو
کہنے آئی تھی کہ کتنا عرصہ ہو گیا ہے ہمارے گھر میں شہنائی نہیں گونجی۔ ڈھولک نہیں بجی…
ناچ گانا نہیں ہوا، کوئی رونق نہیں لگی۔"

"یوں کہو کہ میکے کی یاد ستا رہی ہے۔"

جنت بیگم نے بڑا ڈھونڈ کے وار کیا۔ خورشید کے کسی چچا کو گانے کا شوق تھا، خود ہا…
مونیم دبا کے بجاتے ہی تھے بیاہ کر بھی کسی گانے والی کو ہی لے آئے، اسی بات کا طعنہ…
بیگم سوتن کو دیا کرتی تھیں۔

"میکے میں جو رونقیں لگا کرتی تھیں۔ وہ یہاں کہاں۔ یہاں نہ ہارمونیم کی…
پیں......نہ گجرے کی مہک......نہ گھنگروؤں کی چھن چھن......نہ پکے راگوں کی سا…
گاما......"

"ہاں بس چوبیس گھنٹے ایک تمہاری بک بک......" خورشید نے جل کر جواب دیا…

"ہر وقت سوتنا پا ہی نبھاتی رہنا......میں جو بگڑی ناں، تو اکیلی اس منجی پہ بیٹھی پان کی
جگالی کرتی رہ جاؤ گی اور وہ تمہاری اونچے خاندان والی جٹھانی......وہ تمہاری کڑمنی (سمدھن)
نہیں مزہ چکھا کے رکھ دے گی۔ ہونہہ بڑی آئی میکے کے طعنے دینے والی۔"

خورشید نے ان کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا اور اٹھ کے جانے لگیں۔

"اے خورشید......سن تو......میں تو مذاق میں......"

جنت بیگم کے ہاتھ پیر پھولے......واقعی یہ ایک حقیقت تھی۔ اس دبنگ شخصیت والی
جٹھانی کے آگے وہ اول دن سے دبی ہوئی سی رہتی آرہی تھیں۔ تاوقتیکہ خورشید نہ آگئی۔
خورشید کے آنے سے پہلے تو وہ سوتن کے جلاپے سے ہی ادھ موئی ہو گئیں اب جب کہ بیٹی
جوان ہو چکی تھی۔ بیاہنے کے لائق تھی۔ بیرسٹر صاحب کو نہ جانے کیا سوجھی جو ملتان سے یہ
سوغات اٹھا لائے جو کسی طرح بھی جنت بیگم کے ہم پلہ نہیں تھی۔ ذات برادری سے تو الگ تھی
ہی......طبقاتی فرق بھی نمایاں تھا اور پھر شکل وصورت......کہاں جنت بیگم......بادام کی سی
رنگت......بوٹا سا قد......نازک سراپا......مہین آواز......لکھنوی لب و لہجہ......سلیقہ......
خاندانی نجابت......اپنے زمانے کی مناسب تعلیم اور دوسری جانب خورشید......
اُجڈ......گنوار......پانچ فٹ نو انچ قد کے ساتھ پچاسی کلو وزن......گہری سانولی
رنگت......پاٹ دار آواز، موٹے نین نقش، کسی کام کا نہ طریقہ نہ سلیقہ......ذرا بھی تو متاثر کن
شخصیت نہیں تھی۔

"پتا نہیں کس ادا پہ مرمٹے ہوں گے بیرسٹر صاحب۔ کیا ان پھٹی ایڑیوں......کیا مہندی
رنگے پیلے ناخنوں والے، موٹی کالی انگلیوں والے مردانہ سے نظر آتے ہاتھوں پہ......جامنی
رنگ کے موٹے ہونٹوں پہ......یا ان سے جھانکتے بڑے بڑے مگر سفید دانتوں پہ جو ہر بات
پہ نکل آتے تھے یہ بات جنت بیگم اب تک نہ سمجھ پائی تھیں۔ اب تو خیر اس بارے میں سوچنا
ہی چھوڑ دیا تھا......مگر تب دن رات اسی بارے میں کڑھتی رہتی تھیں......جہاں آرا نے پہلے
ہی مت مار رکھی تھی، اوپر سے سوکن بھی آگئی۔ انہیں اپنے دن تمام ہوتے نظر آئے مگر پھر ایک
دن جو ایک ماہ پرانی بیاہ کے آئی دلہن خورشید کا دھواں دار معرکہ جہاں آرا بیگم کے ساتھ ملاحظہ
فرمایا تو دنگ رہ گئیں۔ یہ جوہر تو اب کھلا ان پہ اپنی سوتن کا۔

وہ جو دن رات سوچوں میں غرق خورشید کی ذات کا وہ پہلو تلاشتی رہتی تھیں جس پہ ان
کے تئیں بیرسٹر صاحب لٹو ہوئے ہوں گے۔ شاید یہی جی داری......یہی بے دھڑک پن ہوگا
اور وہ......وہ بھی فوراً ہی فدا ہو گئیں اور اپنی اس سوت سے دوستانہ گانٹھنے میں ہی اپنی بھلائی

جانی......اور گزرتے وقت نے ثابت کیا کہ ان کا وہ فیصلہ درست تھا، بھلے ان کے اس کے پیچھے ایک غرض تھی...... جہاں آرا کے مقابلے میں اپنا پلڑا بھاری رکھنے کی......لیکن رفتہ وہ جان گئیں کہ خورشید کی ذات میں صرف دو عیب تھے ایک تو یہ کہ قدرت نے ظاہری شخصیت ایسی دی تھی کہ اس کے بارے میں پہلا...... حتیٰ کہ دوسرا تیسرا تاثر بھی ناگوار ہی پڑتا تھا اور دوسرا عیب یہ تھا کہ وہ ان کی سوتن تھی۔

لیکن پھر وہ جاننے لگیں کہ اندر سے خورشید کیا تھی۔ وہ تازہ ناریل کے جیسی تھی...... سے سخت...... بہت زور سے ٹکرانے کے بعد پھوٹتی۔ مگر جب پھوٹتی تو جھر جھر میٹھا ٹھنڈا اندر سے بہنے لگتا۔

اور پھر جب وہ جنت بیگم کی خاطر سینہ ٹھونک کر جہاں آرا بیگم کے خلاف میدان اترنے لگیں تو سمجھو خورشید کے بغیر ان کا لقمہ تک توڑنا حرام ہو گیا۔ وقت گزرنے کے خورشید بھی اپنا یہ مضبوط ہتھیار اور اس کی قدر و قیمت جان گئیں اس لیے جب بھی دیکھتیں جنت بیگم کے تیور نخریلے ہو رہے ہیں، دینے لگتی تڑیاں اور جنت بیگم کے ہاتھ پیر پھول جاتے جیسے اس وقت پھول رہے تھے۔

"ذرا سا مذاق بھی برداشت نہیں کرتی...... لو بھلا...... اب ہم دو سکھیاں...... دو جے سنگ ہنسی ٹھٹھول بھی نہ کریں تو تنہائی کے جاڑے میں ٹھٹھر کے رہ جائیں۔ ادھر......نہیں تو......"

اور خورشید دل ہی دل میں مسکراتی......اوپر سے منہ بناتی دوبارہ گھٹنے سے گھٹنا جوڑ بیٹھ گئی۔

"اب بتا، کیا کہے جا رہی تھی۔"

"یہی کہ حلیمہ کے بیاہ کے بعد دوبارہ اس چھت پہ بتیوں کی لڑیاں نہ لٹکیں۔"

"شب برات اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم پہ لگاتے تو ہیں صغیر میاں۔"

"آئے ہائے آپاں...... مطبل تو سمجھا کر...... میں یہ کہہ رہی تھی کہ اتنے سالوں کوئی اور شادی نہیں ہوئی اس گھر میں......؟"

"تو کس کی ہوتی بھلا۔"

"لے اپنا ٹیپو...... شیر جوان ہے میرا پتر۔"

"گھاس چر گئی ہو کیا۔ ٹیپو کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"جیسے اوروں کی ہوتی ہے۔ اس کی کیا گرجے جا کے ہو گی؟"

"اس بھولا جبطا کو کون دے گا اپنی بیٹی۔ کسی کو بھاری ہو گی بھلا؟"

"کیسی ماں ہے تُو آپاں؟"

"ماں ہوں...... مگر اندھی نہیں ہوں خدانخواستہ......"

"میرا تو اتنا جی کرتا ہے کہ اپنے ٹیپو کے سر پہ سہرا سجے......اس کی دلہن آئے، اس کے ڈھیر سارے بچے ہوں، مجھے دادی دادی کہتے میرے کاندھے پہ چڑھیں۔ کوئی اِدھر سے کھینچے......کوئی اُدھر سے پکڑے۔"

خورشید کی اندر کو دھنسی گول آنکھوں میں الوہی سی چمک پیدا ہو کر انہیں بڑا خوبصورت اور نرم سا تاثر دے رہی تھی۔ جنت بیگم کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ کچھ جگنو خورشید کی آنکھوں سے اُڑتے ہوئے ان کی پلکوں کے کنارے بھی آ کے بیٹھنے لگے تو انہوں نے جلدی سے پلکیں جھپکتے ہوئے انہیں اس منڈیر سے اڑا دیا۔

"تمہارا کیا ہے خورشید......! تمہارا جی تو دسمبر میں آم کھانے کو بھی کرتا ہے۔ اپنے جی کی بھلی کہی تم نے......"

"بس مجھے نہیں پتا...... ٹیپو کی شادی کرا آپاں......"

"پاگل ہوئی ہے کیا...... گڈے گڑیا کی شادی کرا لے اتنا ہی بچپنا جاگ اٹھا ہے تو۔"

"آخر ٹیپو کی شادی پہ تجھے تکلیف کیا ہے؟" وہ تنک کر پوچھنے لگی۔ قریب تھا کہ لڑ ہی پڑتی۔

"مجھے کیا تکلیف ہو گی خورشید!" جنت بیگم کے لبوں سے آہ نکلی۔ "مجھے تو......" وہ دل کی بات بتاتے بتاتے رک گئیں۔ کہیں اس خواہش کا اظہار کی راہ مل گئی تو زیادہ منہ زور نہ ہو جائے۔

"مگر باقی لوگوں کو تو ہو گی...... سب سے زیادہ اس لڑکی کو جسے ہم بیاہ کر لائیں گے۔ اگر ٹیپو کے جوڑ کی ہی لائے تو کیا فائدہ...... ایک تو باؤلا ہے ہی، دوجی باؤلی لا کے گھر بھر اپنا ماتھا پھوڑے گا کیا؟ اور اگر بھلی چنگی لاتے ہیں تو یہ اس کے ساتھ ظلم ہو گا۔ ٹیپو خود کو سنبھالنے جوگا نہیں، بیوی کی ذمہ داری کیا نبھائے گا...... نہ...... میں تو نہ لوں کسی کی بددعا......اور پھر صغیر میاں...... ان پہ ایک اور بوجھ ڈالنے والی بات ہو گی۔ داماد بھی ہے...... بھتیجا بھی ہے......اس لیے چپ چاپ برداشت کیے جا رہا ہے ورنہ ٹیپو نے تو......"

"بس کرا آپاں...... میرے پتر کو زیادہ نہ کچھ کہہ......" خورشید کو ٹیپو میں کوئی عیب نظر ہی نہیں آتا تھا۔

''میں آپے لے آؤں گی اپنے لیے کوئی نوں (بہو) ملتانوں۔''

''خبردار......'' جنت بیگم فوراً سنجیدگی اور ملال کا خول تڑخ کر باہر نکلیں۔

''خبردار جوتُو اپنے جیسی کوئی دوسری دیونی یہاں لائی تو......غضب خدا کا ایک گوش پہاڑ کم ہے کیا......اینٹیں ہل گئیں ہمارے مکان کی۔ میرے سسر بہشتی نے اپنے وقتوں بنوایا تھا تو اب تک سلامت ہے ہوتا کوئی آج کے زمانے کا موئے سیمنٹ، پلستر کا بنا تو ہل گئی ہوتیں ایک ایک ستون کی اور یہ چلی ہیں اپنے خاندان کا دوسرا نمونہ لانے کے چپکی بیٹھی رہ......ہاں نہیں تو......''

☆======☆======☆

''ماسی......ماسی......تیرا ویاہ ہو رہا ہے؟''

گلی میں سے چھوٹا بھاگتا ہوا آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ وہ ابھی ابھی جنتے کے گھر سے نکل رہی تھی۔

''ابا کہہ رہا تھا تُو اب ماسی سے بے بے بن جائے گی میری......اور تو اور دونوں سے نکل کر ابے کے کوٹھے پہ چلے جائیں گے۔ ابے نے تیرے لیے پکا کوٹھا بنوایا ہے، اٹوں (اینٹوں) والا اور چٹی قلعی والی کندیں (دیواریں) ہیں ماسی۔ دس (بتا) ناں، اور گے اب؟''

گل نے خالی خالی نظروں سے اس میلے کچیلے......بہتی ناک والے اور ہر وقت رہنے والی آنکھوں والے بچے کو دیکھا۔ اسے اس کی اور ایسے ہی دو اور بچوں کی آیا ماں کے خیال نے ہی کھڑے کھڑے موت آنے لگی......وہ اس کی بہن کی اولاد تھی۔ اس کی کی جواب رہی نہ تھی۔ اب اسے یہ صرف شوکے کی اولاد لگ رہے تھے۔ کبھی اسے ان سے ہمدردی تھی......محبت تھی......انہیں کوڑا چنتے دیکھ کر اسے دکھ ہوتا تھا۔ ان کو دو سر چھوٹا کھاتے دیکھ کر اسے رونا آتا تھا۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ شوکا انہیں اپنے ساتھ جائے اپنے گھر تاکہ انہیں دو وقت پیٹ بھر کھانا تو مل سکے۔ شاید وہ انہیں سکول بھی داخل دے لیکن اب شوکا انہیں لے جانے پہ تیار تھا تو وہ بطور تاوان ساتھ جانے پہ تیار نہیں تھی اب اسے رہ رہ کے ان کے ہونے پہ ہی تاؤ آ رہا تھا۔

یہ نہ ہوتے......بلکہ مروفاں کی شادی نہ ہوتی شوکے سے......شوکا کبھی ان کی زند میں نہ آیا ہوتا......

مروفاں نہ مرتی......اگر مرتی بھی تو دوسری یا تیسری بیوی ہی سے شوکے کا دل

جاتا۔ اسے ایک اور شادی کا خیال نہ آتا۔

اگر آتا بھی تو گل اس کی پسند کے معیار پہ پوری نہ اترتی......

کاش یاسر نہ جاتا۔

جاتا تو اس کے ساتھ یہ حادثہ نہ پیش آتا۔

کاش بڑا ملک اس کی عزت کو خطرے میں نہ ڈالتا اور مایوسی کی آخری حد پہ جاتی انتقام اور بغاوت کے زہر سے ابلتی وہ قدسیہ کا زیور چرانے پہ مجبور نہ ہوتی۔

کاش......کاش......

یہ نہ ہوتا......جو سب ہوا ہے، وہ سب نہ ہوتا۔

لیکن یہ سب ہو چکا تھا اور جو آئندہ ہونا تھا، اسے ہونے سے روکنا تھا......وہ ایسی تھی ہی نہیں کہ خود کو حالات کے دھارے پہ بہتا چھوڑ دیتی......اپنے ساتھ قدرت کو ہر انہونی آرام سے کرنے دیتی۔

اس نے حقارت کے ساتھ چھوٹے کو پرے دھکا دیا۔

''جا دفع ہو......اپنے ابے کے پکے کوٹھے پہ......جا اپنے ساتھ اپنی کسی ہوتی سوتی مر جانی کو لے جا......''

اماں جنتے کے ٹھکرانے کے بعد وہ انتقاماً ایسی زبان عرصے بعد استعمال کر رہی تھی، جو انہوں نے جتن کر کے چھڑوائی تھی۔

''لیکن ماسی......!'' وہ خالہ کا یہ روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''جا......جا کے اپنے ابے کی میت رو......جا......''

اس کے دھاڑنے پہ وہ سرپٹ ننگے پاؤں لیے بھاگا......

گل نے دوپٹے کا پلو کھول کے دیکھا۔

ساڑھے تین سو روپے تھے۔

اس نے کانوں کو......ناک کو ہاتھ لگایا۔

سونے کی چھلکا سی بالیاں تھی......اور وہ ناک کی کیل جو یاسر نے جانے سے پہلے بنوا کے دی تھی۔

''یہ ذرا ذرا سی بات پہ ناک چڑھا لیتی ہوناں......اس کے لیے دے رہا ہوں کیل حالانکہ کیل نہیں......نکیل ڈالنا چاہیے تمہیں۔''

اس نے بظاہر چڑاتے ہوئے لیکن محبت سے بوجھل لہجے میں کہا تھا......ایسا ہی تھا

وہ...... کھل کے کبھی پیار نہیں جتاتا تھا...... بس اس کے انداز سے جھلک جاتا تھا۔

گل نے ناک کی کیل کو آہستہ سے سہلایا۔

یہ یاسر کی نشانی تھی۔ اس کا تحفہ...... اسے وہ زادِ راہ کے طور پہ بھی استعمال کرنا گوارا نہ کر سکتی تھی۔ البتہ بالیاں اتار کے ان ہی ساڑھے تین سو روپے کے ساتھ باندھ لیں اور گلی میں مڑ گئی۔ جو سیدھی بڑی سڑک پہ نکلتی تھی۔ وہاں سے وہ کسی بھی بس، ویگن کو ہاتھ دے کر روک لیتی۔ بھلے وہ کسی بھی شہر جا رہی ہو۔ اکیلی لڑکی کو دیکھ کر تو ضرور ڈرائیور از راہ ہمدردی بس روک ہی لے گا...... ویگنوں والے اڈے تک جانے کا نہ وقت تھا نہ وہ رسک لینا چاہتی تھی۔ اسے گھر پہ موجود نہ پا کے شوکے نے سب سے پہلے وہیں کا رخ کرنا تھا۔

تیز تیز قدموں کے ساتھ چلتی وہ سڑک پہ آئی۔ دن تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ شام ہونے ہی والی تھی۔ شام...... جس کے آنے سے پہلے پہلے اس نے یہاں سے دور نکلنا تھا۔

اس کی قسمت کہ سڑک پہ آتے ہی سامنے سے بس آتی نظر آگئی۔ اس نے روکا اور پوچھے بغیر سوار ہو گئی کہ یہ بس کہاں جا رہی ہے۔ وہ تو جب بس چل پڑی اور کنڈیکٹر ٹکٹ کے لیے آواز لگاتا اس کے پاس آیا تو پتا چلا......

"چالیس روپے...... مرید کے...... چالیس روپے...... مرید کے۔"

"مرید کے......" وہ چونک اٹھی۔

وہاں جانا تو خطرے سے خالی نہیں تھا۔

ایک تو شوکا سب سے پہلے وہاں پہنچتا...... کیونکہ وہیں وہ ملازمت کرتی تھی اور سب سے پہلا دھیان اسی جانب جاتا تھا اس لیے تو وہ یہ سوچے ہوئے تھی کہ بالکل کسی انجان جگہ چلی جائے گی۔

دوسرا وہیں سے وہ واردات کر کے بھاگی تھی۔ پولیس شوکے سے پیسہ لے تو گئی تھی کیا پتہ...... اور اگر قدسیہ یا بڑے ملک کی نظروں میں آجاتی تو وہ...... تو......؟ مرید کے کون سا بہت بڑا شہر تھا۔ اس کے گاؤں سے ذرا سا ہی بڑا...... جبکہ وہ ہجوم میں کھو جانا چاہتی تھی۔

"کدھر اترنا ہے بی بی؟"

بیس منٹ بعد ہی مرید کے کی حدود شروع ہو گئی۔

"ویگنوں کے اڈے۔" اس نے فوراً فیصلہ کر لیا۔

"آخری سٹاپ کی سواری۔" کنڈیکٹر نے چلا کر ڈرائیور کو اطلاع دی۔

گل نے سوچ لیا تھا وہ اس بس سے اترتے ہی کسی دور کے شہر جانے والی بس پہ چ

جائے گی۔ اتنا کرایہ تو ہے اور ایک وقت کے کھانے کے پیسے بھی...... آگے کا اللہ مالک ہے۔

"اڈا......" کنڈیکٹر کی آواز پھر گونجی...... گل بڑی سی کالی چادر سے خود کو اچھی طرح لپیٹے...... چہرہ آدھے سے زیادہ چھپائے ویگن سے اتری تو اس کے پاؤں میں ہوائی چپل تھی۔ پرانا، گھسا ہوا لان کا جوڑا، پلو سے بندھے تین سو روپے اور ہزار بارہ سو مالیت کی دو بالیاں اور چند سکے...... نہ کوئی گٹھڑی نہ کوئی سامان۔

وہ لوگوں میں گھس گھس کر چلتی...... دانستہ کسی کی نظروں میں نہ آتے ہوئے چل رہی تھی جب کسی سے بری طرح ٹکرا گئی۔

"اندھی ہے......؟"

وہ بڑی بدتمیزی سے اس پہ الٹ پڑا تھا۔ گل نے کرارا سا جواب دینے کے لیے پلو چہرے سے تھوڑا سا پرے کیا اور چلا اٹھی۔

"ٹیپو......"

☆======☆======☆

"ہائے...... ایمان سے کیا ظالم مسکراہٹ ہے کمینے کی۔"

چھنو ٹھنڈی سانس بھرتے زمین کے کاندھے پہ گری۔ دونوں اس وقت کالج گراؤنڈ میں آم کے درخت کے نیچے گھاس پہ بیٹھی کیریوں پہ نمک مرچ لگا کے کھا رہی تھیں۔

"کس کی......؟ کینٹین والے انکل کی......؟"

زمین نے چند لمحے غور کرنے کے بعد یہ سوال کیا تھا۔ کیونکہ پورے کالج میں اور تو کوئی مرد تھا نہیں۔

"لعنت ہے تم پہ...... وہی مچھر میلی بنیان والا رہ گیا ہے میرے لیے؟" چھنو بدمزہ سی ہو گئی، پھر کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے ساری بدمزگی بھول کر مسکرانے لگی۔

"میں تو ساجد کی بات کر رہی ہوں۔"

"یہ کون ہے؟"

"وہ ویڈیو والا۔"

"کون سا؟" زمین ان پہیلیوں پر ہمیشہ الجھتی تھی۔

"وہی...... یاد نہیں، آغا صاحب کے ہاں شادی پہ میں تمہاری فیملی کے ساتھ ہی تو گئی تھی...... یاد آیا......؟"

پورے علاقے میں صغیر احمد کے بعد آغا صاحب کا گھرانہ متمول سمجھا جاتا تھا۔ ان کے

گھر سے شادی کا بلاوا آیا تو چھنو بن بلائے ساتھ لٹک گئی تھی۔

"ہاں...... یاد آیا...... گئی تھیں تم ساتھ......" زرمین نے منہ بنایا۔

"اور کتنی ڈانٹ کھائی میں نے دادی جان سے۔ تم بھی تو تماشا ہو پورا۔ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ کی مکمل تفسیر...... مہندی میں شرارہ پہن کر، بارات میں ساڑھی پہن کر چلی آئی...... پورے سولہ سنگھار سمیت......"

"ہاں تو وہی شرارہ اور ساڑھی ہی تو جادو چلا گیا ساجد پہ...... ساجد اس فنکشن کی مووی بنانے آیا ہوا تھا۔ میرے اتنے اچھے اچھے پوز لیے ہیں اس نے کہ کیا بتاؤں اور وہ جو مہندی پہ ڈانس کیا تھا ناں میں نے...... جس پہ تم ڈیلے نکال نکال کر گھور رہی تھی۔ وہی "کوئی پردیسی میرا دل لے گیا" والا وہ مووی میں اتنا اچھا آیا ہے، کبھی دیکھ تو سہی۔"

"تُو نے مووی کہاں دیکھی......؟" ظاہر ہے آغا صاحب کے ہاں تو آنا جانا تھا نہیں۔

"ساجد نے دکھائی۔"

"کیسے......؟" وہ اور ہونق ہوگئی۔

"وی سی آر پہ لگا کے اور کیسے؟"

"مگر تُو اس سے ملی کیسے، کہاں...... اور کب......؟"

"وہیں فنکشن پہ جان پہچان ہوئی تھی اور جان پہچان ہو جائے تو ملنے ملانے میں کیا وقت لگتا ہے بھلا......"

"مگر فنکشن میں تو......" وہ سوچ میں پڑ گئی...... سارا وقت تو وہ چھنو کے ساتھ ہی تھی۔ پھر کب اور کیسے اس نے جان پہچان نکال لی۔

"اچھا...... اور وہ رفیق......" اس نے چھنو کے اس عاشق کا نام لیا جس پہ وہ چند دن پہلے تک مرا کرتی تھی۔ اور اس کے نہ ملنے پہ زہر پھانک لینے کے ارادے کیے جاتے تھے۔

"وہ......" چھنو نے چھینی ناک سکوڑی۔

"پتا نہیں...... ملا نہیں کتنے دنوں سے۔"

"وہ...... یا تُو نہیں ملنا گوارا کر رہی۔"

"تُو ہی تو کہتی تھی، رفیق کسی کام کا لڑکا نہیں دفع کر اسے، میں نے کر دیا دفع۔"

"زیادہ بنو مت چھنو......! میرے کہنے کو تم کیا اہمیت دیتی ہو یہ اچھی طرح پتا ہے مجھے...... مجھے تو رفیق شروع سے اچھا نہیں لگتا۔ محلے کا سب سے آوارہ اور نکما لڑکا

باز...... اوپر سے چھچھورا جی بھر کے...... تب تو میری ایک نہ سنی تم نے...... اور لگی رہی محبت کی پینگیں بڑھانے...... اب وہ مووی والا...... کیا نام ہے اس کا......"

"ساجد......" چھنو جھٹ بولی۔

"ہاں...... وہ مل گیا تو اسے دفع کر دیا اور احسان میرے سر......"

"نہ ناں...... میں نے قسم سے تیرے لیے رفیق کو......"

وہ معصوم بن کر کہہ رہی تھی۔

"رہنے دو...... رہنے دو...... بڑی آئی میرے لیے...... اتنا ہی ہے تو اب میرے لیے اس ساجد سے ملنا چھوڑ......"

چھنو ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔

☆======☆======☆

"چل آ...... تجھے نان کباب کھلاتا ہوں۔"

ٹیپو اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ رہا تھا۔

"نہیں...... بھوک نہیں ہے۔"

وہ بازار تو ہرگز نہ جانا چاہ رہی تھی۔

"تُو نے بھی تو کھلائے تھے مجھے...... میں کسی کا احسان نہیں رکھتا۔"

"پھر سہی ٹیپو...... ابھی مجھے جانا ہے۔"

"کہاں؟"

اس سوال پہ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"آہا...... تمہیں بھی نہیں پتا...... مجھے بھی نہیں پتا...... مزے......" وہ تالیاں بجانے لگا۔

"ہم دونوں کو نہیں پتا ہمیں کہاں جانا ہے، اکٹھے چلیں؟"

اس کی پیش کش پہ گل کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

اس نے ذرا غور سے ٹیپو کا جائزہ لیا۔

وہ شاید آج کل میں گھر سے نکلا تھا۔ حالت ابھی دگرگوں نہیں ہوئی تھی۔ بال بھی پچھلے دنوں کروائی حجامت کے بعد مناسب لگ رہے تھے، سرمئی شلوار قمیص پہلے کی نسبت تو بہت صاف ستھری تھی۔ پُرشکن البتہ ضرور تھی۔ یعنی کل ملا کے وہ اتنا گیا گزرا بہرحال نہیں لگ رہا تھا جتنا پچھلی ملاقات میں لگ رہا تھا اور اگر منہ بند رکھے تو شاید ہی کسی کو گمان ہو کہ وہ نیم دیوانہ ہے۔

''بیس پچیس برس کا لبوترا مرد ہے۔ ساتھ ہو تو یہ جو آتے جاتے سارے موٹی موٹی
آنکھیں نکال کر گھورے جا رہے ہیں، یہ تو باز رہیں گے اور پتا نہیں قسمت کس شہر میں لے
جائے۔ اکیلی ہونے سے تو بہتر ہے اسی لولے لنگڑے سہارے کو غنیمت جان لیا جائے۔'' اس
نے فیصلہ کیا اور مسکرا کے ٹیپو کو دیکھا۔

''کیوں نہیں...... تمہارے ساتھ واقعی مزہ آئے گا۔''

''پیسے بھی ہیں میرے پاس...... یہ دیکھ۔''

اس نے قمیص ذرا سی اٹھا کر نیفے میں بندھی رقم دکھائی۔

''پورے بائیس سو...... بائیس سو کے پتا ہے کتنے نان کباب آتے ہیں؟''

''یہ حساب راستے میں کرلیں گے۔ ابھی آؤ۔''

اس نے ٹیپو کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور دوبارہ ویگنوں کے اڈے کی جانب مڑ گئی۔

''گلابو......!''

مگر ایک جانی پہچانی آواز کے پکارنے پہ اسے پھر سے رکنا پڑا۔

☆======☆======☆

''دیکھو حلیمہ......! نرمین اب بڑی ہوگئی ہے۔ خود پہ توجہ دو......''

صغیر احمد کافی دنوں بعد اسے سمجھانے کے موڈ میں آیا۔ ورنہ اب پتھر سے سر پھوڑنے کا
شوق رہا تھا نہ ہمت......

''بڑی نرمین ہوگئی ہے، توجہ میں خود پر دوں۔'' حلیمہ دور کی کوڑی لائی۔

''ایسی حجت بازی کرنے میں دماغ خوب چلتا ہے ان دونوں بہن بھائیوں کا۔''

جہاں آرا نے قریب سے گزرتے ہوئے لقمہ دیا۔

''اور میاں اسے کیا بتا رہے ہو کہ نمو بڑی ہوگئی ہے، یہ ماں ہے اسے خود نہیں پتا؟''

''کب سے تو سن رہی ہوں۔ نمو بڑی ہوگئی ہے۔ پتا کیسے نہیں چلے گا۔'' حلیمہ انکساری
سے مسکرائی۔ جیسے اپنے ''باعلم'' ہونے کی داد طلب کر رہی ہو۔

''تمہیں اس کا دھیان رکھنا چاہیے۔ اس کو وقت دینا چاہیے۔ بچیوں کو اس عمر میں ماں
کی ضرورت سب سے زیادہ ہوتی ہے اور پھر اب وہ محسوس کرنے لگی ہے کہ اس کی ماں اس
کے ساتھ ویسے کیوں نہیں پیش آتی جیسے اوروں کی مائیں ہوتی ہیں۔''

''کیسی ہوتی ہیں اوروں کی مائیں؟''

حلیمہ نے الٹا سوال اس سے کر دیا تو وہ سر پکڑ کے رہ گیا۔ پھر تحمل سے کہنے لگا۔

''بیٹیوں کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے والی۔ انہیں ان کے بھلے برے کی تمیز بتانے
والی۔ ان کی دوست...... ان کی ہمراز، ان کی رہبر...... رہنما۔''

''اتنی بہت کچھ......؟'' حلیمہ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

''ماں بننا آسان نہیں ہے حلیمہ! اور وہ بھی بیٹی کی ماں......''

صغیر احمد نے آہستہ سے کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا ان نصیحتوں کی بھنک ماں تک جائے جو
اب ذرا فاصلے پہ کیاریوں کو پانی لگا رہی تھیں مگر کان ادھر ہی لگے تھے۔

''کل کو اس کے رشتے کی بات چلے گی تو کیا کرو گی تم؟''

''کل کو......؟'' وہ بری طرح چونکی۔

''ہاں...... ظاہر ہے نمو بڑی ہوگئی ہے تو یہ سب تو ہونا ہے۔ بتاؤ ایسے وقت میں تم کیا
کرو گی۔ کیسے ہینڈل کرو گی...... کیا بات چیت کرو گی...... کیسے معاملات آگے بڑھاؤ گی۔ کچھ
انداز ہے تمہیں؟''

حلیمہ نے لحظہ بھر سوچا...... پھر شرم ساری کے بھرپور احساس کے ساتھ انکار میں سر
ہلاتے جھکا دیا۔

''اسی لیے کہتا ہوں خود پہ توجہ دو...... اماں تمہارے بھلے کے لیے ہی ڈانٹ ڈپٹ کرتی
ہیں۔ بجائے رونے کے دھیان سے سنا کرو اور کچھ سیکھا کرو۔''

''اچھا جی...... سیکھ لوں گی...... سب سیکھ لوں گی۔''

''شاباش......'' وہ تابعداری کے اس مظاہرے پہ جو کم ہی دکھایا جاتا تھا، خوش ہو
گیا۔

''اور ٹیپو کہاں ہے...... ذرا بھیجنا تو......''

اور حلیمہ جو اس شاباش کے خمار میں مدہوش مسکرائے چلی جا رہی تھی، شوہر کے نئے
فرمان پہ سہم گئی۔

''اب آئی شامت میرے لاڈلے بھیا کی۔'' وہ بڑبڑائی پھر ڈرتے ڈرتے بتا دیا۔

''اللہ جانے۔''

اور یہ ٹیپو کے حوالے سے بتائی جانے والی سب سے مقبول ترین اطلاع تھی...... اللہ
جانے۔

صغیر احمد صبر کا گھونٹ پی کے رہ گیا۔

زچ کر ڈالا تھا اسے اس چھ فٹ کے سالے نے۔ جس کا قد جتنا بڑھتا تھا، عقل اتنی گھٹتی

گئی تھی۔

☆======☆======☆

"رانی......تُو......"

اپنی سہیلی کو چند قدم کے فاصلے پہ دیکھ کر گل بے تابی سے آگے بڑھی......مگر پھر ٹھٹک
رک گئی۔ اچانک یاد آ گیا کہ رانی قدسیہ کی پرانی ملازمہ بھی ہے......کہیں اس کے ساتھ تو
اس کی آنکھوں کے ہراس سے رانی اس کے تذبذب کی وجہ جان گئی۔

"نکال دیا ہے کم بختوں نے مجھے نوکری سے۔"

"کیوں؟"

"تیری وجہ سے......کہتے تھے ساتھ ملی ہوئی ہوں تیرے اور گلا بوٹو کچھ نہ بتا......پر
میں اصل بات جانتی ہوں۔"

"کیا......؟ کون سی بات......؟" گل کا دل دھک سا رہ گیا۔ اس نے چور نظروں
برابر کھڑے ٹیپو کو دیکھا جو اسے رانی کے ساتھ مصروف دیکھ کر ساتھ کھڑی بھٹے والی ریڑھی
سے نرم سا بھٹہ چن رہا تھا۔

"یہی کہ تیرے خلاف سازش ہوئی ہے......اس ملک کے بچے نے ہاتھ نہ آ
کڑ دی والا حساب کیا ہے تیرے ساتھ......"

"تت......تمہیں......تمہیں کیسے پتا؟" گل نے خشک پڑتے لبوں پہ زبان پھیری۔

"اتنے سالوں سے ادھر ہوں......سب پتا ہے......سب نمک حلالی کرتے ہیں
لیے مالکوں کے کرتوتوں پہ پردے ڈالتے ہیں۔ میرے پہ کبھی نظر نہیں گئی ملک کی......
لیے بھی سوچا جب مجھے کوئی تکلیف نہیں دیتا تو مجھے کیا پڑی ہے میں اس کے کرتوت بی بی
کے سامنے کھولوں......اور ویسے بھی انہوں نے کون سا میری بات کا یقین کرنا ہے۔ سار
کے سامنے تو ایسی نظریں نیچی کر کے رہتا ہے خبیث کا بچہ......بھلا تُو اور چوری......؟
پہلے ہی پتہ تھا۔"

رانی کے یقین بھرے لہجے پہ گل کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔ اسے کیا ضرورت تھی جو
یقین جھٹلا دیتی۔

"اب بتاؤ میں کیا کروں؟ آپا نے تو میرے پیچھے پولیس لگا دی۔"

"سنا ہے تُو نے پیسے دے کر......"

اس سے پہلے کہ رانی کی نظروں میں ہلکورے لیتا شک کوئی واضح صورت اختیار کر

جلدی سے بتانے لگی۔

"وہ پیسہ تو عذاب بن گیا ہے۔ گاؤں کا ایک رشتہ دار......بڈھا کھوسٹ، تین تین
بیویوں والا۔ میرے بدلے پولیس اور آپا کو تین لاکھ دینے کے بعد اب مجھ سے شادی کی بات
کر رہا ہے؟"

"ہائے میں مر جاواں۔"

رانی نے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

"میں تو پہلے ہی کہوں......تیرے پاس کہاں سے آئے دو لاکھ روپے یہ ضمانت دینے
کے لیے۔ آپا نے کہا بھی......کہ دیکھا......نکلے کہ نہیں پیسے......پر میرا دل مانتا نہیں تھا۔ تو یہ
اصل بات......"

"میرے ماں باپ تیار ہیں اس سے میری شادی کے لیے۔ اس لیے میں گھر سے
بھاگ آئی۔"

"اس کے ساتھ......؟"

رانی نے جلدی جلدی بھٹہ چباتے ٹیپو کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"یہ تو ابھی ملا ہے راستے میں......اللہ لوک ہے......مگر ہے تو مرد......حفاظت کے لیے
ساتھ لگا لیا۔"

"اب کدھر......؟"

"جدھر نصیب لے جائے۔" گل نے آہ بھری۔

"میں اپنے مامے کے گھر جا رہی ہوں۔ لاہور......چلنا ہے؟"

"لاہور......؟" گل نے ٹیپو کی جانب دیکھا جو بھٹے میں بری طرح مگن تھی۔ اس کا گھر
بھی لاہور تھا۔

"چلتی ہوں۔"

"چل پھر......ادھر کام بھی بڑا مل جائے گا اور اتنے بڑے شہر میں کوئی پوچھنے والا بھی
نہیں ہو گا۔"

"کہاں رہتا ہے تمہارا ماما؟"

وہ ٹیپو کا ہاتھ تھام کے اس کے پیچھے پیچھے لاہور جانے والی بس کی جانب بڑھنے لگی۔

"گوالمنڈی......مسجد میں امام ہے۔"

تینوں بس میں چڑھ رہے تھے جب گل کی تلاش میں مرید کے اڈے پہ اترتے شو کے

کی نظران پہ پڑی۔

☆======☆======☆

''اماں......''

''خیال آگیا تمہیں بڑھیا ماں کا۔''

جنت بیگم، حلیمہ کے پکارنے پہ اس پر الٹ ہی تو پڑیں۔

''سارا دن ساس کے کولہے سے چپکی بیٹھی رہتی ہے اوروں نے بھی لونڈیاں بیاہی [cut] کوئی ایسی پرائی نہیں ہوتی جیسی تم...... ہم میکے سے کوسوں دور بیاہے تھے، سال بعد عید، [cut] برأت پہ جانا ہوتا تھا پھر بھی ماں سے ایسے غافل نہ تھے۔ ایک تم ہو بیٹی...... ایک چھت نیچے رہتے ہیں مگر تم کو خبر نہیں ہوتی ماں کس حال میں ہے۔''

''وہ اماں......! میں نے......'' اس نے ماں کو دم لینے کے لیے رکتا دیکھ کر جلدی [cut] کہنا چاہا مگر وہ ہاتھ آیا موقع کاہے کو جانے دیتیں۔

''بس ساس ہے اور تم ہو...... بھلی...... ذرا یہ تو بتاؤ اتنی للو چپو کے بعد اس نے کو [cut] تمہارا نام کر دیا۔ پھٹکار کے علاوہ اور کچھ ہے اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے؟''

''وہی تو...... میں اسی لیے......'' ایک اور کوشش...... ناکام کوشش۔

''دل جلتا ہے میا کا تمہیں یوں ناقدری سے رُلتے دیکھ کر مگر تمہیں اس کا ہوش کا [cut] کا...... اتنا نہ ہوا کہ ماں کے سینے میں ٹھنڈ ڈالنے کی خاطر ہی ساس کے مقابلے پہ اتر آ [cut] اور گئے سال دب کے رہوگی......؟''

''اماں......!'' وہ روہانسی ہوگئی۔ ادھر جنت بیگم کی بھی سانس پھول گئی۔ ایک ہاتھ [cut] اسے گھڑے سے پانی ڈالنے کا کہہ کر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر میٹھی گولیاں ٹٹولنے لگیں [cut] خشک ہونے پہ بڑے شوق سے چبائی جاتی تھیں۔

''اماں......! مجھے ایک بات پوچھنی تھی...... وہ...... نمو کے ابا نے تو کہا تھا اماں [cut] سے پوچھوں۔ مگر مجھے ان سے ڈر لگتا ہے...... ویسے بھی ان سے کچھ پوچھتی ہوں تو پہلے [cut] کے غصہ کرتی ہیں: پھر کچھ بتاتی ہیں جو پلے ہی نہیں پڑتا میرے۔''

''ہائے ہائے میری بچی کا سانس خشک کر کے رکھ دیا ہے اس جلاد صفت ساس نے [cut] ہائے بیرسٹر صاحب! کہاں پھنسا ڈالا میری پھول سی نازک بچی کو۔''

وہ ہاتھ ملتے ہوئے ہل ہل کر افسوس کرنے لگیں اور وہ جڑ کر ماں کے برابر بیٹھ [cut] رازداری سے پوچھنے لگی۔

''پوچھنا یہ تھا اماں کہ کل جب نمو کو دیکھنے لڑکے والے آئیں گے تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کیسے بات کرنی ہوگی۔ کیسے معاملہ آگے بڑھانا ہوگا۔''

بڑے مدبرانہ انداز میں وہ صغیر احمد کے الفاظ دہرا رہی تھی۔

''نمو کو دیکھنے لڑکے والے......؟ کب......؟''

''کل......''

''آئے ہائے...... اور مجھ بڑھیا دکھیاری کو کسی نے خبر بھی نہ کی...... لو دیکھیو بیرسٹر صاحب......! کیسا اندھیر مچا ہے یہاں...... میں نانی ہوں...... نمو کی نانی...... مجھے کیسے دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا ہے۔''

''بتاؤ ناں اماں!''

حلیمہ نے اس واویلے پہ توجہ دیتے ہوئے ماں کا کاندھا ہلا کر اپنی جانب متوجہ کیا جیسے یاد دلانا چاہتی ہو کہ وہ کچھ پوچھ رہی تھی۔

''پرے ہٹ...... تجھے بیٹی ہو کر شرم نہ آئی...... کہہ نہیں سکتی تھی اپنے میاں کو کہ جا کر خود ساس کو خبر دیتا بیٹی کے رشتے کی۔ یعنی حد ہوگئی۔ کل مہمان آتے...... پھر جا کے نانی کو پتا چلتا اور دادی...... اسے تو ساری خبریں ہوں گی...... بلکہ یہ رشتہ لائی بھی وہ ہوگی۔ اسے ہی شوق ہے چھوٹی عمر کی بچیوں کو اس بوجھ تلے دبانے کا۔ اپنے دیور کے لیے بھی اسی نے رشتہ دیکھا تھا اور لے آئی تھی مجھے پندرہ سال کی عمر میں بیاہ کے...... پھر تجھ پہ نظر ٹھہری بدبخت کی۔ تجھے بھی سولہواں پار نہ کرنے دیا اور مٹھی میں جکڑ کے رکھ لیا بہو بنا کے۔ اب میری نمو...... پھول سی بٹیا۔ اسے کاہے کو چبھ رہی ہے بابل کے آنگن میں ہنستی کھیلتی...... کے اناج کھا جاتی ہے وہ دادی کا......؟ ابھی عمر کیا ہے اس کی......؟ ارے باپ رے...... کہیں اپنی بہن کے ہاں تو نہیں دے رہی میری بچی کو...... اس کی بہن کے درجن بھر جوان پوتے اور نواسے ہیں۔ لونڈوں کا بازار لگا ہے اس کے ہاں۔ ہائے خورشید......! سنتی ہے...... یہ کیا ظلم ہونے لگا ہے پہلے میں...... پھر میری بیٹی...... اب میری بیٹی کی بیٹی اس جلاد صفت عورت کی بھینٹ چڑھنے لگی ہیں۔ ارے اس کی بہن تو اس سے دس گنا بڑھ کے آدم خور ہے۔ اس کی تین کی تین بہوئیں تو جوانی میں ہی مر مرا گئیں۔ اس کی دہشت ہوگی ضرور۔ اب یہ چلی ہے پوتوں نواسوں کی ٹولی کی ٹولی بیاہنے اور دوبارہ سے ساس بننے...... میں کہے دیتی ہوں...... یہ نہیں ہونے دوں گی۔''

''کیا اگڑ بگڑ مچا رکھی ہے سویرے سویرے۔''

"یہ متی سمجھنا بھابھی...... کہ ہم چپ ہیں تو بے زبان ہیں۔ ایسی من مانی نہ ہونے دوں گی میں اس گھر میں۔"

"اب کون سا تیر کھینچ مارا میں نے؟" جہاں آرا بولی۔ وہ بھی فرصت سے تھیں، اس لیے اطمینان سے باہر نکل آئیں حساب صاف کرنے۔

"پورے کا پورا ترکش الٹ دیا میرے سینے میں۔"

انہوں نے چھاتی پیٹی...... شور سن کر خورشید بھی جمائیاں لیتی نکل آئی۔

"کیا ہوا ہے آپاں؟"

"یہ پوچھ خورشید! کیا نہیں ہوا۔ اب ہماری حیثیت اس گھر میں کاٹھ کباڑ سے زیادہ نہیں۔"

"چلو تمہیں خود پتا چل گیا کہ کتنے پانی میں ہو۔"

جہاں آرا نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

حلیمہ جھک کر ماں کے پیروں تلے فرش کو گھورنے لگی۔ پانی تو کہیں نہیں تھا۔ خشک سارا...... وہ اسی سوچ میں غرق ہوگئی۔ کیسا پانی......؟ کتنا پانی......؟

صغیر احمد کی قسمت گردش میں تھی جو وہ عین اسی وقت وہاں آ نکلا اور جنت بیگم دہائی دیتے ہوئے اس کے سامنے......

"بیٹی کے رشتے کے لیے لوگ بلوا لیے...... بیاہ ہی دینا ہمیں خبر دیے بغیر...... میاں...... ہم نے تو تمہیں نہ داماد سمجھا نہ بھتیجا جانا۔ نرے بیٹے کی سی عزت اور مان سدا...... اور تم...... تم نے ہمیں بزرگ جانا نہ عزیز...... ذرا سی بھی اہمیت نہ دی۔"

"ہوا کیا ہے چچی جان؟"

وہ حیرت سے کبھی ساس تو کبھی ماں کے بگڑے تیور دیکھ رہا تھا۔ حلیمہ الگ بت بنی زمین پہ نظریں گاڑے بیٹھی نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔

"اب اور کیا ہونا باقی ہے...... مجھ سے نہ پوچھا۔ نہ ذکر کیا اور چپکے چپکے نرمین کے رشتے کی بات چلا دی۔"

"کیا......؟" صغیر احمد سے پہلے جہاں آرا چلائیں۔

"نرمین کا رشتہ......؟"

"ہاں...... وہی موئے جو کل آنے والے ہیں۔"

"یہ کس نے کہا آپ سے......؟" جنت بیگم کے اتنا کہنے کی دیر تھی، جہاں آرا نے

دھونا مچا دیا۔

"پچھلے بیس سالوں سے بہو کے ہوتے ہوئے ساری ذمہ داریاں میں تن تنہا نبھا رہی ہوں...... بچی پیدا اس نے کی...... پالی پوسی میں نے...... آج یہ سرپرست بن بیٹھی...... واہ صغیر احمد...... اچھا صلہ دیا تم نے ماں کو...... آج بیوی سب کچھ ہوگئی تمہارے لیے...... سارے دکھ سکھ اس سے بانٹنا...... میں تو غیر ہوں، مجھے تو اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد کے بارے میں خبریں باہر والوں سے ملا کریں گی۔"

"کون سے باہر والے بھابھی؟ ہوش ٹھکانے میں رکھ کے بات کرو۔ جتنی تم گھر والی...... اتنی میں گھر والی...... اور یہ بوگس اداکاری میرے سامنے تو مت کریو...... سب کر کرا کے اب رونا ڈال رہی ہو۔"

"بس......" صغیر احمد دھاڑا۔ "رائی کا پہاڑ بنانے کے لیے بھی رائی کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ سب تو بغیر رائی کے پہاڑ بنانے میں ماہر ہیں۔ کوئی نہیں آ رہا کل...... نہ پرسوں...... اور حلیمہ......!"

حلیمہ ابھی تک جنت بیگم کے پیروں پہ ٹکٹکی باندھے ہوئے تھی کہ شاید یہاں سے کوئی چشمہ پھوٹ پڑے۔

"حلیمہ......!" اب کے صغیر احمد نے چلا کے کہا۔

"جی......" وہ پوری جان سے لرز کے بولی تھی۔ ہونٹ سفید پڑ گئے تھے۔ ہتھیلیاں برف......

"اندر چلو......"

اور وہ مرے مرے قدموں سے صغیر احمد کے پیچھے سر جھکا کے چلتی ہوئی سوچ رہی تھی...... "اب پتا نہیں کس بات کا غصہ ہے نمو کے ابا کو میں تو ہمیشہ وہی کرتی ہوں جو یہ کہتے ہیں۔"

☆======☆======☆

گوال منڈی کے اسٹاپ پر اتر کر رانی نے گل کو ٹھوکا دیا۔

"اسے تو چلتا کر...... اب کیسا ڈر......؟"

"ہاں کہتی ہوں...... مگر یہ جائے گا بھی؟"

وہ ٹیپو کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اتنا تو آزما چکی تھی کہ اسے جو کہا جاتا تھا، ضد میں آ کے اس کے الٹ کرتا تھا۔

''جائے گا کیسے نہیں۔ تم کہو تو...... ویسے بھی اس کا گھر تو یہیں ہے اور دوسری بات میرا ماما ہے مولوی...... وہ بالکل پسند نہیں کرے گا جوان جہان لڑکے کا ہمارے ساتھ آنا۔''

''ہاں...... یہ تو ہے...... ٹیپو......!''

وہ قلفی کھاتے ٹیپو سے بات کرنے مڑی اور وہیں ساکت ہو گئی۔ چلتی ہوئی ویگن سے چھلانگ مار کے اترنے والا وہ شوکا ہی تھا۔ سو فیصد وہی۔

''رانی...... وہ......'' اس نے بوکھلا کے کہنا چاہا۔ پھر وقت ضائع نہ کرتے ہوئے پاس سے گزرتے سائیکل رکشہ کو روک لیا اور جلدی سے سوار ہو گئی۔

رانی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی تقلید کی۔

''اے...... سن......'' ٹیپو نے آدھی کھائی...... باقی تیزی سے پگھلتی قلفی کو سڑک پہ پھینکا اور لپک کر رکشے پہ سوار ہو گیا۔

شوکے نے آس پاس دیکھا۔ دوسرے رکشے میں سوار ہونے کے لیے ذرا وقت لگا مگر اتنا بھی نہیں کہ وہ گل کا پیچھا نہ کر پاتا۔

''کون تھا یہ......؟ وہی بڈھا......؟''

''ہاں...... یہ تو لاہور تک پہنچ گیا...... اب کہاں جاؤں میں۔''

''جہاں مرضی جا...... مگر مجھے تو یہیں اتار دے۔''

رانی جواب تک اس کا ساتھ دینے کے وعدے کر رہی تھی اچانک ہی ہمت ہار بیٹھی۔

''یہ تو لمبے چکر لگ رہے ہیں۔ میں ایویں ہی پھنس جاؤں گی۔''

''نہیں رانی...... ایسے مت کہو...... تم نے بھی دامن چھڑا لیا تو میں......''

''تو بتا میں کیا کروں؟ میرے مامے کا تجھے پتا نہیں ہے۔''

''اسے مت بتانا اصل بات کا......''

''اور یہ جو پیچھے پہنچ گیا وہاں؟''

''کہہ دیں گے راستے میں پیچھے لگ گیا تھا۔''

''یہ خود بتا دے گا اصل بات...... اور اگر وہ چوری والی بات کھل گئی تو...... چاہے جھوٹی سہی مگر ماما تو بگڑے گا ناں...... اور یہ......''

اس نے گل کے ساتھ بیٹھے ٹیپو کو گھورا جو رکشے میں لگی ریما کی تصویر کو نثار ہو جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''اس کا کیا کرنا ہے جو ساتھ چپکا آ رہا ہے...... لسوڑھا......''

''ایک طریقہ ہے۔''

مصیبت کے وقت گل کا دماغ ہمیشہ تیز کام کرتا تھا۔

اس وقت بھی ایک منصوبہ اس کے اندر پلتا ہوا اس کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔

☆======☆======☆

''دال میں بگھار ذرا اچھا نہیں لگا بھابھی!''

خورشید نے دال کے کٹورے سے لگی دال انگلی سے چاٹتے ہوئے حسبِ عادت نقص نکالا۔

سب دسترخوان پہ جمع تھے...... علاوہ نمو کے...... جو چولہے کے آگے کھڑی چپاتیاں پکا رہی تھی۔

''کچھ تو دل کھول کے گھی ڈالا کرو...... ذرا سی ''شوں'' کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی باورچی خانے سے۔''

''سارا وقت تو تمہارا ریڈیو بجتا رہتا ہے۔ آواز کہاں سے آئے۔'' جہاں آرا نے کوفت سے ناک سکوڑی۔

''ہائے تڑکا تو لگاتی تھی میری بے بے...... وہ بھی دیسی گھی کا۔ سارے پنڈ میں خوشبو پھیلتی تھی۔''

''کاش تمہیں بھی سکھا دیا ہوتا کچھ...... تمہاری بے بے نے۔''

''بس بھی کریں اماں!'' صغیر احمد نے کھانے سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

''کیا کروں میں...... انسان ہوں۔ عمر ہو گئی ہے سارا دن کولہو کا بیل بن کر کام میں جتی رہتی ہوں۔ تمہاری بیوی تو ایک سنوارے گی اور سو بگاڑے گی...... اور باقی لوگ کام کے معاملے میں خود کو مہمان بنا کر بیٹھ جاتے ہیں گھر کا...... ویلے ہر معاملے میں حق جتانے کو آگے آگے...... ایک نمو بے چاری ہے جو کالج سے آنے کے بعد بھی میرے ساتھ لگی رہتی ہے۔''

''نرمین! بیٹا بس کرو...... بہت ہیں روٹیاں۔''

نرمین کو روٹی لاتے دیکھ کر صغیر احمد نے محبت اور شفقت سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ بیٹھنے کو تھی جب حلیمہ نے کہا۔

''نمو......! ماموں کے لیے بھی دو پکا کے لپیٹ دینا دسترخوان میں۔''

''تمہیں کیا الہام ہو رہا ہے کہ آج وہ ٹپکے گا؟''

جہاں آرا نے ناگواری سے کہا۔ ٹیپو کا محض ذکر ہی ان کا منہ کڑوا کرنے کو کافی تھا۔

"تین چار روز ہو گئے ہیں اسے گئے۔ اتنے میں آ ہی جایا کرتا ہے۔" حلیمہ نے سا... سے کہا مگر جنت بیگم تپی بیٹھی تھیں۔

"ہاں...... آ ہی جایا کرتا ہے۔ دھکے کھا کے...... جیب خالی کر کے...... اب کے ... میں خود نکالوں گی...... وہ بھی پیسے دھیلے کے بغیر...... پھر دیکھوں گی کون سے مزے کرتا ہے۔"

"یہ تو تم زندگی میں پہلا عقل والا کام کرو گی۔" جہاں آرا نے مذاق اُڑاتے لہجے میں کہا۔

اسی وقت دروازے پہ آہٹ سی ہوئی۔ وہ سب برآمدے میں دسترخوان بچھائے ہوئے تھے۔ پچھلے صحن کا گلی میں کھلنے والا دروازہ عموماً رات تک بغیر کنڈی کے رہا کرتا تھا۔

"السلاماں...... علیکم......"

ٹیپو نے اندر داخل ہوتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں سلام جھاڑا۔ سب چونک کر دیکھنے لگے۔ اس بار گرمجوشی اور جوش وخروش کچھ ضرورت سے زیادہ تھا۔

"کتنی لمبی عمر ہے میرے لال کی۔"

خورشید نے لہک کر کہا...... مگر باقی سب اس کا حلیہ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

اس نے نہ جانے کس کا ریشمی کرتہ پہن رکھا تھا۔ شوخ سے رنگ کا...... جو اتنا کھلا تھا کہ اس جیسے دو سما جاتے اس کرتے میں، چوڑائی میں دگنا...... اور لمبائی میں آدھا...... گھٹنوں سے کہیں پہلے ختم ہو رہا تھا مگر وہ اس عجیب وغریب لباس میں بھی خوشی سے کھلا پڑ رہا تھا اور گلے میں پھولوں کا ہار۔

"آ، ناں...... شرمانے والی کیا بات ہے۔ اپنا گھر ہے تمہارا۔"

"لو...... اس کی کسر تھی۔"

ٹیپو کے منہ گھما کر کسی کو بلانے پہ جہاں آرا با آواز بلند بڑبڑائیں۔

"اب نہ جانے کون سے اوباشوں کو گھر تک لانے لگا ہے۔"

مگر ان کے اندازے کے بالکل برعکس اندر آنے والا نہیں، بلکہ آنے والی تھی...... جٹ کے سرخ پھولوں والے نیلے شلوار قمیص میں ملبوس......

سر پہ سرخ شیفون کا دوپٹہ کاندھوں سے لپٹی سیاہ چادر...... تیکھے نین نقش...... رنگت...... سانچے میں ڈھلا وجود...... سب ہی حیرت سے اسے تکنے لگے۔

حیرت اس کے یہاں آنے پہ کم تھی...... "ٹیپو کے ساتھ" آنے پر زیادہ تھی۔

"اماں......! میری دلہن...... گل......"

ٹیپو کے شرماتے ہوئے کہنے پہ دسترخوان پہ ہلچل مچ گئی۔

☆======☆======☆

"آ...... آ...... آ......"

حلیمہ صحن میں پنجوں کے بل فرش پہ بیٹھی، روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کے چڑیوں کو ڈال رہی تھی۔ اس کے سامنے مٹی کے پیالے میں پانی میں بھیگے رات کی باسی روٹیوں کے ٹکڑے تھے اور ڈھیر سارے تھے۔

روز ہی رات کو تھوڑی بہت روٹی بچتی اور وہ پانی میں بھگو کے رکھ دیتی۔ صبح جاگنے کے بعد سب سے پہلا کام اس کا یہی ہوتا کہ وہ یہ روٹی چڑیوں کو ناشتے کے لیے پیش کرتی۔ آج پیالہ باہر تک اُبل رہا تھا، جیسے ساری کی ساری روٹیاں بچ رہی ہوں اور یہ سچ بھی تھا۔ تین کھانے کے وقت ٹیپو نے جو دھماکا کیا اس کے بعد کس کے حلق سے نوالہ اترنا تھا۔ سب نے جو ایک ایک دو دو نوالے لیے تھے، باقی کی روٹی سالم کی سالم حلیمہ نے سب کے آگے سے اٹھائی تھی اور پیالے میں بھر لی تھی۔

"آ...... آ...... آ......"

وہ چڑیوں کو بلانے کے لیے مخصوص انداز میں پکار بھی رہی تھی مگر وہ تھیں کہ آ ہی نہ رہی تھیں...... آتیں بھرے پیالے کو دیکھتیں اور پھر سے اُڑ جاتیں شاید اتنا اوپر تک بھرا پیالہ انہیں اوپرا اوپرا سا لگ رہا تھا یا پھر شاید ان کی نظر ہی سیر ہو رہی تھی اسے دیکھ دیکھ کے۔

"میں کہتی ہوں...... دفع ہو جا۔" اندر سے جنت بیگم کے دھتکارنے کی آواز آئی۔

"بس کر اماں......" ٹیپو نہ جانے کس برتے پہ شیر ہوا جا رہا تھا۔

"اے...... گل تے سن۔" خورشید کا پچکارنا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی۔" جہاں آرا بیگم کی پیش گوئیاں دوہرانا۔ بیچ بیچ میں ہلکی ہلکی سسکیوں کا ابھرنا۔

حلیمہ نے کوفت سے گردن پھیر کے اندر گول کمرے کی جانب دیکھا، جس کے بند دروازے کے پار سے یہ آوازیں ابھر رہی تھیں۔

"کتنا شور ہے، بے چاری چڑیاں ڈر کے مارے آ بھی نہیں رہیں۔"

اس نے سر جھٹکا اور اپنی سنگی سکھیوں کو بلانے کی ایک اور کوشش کی۔

"آ...... آ...... آ......"

داسی ڈھولن یار دی

☆======☆======☆

"ہائے بیرسٹر صاحب! مجھے اکیلا ہی اتنا سب کچھ دیکھنے کے لیے چھوڑ گئے"
سے وہ ہل ہل کے فریادیں کرتی رو رہی تھیں۔

جہاں آرا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تھا تو بڑبڑا کے رہ گئیں۔

"ہاں کاہے کو چھوڑ گئے اکیلا...... لے ہی گئے ہوتے اپنے سنگ......" پھر صغیر
تنبیہا گھورنے پہ کوفت سے کہنے لگیں۔

"اے بس بھی کرو جنت! رات سے واویلا مچا رکھا ہے۔"

"بس تو تم کرو بھابھی......! میں جانوں اور میری اولاد جانے۔ تمہارا کیا حق
میرے معاملے میں بڑھ بڑھ کے فیصلے دینے کا۔"

"اے لو مجھے کیا باؤلے کتے نے کاٹا ہے، جو میں تمہارے معاملے میں بولوں......
انگاروں میں ہاتھ دینے والی بات ہوگئی گویا۔"

"اچھا تو جب میں رات کو ہی اس کلموہی کو دفعان کر رہی تھی تو کاہے اسے
گھسایا؟"

"جوان جہان لڑکی! خوب صورت گہنے لتے پہنے ہوئے آدھی رات کو کہاں خوار
بے چاری، کچھ تو خدا کا خوف کرو۔"

"خدا کا خوف وہ کھائے جس نے میرے بھولے بھالے بچے کو ورغلایا۔" وہ پھر
پھپک کے رو دیں۔ مگر جہاں آرا کا دل پہلے کبھی پسیجا تھا ان کے آنسوؤں پہ جواب نرم پڑتا

"اوہو...... بھولا بھالا...... وہ اغوا کر کے لے نہیں گئی تمہارے بھولے بھالے کو۔
صورت مومناں، کرتوت کافراں اسے بھگا کے لایا ہے جیسے بھی آئی۔ آخر ہمارے گھر کی
پہ آئی تھی۔ خاندانی شرفاء میں سے ہیں ہم۔ کیسے نکال دیتی اسے، عزت والوں کو صرف
عزت کا نہیں سب کی عزت کا خیال ہوتا ہے۔"

وہ سب اس وقت گول کمرے میں رات بھر کی جاگی متورم آنکھیں اور غبار سے بھرے
دل لیے بیٹھے تھے۔

"کون سی عزت، کیسی عزت۔" خورشید کب تک چپ رہتی بھلا، وہ تو ایسے ہی اٹھ
گئی تھی۔ "اتنی عزت والی ہوتی وہ تو آدھی رات کو ماں بیو کے گھر سے زیور چرا کے بھاگتی"

"میرا منہ مت کھلواؤ خورشید! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس گھر میں اس سے پہلے
کون چور دروازوں سے آچکا ہے۔" خورشید تلملا کے رہ گئی۔

ایک وہی تھی آج سے سالوں پہلے جس کو ایسی ہی ایک حبس بھری رات میں بیرسٹر
صاحب نے کالے برقعے میں لپیٹ کر گھر بھر کے سامنے لا کے رکھ دیا تھا۔

"دیکھ رہی ہو آپاں!" اس نے جنت بیگم سے کمک چاہی۔

"دیکھ بھی رہی ہوں اور سن بھی رہی ہوں۔" انہوں نے ایک خشمگیں نظر آرام کرسی پہ
جھولتے ٹیپو پہ ڈالی اور ذرا آگے بڑھ کے اس کے پہلو میں ایک دھموکا جڑا۔ جھولے جھولنے
میں مگن وہ بری طرح بلبلا اٹھا۔

"سب اس ناہنجار کی وجہ سے ہو رہا ہے، بائیس سالوں میں کون سا دکھ نہیں دیا اس
نامراد نے بس یہ کسر باقی رہتی تھی۔"

"بس کرو اماں! میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔" اس نے پہلو سہلاتے ہوئے ہونٹ لٹکا
کر کہا۔

"اچھا تو کون سے ثواب کمائے ہیں کسی غریب کی عزت اچھال کے؟" جہاں آرا نے
کلس کر دریافت کیا۔

"میں نے پیار کیا ہے تائی اماں!"

ٹیپو کے لمبوترے زرد چہرے پہ ایکا ایکی رنگ اتر آئے مگر بجائے اسے نکھار دینے کے
مزید مضحکہ خیز بنا گئے۔

"اور تائی اماں...... پیار گناہ نہیں ہوتا۔"

جہاں آرا نے حیرت کے مارے منہ پہ، ہاتھ رکھ لیا، خورشید نثار ہو کر بلائیں لینے لگی۔

"صدقے جاواں کیا سوہنی گل کی ہے۔"

جبکہ جنت بیگم نے تلملاتے ہوئے اس کی کمر میں ایک اور دھموکا جڑ دیا۔

"توبہ توبہ...... حد ہے بے حیائی کی۔" جہاں آرا کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔ "ذرا لحاظ
نہیں نہ ماں کا نہ بہنوئی کا اور نہ۔" اچانک چونک کر انہوں نے پرلے کونے میں بیٹھی نرمین کو
دیکھا، جو رسالے کی اوٹ میں اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو چلو نکلو۔"

نرمین نے فوراً حکم کی تعمیل کی...... ماموں کی بات سن کر ویسے ہی پیٹ میں گدگدی سی
ہو رہی تھی۔ اکیلے میں جا کے خوب مزے لے لے کر کھل کر ہنسنے کو جی چاہ رہا تھا، اور پھر اسے
دیکھنے کی بھی چاہ تھی جس کی صرف ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی، کچن سے روٹی لاتے لاتے
اور پھر جنت بیگم کے غیض و غضب سے بچانے کے لیے جہاں آرا نے اسے اندر کسی کمرے

میں بند کر دیا تھا۔

"جوان بچی والا گھر اور ایسی بے حیائی کے مظاہرے۔" وہ اب تک کلسے پڑ تھیں۔

"بس میں نے کہہ دیا...... نکال باہر کرو اس حرافہ کو...... بلکہ میں خود جاتی ہوں، اکھاڑ کے نہ باہر دھکیلا تو جنت بیگم نام نہیں۔"

انہیں اٹھتے دیکھ کر ٹیپو شیر ہوا۔

"اماں! وہ بیوی ہے میری...... نکاح پڑھایا ہے میں نے اس کے ساتھ۔"

"واہ میاں۔" جہاں آرا نے زمانے بھر کا طنز چہرے پہ سجا کے اور لہجے میں بھر کے گھورا۔

"الف بے کا قاعدہ تو تم سے پڑھا نہ گیا...... نکاح پڑھوانے کی عقل کہاں سے آ گئی"

"پیار سب کچھ سکھا دیتا ہے تائی اماں!" ٹیپو کی جانب سے ایک بار پھر شرماتے ہو قابلیت جھاڑی گئی۔

"لاحول ولا......" جہاں آرا نے منہ سکیڑا۔

"تیرے پیار کی تو میں۔" جنت بیگم نے چپل اٹھائی۔

"بس کیجیے۔" اب تک خاموشی سے کسی فکر میں ڈوبے صغیر احمد نے کھڑے ہو کر اعلا کیا۔

"بہت ہو گیا کب سے میں یہ بے کار کی بحث سن رہا ہوں۔ کوئی کچھ نہ کہے گا نہ کر پہلے اس لڑکی سے کیا نام ہے اس کا......"

"گل......" ٹیپو نے جھٹ بتایا۔

"پیارا نام ہے ناں بھائی میاں؟"

"اس سے بات کرنا ہو گی۔" صغیر احمد نے ٹیپو کا اشتیاق بھرا استفسار نظر انداز کر ہوئے اپنی کہی۔

"کیسی گل کیسی بات، بھگوڑی کی کوئی جگہ نہیں ہمارے خاندان میں ہے ناں آپا؟" خورشید نے جنت کی دل جوئی کی خاطر کہا...... حالانکہ وہ ٹیپو کی ملتجیانہ نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔

"چھوٹی اماں، اگر واقعی یہ نکاح ہوا ہے تو وہ اب ہمارے خاندان کا حصہ ہے۔"

"اور اس گھر کی عزت۔" جہاں آرا نے اضافہ کیا۔

"بالکل صحیح بالکل صحیح اب آئیں گے مزے۔" ٹیپو تالیاں بجانے لگا۔

"بکے جا رہا ہے۔ بکے جا رہا ہے۔" جنت بیگم نے کب سے ہاتھ میں پکڑی چپل آخر دے ہی ماری۔ پھر داماد سے ذرا سبھاؤ سے کہا۔

"تم رہنے دو صغیر میاں! میں اس لڑکی سے خود نمٹ لوں گی۔"

"صغیر احمد تو چپ رہا مگر، جہاں آرا کو برا لگ گیا۔"

"تم اس معاملے سے صغیر احمد کو کیسے الگ کر سکتی ہو جنت بیگم...... اس کا پورا حق ہے ٹیپو پہ...... اور اس گھر کے ہر معاملے پہ...... یہ مت بھولو کہ میرا صغیر احمد اس پورے کنبے کا سرپرست ہے۔"

یہ وہ نکتہ تھا جس پہ آ کر جنت بیگم کی کبھی ہمت نہ ہوتی تھی جٹھانی سے بحث کرنے کی۔

☆======☆======☆

زرمین دبے پاؤں برآمدے سے گزر رہی تھی، ٹیپو کے دروازے کے پاس رک کے اس نے پیچھے نظر گھما کے اطمینان کرنا چاہا، برآمدہ بھی خالی تھا اور سامنے کی راہداری بھی سنسان پڑی تھی، بس ذرا پرے برآمدے کی دو سیڑھیاں چھوڑ کے تیسری اور آخری والی سیڑھی پہ حلیمہ سر نہوڑائے صحن کی اینٹوں پہ پنجے ٹکائے کسی سوچ میں غرق تھی۔ زرمین نے بند دروازے پہ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا، دروازہ مقفل نہیں تھا اس نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

☆======☆======☆

وہ نیم تاریک کمرے میں بڑے سے پلنگ کے ایک کونے پہ ٹکی بیٹھی تھی۔ دن کب کا چڑھ چکا تھا یوں بھی گرمیوں کے دن تو بس پلک موندنے کی دیر ہوتی ہے پھر سے نکل آتے ہیں مگر یہ کمرہ اس بڑے سے حویلی نما مکان کے اس کونے میں کچھ ایسے رخ پہ بنا تھا کہ چلچلاتی دھوپ اور روشنی سے خاصا محفوظ رہتا...... ٹیپو کے لیے تو اس کمرے میں خاص رعایت تھی جب تک جی چاہتا سویا رہتا، دن کے گیارہ بارہ بجے بھی یہاں جھٹ پٹے کا سماں ہوتا۔

واحد کھڑکی جو پچھلی جانب کھلتی تھی نہ گھر کے عقبی صحن میں تھی نہ داخلی دالان میں بلکہ دائیں جانب والی چھوٹی سی گلی میں کھلتی تھی جو صحن اور باغیچے کو آپس میں ملاتی تھی...... یہ گلی خود رو جھاڑیوں سے تو اٹی ہی ہوئی تھی...... اس کے علاوہ آٹھ فٹ، لمبی دیوار بھی اس کی حد بندی کر رہی تھی اور سب سے بڑھ کے عین کھڑکی کے اوپر سایہ کیے ہوئے بڑا سا جامن کا پیڑ جس نے کئی سال پہلے پھل دینا بند کر دیا تھا البتہ سایہ خوب دیتا تھا۔

گل کو یہاں کچھ گھنٹے قبل باقاعدہ دھکیل کر بند کیا گیا تھا اور اس نے اس حسن سلوک پہ

بجائے رنجیدہ ہونے کے خدا کا شکر ادا کیا تھا...... ورنہ وہ جنت بیگم تو اسے چیر پھاڑنے
تھی۔ اندر آنے کے بعد باوجود گرمی کے اس نے پنکھا تک نہیں چلایا تھا نہ چادر اتاری تھی
پنکھا اس لیے نہیں چلایا تھا کہ باہر سے آتی آوازوں سے کچھ اندازہ لگاتی رہے کہ
کے بارے میں کیا فیصلہ ہو رہا ہے۔

اور چادر اس لیے اب تک لپیٹ رکھی تھی کہ کون جانے کب نکلنے کا حکم آجائے۔

اپنی پوٹلی گود میں رکھے...... بیڈ کے کونے پہ ٹکی وہ منتظر نظریں بار بار دروازے پہ
پھر گود میں رکھے ہاتھوں پہ ڈال کے بیٹھ جاتی۔

"پتہ نہیں کیا ہوگا اب...... اتنا بڑا جوا کھیل تو لیا پتہ نہیں نتیجہ کیا نکلے ہار یا جیت۔"

اسی وقت دروازہ ہلکا سا کھلا۔

روشنی کی ایک باریک سی لکیر اندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی سلین زدہ نیم تاریکی میں راستہ بنا
لگی۔

گل نے بے تابی سے سامنے دیکھا...... ذرا سے کھلے دروازے سے ایک لڑکی کا
جھانکتا دکھائی دیا۔

کم سن...... معصوم، الہڑ اور متجسس حیران چہرہ۔

گل نے بڑے بڑے حسین چہرے دیکھے تھے۔

مسحور کر دینے کی حد تک حسین۔

بہکا دینے والے حسین۔

مگر اتنی معصومیت کسی اور چہرے پہ نہیں دیکھی تھی...... یہ معصومیت دنگ کر دینے وا
تھی۔

بمشکل سترہ اٹھارہ کا سن...... برف کی سی سفیدی لیے ہوئے اور اسی سفیدی میں کہیں
کہیں گلال کے چھینٹے کتنے دلربا لگ رہے تھے۔ بڑی سیاہ بڑی بھولی سی آنکھیں جن میں کوئی
بھید بھاؤ نہیں تھا کوئی اسرار پنہاں نہیں تھے نہ کوئی پسندیدگی نہ کوئی بھول بھلیاں لمبی لمبی پلکوں
میں قید بادامی آنکھیں جن میں تحیر اور معصومانہ سا اشتیاق جھلک رہا تھا۔

نیم واگوشوں والے بھرے بھرے ہونٹ۔

کچھ کچھ گولائی لیے ہوئی چھوٹی سی ناک۔

گل نے ایک ہی نظر میں اس کا بھرپور جائزہ لے لیا۔ نہ جانے رات بھر کی تھکن تھی یا ا
کے چہرے پہ یا انہ جانے اندیشوں کا ہراس، جو وہ انجانی معصوم لڑکی آنکھوں میں ہمدردی اور

تاسف بھرے جذبات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

گل نے مسکرانے کی کوشش کی حالانکہ جانتی تھی اس کوشش میں وہ کتنی ہونق لگ رہی ہو
گی اور ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر بلایا اس دوستانہ پیش قدمی پہ بجائے اس کے کہ اس
لڑکی کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ آجاتی۔ الٹا وہ ہمدردی اور تاسف بھی غائب ہو گیا۔ وہ بے
حد گھبرائی ہوئی نظر آئی اور جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

گل دیر تک بند دروازے کی جانب خالی خالی نظروں سے دیکھتی اور سوچتی رہی۔

"اتنی معصومیت اتنی لاعلمی اتنی بے گانگی کاش مجھے بھی نصیب ہوئی ہوتی، میں نے تو
آنکھ کھلتے ہی جاننے کا عذاب سہا ہے، کہاں تھا میرا بچپن...... کہاں تھی میری معصومیت؟
کہاں تھا میرا الہڑپن کاش! مجھے بھی کچھ پتہ نہ ہوتا نہ اس زمانے کا نہ زمانے کی اونچ نیچ کا نہ
لوگوں کی مکاریوں کا نہ دوہری شخصیتوں کا نہ چہرہ در چہرہ پڑے نقابوں کا نہ متعفن ہوتے
رازوں کا۔ کاش مجھے کچھ علم نہ ہوتا میں نے اپنی عمر سے بڑے عذاب اپنے کاندھوں پہ اٹھائے
ہیں کتنی خوش نصیب ہے یہ لڑکی اس تک آنے والے سارے عذاب اپنے اپنے کاندھوں پہ
خوشی خوشی لینے والے اس کے اپنے اس کے سامنے ڈھال بن کے کھڑے ہیں۔ جب ہی تو
بچپن کی دہلیز پار کر لینے کے بعد بھی اس کی آنکھوں سے بچپن کی ملائمت رخصت نہیں ہوئی۔"

گل نے اس انجانی لڑکی کی معصومیت سے یکا یک بے حد بے حساب حسد محسوس کیا۔

"کیا فرق تھا اس میں اور مجھ میں، سوائے اس کے کہ وہ وہاں پیدا ہوئی جہاں اسے
رحمت سمجھا گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسلام سمجھا گیا اور میں، میں وہاں پیدا ہوئی جہاں مجھے
سکے ڈھالنے والی ٹکسال سمجھا گیا۔ یہ جس چار دیواری میں رہتی ہے، وہاں اس کے حسن
جوانی، عزت اور معصومیت کو بچائے رکھنے کے لیے بہت سے پہرہ دار ہیں اور میں جس جگہ
میں پرورش پاتی رہی وہاں مجھے پیدا کرنے والے ہر بار میرے قد میں ایک انچ کے اضافے
کے ساتھ میری بولی مزید بڑھانے کا سوچنے لگتے۔"

☆======☆======☆

"یہ تم نے ڈھنگ کی بات کی میاں!"

جہاں آرا بیٹے کے ساتھ راہداری میں چلتی باتیں کرتی آرہی تھیں۔

"ان دونوں کی تو عادت ہو گئی ہے خودسری کی۔ اب بھلا ایسی باتیں جذباتی ہو کر سلجھتی
ہیں بھلا، جو بھی ہے جیسی بھی ہے جیتی جاگتی پورے ہاتھ پیر کی لڑکی ہے۔ ایسے کیسے دھکا دے
دیں۔ نہ جانے اب اس کے ماں باپ بھی اسے قبول کریں یا نہیں۔"

"ایک لحاظ سے ان کا کہنا بھی ٹھیک ہے۔" صغیر احمد نے سنبھل کے ساس کے موٗ
کی وکالت کی۔

"ایسی لڑکی جو بغیر نتائج کی پرواہ کیے اتنا بڑا قدم اٹھالے وہ کسی اچھے خاندان کی
نہیں سکتی۔ خاندان اچھا بھی ہوا تو کردار مشکوک ہوگا، بلکہ مجھے تو اس کی دماغی حالت
شبہ ہے کوئی ایسی حسین وجمیل لڑکی مکمل ہوش وحواس میں تو اس جیسے لڑکے پہ فدا نہیں ہو
اس بات پہ جہاں آرا ٹھٹک کے رک گئیں۔

"عجیب دھڑکا لگا دیا تم نے تو ہائے پروردگار دو پاگلوں نے زندگی عذاب کر رکھی
اب جو یہ تیسری والی بھی مستقل گلے پڑ گئی تو اے میاں! ان دیوانوں کے تو بچے بھی پگلے
گے۔" انہیں الگ ہی وسوسے لاحق ہوگئے۔

"ہمارے آنگن میں تو ریل پیل ہوجائے گی باؤلوں کی۔"

"آپ بھی اماں!" صغیر احمد نے اکتاہٹ کے ساتھ انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

ان ہی سوچوں میں غرق دو تین قدم اٹھانے کے بعد وہ ٹیپو کے کمرے کے باہر کھ
تھیں۔

"بسم اللہ کرو بیٹا!"

"آپ بھی آئیں۔" وہ کچھ ہچکچایا۔

"مجھے تو معاف رکھو میاں! تمہیں جو بات کرنی ہے کرو۔ جو فیصلہ لینا ہے لو، میں سا
ہوئی تو جنت بیگم ہر فیصلے کا سہرا میرے سر باندھ کے بلاوجہ کا فساد کھڑا کرے گی۔ تمہارا اشا
تھوڑا بہت لحاظ کرلے۔"

"میں اکیلا اندر۔" وہ متذبذب تھا۔ "کچھ مناسب نہیں لگتا۔"

"وہ تو جیسے بڑی مناسب حرکت کر کے آئی ہے۔" جہاں آرا نے برا سا منہ بنا
دروازے پہ دستک دی۔ دستک سے ہی ساری ناگواری واضح ہو رہی تھی۔

چند سیکنڈ کے انتظار کے بعد انہوں نے دوبارہ ہاتھ بڑھایا مگر فوراً ہی دروازہ کھل گیا
سامنے گل سلیقے سے چادر اوڑھے، دوپٹہ سر پہ لیے کھڑی تھی۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"

جہاں آرا تو ناک پہ انگلی رکھے اس کا بغور جائزہ لینے میں مصروف تھیں صغیر احم
گڑبڑا کے ہلکی سی آواز میں جواب دیا۔

گل سر جھکائے ایک طرف ہوگئی۔ جہاں آرا نے صغیر احمد کو ٹہوکا دے کے اندر جانے کا اشارہ کیا لیکن وہ ہنوز متامل تھا۔

"یہ صغیر احمد ہیں، میرے صاحبزادے۔" جہاں آرا نے تعارف کی رسم نبھائی۔

"اور طلعت منیر کے بہنوئی۔" گل کی نظروں میں استعجاب دیکھ کر جہاں آرا نے وضاحت کی "طلعت منیر یعنی ٹیپو جو تمہیں اپنی منکوحہ بتا رہا ہے۔" ان کے لہجے میں شک پھنکاریں مار رہا تھا۔

"اوہ۔" گل بے ساختہ کہہ اٹھی اور کہہ کر پچھتائی۔

"اے بی بی! جس کا اصل نام تک نہیں جانتی ہو، اس کے ساتھ نکاح کے بول کیسے پڑھوالیے۔"

انہیں تو گویا موقع مل گیا اسے لتاڑنے کا، وہ چپ چاپ سر جھکائے سنے گئی۔

"میاں! تم بھی تو کچھ بولو۔" تھک ہار کے انہوں نے دوبارہ صغیر احمد کو ٹہوکا دیا۔

"آپ اندر آیئے بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" گل کے کہنے پہ جہاں آرا نے حیرت سے بھنویں اچکائیں۔

"لو، یہ تو گھر کی مالک ہی بن بیٹھیں گویا۔ ہمیں اندر آنے کی دعوت دے رہی ہے۔"

وہ اندر مڑ جانے کے بعد دیوار پہ لگے بٹن ٹٹول رہی تھی۔ بلب جلانے کے لیے جب انہوں نے صغیر احمد سے سرگوشی کی۔ وہ چپ چاپ اندر بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

خورشید چینی کے بڑے سے پیالے میں جو چائے سے لبالب بھرا تھا، رسک بھگو بھگو کے کھا رہی تھی۔ جبکہ پاس بیٹھی جنت بیگم اب تک آنسو بہانے میں مصروف تھی۔

"ایسی نیستی قدم گھسی ہے گھر میں...... جس وقت پہلا قدم رکھا اس وقت سارے رات کا کھانا کھانے والے تھے وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اور اب بھی ذرا ڈھنگ کا ناشتہ نصیب نہیں ہوا۔ نہ پوریاں نہ پراٹھے، سوکھے پاپے بھگو بھگو کے کھانے پڑ رہے ہیں۔"

کھانے کے دوران اس کا دل جلا تبصرہ بھی جاری تھا۔

"تجھے اپنے کھانے کی پرواہ ہے، میرے تو کلیجے آگ لگی ہے آگ۔" لال ہوتی باریک سی ناک کو شڑوں کر کے سکوڑا۔

"لسی بنادوں آپاں؟" اس پیشکش پہ جنت نے گھور کے اسے دیکھا۔

"کلیجے کی آگ میں فیدہ دیتی ہے۔ تجھے نا اصل میں معدے کی گرمی ہوگئی ہے۔ کل

کریلے گوشت بھی تو دبا کے کھایا تھا۔"

"اٹھ...... دفعان ہو منہ مت لگو میرے...... میرا بچہ نہ جانے کس چنڈال کو اٹھا لایا ہے اور تُو واہی تباہی بکے جا رہی ہے۔ اب نہ جانے صغیر احمد اندر کون سی کھچڑی پکانے لگے ہیں۔"

"آئے ہائے کھچڑی......" خورشید نے چائے کا بڑا سا گھونٹ زوردار آواز کے ساتھ بھرتے ہوئے پیالہ طشتری میں پٹخا۔

"سویرے چائے پاپے۔ دوپہری کھچڑی رات کو شاید دلیہ ملے گا...... چنگی وہٹی آئی ہے تیری آپاں! لوگوں کے گھروں میں وہٹیاں آتی ہیں تو قورمے بریانیاں کھانے کو ملتی ہیں۔ ادھر تو دال روٹی سے بھی گئے۔"

"کیسی وہٹی؟ کہاں کی وہٹی؟" جنت بیگم صحیح معنوں میں بھڑک اٹھی۔

"اب کے تم نے بھاڑ سا منہ کھولا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا...... ہاں۔"

"تم جتنا مرضی زور لگا لو آپاں! اب تم ساس تو بن گئی ہو۔" خورشید نے چٹخارے لیتے ہوئے کہا۔

"ارے جب میں جانتی ہی نہیں اس شادی کو تو کیسی ساس، کیسی بہو...... اور وہ ٹیپو، سب جانتے ہیں کہ وہ باؤلا ہے دماغ صحیح کام نہیں کرتا اس کا۔"

"رہنے دے آپاں! ایسے ہی سائیں بنا پھرتا ہے۔ اتنا بھی اللہ لوک نہیں ہے۔ بڑا سیانا ہے۔ میرا لال...... دیکھو تو کیسی چھانٹ کر لڑکی پسند کی ہے سوہنی اُچی لمبی۔"

"پرے ہٹ دور ہو جا میری نظروں سے۔" جنت بیگم اسے دونوں ہاتھوں سے پلنگ سے دھکیلنے لگیں۔

"آخر ہے ناں سوت کیسے مزے لے رہی ہے مجھے تکلیف میں دیکھ کے، ہائے بیرسٹر صاحب!"

☆======☆======☆

ٹیپو کے اجڑے ہوئے بے رونق، بے ڈھب بے اطوار کمرے میں ایک وہ تھی جو نظروں کو جچ رہی تھی۔ اپنی تمام تر سادگی اور تھکن بھرے وجود کے ساتھ۔ کمرے میں اس کی سسکیاں ابھر ابھر کے ڈوب رہی تھیں

"اب رونے سے کیا حاصل بی بی!" جہاں آرا نے ایک ہنکارا بھر کے گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑا جس کے تسلسل میں گل کے رونے سے تعطل آ گیا تھا۔

"گھر کی دہلیز تو پھلانگ لی...... اماں باوا کی عزت پہ کالک بھی تھوپ دی۔ اب کیوں

پچھتا رہی ہو؟"

"مجھے اس گھر کو چھوڑنے کا نہ کوئی دکھ ہے نہ پچھتاوا۔" گل نے آنسو پونچھے۔

صغیر احمد اور جہاں آرا دونوں ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھ کے رہ گئے۔ بلکہ جہاں آرا تو اپنی ناگواری چھپا بھی نہ سکیں۔

"بڑی دیدہ ہوائی لڑکی ہو...... بی بی یہ پیار محبت کے قصے کتابوں فلموں تک بھلے لگتے ہیں اور اگر تمہیں ایسا شوق لاحق ہوا تھا تو کوئی ڈھنگ کا بندہ ملنے تک چار دن انتظار کر لیتیں۔ ایسا کیا اتاؤلا پن کہ ٹیپو جیسے لونڈے کے لیے اپنی عزت داؤ پہ لگا دی۔"

"عزت داؤ پہ نہیں لگائی اماں جان! عزت بچانے کے لیے خود کو داؤ پہ لگا دیا۔"

"کیا مطلب؟" صغیر احمد چونکا۔

"آپ جو سمجھ رہے ہیں ایسی بات نہیں ہے، میں ٹیپو میرا مطلب ہے طلعت منیر صاحب کو کچھ عرصے سے جانتی ضرور ہوں لیکن ہمارے درمیان وہ تعلق نہیں تھا جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"تو کیا تعلق تھا تمہارا طلعت منیر صاحب سے؟" وہ چبا چبا کر کہہ رہی تھیں۔

"بے ضرر سا انسان سمجھ کر میں اکثر انہیں گھر سے کھانا وانا لا کر دے دیا کرتی تھی۔ اکثر ڈرامے کی ٹولی کے ساتھ آتے رہتے تھے ہمارے شہر میں۔ بھلے انسان ہیں وہ اور جب مشکل وقت میں ضرورت پڑی تو مجھے لگا اللہ نے اس معصوم اور سادہ انسان کو شاید میری ہی مدد کے لیے بھیجا ہے۔"

جہاں آرا سے ٹیپو کے لیے اتنے اچھے تعریفی الفاظ برداشت نہ ہوئے ان کے منہ کے زاویے بگڑ گئے۔

"کیسی مدد؟ کیسا مشکل وقت؟ کھل کے بات کرو۔" صغیر احمد نے تفصیل جاننا چاہی۔

"میری اماں...... میری اماں رقم کے عوض کسی بڈھے سے میری شادی کر رہی تھی۔"

نہ یہ پورا جھوٹ تھا نہ آدھا سچ مگر بیان کرتے ہوئے گل کے جو آنسو بہہ رہے تھے وہ سو فیصد سچے تھے۔

"سگی اماں؟" جہاں آرا نے حیرت سے کہا۔

"نہیں......" اب کے اس نے جھوٹ کا سہارا لیا...... کون مانتا سگی ماں ہو کر بھی بھلا گاں ایسا کر سکتی ہے۔

"تب۔" وہ سر ہلانے لگیں۔

"میں کر بھی لیتی شادی...... اگر میرے اس بڈھے سے شادی کر لینے سے میری اباّ کی مشکلوں میں کمی ہوتی ہے یا میرے چھوٹے بہن بھائیوں کا بھلا ہوتا ہے تو میں خوشی خوشی لیتی شادی۔"

"تو کیوں نہیں کی؟ کیوں بھاگی گھر سے؟" صغیر احمد نے ڈپٹ کر کہا۔

وہ دوبارہ سسک اٹھی۔

"وہ...... وہ اچھا آدمی نہیں تھا سارا شہر جانتا تھا وہ، وہ جوان اور خوب صورت لڑکیوں سے شادی کرنے کے بعد انہیں کس طرح استعمال کرتا تھا۔"

"توبہ توبہ۔" جہاں آرا نے دوبارہ گال پیٹے۔ "اندھیر ہے اندھیر۔"

"میں جانتے بوجھتے گناہ کی دلدل میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔"

اب وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ صغیر احمد اور جہاں آرا کے مابین ایک بار پھر کچھ سنتی نظروں کا تبادلہ ہوا۔

"طلعت منیر صاحب بھلے خاندان کے لگے مجھے، میں نے سوچا گناہ کا ایندھن بننے سے بہتر ہے میں یہ رسک لے لوں اور کچھ نہیں تو ایک شریف اور عزت دار گھرانے میں جگہ ہی مل جائے گی۔ آپ چاہیں تو مجھے ایک خادمہ، ایک ملازمہ ہی سمجھ لیں۔ کونے میں پڑی رہوں گی۔"

"نکاح کا انتظام کیسے ہوا؟ ٹیپو سے تو یہ امید رکھی نہیں جا سکتی۔"

صغیر احمد کی نظروں میں ابھی بھی بے یقینی کی کیفیت تھی البتہ ماں کے تاثرات قدرے نرم تھے۔

"میری ایک سہیلی نے...... دراصل۔" وہ سر جھکا کے شرمندہ لہجے میں کہتی کہتی خاموش ہوگئی۔

"اگر صرف اس شادی سے بچنا چاہتی تھی اور کسی شریف گھرانے میں پناہ حاصل کرنا مقصد تھا تو اس کے لیے ایک ذہنی...... طور پہ کمزور شخص سے نکاح کرنے کی کیا ضرورت تھی ویسے ہی آجاتیں یہاں۔"

اس کے لہجے میں بھی شکوک بھرے تھے۔

چند ساعت کی خاموشی کے بعد گل کی جھجکتی ہوئی آواز ابھری۔

"میں کسی پہ بھروسہ نہیں کر سکتی تھی، چاہے وہ ذہنی طور پہ میرا مطلب ہے بہر حال وہ ایک مرد ہیں میرے لیے نامحرم تھے میں بغیر کسی شرعی رشتے کے ایک نامحرم کے ساتھ کیسے

جا سکتی تھی۔"

اس دلیل کو سننے کے بعد جہاں آرا نے تائیدی اور توصیفی انداز میں سر ہلایا ان کی نگاہوں میں پسندیدگی تھی۔ جبکہ صغیر احمد لب بھینچے اسے دیکھتا کچھ سوچ رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ جانتی تھی ٹیپو اس وقت کہاں ہوگا...... وہ سیدھی اوپر گئی اور اس کے اندازے کے عین مطابق وہ چھت پہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ حلیمہ کا کلیجہ دہل گیا۔

"ٹیپو!" وہ تیر کی طرح اس کے پاس پہنچی اس کے ہاتھ میں رول کی ہوئی روٹی تھی۔

"تُو ادھر بیٹھا ہے میں نیچے سارے ڈھونڈ کے آئی ہوں تجھے۔"

"آپا!...... میں کہے دیتا ہوں اگر میری دلہن کو کسی نے گھر سے نکالا تو میں بھی چلا جاؤں گا، ہمیشہ کے لیے کبھی نہیں آؤں گا۔" آنسو اس کے چہرے پہ جم چکے تھے۔

"کہاں جائے گا تُو ٹیپو۔" وہ گھبرا اٹھی۔

"بتاؤں گا تھوڑا ہی...... پھر تو تم ڈھونڈتی آجاؤ گی وہاں۔"

"یہ دلہن تجھے ملی کہاں؟"

"میلے میں۔"

"میلے میں دلہنیں بھی ملتی ہیں؟" حلیمہ کے اندر اچانک جوش بھر گیا۔

"پھر تو دولہے بھی ملتے ہوں گے مجھے لے کر چل نا کسی دن...... اپنی نمو کے لیے اچھا سا دولہا لائیں گے۔"

"تمہیں نمو کی پڑی ہے آپا! میرا کیا ہوگا۔" وہ کہنی موڑ کے ماتھے پہ رکھے بچوں کی طرح بلک کر رونے لگا۔

"میرا گھر بسنے سے پہلے اجڑ رہا ہے ہائے میرا سہاگ۔"

ڈراموں میں سنے سارے ڈائیلاگ ایک ایک کر کے کام آرہے تھے۔

"میری دلہن...... اتنی مشکل سے ملی ہے اور بھائی میاں اور اماں اسے واپس بھیج رہے ہیں۔ پتہ ہے آپا...... وہ واپس گھر نہیں جائے گی۔ کہہ رہی تھی تمہارے گھر والوں نے نہ روکا تو سمندر میں ڈوب کر جان دے دوں گی۔"

"اچھا...... بڑی بہادر ہے۔" حلیمہ فوراً متاثر ہوگئی۔

"ڈر نہیں لگتا اسے سمندر سے...... میری تو بڑی جان جاتی ہے۔" وہ جھرجھری لے کر رہ

گئی۔

''آپا! تم کہو ناں بھائی میاں سے...... وہ اسے رہنے دیں۔'' وہ حلیمہ کا پلو کھینچ کر ضد پہ اُتر آیا۔

''تمہارے بھائی میاں میری بات کہاں مانتے ہیں۔'' حلیمہ نے ایک سرد آہ بھر کر دکھی لہجے میں کہا۔ آنسو اس کی پلکوں پہ ٹنگ گئے۔

''ایک بات نہیں سنتے میری کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں فروٹ چاٹ کھلا لائیں مانتے ہی نہیں۔'' آنسو اب پلکوں سے ٹپک کر رخساروں پہ آن گرے۔

''بس مجھے نہیں پتہ میری دلہن کہیں نہیں جائے گی۔'' وہ ہٹیلے پن سے کہنے لگا۔

''میں کہہ دوں گا بھائی میاں سے میں نے بھی تو اپنی آپا نہیں دی تھی دلہن بنا کے، میری دلہن سے کیوں بیر ہے انہیں۔''

''تجھے نہیں پتہ ٹیپو...... وہ تو کچھ بھی نہیں کہہ رہے یہ تو اماں ہیں جو نہیں چاہتیں کہ یہاں رہے۔''

''اماں کو کیا تکلیف ہے؟'' وہ بدتمیزی سے بولا۔

''پاگل...... وہ اماں جو ہوئی'' حلیمہ نے سمجھ داری کا مظاہرہ کیا۔

''تیری دلہن ان کی کیا لگی؟''

''بہو۔''

''اور بہو کس ساس کو اچھی لگتی ہے؟ کسی کو بھی نہیں اتنا بھی نہیں پتہ۔''

''ہاں...... ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تائی اماں کو کون سا تم اچھی لگتی ہو۔ لیکن پھر بھی آپا تم رہی ہو ناں اس کے گھر، پھر بے شک اچھی نہ لگے میری دلہن کسی کو لیکن وہ رہے گی ضرور۔''

''اچھا چھوڑ یہ باتیں لے روٹی کھا ناشتہ تو ابھی بنا نہیں۔ رات کی روٹی گرم کر کے اس پہ مکھن اور چینی لگا کر لائی ہوں تیرے لیے۔ رات بھی تُو نے کچھ نہیں کھایا۔''

''وہ بھی تو بھوکی ہوگی۔'' ٹیپو نے اداسی سے منہ لٹکا لیا۔

''پچاس روپے روز دیتے ہیں اس کے ابا...... خود ہی کچھ کھا پی لے گی۔''

''کون؟''

''نمو...... کالج میں بڑا کچھ ملتا ہے کھانے کو۔''

''میں اپنی دلہن کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ پھر سے دھاڑیں مار کے رونے لگا۔

''بے چاری نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔''

''کل سے؟'' حلیمہ بھی پریشان ہوگئی۔

''پتہ ہے آپا! وہ کتنی اچھی ہے...... میلے کے ساتھ جب میں اس کے شہر گیا تھا تو پاس ہی گھر تھا اس کا ایک دن مجھے بھوک لگی تھی، پیسے بھی نہیں تھے پاس...... اس نے مجھے ڈھیر سارے نان کباب کھلائے۔''

''اچھا...... مزے کے تھے؟'' حلیمہ نے دلچسپی لی۔

''بعد میں کہنے لگی...... تم کتنے اچھے ہو کتنے بھولے اور کتنے پیارے بھی۔'' وہ شرما گیا۔

''پیار کرنے لگی تھی ناں مجھ سے۔''

''پیار......'' حلیمہ بھی شرما گئی اس کے ہونٹوں پہ ایک میٹھی سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

''آپا...... اے آپا۔'' ٹیپو نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''آں...... ہاں۔'' وہ چونکی کچھ ڈری۔

''کیا سوچ رہی تھیں؟'' وہ سر جھکا کے شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''بتاؤ ناں''

''اوں...... ہوں۔''

''نہ بتا پیسے تو دے تھوڑے سے۔'' وہ فوراً مطلب پہ اتر آیا۔

''پیسے؟''

''اس منحوس گھر میں تو کچھ بننے والا نہیں۔ سارے جل ککڑے میرا گھر بسنے کا سوگ منا رہے ہیں۔ میں بازار سے ہی ناشتہ لا دوں بے چاری کو۔''

حلیمہ نے دوپٹے کی گرہ کھول کر سو کا نوٹ نکالا۔

☆======☆======☆

ٹیپو حلوہ پوری کا لفافہ لے کر چپکے سے کمرے میں داخل ہوا۔ بتی جلائی تو گل ندارد۔

"دلہن......" وہ سراسیمہ ہو کر چلایا...... لفافہ وہیں زمین پہ پٹخ کر دیوانہ وار کمرے

بھاگا۔

"میری دلہن...... میری دلہن کو نکال دیا ظالموں نے۔" وہ بھاگا چلا تا سیدھا

کمرے میں آیا کہ دہائی دے سکے اور ٹھٹک کر رک گیا گل، جہاں آرا کے ساتھ فرشی دستر

پہ بیٹھی خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھی...... جنت بیگم کے سامنے بھی ناشتہ رکھا تھا مگر

پھلائے ناراض بیٹھی تھیں۔

"میری دلہن نہیں گئی۔" ٹیپو سے مسرت چھپائے نہ چھپی۔

"وہ کیوں جانے لگی؟ دشمنوں نے اسے میرے سینے پہ مونگ دلنے بٹھا دیا ہے

جنت بیگم نے جہاں آرا کو گھور کے کہا جو گل کو گھٹنے سے لگائے بیٹھی تھیں۔

"شکر کرو کہ گھر بیٹھے بہو مل گئی ہے ورنہ لوگ کنوؤں میں بانس ڈلوا لیتے ہیں بیٹوں

دلہن ڈھونڈنے کے لیے۔"

"مگر کنوؤں میں تو دلہنیں نہیں ہوتیں اماں!" حلیمہ نے کپ میں چائے انڈ

کہا۔

"نکلتی ہیں...... تمہارے جیسی۔" وہ بڑبڑائیں۔

"ٹیپو کو تو دلہن میلے سے ملی تھی۔" حلیمہ نے گل کو پیار سے دیکھ کر کہا۔

"جہاں سے بھی ملی ہو۔ اب سنبھال کے رکھو۔ قسمت آئے دن مہربان نہیں

کرتی۔"

"میں نہیں رکھنے والی ایسی راہ چلتی کو۔" جنت بیگم نے صفا چٹ جواب دیا۔

"شریف گھر کی ہے، حیا والی ہے، پڑھی لکھی اور تمیز دار بھی...... خوب صورتی تو خیر نظر آنے والی چیز ہے...... نظر آ ہی رہی ہے اور تمہیں کیا چاہیے۔ اپنے لڑکے کو لے کر نکلو۔ ان میں سے کسی ایک گن والی بھی تیار ہو اس سے شادی کرنے پہ تو جو چور کی سزا وہ میری...... لوگ ترستے ہیں ایسی بہوؤں کے لیے...... اچھے بھلے مردوں کے ہاتھ کیسی اودھ بلائیں لگتی ہیں۔"

آخری فقرہ حلیمہ کو گھور کے کہا گیا، جس پہ حلیمہ بے طرح شرما گئی اور مسکرا کے فخریہ انداز میں گل کی جانب دیکھنے لگی۔

گل اس عجیب انداز پہ الجھ گئی...... کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ٹیپو سے نرمی سے مخاطب ہوئی، جو بچوں کے سے اشتیاق سے اس کے پاس بیٹھا اسے تکے جا رہا تھا اس کی بلا سے باقی لوگ بھی جتنی مرضی بحث میں الجھے رہیں۔

"آپ بھی ناشتہ کر لیجیے۔" اتنی عزت اتنے التفات پہ تو وہ لٹو ہی ہو گیا...... جنت نے سر جھٹک کر اپنی ناگواری ظاہر کی۔

"ذرا پرے کھسکو آپا!" ٹیپو نے گل کے اور نزدیک ہونے کی غرض سے حلیمہ کو ٹہوکا دیا۔

"ہاں ہاں...... پرے کھسکو...... اسے جورو کے گھٹنے سے لگ کے بیٹھنا ہے۔ اس کے ہاتھ سے لقمے لے گا۔"

جنت بیگم کے جل کے کہنے پہ گل شرمندہ سی ہو گئی۔

"ہاں ہاں بیٹھوں گا جڑ کے...... چپک کے۔"

وہ گل سے لپٹ گیا۔ وہ بالکل ہی سراسیمہ ہو گئی بوکھلا کے پیچھے ہٹنا چاہا مگر ٹیپو نے اس کے شانے کے گرد بازو لپیٹ کر اسے اور پاس کر لیا۔

"کر لو جو کرنا ہے میری دلہن ہے میری، ہاں کھاؤں گا میں اس کے ہاتھ سے نوالے۔"

جنت اور جہاں آرا دونوں حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھنے لگیں...... حلیمہ کو البتہ ٹیپو کا یہ تماشہ دلچسپ لگ رہا تھا۔

"گل...... کھلاؤ ناں مجھے۔"

گل نے باری باری سب کے چہرے دیکھے...... ہر جانب ناگواری اور ناپسندیدگی ہویدا تھی...... وہ گھبرا اٹھی اس ابتدائی مرحلے پہ اسے کسی کی ناراضی مول نہیں لینا تھی اور ٹیپو یہاں بنی بنائی کر کری کرانے پہ تلا بیٹھا تھا۔ اسے سخت تاؤ آیا، دل چاہا دونوں ہاتھوں سے اس مردود کو پرے دفعان کر دے۔

"کھلاؤ نا میری جان! دیکھنا کیسے جل کے کباب ہوتی ہے اماں! کھلانا۔"

اب کے اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کے پلیٹ کی جانب کیا۔ گل نے گھبرا کے ہاتھ چھڑایا اور پلیٹ اٹھالی۔

"لیجیے..... کھائیے۔" شائستگی اس نے دانستہ اپنے لب و لہجے میں کوٹ کے بھری تھی۔

"اب میں کچھ کھاؤں گا..... پیوں گا تو تمہارے ہاتھ سے۔" وہ ضد پہ اڑ گیا۔

"ایسا اتاولا پن نہ دیکھا..... نہ سنا، پھٹا پڑ رہا ہے۔ اوقات سے اچھی جورو پا کے۔" جہاں آرا نے نفرت سے ناک سکوڑی۔

"دیکھو دلہن! کھلا دو ورنہ میری بے عزتی ہو جائے گی سب کے سامنے کھلاؤ اور ان سب کی کچی کردو۔"

گل آہستہ سے ایک نوالہ توڑ کے شوربے میں بھگونے لگی۔ کن اکھیوں سے اس نے حلیمہ کی جانب دیکھا، جو بڑے اشتیاق سے اس کے اور ٹیپو کے درمیان سر گھسائے ہوئے تھی۔

گل نے جھٹ نوالہ حلیمہ کے سامنے کر دیا۔

"آپا کے ہاتھ سے لیجیے ناں کتنا پیار کرتی ہیں وہ آپ سے۔"

حلیمہ نے خوش ہو کر نوالہ تھاما اور ٹیپو کے منہ میں دے دیا۔ جہاں آرا کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

☆======☆======☆

خورشید، نرمین کے سر میں تیل لگا رہی تھی..... نرمین فرش پہ بیٹھی تھی اور سر اس نے تخت پہ بیٹھی خورشید کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ خورشید خوب زور و شور سے اس کے مالش کر رہی تھی۔

"بس کریں ناں نانی اماں۔"

نرمین کے چہرے پہ سکون کی بجائے تکلیف کے آثار تھے۔

"چپ کر کے بیٹھی رہ..... بال نہیں، جنجال ہے تیرے سر پہ۔ پوری شیشی تیل کی لگ گئی تو فرق پڑے گا۔"

"پوری شیشی نانی اماں!" وہ کراہی۔

اسی وقت دھڑ سے دروازہ کھلا اور بھنا کھاتی چھنو اندر آئی۔

"نمو..... یہ میں کیا سن۔"

ابھی حیران پریشان انداز میں اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ خورشید نے ٹوک دیا۔

"نہ سلام نہ دعا..... ابھی ہوتی وہ جہاں آرا ادھر تو تیری چنگی بے عزتی خراب کرتی...... ہے تو تُو اسی جوگی۔"

"سلام نانی! دراصل میں نے خبر ہی ایسی سنی ہے کہ دھیان نہیں کیا اس طرف میں دو دن کے لیے گجرات کیا گئی کہ محلے میں افواہیں گرم ہوگئیں۔"

"کیسی افواہیں؟"

"یہی کہ ٹیپو..... وہ تمہارا ماموں..... رات کسی لڑکی کو بھگا لایا ہے۔" اس نے سراسر مذاق اُڑاتے لہجے میں کہا۔

"میں نے بھی خوب سنائیں کہ جاؤ کسی اور کو اُلو بناؤ۔ میں نہیں آنے والی ایسی بے کار افواہوں میں..... پھر سوچا، جا کے پتہ تو کروں، یہ افواہیں پھیلا کون رہا ہے۔"

"یہ افواہیں نہیں ہیں۔" نرمین نے آہستہ سے کہا۔

"کیا مطلب۔" وہ چونکی۔

"مطلب کیا ہونا ہے..... میرا ٹیپو چن ورگی ووہٹی لایا ہے۔"

"چہ..... چہ..... چن۔" چھنو کے حلق میں کچھ اٹک گیا۔

خورشید اس کے سر پہ ہاتھ لگا کے اس کے بالوں کی صحت چیک کرنے لگی۔

"آ تیرے جھاٹے میں بھی ماسہ تیل لگا دوں۔"

"واہ....." چھنو نے اس کا ہاتھ جھٹک کر تیز لہجے میں کہا۔

"ووہٹی..... پتہ نہیں کسی طوائف کے کوٹھے کی پوچھن سمیٹ لایا ہے وہ اور تم چلی ہو رشتے جوڑنے۔"

"دفع..... مرجانی کسی کنواری کڑی کی اتنی لمبی اور گندی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں کی..... کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے نمو کی دادی جو اسے تیرے سے بچاتی پھرتی ہے تو ٹھیک کرتی ہے۔"

"چلو..... اب دیکھتی ہوں اس بھگوڑی سے کیسے بچا کے رکھتی ہیں اسے۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا دادی نے اسے گھر میں کیسے گھسنے دیا۔ ویسے تو بڑی اصولوں والی بنتی ہیں۔"

"مجھے پتہ ہے۔" خورشید نے راز داری سے بتایا۔

"آپاں کی ضد میں رکھا ہے اس نے، کہتی ہوگی کہ جو کس بل وہ جٹھانی بن کے اور میں سوتن بن کے نہ نکال سکی، شاید یوں نکال دے۔"

"گھر کا ماحول خراب ہو جائے گا نانی!" چھنو نے ناک چڑھائی۔

"نہیں چھنو! ممانی بڑی اچھی ہے۔" زمین نے دبے دبے جوش کے ساتھ بتایا۔

"ہونہہ...... میں خوب جانتی ہوں ایسی گھر سے بھاگنے والیوں کو۔" اس کی بات پہ خورشید نے ٹھٹھا لگایا۔

"ہاں تو نہیں جانتی ہوگی تو اور کون جانے گا...... تیرے دادکوں (ددھیال) میں سے اور نانکوں (ننھیال) میں سے تین گھر سے بھاگی ہوئی ہیں۔"

"کچھ دیکھ کے بھاگی تھیں وہ۔" وہ کون سا شرمندہ ہونے والوں میں سے تھی۔ ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"اور یہ...... جس کا ٹیسٹ اتنا خراب ہے کہ وہ ٹیپو جیسے کے ساتھ بھاگ جائے تو یہ کتنی گئی گزری ہوگی، وہ مجھے تو لگتا ہے چڑیلوں کا بھاؤ گر گیا ہے جو وہ کہیں سے۔"

"شربت لیجیے۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی...... نظروں کے سامنے سلور ٹرے تھا۔ ٹرے میں رکھے شربت کے گلاس مکرامے کا پوش اور بڑے سک سے آرٹسٹک انگلیوں والے سانولے پُرکشش ہاتھ اور شائستگی ولوچ سے رچی بسی آواز...... اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

گدگدانے والی کیفیت لیے بھرے بھرے ہونٹ...... اَن گنت افسانے سناتی کسی راج نرتکی جیسی آنکھیں...... ستواں ناک میں پڑی سونے کی کیل سانچے میں ڈھلا سراپا۔

"یہ ہے میری ممانی۔" زمین نے فخریہ انداز میں تعارف کرایا۔

چھنو کا گلاس تھامنے کے لیے بڑھتا ہاتھ وہیں تھم گیا۔

☆======☆======☆

وہ سیلن زیادہ باس سے بھرا کمرہ۔

گل کو اس کمرے میں گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ جہاں آرا نے اسے بصد اصرار اندر بھیجا تھا کہ وہ آرام کر لے...... اسے آرام کی ضرورت بھی تھی...... ساری رات پلنگ کی پائنتی پہ ٹک کے گزاری تھی...... نظریں دروازے پہ اس وقت تک لگی رہی تھیں، جب تک یہاں رہنے کا پروانہ نہ مل گیا تھا۔ لیکن آرام اور اس کمرے میں؟

نیند سے مندتی آنکھیں اس کمرے میں آنے کے بعد پٹ سے کھل گئی تھیں...... یہ کمرہ اس کی جھگی کے مقابلے میں دس گنا بڑا تھا۔ پرانے وقتوں کی بنی اونچی چھت...... دیوار گیر آبنوسی الماریاں...... یہ بڑا سا جہازی سائز پلنگ...... لیکن ہر چیز سے تکیے سے چادر سے تولیے سے سب سے ٹیپو کی مخصوص بدبو آ رہی تھی...... جو پہلے اسے خاص محسوس نہیں ہوئی تھی

لیکن جب سے اس کا نام ٹیپو کے نام سے جڑا تھا اسے خواہ مخواہ ہی اس نام سے اور اس نام سے وابستہ ہر چیز سے چڑ ہونے لگی تھی۔ پھر ٹیپو کی بدبو کیسے برداشت ہوتی۔ وہ چونکہ ٹیپو کی بیوی کی حیثیت سے یہاں داخل ہوئی تھی۔ اس لیے یہ ایک طے شدہ بات تھی کہ اسے جگہ اسی کمرے میں ملنا تھی۔

وہ جھنجلائی ہوئی سی تکیے پہ سر پٹخ رہی تھی...... پھر اٹھ کے بیٹھ گئی ماتھا بے شمار سلوٹوں سے پُر تھا۔

"کیا مصیبت مول لے لی میں نے۔" وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔

"لیکن اور کیا کرتی...... شوکے کے ہاتھ لگ جاتی تو پھر دوبارہ نکلنا محال ہوتا...... یہاں سے تو جب چاہے نکل سکتی ہوں۔"

اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی...... دل کو خود بخود سکون سا ملنے لگا۔

"کون سا میں نے سچ مچ۔" وہ اب شانت نظر آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

حلیمہ صحن میں لگے نل کے پاس نیچے زمین پہ چوکی پر بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ نزدیک ہی واشنگ مشین لگی تھی۔ حلیمہ کسی قمیص کا کالر ہاتھ سے رگڑتے ہوئے حسبِ عادت کسی گہری سوچ میں گم تھی...... منہ تھوڑا سا کھلا ہوا...... ہونٹ خشک پڑ رہے تھے۔ کھلے نل سے پانی بہہ رہا تھا۔ اچانک واشنگ مشین کا الارم بج اٹھا اس کی تیز اور کرخت آواز بھی حلیمہ کا ارتکاز نہ توڑ سکی اس کی پلک تک نہ جھپک رہی تھی اور ہاتھ سلو موشن کے سے انداز میں قمیص کو رگڑے جا رہے تھے۔ الارم کی کریہہ آواز پہ جہاں آرا اکتا کے کمرے سے نکلیں اور حلیمہ کی حالت دیکھ کر اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"ہائے ری قسمت۔" اور آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ سے قمیص چھینی...... الارم تھک ہار کے خود ہی بند ہو گیا۔

"گنوں کی پوری...... ناس کر کے رکھ دی نئی قمیص میرے صغیر احمد کی...... اور یہ پانی کیوں کھلا چھوڑ رکھا ہے...... اٹھو یہاں سے۔" حلیمہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خود کر لوں گی میں...... تم جاؤ جا کے سبزی بناؤ۔" وہ تابعداری سے سر ہلاتے کچن کی جانب مڑ گئی۔ جہاں آرا بڑبڑ کرتی چوکی پہ بیٹھ کے دھلے کپڑے نچوڑنے لگیں۔

"لائیے اماں جان...... میں کر دیتی ہوں۔" گل نے آگے بڑھ کے ان کے ہاتھ سے قمیص لینا چاہی۔

"اررر...... رے تمہارا کام نہیں ہے یہ۔" وہ بوکھلا گئیں کہ کیسے اور کیا کہہ کر منع کریں اسے۔

"کام تو یہ آپ کا بھی نہیں ہے۔" اس نے محبت اور احترام لہجے میں سمو کر کہا۔ جہاں آرا حیرت سے تکتی رہ گئیں۔

"میرا مطلب ہے یہ سب کرنے کی آپ کی عمر نہیں ہے۔"

"اور جس کی عمر ہے...... جس کی ذمے داری ہے اس میں صلاحیت ہوتی یہ کم سنبھالنے کی تو رونا کس بات کا تھا۔" انہوں نے افسوس سے کہا تو گل نے نیچے بیٹھ کر ان کے آگے رکھے کپڑے بالٹی میں ڈالے اور بالٹی اپنے آگے کھسکا لی۔

"آپ آرام کیجیے...... میں کرلوں گی۔"

"مگر تم......" وہ ہچکچا گئیں۔

"آپ ہی نے تو مجھے اس گھر میں سر چھپانے کی جگہ دی ہے پھر آپ تو غیریت نہ برتیں۔ اگر مجھے یہیں رہنا ہے تو اس گھر کو اپنا جان کے یہ سب کرنے دیں۔"

"مگر تم ایک دن کی بیاہی دلہن ہو جو بھی ہے جیسے بھی آئی ہو، ہو تو نئی دلہن ایسے کیسے کام پہ لگا دوں۔ یہ ہمارے گھر کا وتیرہ نہیں ہے ہم تو دلہنوں سے تب تک کام نہیں کرواتے جب تک ان کے ہاتھوں کی مہندی بھی......"

کہتے کہتے ان کی نظریں اس کے جھاگ سے بھرے ہاتھوں پہ گئی اور وہ چپ کر گئیں۔ گل اداسی سے مسکرا دی۔

"کیسی مہندی اماں جان......! میں اس گھر کی دلہن بن کے نہیں، پناہ لینے والی بن کے آئی ہوں۔ مجھے اس حیثیت سے رہنے دیں۔" جہاں آرا چند لمحے افسوس سے اسے دیکھتی رہیں پھر ایک تاسف بھرا ہنکارا بھر کے اٹھ گئیں۔

"کیسے کیسے ہیرے کیسے کیسے ناقدروں کی جھولی میں آن گرتے ہیں۔" پھر چادر اوڑھنے لگیں۔

"میں ذرا اس نامراد کام چور رجو کی خبر لوں...... آئے دن کام سے چھٹی، اس کے انتظار میں رکھے رکھے کپڑوں کا ڈھیر ابل رہا تھا۔"

"ایسی تنگ کرنے والی ملازمہ ہے تو چھٹی کر دیں اس کی جگہ میں آ گئی ہوں...... سب سنبھال لوں گی۔"

"جیتی رہو۔" وہ نہال ہو گئیں اس مستعدی پہ اس تابعداری پہ۔ "گرہستنوں والے

اطوار ہیں تمہارے...... مگر اس رجو کی چوٹی کھینچ کے تو لانا ہی پڑے گا۔ بھلا اتنے بڑے گھر کی صفائی کسی ایک بندے کے بس کی بات ہے؟"

ان کے نکلنے کے بعد گل نے بڑے دھیان سے ایک ایک کپڑا دھویا...... وہ تار پہ کپڑے پھیلا رہی تھی، جب ٹیپو دونوں ہاتھ پیچھے کر کے کچھ چھپاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ ساتھ ساتھ وہ گردن اونچی کر کے دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ سامنے سے کوئی آ تو نہیں رہا۔ گل کی نظر اب تک اس پہ نہ گئی تھی...... وہ کسی اور خیال میں گم کسی معمول کی طرح ایک ایک کپڑا پھیلا رہی تھی ایک دوپٹہ پھیلانے کے بعد اس نے جیسے ہی دوسرا دوپٹہ جھٹک کر کھولا، سامنے ٹیپو کا مسکراتا چہرہ سامنے تھا...... اس کے اچانک نظر آ جانے پہ وہ ڈر سی گئی۔

"اوہ...... تم نے ڈرا ہی دیا۔" وہ سینے پہ ہاتھ رکھے کہہ رہی تھی۔

"سچی؟ ڈر گئیں مزے۔" وہ ہنسنے لگا...... پھر ہنستے ہنستے اچانک اس کی کلائی تھام لی۔

"اندر چلو۔"

"کہاں؟" وہ ہونق ہو گئی۔

"اندر کمرے میں۔" وہ آنکھیں مٹکا مٹکا کے کہتا بڑا اوپرا سا لگ رہا تھا اس ٹیپو سے قطعاً مختلف جو پہلی بار اسے ملا تھا اور جو سرکس کی ممتاز بیگم پہ فدا ہو رہا تھا۔

"کک...... کیوں میرا مطلب ہے میں کام، کام کر رہی ہوں۔" اس کی ہتھیلیاں پسیجنے لگیں...... دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔

"کیوں...... تم کیوں کر رہی ہو؟ وہ رجو بدتمیز کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں پتہ تم جاؤ مجھے کام کرنے دو۔"

"پھر سے تم؟ اندر تو آپ آپ کر رہی تھیں؟"

"اچھا...... آپ۔" وہ تحمل سے بولی۔

"آپ اندر جائیں۔"

"تم بھی آؤ ناں...... تمہیں کچھ دکھانا ہے؟"

"دکھاؤ...... دکھائیں۔" ساتھ ہی تصحیح کر دی مبادا پھر کوئی اعتراض نہ اٹھ جائے۔

"میٹھا پان لایا ہوں تمہارے لیے۔" اس نے پیچھے چھپایا ہاتھ آگے کر کے دکھایا...... میٹھے پان کا کچومر نکل رہا تھا۔ اسے سخت گھن آئی۔ میلے کچیلے ہاتھ بند مٹھی کی وجہ سے پسینے سے بھرے اور پسینے کی وجہ سے ہاتھ کی گہری لکیروں میں دبی میل کا کیچڑ سا بنا ہوا...... اور چرمر ہوئی پان کی پڑیا۔

"میں نہیں کھاتی۔" مارے کراہیت کے اس نے منہ ہی پھیر لیا۔

"جب ہی اتنے چٹے چٹے دانت ہیں تمہارے۔"

وہ کوئی جواب دیئے بغیر اپنا کام کرتی رہی...... ایک اور چادر پھیلا کے ڈالی تو ٹیپو نے اپنا وہی ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ گل نے گھبرا کے اسے دیکھا...... وہ حیران بھی تھی، پریشان بھی......

"چھوڑو ناں یہ سب آؤ اندر چلتے ہیں۔"

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹیپو کو دیکھا...... وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ اب کسی دیوانے کی نہیں، کسی مرد کی آنکھیں تھیں۔

"اندر؟" اس کے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔

"ہاں اندر چل ناں۔" اب کے اس نے آنکھ بھی مار دی۔

جس بات کو گل بھانپ کے بھی نظر انداز کرنا چاہ رہی تھی، اب نہ کر سکی...... اس کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"وے ٹیپو۔" خورشید کی آواز پہ اس کی جان میں جان آئی۔ وہ سر کھجاتی یہیں آ رہی تھی۔ گل نے جلدی سے خالی بالٹی اٹھائی اور برآمدے کو پار کرنے لگی۔

"کیا ہے؟" ٹیپو پھاڑ کھانے کے انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"جب دیکھو آوازیں دیتی رہتی ہے۔"

☆======☆======☆

وہ رات کے اندھیرے میں چھپ چھپ کے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی...... بار بار پیچھے مڑ کے بھی دیکھ لیتی، چھت پہ آنے کے بعد اس نے برابر والی چھت پہ جھانکا۔ وہاں وہ بائیس تیئیس برس کا لڑکا دوسری جانب منہ کیے نیچے جھانک رہا تھا۔

"اے...... شش۔"

لڑکے نے مڑ کے دیکھا...... چھنو چھت پہ آ چکی تھی۔ وہ فوراً درمیانی دیوار پھلانگ کے اس کی چھت پہ آ گیا۔

"ادھر کیا دیکھ رہے تھے؟" چھنو نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

"وہ نیچے۔" وہ گڑبڑا گیا۔

"سب پتہ ہے مجھے۔" وہ ہلکا سا پھنکاری۔

"ادھر مجھے ملنے کے لیے بلایا ہے۔ ادھر پیچھے والی فری کو تاک تاک کر دیکھا جا رہا

ہے۔ چھت پہ سوتی ہے ناں وہ۔"

"مجھے کیا پتہ...... کہاں سوتی ہے کہاں جاگتی ہے مجھے تو ہر جگہ تم ہی تم نظر آتی ہو۔" اس نے ہلکے سے چھنو کا چہرہ چھوا...... وہ فوراً ہی اس کا ہاتھ جھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"چل چل مجھے ایسے چونچلے اچھے نہیں لگتے، وہ بھی خالی پیٹ بھابھی نے بھی پتہ نہیں کس دل سے ٹینڈے پکائے تھے بالکل ان کی طرح پھیکے سخت مجھ سے تو دوسرا نوالہ نہیں لیا گیا۔"

"دیکھ لو دل کو دل سے راہ ہوتی ہے مجھے پتہ تھا میری چھنو کو بھوک لگی ہے اس لیے تکے اور نان لے کر آیا ہوں۔"

"بس بس زیادہ ہیرو نہ بن...... ایسے کہہ رہے ہو جیسے سچ مچ گھر بیٹھے میرے بارے میں سارا پتہ چل جاتا ہے۔ ہونہہ دل کو دل سے راہ۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔

"ویسے بھی دیوار سے دیوار ملی ہے ہمارے گھروں کی۔ جس وقت تم نے ٹنڈوں کی پلیٹ اٹھا کے بھابھی کے منہ پہ مارنے کی دھمکی دی تھی تب میں اپنے صحن میں سب سن رہا تھا اسی وقت بھاگا تھا تکے لینے۔"

"اسی وقت کے؟" ہلکا سا چیخی۔

"اب تک وہ ٹھنڈے ہو گئے ہوں گے لاؤ۔"

اور آدھے سے زیادہ تکے کھانے تک اس نے سوائے نوالے منہ میں لینے کے کسی اور مقصد کے تحت منہ نہ کھولا۔ پیٹ کچھ بھر گیا تو جتانے والی نظروں سے اسے دیکھ کر کہنے لگی۔

"ایک دو تکے اپنی بے چاری اماں کو بھی لا دیتے تھے۔ پیالی اٹھا کے سالن مانگنے آئی تھی۔ شام کو ہمارے ہاں۔" اسے عاشقانہ انداز میں تکتا وہ شرمندہ سا ہو کر زمین کریدنے لگا۔

"بھابھی نے بھی وہی ٹینڈے صاف کر کے ان کی پیالی میں ڈال دیئے، جو میں نے لائے تھے۔" وہ کمینگی سے ہنسنے لگی۔ بے چارے کی شرمندگی سوا ہو گئی۔

"تم نے تو نہیں کھائے؟" اب وہ ہڈی چوستے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں نہیں، ہمارے ہاں تو آلو قیمہ بنا تھا۔ وہ ٹنڈے تو اماں نے ماسی کے لیے لیے تھے۔"

"اچھا ماسی بھی رکھ لی تمہاری اماں نے؟" چھنو نے کچھ بے یقینی کچھ تمسخر سے پوچھا۔

"چھوڑو ناں یہ اماؤں اور ماسیوں کی باتیں۔" وہ اس کا ہاتھ سہلانے لگا۔

"میں اس طرح چھت پر چوروں کی طرح ملتے ملتے تنگ آ گیا ہوں۔ کوئی باہر پروگرام بناؤ نا۔ کسی دن کالج سے۔"

"وہی تو نہیں کر سکتی۔" چھنو منہ بنا کے رہ گئی۔

"یہ نمو عذاب بن کے سر پہ سوار ہو گئی ہے۔ نہ خود کچھ کرتی ہے نہ کرنے دیتی ہے۔ ا... کے کہنے کی تو میں پرواہ نہیں کرتی مگر آنا جانا اس کے ساتھ ہوتا ہے اور واپسی پہ کبھی اس لینے آ جاتا ہے کبھی ماموں اگر جو کسی نے دیکھ لیا تو سیدھا میرے ابا سے جا کر شکایت جڑ گا۔"

"یہ نمو سے تمہاری دوستی ہوئی کیسے؟"

"وہ میری دوست بنی پھرتی ہے، میں اس کی دوست نہیں ہوں۔" وہ اس کے کر سے ہاتھ پونچھ رہی تھی۔

"یکطرفہ محبت کا تو سنا تھا۔ یہ دوستی بھی یکطرفہ ہوتی ہے کیا؟ پہلی بار سنا ہے۔"

"ہائے بڑی مرچیں ہیں۔" وہ بار بار سرخ سی زبان باہر نکال رہی تھی۔

"بوتل نہیں لائے؟"

"کیا کچھ لاتا چھت پہ...... اسی لیے کہتا ہوں کسی دن کالج کے بعد نکلو میرے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھلاؤں گا۔"

"وہی مصیبت نمو، اچھا کرتی ہوں کچھ۔"

"ایسی زبردستی کی سہیلی بنی ہوئی ہے تو جان کیوں نہیں چھڑوا لیتی ہو اس سے۔" وہ کے رہ گیا کتنے ہفتوں سے تکے کھلائے اور جوس پلائے جا رہا تھا۔

"کر تو لوں مگر...... تمہیں پتہ ہے ناں اس علاقے کا، اس محلے کا سب سے کھاتا سب سے عزت والا گھرانہ کون سا ہے؟"

"صغیر چچا کا۔"

"تو پھر اندازہ لگا لو کہ میں نے نمو سے جان کیوں نہیں چھڑائی۔" وہ پُر اسرار طر سے مسکرانے لگی۔

☆======☆======☆

وہ کمرے میں اکیلی تھی۔

سارا دن اس سے چھپتے چھپاتے کونے کھدروں میں گھسے، الٹے سیدھے کاموں خود کو پھنسائے گزار لیا تھا۔ اب رات کس بل میں گزارتی...... آنا ہی پڑا۔

اس نے ہتھیلیاں کھول کے دیکھا، گھبراہٹ کے مارے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا اور پسینے سے بھری ہتھیلیوں پہ مہندی کا رنگ اور بھی تیز چمک دے رہا تھا۔ یہ مہندی جہاں آرا نے خاص حکم دے کر زمین سے لگوائی تھی اور رنگ گہرا آنے پہ بطور خاص جنت کو سنایا گیا تھا۔

"واہ لگتا ہے ساس کی چہیتی رہو گی۔"

"میری جوتی سے۔" جنت بیگم کلس کے رہ گئیں۔

پھر اس نے گلے سے سرخ دوپٹہ نوچ کے اتارا...... جس کے چاروں جانب رو پہلی کرن اسے خار کی مانند چبھ رہی تھی۔ چوڑیاں اتار کے سنگھار میز پہ پٹخیں...... اسی کرن لگے دوپٹے سے بے دردی سے رگڑ کے ہونٹ صاف کیے، جہاں میک اپ کے نام پہ سرخ لپ اسٹک لگائی گئی تھی۔

دروازے کے قریب آہٹ ہونے پہ اس نے چونک کر دیکھا۔ کوئی تھا جو دروازے کے پاس سے ہو کر گزر گیا۔

اس نے سکون کی سانس لی...... مگر ابھی یہ سانس پوری نہ ہونے پائی تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور دھلا دھلایا صاف ستھرا سا ٹیپو مسکراتا شرماتا سامنے تھا، نہ جانے کس نے رگڑ کے نہلایا تھا اسے جو اصل شکل نکل آئی تھی اس کے باوجود اس کا دل اسے دیکھ کے بیٹھا جا رہا تھا۔

ایک قدم اس نے گل کی جانب بڑھایا...... اور گل نے ایک قدم کونے میں دھری گٹھڑی کی جانب بڑھایا۔

"کیا لگ رہی ہے تُو میک اَپ شیک اَپ میں......"

ٹیپو کا لہجہ انجانے جذبات سے بوجھل ہوا جا رہا تھا...... "بالکل ممتاز بیگم جیسی......"

اس کی تعریف کے اس انداز نے گل کو کھولا کے رکھ دیا۔ پنجرے میں بیٹھی لومڑی کے دھڑ والی ممتاز بیگم اسے منہ چڑاتی نظر آئی۔

اس نے گٹھڑی کی ادھ کھلی گرہ میں ہاتھ ڈالا...... چند سیکنڈ بعد بند مٹھی نکال کر پہلو میں چھپا لی۔

☆======☆======☆

جہاں آرا گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے، بڑی تکلیف کے عالم میں چلتی باورچی خانے کی جانب جا رہی تھیں۔

"یہ گھٹنوں کی تکلیف مجھے نہیں اس پورے گھر کو لے ڈوبے گی۔ ایک میں نہ ہوں تو دس

بجے تک ناشتہ ہی نہ تیار ہو، بہو ہے تو کوڑی کام کی نہیں۔ اور وہ دونوں...... چڑ
گھڑوں...... کھانا ہے تو پتیلیوں۔ کام کے وقت قبر کھود کے بیٹھ جاتی ہیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی باورچی خانے میں داخل ہوئی اور چونک گئیں۔ گل چوکی دھرے چھپ پراٹھے تلے جا رہی تھی۔ تپائی پہ دھری ٹرے میں ایک پلیٹ میں پانچ انڈے نفاست سے تلے رکھے تھے۔ دوسری میں رات کی بچی آلو کی بھجیا۔ اور ایک پیالی میں نکالا رکھا تھا۔

دوسرے چولہے پہ چائے کا پانی رکھا تھا برابر والی چوکی پہ حلیمہ بیٹھی تھی اور اپنے کا میں مصروف تھی۔ ایک ہاتھ میں پرانے اخبار کے پھٹے ہوئے ٹکڑے رکھے تھے۔ دوسرا ہاتھ سے وہ ایک ایک ٹکڑا چولہے کی آگ میں جھونکتی تھی اور پھر آگ دھڑ دھڑ پکڑتے د اس کے چہرے پہ بچوں کی سی طمانیت اور سرور چھا جاتا۔ کاغذ کو راکھ میں بدلنے کا عمل اس ہونٹوں پہ سرشاری مسکراہٹ لے آتا۔ لیکن یہ مسکراہٹ جہاں آرا کے دل کو جلا کے رکھ دیتی۔

"اس شتابہ کے کھیل تماشے ہی ختم نہیں ہوئے...... جانے کب ہوش پکڑے گی یہ۔"

حلیمہ یہ سن کر گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکا کے شرما کے مسکرا دی۔ گل نے روٹی بیلتے بیلتے رک بڑے اچنبھے سے یہ منظر دیکھا۔ لیکن جہاں آرا کے لیے یہ منظر ہزار بار کا دیکھا ہوا تھا۔ ا ہزار بار کڑھنے کے باوجود نئے سرے سے کڑھ گئیں۔

"یا اللہ......! میری مٹی عزیز کر لے۔ اب اور نہیں دیکھا جاتا۔ اس کی تو آنکھوں کا ہی مر گیا ہے۔ مسکراہٹیں دیکھو ذرا...... یہ حال رہا تو گلی میں نکلے گی تو بچے ڈھیلے گے...... ڈھیلے۔"

پھر گل پہ توجہ دی......

"اچھا کیا بیٹی! جو تم نے وقت پہ چولہا چوکی سنبھال لی۔ میں تو سمجھے بیٹھی تھی کہ با سارا گھر بنا ناشتے کے رہے گا یا میں بنا گھٹنوں کے...... اس درد کے ساتھ اب کام کرنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"آپ آرام کیجیے اماں جان! آپ کا ناشتہ میں آپ کے کمرے میں پہنچا دوں گی۔"

"ہاں ہاں...... جاتی ہوں...... میں نے کہا تمہیں یہ تو بتا دوں کہ گھر میں کس کس کو لینا پسند ہے ناشتے میں۔"

"مجھے پتا ہے اماں جان! دو دن سب کے ساتھ بیٹھ کے ناشتہ کیا ہے۔ اتنا اندازہ تو جاتا ہے۔"

مگر جہاں آرا بے یقینی اور تعجب کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھنے لگیں تو وہ مسکرا کے تفصیل سے بتانے لگی۔

"آپا، بھائی صاحب، نرمین، طلعت منیر صاحب اور چھوٹی اماں کے لیے فرائی انڈے اور پراٹھے۔ نرمین اور چھوٹی اماں بغیر اچار کے ناشتہ نہیں کرتیں، سو وہ بھی رکھا ہے، آپ انڈا نہیں لیتی ہیں اس لیے آپ کے لیے پراٹھے کے ساتھ آلو کی بھجیا اور بڑی اماں انڈا لیتی ہیں نہ سالن نہ پراٹھا۔ ان کے لیے دہی اور بن، بھائی صاحب اور نرمین کے لیے دم والی چائے باقی سب کے لیے دودھ پتی۔"

"شاباش سلیقے والی ہی نہیں۔ عقل والی بھی ہو۔" وہ نہال ہو کر توصیفی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"ایک یہ بی بی ہیں......" اب کے حلیمہ کو خشمگیں نظروں سے نوازا گیا۔

"عقل ہی چوپٹ اور......" وہ افسوس سے سر ہلاتی اٹھ گئیں۔

گل نے بطور خاص حلیمہ کے چہرے پہ نظر ڈالی۔ وہ پھر سے مسکرا رہی تھی مگر بغور دیکھنے پہ احساس ہوتا تھا کہ اس کی یہ مسکراہٹ میکانکی اور بے تاثر سی تھی۔ جیسے بٹن دبانے سے مشینری چالو ہو جائے، ویسے ہی جہاں آرا کی کسی بھی بات پہ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ جاتی تھی۔

"آپ جائیے۔ ناشتے کے بعد میں سرسوں کے تیل میں لونگیں جلا کے لاتی ہوں۔ آپ کے گھٹنے پہ مالش کے لیے......"

"جیتی رہو۔"

ان کے جانے کے بعد گل نے چمٹے سے پراٹھا اتارتے اتارتے حلیمہ کو دیکھا، جواب تک مسکرا رہی تھی مگر اب اس کی اس مصنوعی مسکراہٹ کے رنگ پھیکے اور بے جان پڑ رہے تھے۔

"آپا! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔" وہ کھل اٹھی۔

"بتائیں گی؟" وہ جھجک رہی تھی۔

"ہاں...... ضرور...... مجھ سے کوئی کچھ پوچھتا ہی نہیں۔ تم پوچھو گی تو کیوں نہیں بتاؤں گی۔"

"اماں جان...... آپ کو اتنا برا بھلا کہتی ہیں۔ آپ یہ سب سن کر بھی مسکراتی کیوں رہتی

ہیں؟"

"نہیں پتا ناں؟" حلیمہ فخریہ انداز میں مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں ایک اسرار بھی پنہاں تھا۔

"کسی کو بھی نہیں پتا...... بتاؤں تمہیں؟" وہ پاس کھسکی اور اس کے کان کے پاس ہو کر رازداری سے بتانے لگی۔

"جب میری شادی ہوئی تھی نرمین کے ابا سے تو انہوں نے...... انہوں نے پہلی رات مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"انہوں نے کہا تھا میری اماں کچھ بھی کہیں...... تم برا نہ ماننا۔ نہ ہی غصہ کرنا۔"

"تو؟"

"تو...... پاگل اسی لیے تو میں مسکرا دیتی ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ جب میں مسکراتی ہوں تو کسی کو پتا تو نہیں چلتا کہ میں نے اماں کی بات کا برا مانا ہے؟"

گل نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا اور نم ہوتی پلکیں تیزی سے جھپک کر انہیں خشک کرنے لگی۔

"دیکھا......؟" فخریہ اور داد طلب مسکراہٹ لیے حلیمہ نے ناشتے کے لوازمات کا ٹرے اپنی جانب کھسکائی اور باورچی خانے سے چل پڑی۔

☆======☆======☆

"کہاں گیا میرا گھڑا؟ کون مردود لے گیا؟"

جنت بیگم نے شور برپا کر رکھا تھا۔ جب کہ برابر میں لیٹی خورشید بانو سوتے رہنے کی اداکاری کر رہی تھی یا پھر واقعی اس کی نیند اتنی گہری تھی کہ اس ہنگامے کا بھی کوئی اثر نہ ہو رہا تھا۔

جنت بیگم نے اسے جھنجوڑنا شروع کر دیا۔

"تُو سوتی رہو...... میرا دکھ نہ بانٹنا۔"

"آئے ہائے آپا......! سونے مرنے دے۔"

خورشید نے بے زاری سے اپنے کاندھے سے اس کے ہاتھ جھٹکے۔

"نہیں سونے دوں گی نہ مرنے۔ جب تک میرا گھڑا نہیں مل جاتا۔"

"رکھا کہاں تھا وہ لعنتی گھڑا؟" ناچار وہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"اے میں کہے دیتی ہوں میرے گھڑے کو کچھ نہ کہو۔ ہاں نہیں تو۔"

"کچھ نہ کہوں؟" خورشید نے دانت کچکچائے۔

"میرا بس چلے تو اس گھڑے کو میں...... آخر آپاں! تم گھڑے میں پانی پینا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔"

"بچپن کی عادت ہے کیسے چھٹے؟"

"بچپن میں تو تم انگوٹھا بھی چوستی ہو گی آپاں؟"

"میں دیکھ رہی ہوں خورشید! تُو آج کل میرا جی کلسانے میں بڑی آگے آگے ہے۔ پیچھے ہی رہو۔ میں کہے دیتی ہوں۔"

"آئے ہائے...... تم سے بات کرنا تو اپنی جوتی اپنے سر پہ مارنا ہے۔ کدھر رکھا تھا اس فساد کی جڑ کو۔ ادھر ہی تو رکھا ہوتا تھا۔ یہاں سے کس نے لے جانا ہے۔"

"میں نے باہر صحن میں دھرا تھا۔ چار دن ہو گئے تھے دھلے ہوئے۔ سوچا تھا رجو آئے گی تو دھلواؤں گی۔ اب جا کے دیکھتی ہوں تو نہ گھڑا ہے نہ گھڑے کی مٹی...... وہ کم بخت چھنو آئی ہو گی۔ توڑ دیا ہو گا اور موئی جاتے ہوئے سارے سراغ بھی مٹا گئی ہو گی۔"

"جب پتا ہے تو کیوں کھپ ڈال رہی ہو؟" خورشید نے لمبی سی جمائی لی اور پھر بات مکمل کی۔

"سو جاؤ صبر کر کے۔"

"صبر؟ ذرا ہاتھ لگے وہ نگوڑی۔ وہ دھواں دار پیٹوں گی کہ املتاس کے جلاب لینے کے بعد جو حال ہوتا ہے، اس سے بری حالت ہو گی مردار کی۔"

"ہاں...... تم سے پٹ چکی وہ شتونگڑی۔"

"ہر بار جل دے جاتی ہے۔ کبھی ہاتھ لگے بھی تو ٹسوے بہا کے معافی مانگ لیتی ہے۔ اب کے آنسوؤں کے بجائے آنکھوں کی پتلیاں بھی نکال کے میرے تلوے سے مل دے گی تو نہ بخشوں گی۔"

ابھی وہ چھنو کی شان میں اور بھی لفاظی اور فصاحت کا مظاہرہ کرتیں مگر اسی وقت گل اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں گھڑا تھا۔ گھڑے کے منہ پہ موتیے کے پھولوں کا گجرا بھی دھرا تھا۔ جنت بیگم نے ایک تیز نظر اس پہ ڈالی...... دوسری گھڑے پہ۔ مگر بولنے سے احتراز کیا۔

"اماں جان! آپ کا گھڑا میں نے اچھی طرح اندر باہر سے دھو کر صاف پانی سے بھر دیا ہے۔"

"نہ جانے پلید ہاتھوں سے بھرا ہے کہ دھوئے بھی تھے۔"

گل نے اس بڑبڑاہٹ کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور گھڑا پاس کی تپائی پہ رکھ چپکے سے واپس مڑ گئی۔

جنت بیگم نے نخوت سے سر جھٹکا۔

"گھنی...... کیسے دبے پاؤں آ کے سن گن لے رہی تھی۔ چنٹ ہے پوری۔"

"تیری بہو کی تو تیرے ساتھ بڑی تال میل ہو گئی ہے آپاں! دیکھ بالکل تیری ط موتیے کا گجرا ڈالا ہے۔"

"ڈالے اپنی میا کے مزار پہ۔"

"اور خوشبو بھی آ رہی ہے پانی سے۔ ہو رے صندل چھڑ کا ہے۔"

"چھڑ کے اپنے باوا کے مرقد پہ۔"

☆======☆======☆

صغیر احمد سامنے دھری ٹرے میں سے چپ چاپ کھانا کھا رہے تھے مگر کھانے انداز سے رغبت اور پسندیدگی ظاہر ہو رہی تھی۔ جہاں آرا سامنے بیٹھی اپنے گھٹنے ہ ہولے دبا رہی تھی۔ چہرے سے تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔

"یہ ڈاکٹری دوائیں مجھے راس نہیں آتیں میاں! اب کے کسی حکیم کے پاس لے جا

"اسپیشلسٹ کو دکھایا تھا اماں! ایک دو دن تک آرام آ جائے گا۔"

پھر ٹرے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ مٹر قیمہ، ماش کی دال، آلو انڈے کا شوربہ، بیسن لگی تلی مرچیں۔

"اور طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ ایک آدھ سادہ سا د لیا کریں کھانے میں۔"

"مجھ میں تو سادہ سا کھانا بنانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ چوکی پہ بیٹھنا بھی مشکل اور کے اٹھنا بھی مشکل۔"

"میں نے کتنی بار تو کہا ہے کہ کچن میں کچھ تبدیلیاں کروا دیتا ہوں۔ آج کل نیچے بی پکانے کا رواج کہاں ہے۔ امریکن کچن بن جائے گا تو آسانی ہو جائے گی۔"

"بس بس رہنے دو میاں! مجھے نہیں بھاتیں ایسی تبدیلیاں موئے امریکیوں کی نقل کیوں کریں؟ آج کھڑے ہو کر پکائیں گے۔ کل کھڑے ہو کر کھانے کا بھی رواج ڈالا جا گا گھر میں، نا بابا نا بیٹھ کر کھانے اور بیٹھ کر پکانے میں ہی برکت ہے۔"

"میں نے آپ کی سہولت کے لیے کہا تھا۔ ویسے کھانا مزے کا بنا ہے۔ حلیمہ کو آپ کے ساتھ رہتے رہتے تھوڑا بہت پکانا آ ہی گیا۔"

"اس کے ساتھ ساتھ رہ کے میں تو کھانا پکانا بھول سکتی ہوں، مگر وہ نہیں سیکھ سکتی۔"

"تو...... یہ؟" صغیر احمد کا کھاتے کھاتے ہاتھ رک گیا۔

"گل نے بنایا ہے...... ٹیپو کی دلہن نے۔"

صغیر احمد کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔ ایک دم کھانے سے جی اچاٹ ہو گیا۔

"رہنے دیتیں۔ بازار سے آ جاتا۔ یا نمو کالج سے آنے کے بعد بنا لیتی۔"

"کیوں......؟ کون سا احسان کر لیا اس نے۔"

جہاں آرا نے تیز لہجے میں کہا۔

"اب یہیں رہنا ہے تو مفت کی تو میں نہیں توڑنے دوں گی۔ پہلے کیا کم مفت خورے ہیں گھر میں، تم زیادہ عادتیں مت خراب کرو میاں!"

"میرا کہنے کا مطلب یہ تھا اماں...... کہ...... ابھی تک تو یہ بھی واضح نہیں ہوا کہ اس کا یہاں رہنا درست بھی ہے یا نہیں۔ مجھے تو اس کے گھر والوں پہ حیرت ہے۔ پلٹ کر پوچھا نہیں بیٹی کو۔"

"ماں سگی نہ ہو تو سب سوتیلے ہو جاتے ہیں۔" انہوں نے آہ بھر کے کہا۔

"پھر بھی...... کبھی آ گئے تو...... کہیں پولیس کیس نہ بن جائے۔ کہیں کسی مشکل میں نہ پڑ جائیں ہم۔"

"کچھ نہیں ہوتا میاں!"

وہاں ہنوز بے فکری کا عالم تھا۔

"دو ہفتے ہو گئے۔ ہونا ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔ تم بے فکر رہو۔ مجھے پرکھ ہے انسان کی۔ لڑکی حالات کی ستائی ہوئی ہے، کردار میں جھول نہیں ہے۔ ایسے ویسے خاندان کی بھی نہیں لگتی۔ آنچل تک نہیں ڈھلکنے دیتی، ہاں سونے میں تولنے کے قابل ہے مگر مول لگا تو اس باؤلے کا۔"

صغیر احمد کا ہاتھ سستی سے نوالہ توڑ رہا تھا۔

"ویسے ایک بات ہے۔ قسمت کے تیز ہیں دونوں بہن بھائی۔" جہاں آرا کی اگلی بات نے آدھا توڑا نوالہ وہیں رہنے دیا۔

"جسے کوئی چمار اپنی سڑن لڑکی بھی نہ دے اسے گل جیسی حسین اور ذہین بیوی ملی اور

حلیمہ کو دیکھ لو...... اس کا نصیب ہی ہے جو تمہارے ساتھ جوڑ بن گیا۔ ورنہ کہاں وہ کہاں تم
جنت نصیب کرے تمہارے ابا کو بھائی کی محبت میں رشتہ جوڑ گئے اور نبھانا بلکہ بھگتنا ہم کو
ہے۔"

صغیر احمد نے ٹرے پرے کھسکا دی اور پانی کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔

☆======☆======☆

"تم خیریت سے ہو گے...... یہ میں جانتی ہوں کیونکہ تمہاری یاد آنے پہ بے چینی
نہیں گھیرتی...... میرے دل کی دھڑکنیں سُر ضرور بکھیرتی ہیں مگر اودھم نہیں مچاتیں۔ ورنہ
دن پہلے تک تو یہ حالت تھی کہ پلک سے پلک نہیں جڑتی تھی میری...... شکر ہے کہ تمہارے
سے یہ بلا ٹلی...... اب تم دل لگا کے وہاں کام کرنا اور خبردار تب تک واپس آنے کا مت
سوچنا...... جب تک اس قابل نہ ہو جاؤ کہ واپس آ کر کوئی چھوٹا موٹا ہی سہی مگر اپنا کاروبار
شروع کر سکو۔ میری بالکل فکر مت کرنا۔ میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔"

اتنا لکھنے کے بعد گل نے ہاتھ روکا اور اپنے برابر بے سدھ سوئے ٹیپو پہ بیگانی سی نگاہ
ڈالی۔ وہ اوندھا لیٹا تھا اور ادھ کھلے منہ سے رال ٹپک کر تکیے کو گیلا کر رہی تھی۔ اس نے
کراہت سے منہ پھیر لیا۔

"میں اب اس فیکٹری میں کام نہیں کرتی، تم خط کا جواب وہاں کے پتے پہ مت دینا۔
میں اب آپا قدسیہ کے ہاں بھی نہیں ہوں۔ اس لیے وہاں فون بھی مت کرنا۔ شاید تم نے کیا
بھی ہو، نہ جانے انہوں نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا ہو لیکن یاسر! تم سوائے میرے
کسی پہ یقین نہ کرنا۔ سچ جو بھی ہے میں تمہیں بتاؤں گی ضرور بتاؤں گی، جب تم واپس آؤ گے۔
میرے اس خط کا جواب تم بالکل مت دینا، میں نہیں چاہتی جہاں میں رہ رہی ہوں۔ وہاں کسی
کو تمہارے متعلق پتا چلے لیکن تمہاری تسلی کے لیے یہاں کا پتا ضرور لکھ کے بھیج رہی ہوں۔
یہاں میں بالکل محفوظ ہوں یاسر......! تم میری بالکل بھی فکر مت کرنا۔"

اس نے ایک بار پھر ٹیپو پہ نظر ڈالی۔ جو ہوش و حواس سے بے گانہ نہ جانے کن جہانوں
کی سیر کر رہا تھا۔ گل کے ہونٹوں پہ ایک بار پھر استہزائیہ مسکراہٹ آ گئی۔

☆======☆======☆

وہ سگریٹ پیتے ہوئے کب سے دیکھ رہے تھے، حلیمہ الماری کے اندر سر گھسائے کچھ
رہی تھی۔ آخر ان سے رہا نہ گیا۔

"حلیمہ......!" اس کے پکارنے پہ وہ بری طرح چونکی اور کچھ چھپانے کی کوشش کرنے

لگی۔

صغیر احمد اور بھی کھٹک گئے۔

"کیا کر رہی ہو حلیمہ؟"

"نہیں...... کک...... کچھ بھی تو نہیں۔" وہ سہم کے بولی۔

"کچھ چھپا رہی ہو، مجھ سے؟"

"نہیں تو......" وہ سراسیمہ نظر آ رہی تھی۔

"صبح بھی تم دیر تک الماری میں گھسی رہیں۔ اب بھی اور پوچھنے پہ بتاتی ہو کہ کچھ بھی نہیں کر رہی۔ سچ سچ بتاؤ کیا چھپا رہی ہو؟"

حلیمہ بھونڈے پن سے مسکرانے لگی۔

ایسی مسکراہٹ جس میں کسی راز کے افشا ہو جانے کا خوف پنہاں ہو۔

صغیر احمد کا دل پسیج گیا۔ انہیں حلیمہ کی حالت پہ ترس سا آنے لگا۔ اب وہ قدرے نرم لہجے میں پوچھنے لگے۔

"کچھ ٹوٹا ہے تم سے؟"

وہ زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"کچھ گم ہو گیا ہے؟"

اس نے پھر سے نفی میں سر ہلایا۔

"سچ سچ بتا دو حلیمہ......! میں اماں سے نہیں کہوں گا۔"

اب تو انہیں بھی کھد بد ہو رہی تھی۔

حلیمہ اس تسلی پہ دونوں ہاتھ پیچھے کر کے کچھ چھپاتی، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کے اس کے پاس آنے لگی۔

"وہ میں...... میں اس دن بازار گئی تھی نا۔"

صغیر احمد اٹھ کے بیٹھ گئے اور بغور اسے دیکھنے لگے، جس کا سادہ سا چہرہ فرطِ جذبات اور ہیجان کی شدت سے تمتما رہا تھا۔

"تو...... تو میں آپ کے لیے بازار سے کچھ لائی تھی۔"

"میرے لیے......؟" وہ حیرت سے بولے۔

"ہوں...... تحفہ...... گفٹ......" وہ شرما گئی۔

صغیر احمد محظوظ سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے لگے۔

"تحفہ...... اور وہ بھی میرے لیے...... یہ بیس سال بعد ایسا خیال کیوں آیا تمہیں؟"
"پہلے بھی آیا تھا کئی بار مگر ڈر لگتا تھا لیتے ہوئے۔"
"دکھاؤ تو کیا تحفہ لائی ہو؟"
وہ سرشار سے لہجے میں کہتے اس کا ہاتھ اپنی جانب کھینچنے لگا اور ہاتھ آگے کرتے ہی ہو گیا۔
"یہ...... موزے...... یہ لیے تھے آپ کے لیے۔"
وہ اب بھی شرما شرما کے کہتی انہیں فخریہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔
"پسند نہیں آئے؟"
اس کی بدلتی کیفیت نے حلیمہ کی مسکراہٹ بھک سے اُڑا دی۔ اب وہ نروس اور خوف زدہ سی نظر آتی انگلیاں چٹخاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ صغیر احمد نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
"اچھا ہے...... بہت اچھا...... پسند آیا ہے۔"
"سچ......؟" وہ یکایک پھر سے خوش ہو گئی۔
"پھر پہن کے دکھائیں۔"
"ابھی نہیں کل......" وہ بے دلی سے کہتے لیٹ گئے۔
"نہیں ابھی ابھی پہن کے دکھائیں۔"
ضد کرتے ہوئے اس نے صغیر احمد کے پاؤں پکڑ کے اپنی طرف کھینچے۔
صغیر احمد کی بے دلی اور مایوسی غصے اور جھنجلاہٹ میں بدل گئی۔ انہوں نے جھٹکے سے اپنے پیر واپس کھینچے۔
"کیا کر رہی ہو حلیمہ......؟ میں نے کہا ہے نا کہ......"
مگر وہ زبردستی اسے موزے پہنانے کی کوشش کرتی رہی۔
صغیر احمد نے اپنے پاؤں چھڑوائے اور خود پہ قابو پانے کی کوشش کرتے بستر سے اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔
"میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے نہیں پہننے، ابھی تو ہرگز نہیں پہننے۔ سنائی نہیں دیتا تمہیں کیا بات سمجھ میں نہیں آتی، آرام کرنا دوبھر کر دیا ہے۔"
وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ننگے پیر کمرے سے نکل گئے اور حلیمہ جھک کر بے تاثر چہرے کے ساتھ نیچے گرے موزے اٹھانے لگی۔

☆======☆======☆

"السلام علیکم نانی اور دادی۔"
چھنو کی آواز پہ تخت پہ بیٹھی پان پہ کتھا لگاتی جنت بیگم اور گملوں میں پانی دیتی، جہاں آرا نے بیک وقت اسے گھور کے دیکھا، اس کا دوپٹہ ایک جانب جھول رہا تھا۔ آنچل آنگن کی گرد سمیٹے پکے فرش کو چھو رہا تھا۔
"نمو......!"
دونوں جانب سے کوئی جواب نہ ملنے پہ وہ حلق پھاڑ کے نرمین کو پکارتی آنگن پار کرنے لگی۔
"توبہ کیا لقا کبوتری کی سی چال ہے۔"
جہاں آرا نے ناک چڑھائی۔
"اور کیا دوپٹہ ہے تو رزق کو جھاڑو دے رہا ہے۔" پہلی بار جنت بیگم نے سمدھن کے سُر میں سُر ملائے۔
"رہنے دیں دادی......! ساری روک ٹوک بس میرے لیے ہے آپ کی...... وہ جو گھر سے بھاگ کر آئی اس کو چوم چاٹ کر رکھ لیا ہے آپ نے اس کے بارے میں کیا کہیں گی۔"
وہ تخت کے پاس رک کر پاندان میں سے چھالیہ ٹونگتے ہوئے تیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔
"خبردار، جو کسی حیادار بیاہتا کے بارے میں انٹ شنٹ کہا تو۔"
جہاں آرا کے ڈپٹ کر کہنے پہ چھنو نے معنی خیز انداز میں بھنویں نچا کر جنت بیگم کو دیکھا۔
"ان کی بڑی سگی ہے وہ۔" انہوں نے بھی ناک چڑھائی۔
"ہاں بھئی۔ صحیح کہا ہے سیانوں نے۔ دشمن کا دشمن، جان سے پیارا۔"
"میری کیوں ہونے لگی سگی، تمہارے ہی بیٹے کی بیوی ہے۔ تم اپنی بہو کی عزت رکھو نہ رکھو، میں تو خاندان کی عزت رکھوں گی۔ آخر نکاح کر کے آئی ہے۔"
"نکاح سے کون سے سرخاب کے پَر لگ جاتے ہیں۔ قاضی کے دو بولوں میں اتنا دم کہاں کہ نسل اور ذات بدل سکیں۔ نہ جانے کہاں سے کالک لپیٹ کر آئی ہے، اور میرے بھولے بھالے بچے کے گلے پڑ گئی ہے۔"
"اور کیا؟"

چھنو نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سونف پھانکنے کے لیے مٹھی بھری۔ جنت بیگم
زور سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔

"پرے ہٹ...... سب چرگئی۔"

جہاں آرا ایک سے دو ہوتے دیکھ کر پہلے ہی کلستی ہوئی اندر جا چکی تھیں۔

"نمو کہاں ہے؟"

"ہوگی اندر کہیں...... ناولیں چاٹ رہی ہوگی۔"

"نمو کل سے بڑی اداس ہے نانی!" اس نے رازداری سے کہا۔

"دادی بھی تو خون خشک کیے رکھتی ہے غریب کا یہ نہ کرو، یہ کرو، وہاں نہ جاؤ، فلاں فلاں
فلاں۔"

"اور کیا...... ؟ میں نے بھی تو اس لیے سنا دیا دادی کو کہ اس آوارہ بدچلن کو کیوں رکھا
ہے پھر...... ؟" وہ تڑپانے کو بولی۔

"اچھا کیا اسے کھری کھری سننے کو ملتی رہیں تو ٹھیک رہتی ہے لے پان کھا۔"

"اور وہ ہے کہاں چھمک چھلو نظر نہیں آرہی۔"

"لگی ہوگی کہیں گھنی میسنی کسی کنیز کی اولاد، بھابھی بیگم کا دل مٹھی میں کرنے کو سارا دن
لگی رہتی ہے نوٹنکی۔ کبھی صفائیاں تو کبھی دھلائیاں اور تو اور کبھی کڑھائیاں۔"

"کسی غریب گھر کی ہوگی مزدور پیشہ......"

چھنو نے ناک چڑھائی۔

☆======☆======☆

ٹیپو اپنے بستر پہ لیٹا تھا مگر اس کے مسلسل ہلتے پیروں اور دروازے پہ بھٹکتی نظروں سے
اس کے اضطراب کا اظہار ہو رہا تھا۔ پھر اس سے رہا نہ گیا تو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ بے
چینی سے دروازہ کھول کے باہر جھانکا۔ پھر اندر پلٹ کے دوبارہ کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد گل دروازہ کھول کے اندر آئی۔

"کہاں تھیں تم؟"

وہ اتنی بے تابی سے اس کی جانب بڑھا کہ گل بوکھلا کے رہ گئی۔

"میں...... میں...... وہ۔"

"کیا...... وہ...... وہ...... ؟"

"کام کر رہی تھی۔"

"ہر وقت کام کام جب دیکھو کام کرتی رہتی ہو۔ جب بلاؤ، کام کرنا ہے۔ کیوں کرتی ہو تم
اتنے کام۔"

وہ پھاڑ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

"کام کرنا تو اچھی بات ہے، کرنا چاہیے تم بھی کیا کرو۔"

"واہ میں کیوں کروں! اپنے ابا کا اکلوتا ہوں۔ ساری عمر کچھ کیے بغیر مزے کر سکتا ہوں
مزے۔ کیا سمجھتی ہو تم مجھے۔"

گل نے بے زاری سے چہرہ موڑ لیا۔

یہ شخص جسے وہ قطعی بے ضرر سمجھتی تھی، اب حد سے برا لگتا تھا۔

"تمہیں بہت کام کرنا پڑتا ہے نا؟"

گل کو ایک کرنٹ سا لگا تھا۔ ٹیپو نے اپنی زرد انگلیوں سے اس کا چہرہ تھامنا چاہا۔

وہ بدک کے پیچھے ہٹی۔

"تائی اماں نے تمہیں نوکر ہی سمجھ لیا ہے۔ سارے گھر کا کام تم پہ لاد دیا ہے۔ دیکھنا صبح
کیسی خبر لیتا ہوں۔"

"نہیں......" وہ گھبرا گئی۔ کتنی مشکلوں سے تو جہاں آرا کا دل جیتا تھا۔ اس گھر میں داخل
ہونے کے اگلے ہی منٹ وہ بھانپ گئی تھی کہ ان تین بوڑھی عورتوں میں سب سے بااثر وہی
ہیں اور اس گھر میں قدم جمانے کے لیے ان کے ساتھ جمانا بہت ضروری ہے۔

"خدا کے لیے کوئی ہنگامہ نہ کرنا۔ کام کا کیا ہے۔ شادی کی ہے تم سے۔ تمہارے گھر
کے کام کرنا تو میرا فرض ہے۔"

"بھاڑ میں جائے فرض۔ شادی میں نے تم سے کی ہے نہ تائی اماں نے کی ہے، نہ ان
کے اس بھوت بنگلے نے۔ تمہیں میں اپنے لیے دلہن بنا کے لایا ہوں، اپنے لیے۔"

گل نے زیر لب بڑبڑا کے اس کی شان میں کچھ کہا۔

"اتنا بھی بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنی دلہن کو کاموں میں ہی خرچ کروا دوں۔"

وہ لیٹ گیا اور اپنے پیر اس کی گود میں رکھ دیئے۔ گل نے ہڑبڑا کے اسے دیکھا۔ پھر
اس کے پیروں کو، کراہیت کا بھرپور تاثر اس کے چہرے سے مترشح تھا۔

"تمہارا فرض ہے میری خدمت کرنا اور مجھ سے پیار کرنا۔ پیر دباؤ میرے۔"

گل ایک زبردستی کی مسکراہٹ کھینچ کھانچ کے ہونٹوں تک لائی۔

"دباتی ہوں شربت پیو گے؟"

"ایک تو تم شربت بہت پلاتی ہو۔"

وہ چڑ کے بولا۔

"تمہاری صحت کے لیے اچھا ہے۔"

وہ اٹھ کے کمرے کے دوسرے کونے میں رکھی میز کی جانب چلی گئی۔ دروازہ کھول کر شربت کی بوتل اور چینی نکالی۔

ٹیپو وہیں لیٹا پیر ہلا ہلا کے گا رہا تھا۔

کھائی کے پان بنارس والا
کھل جائے بند عقل کا تالا

اس کی بھونڈی آواز بڑے سے کمرے میں گونج رہی تھی اور ٹھیک دس منٹ بعد اس کے خراٹے اس کمرے کی فضا میں گونج رہے تھے۔

آئینے کے سامنے بیٹھی گل اطمینان سے اپنی چوٹی کا ایک ایک بل کھولتے ہوئے اس خط کو پوسٹ کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی، جو تین راتوں میں مکمل کیا تھا۔

☆======☆======☆

صغیر احمد بستر پہ لیٹے دھوئیں کے مرغولوں میں گھورتے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

چالیس بیالیس سال کی عمر میں ایسا لگتا تھا کہ جیسے صدیاں جی لی ہوں۔

اور کبھی ایسا لگتا، جیسے اپنی زندگی کا ایک بھی پل اپنے لیے نہ جیا ہو۔

"کسی کولہو کے بیل کی طرح آنکھوں پہ پٹی باندھے بس چکر پہ چکر کاٹے ہوں۔ ایک کے بعد اور دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا۔"

اچانک انہیں حلیمہ کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

وہ چونکا...... وہ تو کب کی سو چکی تھی۔

اور واقعی۔ وہ گہری نیند میں تھی اور شاید کسی خواب میں کھلکھلا رہی تھی۔

صغیر احمد کو کوفت ہوئی۔ مگر حلیمہ کے چہرے میں پھیلی معصوم سی ہنسی ان کی کوفت کو کم کرنے لگی۔

وہ ہنستی چلی جا رہی تھی...... وہ خوف زدہ ہو گئے۔

"حلیمہ...... حلیمہ......"

اسے ڈر سا لگا۔ جیسے دیوانگی کی سیڑھیوں پہ کھڑی وہ ہنستے ہنستے اس پار نہ پہنچ جائے۔

انہوں نے ہولے سے حلیمہ کا کندھا بھی ہلایا۔

"حلیمہ۔ ہوش کرو۔"

مگر وہ کسمسا کے کروٹ بدل گئی۔ چند سیکنڈ بعد پھر سے کھلکھلا کے ہنسنے کا عمل جاری۔

"ٹیپو! تیرے بھائی آوازیں دے رہے ہیں۔"

"تو اب جا۔"

وہ نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ صغیر احمد چڑ کے اٹھے اور دوسری سگریٹ سلگائے کمرے سے نکل آئے۔

برآمدے میں آتے ہوئے انہیں آنگن میں کوئی رنگین سایہ حرکت کرتا نظر آیا۔

"نمو اس وقت یہاں؟"

☆======☆======☆

وہ کب سے خط ہاتھ میں لیے پریشان بیٹھا تھا۔

کتنی بار اس نے گل کے پرانے پتے پہ رابطہ کرنا چاہا فون بھی کیے۔ آخر اسے سختی سے جو جواب دے کر آئندہ فون نہ کرنے کی تاکید کی گئی۔ وہ جواب اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا۔

"گل نے چوری کی؟"

وہ بے یقینی سے اپنے آپ سے پوچھتا۔

"ہاں...... تمہارے لیے۔"

جواب بھی اس کے اندر سے ہی ملتا۔

سوال جتنا اسے گل سے پرے کھینچتا تھا۔ جواب دوبارہ اس سے جوڑ دیتا تھا۔

"لیکن یہ خط......"

وہ لفافہ الٹ پلٹ کے دیکھنے لگا۔ مہر سے اور خط کے اندر لکھے پتے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ لاہور میں ہے۔

"لاہور کی کسی جیل میں تو نہیں؟"

اسے شک گزرا، وہ دوبارہ خط پڑھنے لگا۔ لکھائی سو فیصد اس کی تھی۔ مگر انداز اس کا نہ تھا۔

یاسر کو اس کے پرانے خطوط یاد آنے لگے۔ دیوانگی اور جنون جن کے حرف حرف سے ٹپکا کرتا تھا۔ وہ پڑھ کے اس کی محبت کی شدت پہ کبھی حیران ہوتا۔ کبھی ہنس پڑتا اور کبھی کبھی مغرور ہو جاتا لیکن اس خط کے بے ربط اور روکھے پھیکے انداز نے اس کے اندر وسوسے جگا

دیئے تھے۔ اگرچہ اس نے مختصر سے خط میں چار چھ بار لکھا تھا کہ وہ خیریت سے ہے اور یاسر اس کی فکر مت کرے لیکن یاسر کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

"کچھ تو ہے جو اس خط میں گل کا مخصوص انداز ناپید ہے۔ شاید وہ ذہنی طور پہ اتنی منتشر ہے کہ یا پھر...... نہیں۔ کچھ تو ہے۔"

وہ دوبارہ سے خط پڑھنے لگا۔

☆=======☆=======☆

لکھ لکھ کر چٹھیاں بھیجیں پردیس......

نام تیرے دیا سندیس......

تارے گن گن بتائی رتیاں......

تھک کر ہار گئیں رے اکھیاں......

تجھ بن سُونا لگے جگ سارا......

سیاں رے......

وہ چٹکتی چاندنی میں نہاتی دھیمے سُروں میں گنگنا رہی تھی۔ دل کی ساری تڑپ جیسے آواز میں اتر آئی تھی۔

صغیر احمد مبہوت سا کھڑا دیکھ رہا تھا۔

رات کے اس پہر، ہر سُو پھیلی چاندنی، تنہائی کا فسوں۔ رات کی رانی کی مہک۔ آواز کی نغمگی، پُرسوز گیت اور اس کا قیامت خیز سراپا۔

سب مل کے انہیں پسپا کرنے لگے۔

صغیر احمد نے ایک زور کی جھرجھری لی۔

"یہ کیا کر رہا ہوں میں، وہ ٹیپو کی بیوی ہے اور میری بیٹی سے بس چند ہی سال بڑی۔ شرم آنی چاہیے مجھے۔"

وہ سگریٹ کو ایڑیوں سے مسلتے واپس اپنے کمرے کی جانب پلٹ گئے۔

☆=======☆=======☆

"کیا مصیبت ہے مجھ سے نہیں ہوتا یہ بکھیڑا۔"

زمین نے بالوں میں دیر تک کنگھا کرتے رہنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد جھنجلا کے کہا اور اٹھ کے نانی کے کمرے کی جانب چل پڑی۔

پہلا قدم اندر رکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رکی۔

جنت بیگم اپنے بستر پہ تھیں۔ حلیمہ نیچے صاف چمکتے فرش پہ دھرنا مارے بیٹھی تھی۔ سر ماں کی گود میں دھرا تھا۔ آنکھیں سرور سے بند تھیں۔ ہونٹوں پہ خوابیدہ سی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ جنت بیگم کی مسلسل چلتی زبان کے باوجود۔

"غارت ہوں ایسے اپنے جن کے کلیجے پتھر ہیں پتھر۔ نہ جانے بیرسٹر صاحب نے کیا سوچ کے میری پھول سی بچی انہیں دے دی۔ ہا...... ہا...... سوچا ہوگا سگی تائی ہے۔ پھول سے ہلکا رکھے گی مگر......" وہ رک کر پھر سے آہ بھرنے لگیں۔

چند ساعت انتظار کرنے کے بعد حلیمہ نے پُرتجسس و پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"پھر؟"

"پھر تمہارا کھوپڑا۔" جنت بیگم نے چونک کر غصے سے کہا۔ "میں کیا الف لیلہ سنا رہی ہوں جو مزے لیے جا رہی ہے۔"

"مزا تو اماں مالش کا آیا ہے۔"

"نانی اماں! میرے بھی بال بنا دیں۔ چٹیا سیدھی بنتی ہی نہیں مجھ سے۔"

زمین نے آگے بڑھ کے اپنی حاضری لگوائی۔

"ایک منٹ۔ ذرا صبر کر۔"

وہ پورے انہماک سے حلیمہ کے تیل سے لپ لپ بھرے بالوں میں کنگھا کرنے لگیں۔ کنگھے کے دندانے تیل سے بھر جاتے تو اپنے بندھے بالوں پہ تھپ تھپ مار کے صاف کرتیں پھر دوبارہ پھیرنے لگتیں۔ ساتھ ساتھ تبصرہ رواں دواں۔

"اجاڑ کے رکھ دیا ہے اپنے آپ کو۔ نہ گہنا نہ سنگھار، ڈنڈا سے ہاتھ اور بوچے کان لیے پھرتی ہے۔ جھابڑ جھولے کپڑے پہن کے رکھتی ہے۔ اری اپنی بیٹی کو ہی دیکھ۔"

حلیمہ کی چٹیا۔ جو اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ جنت بیگم کے ہاتھوں میں تھی۔ اس لیے اس نے بڑی دقت کے ساتھ گردن موڑ کے بیٹی کو دیکھا، حکم جو ملا تھا۔

"سہاگنوں والے سنگھار میں نہیں کرتی مگر تیری طرح بھی نہیں پھرتی۔"

اس مکمل منظر کو دیکھتے ہوئے زمین کو اپنے اندر خالی پن محسوس ہونے لگا۔

"نانی اماں! مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

وہ آہستہ آواز میں منمنائی۔

"جوانی میں تو خیر...... کیا بتاؤں، تمہاری عمر میں پور پور ایسے سجا کے رکھتی تھی کہ تمہارے ابا تو میری ایڑی دیکھ کے کوہ قاف کی پریوں کو بھول جایا کرتے تھے۔"

''ابا گئے تھے کوہ قاف؟''

حلیمہ جھٹ بولی تو وہ بے مزہ ہو گئیں۔

''اوں...... ہوں...... چل اٹھ اب آنمو......!''

چوٹی کا آخری بل دے کر انہوں نے اسے فارغ کیا۔

نرمین نے کنگھا حلیمہ کی جانب بڑھا دیا جو ہاتھ چوٹی پہ مل مل کے خوش ہو رہی تھی۔

''یہ کیا؟ میرا ہو چکا۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''امی...... میرے بھی بال بنا دیں۔''

وہ بہت حسرت کے ساتھ بولی۔

''لو اس سے بھلا کہاں بنیں گے تمہارے بال۔ آ میرے پاس۔'' نانی نے چمکارا۔

''نہیں...... میں امی سے بنواؤں گی۔'' وہ ضد کرنے لگی۔

''تمہارے بال اتنے ڈھیر سارے ہیں تو مجھ سے نہیں ہو گا۔'' حلیمہ نے بے چارگی سے کہا۔

''آپ ابھی تک اپنی اماں سے اپنے بال بنواتی ہیں۔ لاڈ اٹھواتی ہیں تو میں کیوں نہیں۔ میں بھی تو بیٹی ہوں آپ کی۔ جیسے آپ نانی اماں کی۔''

وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ جنت بیگم نے اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے حلیمہ گویا ہوئی۔

''ہاں...... یہ تو ہے تم میری بیٹی میں اماں کی...... اور اماں...... نانی اماں کی...... اور نانی اماں......''

وہ کہتے کہتے جنت بیگم کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اماں...... نانی اماں کی بھی کوئی اماں تھی؟''

جنت بیگم نے تاسف سے پہلے اسے دیکھا پھر جتاتی نظروں سے نرمین کی جانب جو کہہ رہی ہوں۔

''اس سے گلہ کر رہی تھیں؟''

نرمین لاجواب ہو کر واپس پلٹ گئی۔

☆======☆======☆

''السلام علیکم چھوٹی امی!''

گل کمرے سے نکل رہی تھی کہ آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوتی خورشید سے بری طرح ٹکرا گئی۔ ذرا سنبھلتے ہوئے سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام۔'' لٹھ ماری گئی پھر ٹیپو کو دے آواز پہ آواز۔

''ٹیپو...... وے ٹیپو! وے اٹھ جا۔''

''وہ تو سو رہے ہیں۔ آپ اندر آئیں نا۔''

''ناں...... وہ تو میں آ ہی جاؤں گی۔ تیری دعوت کی لوڑ نہیں ہے مجھے...... میرے پتر کا کمرہ ہے۔''

وہ نخوت سے اسے ایک طرف کرتی اندر گھسی۔

''توبہ...... ایک بجے تک سویا رہتا ہے۔ ہو کیا گیا ہے اسے۔'' تشویش سے کہتی وہ اسے جھنجوڑنے لگیں۔

گل اطمینان سے ذرا ایک جانب پڑی کرسی پہ بیٹھ کر اپنی چوڑیوں سے کھیلنے لگی۔

''وے اٹھ وے بے غیرتا۔ سویا ہے کہ بے ہوش ہے؟'' پھر مڑ کے گل سے کہنے لگیں۔

''پہلے آدھی آدھی رات کو گھر آتا تھا، تب بھی گیارہ ساڑھے گیارہ بجے اٹھ جاتا تھا۔ اب تو نو بجے نہیں کہ گھسا کمرے میں...... بے شرموں کی طرح تم لوگ دروازہ بند کر لیتے ہو۔ پھر کیوں نہیں اس کی نیند پوری ہوتی۔''

گل اب بھی خاموش رہی۔

''وے ٹیپو! ماں صدقے اٹھ شہزادہ پتر۔ نہا دھو، بال کٹوا کے آ...... کیسا چھترا بنا ہوا ہے۔ اٹھ شاباش حجامت کرا کے شیو بنوا کے آ...... دیکھنا کیسا چن کا ٹوٹا نکلے گا۔''

گل نے یہ پیش گوئی سن کر ناک چڑھائی اور منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔

خورشید کے اتنا جھنجوڑنے اور واویلا مچانے پہ بھی ٹیپو ٹس سے مس نہ ہوا، تو وہ پریشان ہو گئی۔

''ہو کیا گیا ہے میرے پتر کو...... ایسا کون سا نشہ چڑھا ہے جو ٹوٹ ہی نہیں رہا۔''

گل گڑبڑا کے کھڑی ہو گئی۔

''آ...... آپ کے لیے چائے بناؤں؟''

''ناں میں نہیں پیتی بار بار چائے نری کلیجے کا ساڑ، پہلے ہی مت ہو گئی ہے اس منڈے کی۔ پہلے چھ چھ دن گھر نہیں آتا تھا۔ اب حجرے سے ہی نہیں نکلتا۔ ایسا زنانی کو ترسا ہوا......''

وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکلی تو گل نے کب کا رکا ہوا سانس خارج کیا اور اطمینان سے آئینے میں اپنا جائزہ لینے لگی۔

☆======☆======☆

"تم ہی سنبھالو میاں...... مجھ سے تو روز کے فیصلے نہیں نمٹائے جاتے۔" جہاں آرا نے خفگی سے کہا۔

یہ عدالت صغیر احمد کے کمرے میں لگی تھی۔

"ابا...... پلیز۔" زمین نے ان کا ہاتھ پکڑ کے التجا کی۔

"کیا پلیز......" وہ غصے سے بولیں۔

"آئے دن کا تماشا بنا لیا ہے تم نے بازار جانا۔ سب اس چھنو کی صحبت کا اثر ہے۔ نہ اس کا اپنا تلوا ٹکتا ہے گھر میں۔ نہ تمہارا ٹکنے دیتی ہے۔"

"دادی اماں آپ کو تو چھنو سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ ایک ہی تو سہیلی ہے میری اور کر سے جا کے بات کروں۔"

"ہاں ہم تو گونگے بہرے ہیں۔"

"مسئلہ کیا ہے بھئی؟"

صغیر احمد نے اکتا کے کہا۔

"مجھے بازار جانا ہے ابا! اور دادی اماں ہیں کہ اجازت ہی نہیں دے رہیں۔"

"ابھی اس دن تو تمہیں بازار جانے کے لیے گاڑی بھجوائی تھی۔ تمہاری امی بھی ساتھ گئی تھیں۔"

"مہینہ ہو گیا ہے اس بات کو۔" اس نے منہ بسورا۔

"ہاں اور مہینے بھر میں سارے کپڑے چھوٹے پڑ گئے۔"

جہاں آرا نے طنز کیا۔

"دو ہی تو جوڑے لیے تھے ابا! گرمیاں پورے سات آٹھ مہینے کی اور لان کے جوڑے صرف چار۔"

"یہ تو ہے۔" صغیر احمد ہنس پڑے۔

"دیئے جاؤ شہ جوان چھوکری کو۔"

ان کی بڑبڑاہٹ پہ دھیان دیئے بغیر، زمین نے باپ کو نرم پڑتا دیکھ کے مزید لیپا پوتی کی۔

"ابا! پلیز جانے دیں نا...... وہاں سیل لگی ہے۔ اتنے اچھے پرنٹ لائی ہے چھنو اور وہ بھی اتنی کم قیمت پہ، ایک جوڑا دادی جان کے لیے بھی لاؤں گی۔"

"رہنے دو لڑکی! میں نے ساری زندگی نہیں پہنا لان کا جوڑا، کپڑا ہے کہ چھیچھڑا۔ تن سے چپک چپک جاتا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے ہوا آؤ گاڑی بھجواؤں؟"

صغیر احمد نے بحث سمیٹی اور جہاں آرا تلملا کے رہ گئیں۔

"گاڑی؟ اچھا بھجوا دیں۔ مگر آپ اکیلے تو ہمیں گاڑی پہ جانے نہیں دیں گے اور امی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ وہ جانا نہیں چاہتیں۔"

"پھر کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی۔ جوان جہان لڑکی پرائے لڑکے کے ساتھ موٹر میں نہیں بیٹھے گی۔"

"خلیق بھلے گھر کا لڑکا ہے اماں!"

"اور ہماری بچیاں؟ کیا وہ بھلے گھر کی نہیں؟"

انہوں نے چمک کر سوال کیا۔

"دیکھا بھالا بچہ ہے۔ اعتبار والا۔"

"بیٹی کے معاملے میں پرائے لڑکے پہ کیسا اعتبار؟"

"ابا! ہم ٹیکسی لے لیں گے۔"

زمین نے اکتا کے کہا مگر یہ تجویز انہیں اور بھڑکا گئی۔

"اے لو۔ وہ موا ٹیکسی والا کیا سگا ماموں ہو گا تمہارا۔"

"پھر کیا کروں؟ کیسے جاؤں؟"

وہ پھپھک کے رو دی۔

"آپ لے کر جاتے نہیں۔ کوئی بہن، نہ بھائی، جس کے ساتھ چلی جاؤں، چھنو کتنی خوش قسمت ہے چار بھائی دو بھابھیاں ہیں۔ بہنیں بھی تین تین۔ وہ چلی جائے گی اپنی آپا یا بھابھی کے ساتھ، مسئلہ تو میرا ہے۔ میں رہ جاؤں گی۔"

اس کے آنسو دیکھ کے جہاں آرا بھی نرم پڑ گئیں۔

"کیا چھوٹے بچوں کی طرح رو رہی ہو۔ اچھا ایسا کرو۔ چھنو سے کہو۔ وہ اپنی آپا یا بھابھی میں سے کسی کو ساتھ لے لے۔ پھر چلی جانا۔"

اس بار جہاں آرا نے کوئی مخالفت نہیں کی۔ زمین خوشی سے آنسو صاف کرنے لگی۔

صغیر احمد نے بٹوے سے رقم نکالی۔

"ایک ہی بار گرمیوں کی ساری شاپنگ کر لو۔ اماں بھی ٹھیک کہتی ہیں کہ آئے دن بازار

کے چکر لگانا اچھی بات نہیں۔"

زمین نے سعادت مندی سے سر ہلا کے رقم تھامی۔

"اور ہاں......وہ......تمہاری ممانی......"

صغیر احمد نے قدرے توقف کے بعد ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ٹیپو کی دلہن اس کے لیے بھی ایک جوڑا لے لینا، اتنی گرمی میں ریشمی کپڑے پہنے ہے۔"

اس کے دبے لفظوں میں کہنے پہ جہاں آرا نے بے حد جانچتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

☆======☆======☆

"ابا نے ایک جوڑا آپ کے لیے بھی لانے کو کہا ہے۔"

زمین کی بات سن کر چاول چنتے گل کے ہاتھ ذرا کے ذرا تھمے۔ کسی بیتی رات کا سایہ ذہن میں رینگا۔ جب اس نے برآمدے میں کسی کو آتے، تھمتے، محویت سے تکتے اور پھر پلٹتے محسوس کیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مگر پُراسرار مسکراہٹ آ گئی۔

"آپ کو کون سا رنگ پسند ہے۔ میں وہی لاؤں گی ویسے تو آپ پہ سب ہی رنگ اچھے لگتے ہیں۔ کتنی خوب صورت جلد ہے آپ کی کھلی کھلی روشن سی......"

گل ہنس دی اور دھیان سے چاول صاف کرتے کرتے بولی۔

"کوئی سا بھی لے لو......مگر لائننگ میں نہ ہو۔ مجھے پسند نہیں ہے اور قمیص کے کپڑے پہ بڑے بڑے پھول نہ بنے ہوں۔"

"آپ خود کیوں نہیں چلتیں میرے ساتھ؟"

"میں......؟" گل نے دوہرایا۔ پھر اچانک ہی اس کا اپنا جی بھی بازار جانے کو چاہ گیا۔ لاہور شہر کے بڑے بڑے بارونق بازاروں کی صرف شہرت سنی تھی۔ دیکھنے کے ارمان تھے۔

"ہاں ممانی! آپ ساتھ ہوں گی تو دادی جان کا موڈ بھی کچھ بہتر ہو جائے گا۔ بڑی تسلی ہوتی ہے انہیں کہ کوئی بڑا ضرور ساتھ ہو۔"

اس بات پہ گل نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بظاہر سرسری لہجے میں پوچھا۔

"اور میں بڑی ہوں؟"

"ہاں......نہیں میرا مطلب ہے کہ......"

گل زور سے ہنس دی اور پیار سے اس کے چہرے کو چھوا۔

"بڑی ہی تو ہوں۔ عمر میں اتنی نہ سہی مگر رشتے میں تو خاصی بڑی ہوں۔"

"پھر چلیں گی میرے ساتھ؟"

"ہاں......میں نے ابھی تک لاہور دیکھا بھی تو نہیں۔"

"بس پھر تیار ہو جائیں......میں ابھی چھنو کو......"

"کہاں کی تیاری ہے نمو؟"

ٹیپو جمائیاں لیتا آیا آنکھیں لال ہو کر باہر ابل رہی تھیں۔

"میں اور ممانی بازار جا رہے ہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی۔" وہ بگڑ کے بولا۔

"ابا نے اجازت دی ہے۔"

"تیرے ابا نے تجھے دی ہو گی۔ تُو جا یہ کہیں نہیں جائے گی۔" اس نے بڑے رعب سے کہا اور ایک استحقاق بھری نظر گل پہ ڈالی۔ گل لاتعلق سے انداز میں چاول چننے لگی۔

"مگر ممانی تو......"

"تم جاؤ نمو......!" گل نے قطعی لہجے میں کہا تو ٹیپو نے فخریہ انداز میں اسے دیکھ کر زمین کو جتایا۔

"دیکھا......؟"

☆======☆======☆

"چھنو کی بچی! یہاں کیوں لے آئی ہے مجھے؟"

زمین اسی ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہی گھبرا گئی۔

"ملک شیک پئیں گے......آناں......"

وہ اسے کھینچتے ہوئے آگے لے جا رہی تھی۔

"چھنو......زری والے کے ساتھ جو جوس کارنر ہے وہاں کتنا اچھا ملک شیک ملتا ہے اور سستا بھی......ادھر تو......"

مگر چھنو نے تو جیسے زمین کی کوئی بات نہ سننے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ اسے زبردستی کھینچتے ہوئے ایک ٹیبل تک لے گئی۔

"یہاں دیر ہو جائے گی چھنو......! رش بھی کتنا ہے اور ابا نے جلدی آنے کا کہا تھا۔ مری شاپنگ رہ جائے گی تیرے اس ملک شیک میں۔"

"شاپنگ تو ہوتی رہتی ہے یار! آج تو کچھ نیا ہونا چاہیے۔"

"نیا......"

"ہاں......نیا......" اس نے آنکھ دبائی۔ "نیا نکور...... برینڈ نیو......ڈبہ پیک۔"

زمین کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھتی۔

"آ گیا......" چھنو کو دبے دبے جوش کے ساتھ کہتے دیکھ کر اس نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔ ایک چوڑے شانوں والا درمیانہ قامت مگر توانا ڈیل ڈول والا لڑکا نما مرد...... یا......مرد نما لڑکا ان کی ٹیبل تک آ رہا تھا۔ اس کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شکل اور جسامت کے لحاظ سے وہ تیس سے اوپر کا مرد لگتا تھا، مگر پہناوا اور چال ڈھال اسے پچیس سے کم کا ظاہر کر رہے تھے۔

"کون ہے یہ......؟" اس نے سرگوشی کی اور جواب ملنے سے پہلے ہی وہ دونوں کے سامنے والی چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"نمو...... یہ ساجد ہے اور ساجد یہ میری سب سے اچھی اور سب سے پیاری سہیلی زمین۔"

"پیاری تو واقعی ہے۔" وہ چھچھورے پن سے مسکرایا۔

"ویسے میں پیار سے اسے نمو کہتی ہوں۔"

"میں بھی پیار سے نمو ہی کہوں گا۔"

زمین کے تاثرات ایسے ہو گئے جیسے کسی کڑوی چیز کو نگلنے پہ مجبور ہو۔ چھنو بھی ساجد کو اس پہ توجہ دیتے دیکھ کر کلس کر رہ گئی۔

"تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟"

اب وہ قدرے بے رخی اور ترشی سے بولی۔

"سوری یار......! دیر ہو گئی مگر تم دیر کیوں کر رہی ہو آرڈر دو۔"

"میں مینگو ملک شیک لوں گی نمو کو اسٹرابری پسند ہے۔"

زمین نے گھبرا کے چھنو کا ہاتھ دبایا اور انکار میں سر ہلانے لگی۔

"بس......؟ ملک شیک......؟ ایک بج رہا ہے میں نے تو سوچا تھا لنچ اکٹھے کریں گے۔"

"ہاں...... یہ بھی ٹھیک ہے۔"

اس نے جھٹ حامی بھر لی اور زمین کے پسیجے ہوئے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نکالا۔

"مجھے گھر جانا ہے چھنو!" وہ سرگوشی کرنے لگی۔

"چلی جانا کون سا ابھی بہت دیر ہوئی ہے گھر پہ دو ڈھائی بجے کا کہہ کے آئے ہیں۔"

"مجھے شاپنگ بھی کرنی ہے۔"

"بندہ حاضر ہے۔" ساجد فدویانہ انداز میں سینے پہ ہاتھ رکھ کے بولا۔

جہاں زمین کی پیشانی شکن آلود ہو گئی، وہیں چھنو نے بھی زبردست انداز میں گھور کے اسے دیکھا۔ فوراً سنبھل کر کہنے لگا۔

"میں کراتا ہوں تمہیں شاپنگ۔"

اس بار مخاطب زمین نہیں چھنو تھی۔

"بتاؤ...... کیا لینا ہے؟"

چھنو مطمئن ہو کر ادا سے مسکرانے لگی۔ اسے قطعی فکر نہیں تھی کہ ساتھ بیٹھی زمین مسلسل اسے کہنی میں ٹہوکے دے رہی ہے۔

☆======☆======☆

"مجھے بازار کیوں نہیں جانے دیا؟"

گل کمر پہ ہاتھ رکھے بڑے تیور کے ساتھ ٹیپو سے پوچھ رہی تھی، جو بیڈ پہ لیٹا ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

"کیونکہ تم میری بیوی ہو۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"یہی تو بات ہے۔" وہ مسکرایا۔ پیلے پیلے دانت سوکھی جلد والے ہونٹوں پہ قطار میں سج گئے۔

"تم میری بیوی ہو اور وہ بھی خوب صورت بیوی بازار کیسے نکلنے دوں......؟ پاگل ہوں کیا......؟"

گل حیران رہ گئی۔

"ایسی عقل تمہیں کہاں سے آ گئی؟ سچ سچ بتاؤ کس نے پڑھائی ہے یہ پٹی۔"

"وہ اونچے چوبارے والے شیخ صاحب ہیں نا۔"

وہ جوش سے اٹھ بیٹھا اور بتانے لگا۔

"پتا نہیں، میں کب باہر نکلتی ہوں جو محلے کے چوبارے ناپتی پھروں کس کا اونچا ہے کس کا نیچا۔"

"بے وقوف......" وہ جھنجلا گیا۔

''وہی جن کے کبوتر میرے کبوتروں سے بھی چار زیادہ ہیں۔''

''اوہو! وہی جن کی بڑی بیگم بھینگی ہیں اور چھوٹی والی لنگڑی۔'' اس نے ایک اور نشانی بتائی۔

''لگتا ہے اس محلے میں بڑی اور چھوٹی بیگمیں رکھنے کا رواج ہے۔''

''اور وہ جو ہمیشہ مرے چوہے کے رنگ کا پاجامہ پہنتے ہیں، جس کا ازار بند ہمیشہ گھٹنوں کو چھوتا رہتا ہے اور جن کی مونچھیں......''

''بس بس نشانیاں بتانا بند کرو اور بتاؤ کیا کہا تھا ان شیخ صاحب نے تمہیں۔''

''انہوں نے کہا تھا خوب صورت عورت کو بیوی بنانا بڑی مصیبت ہے کیونکہ تھوڑے دن بعد یا تو وہ خوب صورت نہیں رہتی یا پھر بیوی نہیں رہتی۔''

''اوہو...... بڑے ہاتھ لگے ہیں تمہارے شیخ صاحب کو۔ اس لیے بھینگی اور لنگڑی بیویاں جمع کر رکھی ہیں۔''

''انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہیں سنبھال کے رکھوں، تھوڑا رعب جما کے اِدھر اُدھر گھومنے نہ دوں خاص کر پچھلے محلے کی گلیوں میں۔''

''اور کون سا سبق پڑھایا تھا تمہارے شیخ صاحب نے؟'' گل نے طنزیہ نظروں سے اسے دیکھا، جو خواہ مخواہ سمجھ دار بننے کی کوشش میں ہلکان ہوتا اور بھی گاؤدی لگ رہا تھا۔

''وہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ عورتوں کو بتانے والی بات نہیں ہے۔''

اس نے شرما کے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔

گل جل کے راکھ ہو گئی اور جتنی گالیاں یاد تھیں، دل ہی دل میں اسے دینے لگی۔

''اچھا یاد دلایا۔ یہی تو صحیح وقت ہے۔'' وہ قریب کھسکا گل منہ بنا کے پرے ہٹی۔

''سن نا!'' وہ اسے کاندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑ رہا تھا۔

''میں تمہارے لیے شربت بنا کے لاتی ہوں۔ یاد ہی نہیں رہا باتوں میں۔'' وہ فوراً اٹھی۔

''مجھے نہیں پینا شربت وربت...... میرے پاس بیٹھو۔''

اس نے گل کو چوٹی سے پکڑ کر کھینچا اور دوبارہ بیڈ پہ گرا لیا۔

''کیسے نہیں پیو گے......؟'' گل اپنا غصہ اس بار دبا نہیں سکی اور چوٹی چھڑاتے ہوئے غرا کے بولی۔

''کوئی زبردستی ہے......؟'' ٹیپو کا مغز گھومتے تو ویسے بھی سیکنڈ لگتا تھا۔

''پی لونا ں...... میں اتنے پیار سے بناتی ہوں۔''

گل نے اس کی آواز اونچی ہوتے دیکھ کر مصلحتاً زبردستی مسکرا کے کہا۔

''کوئی پیار ویار نہیں کرتیں تم مجھ سے......''

''یہ شربت پیو گے تو اتنے پیارے ہو جاؤ گے، میں تو کیا سب کے سب تمہیں پیار کریں گے۔''

''سب......؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔

''ہوں...... سب......''

''ریما...... صائمہ...... میرا...... سب؟''

''ہاں وہ بھی۔'' گل کا دل تو چاہ رہا تھا اس کے سوکھے لمبوترے تھوبڑے پہ کس کے ایک لگائے۔

''چل جھوٹی۔'' وہ لیٹ گیا۔ ''میں نہیں پیتا شربت۔''

''تو ٹھیک ہے میں بھی نہیں آنے والی اس کمرے میں۔'' وہ فوراً اٹھ کے ذرا فاصلے پہ کھڑی ہو گئی۔

''بڑی اماں کے گھٹنوں میں درد ہے۔ ان کے پاس چلی جاتی ہوں ان کی ٹانگیں دباؤں گی اور پھر وہیں سو جاؤں گی۔''

وہ باہر جاتے جاتے کہہ گئی۔

''گل سن تو...... گل......''

ٹیپو بے چینی سے آوازیں دینے لگا اس کا گلا خشک ہو رہا تھا ہاتھ پیر سنسنا رہے تھے۔

☆======☆======☆

صغیر احمد فجر کی نماز پڑھ کے گھر لوٹ رہے تھے نماز کی ٹوپی اتارتے ہوئے انہوں نے صحن میں قدم رکھا اور وہیں ٹھٹک کے رک گئے۔ گل کیاری کے پاس کھڑی موتیے کے پھول توڑ کے مٹی کے کورے پیالے میں بھر رہی تھی۔ کالی چادر نماز پڑھنے کے انداز میں پوری لپیٹ رکھی تھی۔ آنچل کانوں کے پیچھے اڑسے، دھلے دھلے چہرے کے ساتھ وہ بڑی الگ سی لگ رہی تھی۔

صغیر احمد کے کھنکھارنے پہ وہ چونکی اور آہستہ سے سلام کیا۔ وہ بھی اتنی ہی آہستہ آواز میں جواب دینے کے بعد پاس سے گزرنے لگے۔

''چائے لاؤں آپ کے لیے؟''

گل کے پوچھنے پہ وہ رکے۔ مگر اس کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔
"نہیں شکریہ...... اماں جان کے ساتھ پیوں گا۔"
"اماں جان! تو شاید آج چائے نہ بنا سکیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے ان کی۔ آپ نے دیکھا نہیں نماز کے لیے صحن میں بھی نہیں نکلیں، ساری رات گھٹنوں کے درد سے جاگتی رہی ہیں۔"
صغیر احمد پوری طرح مڑے اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"میں رات کو ان کے پاس ہی تھی۔"
گل نے وضاحت کی۔
"اوہ...... شکریہ ان کا اتنا خیال رکھنے کا۔"
"کوئی بات نہیں۔ بزرگ ہیں وہ میری۔ یہ تو میرا فرض ہے۔"
"نہیں آپ کا تو نہیں فرض تو کسی اور کا ہے مگر وہ......" اداسی سے کہتے کہتے وہ رک گئے۔
"چلیں فرض نہ سہی۔ اسے میری غرض سمجھ لیں۔"
صغیر احمد نے الجھ کر اسے دیکھا تو وہ اپنے جواب کی وضاحت کرنے لگی۔
"مجھے دعاؤں کی حاجت ہے اسی لیے۔"
وہ سر ہلا کے رہ گئے۔
"چائے لاؤں؟" گل نے دوبارہ پوچھا۔
"لے آیئے...... اماں جان کے کمرے میں۔"
اس کا رخ جہاں آرا کے کمرے کی جانب تھا۔
گل کے چہرے سے سادہ اور بے لوث مسکراہٹ غائب ہوئی اور اس نے بھنویں اچکا کے سر جھٹکا۔

☆======☆======☆

خورشید ایک ہاتھ میں چھوٹا سا آئینہ لیے دوسرے میں موچنا پکڑے اپنی بھنویں نوچ رہی تھی۔ وہ اور جنت دونوں تخت پہ بیٹھی تھیں۔ جنت کے سامنے ایک سفید دوپٹہ پھیلا تھا۔
رات بھر کی بارش کے بعد موسم دھلا دھلا سا تھا۔ صحن میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا، ورنہ آج کل تو شام کے بعد صحن میں چھڑکاؤ کرو۔ تب بھی چند منٹ بیٹھنا دوبھر ہوتا تھا۔
"آئے ہائے...... سیاپا...... کی مصیبت اے۔"

خورشید بھنویں سہلاتے ہوئے تکلیف دبا رہی تھی۔
"تجھے کیا آفت آئی ہے جو اس عمر میں بانکا بننے چلی ہے۔ منہ تو دس دن دھوتی نہیں ہے۔ چلی ہے داڑھی مونچھ نوچنے۔"
"ہائے ہائے آپاں......! داڑھی مونچھیں ہوں گی تمہاری کچھ لگتیوں کی...... میں تو یہ دو ڈھائی بال نوچ رہی تھی ماتھے کے۔"
"اے میا......" جنت بیگم نے کلیجے پہ ہاتھ رکھ دیا۔
"یہ میرے نئے نویلے دوپٹے پہ کس نے آم کا داغ لگا دیا۔ تیرے علاوہ کس کی ہوگی یہ حرکت۔"
"میں کیوں لیتی تیرا یہ چٹا دوپٹہ تجھے تو پتا ہے آپاں! مجھے چٹے رنگ سے کتنی نفرت ہے۔"
"سلام بی بی!"
اجو کیسری رنگ کا کریب کا جوڑا پہنے...... کیسری، سبز اور سرخ رنگ کا دھاری دار دوپٹہ لیے، سانولے چہرے پہ گہری براؤن لپ اسٹک لگائے چلی آئی۔ کالی سیاہ کلائیاں آج کانچ کی چوڑیوں سے بھری تھیں۔
"آ گئی تُو...... کیا موت آئی تھی جو مہینہ گھر سے نہیں نکلی تُو۔"
جنت بیگم نے اسے یوں آڑے ہاتھوں لیا جیسے اس کی غیر حاضری کے سبب انہی کو تو سارے گھر کی صفائی کرنا پڑی ہو۔
"وہ...... آپ کو خبر تو ہوگئی ہوگی بی بی۔"
اجو کھسیانی مسکراہٹ کو دوپٹے کا پلو دانتوں میں دبا کے چھپاتے ہوئے بولی۔ "پھر پوچھ کیوں رہی ہیں......؟ مجھے شرمندہ کرنے کے لیے؟"
"سنا ہے اک اور ویاہ کھڑکا لیا ہے تُو نے؟"
خورشید نے آئینہ اور موچنا گھٹنے کے نیچے دبایا اور چسکے لینے لگی۔
"ہاں...... بس...... کر دیا بڑوں نے بیاہ......"
"اوئی کتنوں کو کھائے گی؟ دو تھکانے لگا دیئے۔ اب تیسرے پہ دانت گاڑ کے بیٹھ گئی ہے۔ اے بی بی عزت سے بیوگی کی چادر اوڑھ کے بیٹھ۔"
"اور کیا ہمیں دیکھ بیٹھی ہیں کہ نہیں۔"
خورشید نے لقمہ دیا۔ ذرا اچھی نہیں لگ رہی تھی اسے اجو۔ جیسے کوئلے کی کان میں آگ

دہکا کے بیٹھی ہو۔

''آپ بیٹھ سکتی ہیں بی بی! عزت دار کھاتے پیتے اور خاندانی لوگ ہیں ناں۔ ہم ٹھہرے غریب مسکین لوگ۔''

''اچھی غریب ہو...... خصم مرے سال ہوا نہیں کہ دوسرا مل گیا۔'' خورشید نے حسرت سے آہ بھری۔

''بی بی! آپ لوگوں کا اپنا گھر ہے۔ عزت سے بیٹھی ہو۔ خاندان ہے جو سنبھالے ہوئے ہے آپ کو۔ میں گھر گھر جھاڑو پونچھا کرنے والی۔ میرے سر پہ سائیں کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ باہر تو گدھ نوچ کھائیں گے۔ میرے نام کے آگے کسی مرد کا نام نہ لگا تو میرا نام گالی بن جائے گا۔ میرا دل کہاں مانتا تھا اس بیاہ کو نہ اس کو...... اس سے پہلے والے جب دل میں تو ابھی تک شکو کے ابا کی......''

اس کی آواز بھرا گئی۔ کرن لگے دوپٹے سے آنکھیں بے دردی سے رگڑ کے صاف کیں۔

''مگر کیا کروں مجبوری ہے۔''

''کیسی مجبوری؟''

''کام ملنا بند ہو گیا تھا بی بی! چاہے دوبارہ کی بیوی ہوں۔ بھلے پانچ بچوں کی ماں ہوں مگر ہوں تو تین زیادہ تیس کی۔ سب ڈرنے لگے کہ جوان بیوی ہمارے مرد نہ ہتھیا لے۔ مجھ غریب کو تو مرد کا سوگ منانے کا بھی حق نہیں۔ فوت ہوتے ہی پکڑ کے دوجے کے حوالے کر دیا۔''

جنت افسردگی اور ہمدردی سے اسے دیکھنے لگیں۔ اجو نے ایک آہ بھری اور دوپٹہ کمر سے اڑس کر جھاڑو اٹھا لیا۔

''تم بھی وہی سوچ رہی ہو آپاں! جو میں سوچ رہی تھی۔'' خورشید نے گہرے لہجے میں کہا تو جنت بیگم چونکیں۔

''ہاں میں بھی یہی سوچ رہی تھی کہ شکر ہے مولا کا اس نے عزت بھی دی اور خوشی بھی۔''

''آئے ہائے میں تو کچھ اور سوچ رہی تھی۔''

جنت کے گھورنے پہ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے دل کی بات نکالی۔ اس کے بالکل الٹ۔

''شکر ہے بیرسٹر صاحب نہیں رہے۔ ہوتے اور تیری بات سنتے تو جھٹ سے طلاق دے دیتے۔''

''کی فرق پڑتا......؟'' اس نے بے فکری سے ہاتھ ہلایا۔

''اب بیوہ ہوں...... تب طلاقن ہوتی۔''

''توبہ کتنی حسرت بھری ہے۔'' جنت بیگم نے افسوس سے ہاتھ ملے۔

''کہہ دیتی ہوں، اتنی آگ بھڑک رہی ہے تو شرع کر لے۔'' انہوں نے شرم دلانی چاہی۔

''ہونہہ...... اب مشورہ دے رہی ہے، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت اتنی ہمدردی تھی مجھ سے تو تب بڑی بن کے ایسا کچھ سوچا ہوتا۔''

☆======☆======☆

''مجھے سب پتا ہے چھنو تو آج کل کن ہواؤں میں ہے۔ اس دن میں نے دیکھا تھا تجھے ہوٹل میں ایک لڑکے کے ساتھ۔''

چھنو آج رات پھر چھت پر اس کے ساتھ موجود تھی۔

''چل چل...... میں کیوں جانے لگی، ہو گی کوئی اور......''

''میں اور تمہیں پہچاننے میں غلطی کروں؟''

''خود سوچو...... میں کیسے کہیں جا سکتی ہوں۔ اتنا آسان ہوتا تو تم سے ملنے نہ آ جایا کروں۔''

''میں اتنے مہنگے ہوٹلوں میں لے جا سکتا یا مہنگی بوتیکوں سے شاپنگ کرا سکتا تو تُو ضرور آتی۔''

پل بھر کے لیے چھنو کے چہرے کا رنگ بدلا۔

''میں نے تجھے اس کے ساتھ دکان دکان پھرتے، شاپنگ کرتے بھی دیکھا تھا۔ اب مکر کے دکھا کہ وہ کوئی اور تھی۔''

اس کے کلبلانے کی وجہ حسد تھی نہ رقابت، نہ دکھ صرف یہ پچھتاوا تھا کہ مجھ سے پہلے کوئی دوسرا کیوں کامیاب ہو گیا؟

''اچھا تو تم میری جاسوسیاں کرتے پھر رہے تھے؟''

''یعنی وہ تم ہی تھیں۔'' وہ غصے سے بولا۔

''ہاں...... تھی...... پھر......؟''

پول کھل ہی گیا تھا تو اکڑ دکھانے میں کیا حرج؟

"پھر ادھر کیا لینے آتی ہے؟"

"دماغ خراب تھا میرا۔"

وہ ہاتھ جھاڑتے اٹھ گئی اور جانے کے لیے مڑی، اس نے چھنو کا ہاتھ تھام لیا۔

"چھنو! تجھے ان وعدوں اور قسموں کا ذرا خیال نہیں آیا۔ جو تُو نے میرے ساتھ کیے تھے۔"

"لو میں نے کب کیے تھے؟ تمہیں ہی شوق تھا وعدے کرنے کا بات بات پہ ماں کی قسم اٹھاتے تھے۔ تب ہی تو آئے دن ماں تمہاری ہسپتال پہنچی ہوتی ہے۔"

"یہ بے وفائی تمہیں مہنگی پڑے گی چھنو!"

"جا...... جا...... مہنگی...... کبھی کوئی مہنگی چیز قریب سے دیکھی بھی ہے۔ بڑا آیا۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔

☆======☆======☆

گل کمرے میں داخل ہو کر ٹیپو کو دیکھ کر طنز سے مسکرائی، جو زمین پہ سکڑ کے بیٹھا تھا۔ دیوار سے ٹیک رکھی تھی گھٹنے پیٹ سے جوڑ رکھے تھے اور اپنے ناخن چبا رہا تھا۔

وہ پہلے سے کہیں زیادہ اجڑا حال لگ رہا تھا۔

گل کو دیکھتے ہی وہ بے چینی سے کہنے لگا۔

"گل! تم آ گئیں مجھے پتا تھا تم آج ضرور آؤ گی؟"

"تم نے ناک رگڑی ہو گی اپنی تائی کے آگے۔ جب ہی وہ مجھے آج اپنے کمرے میں سلانے کو تیار نہیں تھی زبردستی بھیج دیا کہ جاؤ اپنے کمرے میں جا کے سو جاؤ۔"

"خدا قسم......! میں نے نہیں کہا میں تو صبح سے نکلا بھی نہیں کمرے سے۔ نکلا ہی نہیں رہا۔"

گل نے مسکرا کے، اسے دیکھا اور مڑ کے کمرے کا دروازہ بند کرتی ہوئی آگے بڑھی۔

"اب تم میرے لیے شربت بناؤ گی؟"

"نہیں...... تمہیں پسند نہیں ہے۔"

وہ اطمینان سے بیٹھ کے اپنی چوڑیوں کو گننے لگی۔

"نہیں نہیں پسند ہے مجھے۔ گل! تم ٹھیک کہتی تھیں وہ شربت بڑا مزے دار تھا، دھانسو، اس سے میری صحت واقعی اچھی ہو جائے گی۔"

وہ منت بھرے لہجے میں اس کی باتیں دہرا رہا تھا۔ لہجے میں عجیب اضطراب بھرا تھا۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ لفظ ایک دوسرے پہ چڑھے جا رہے تھے۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں...... میں نے کل سے نہیں پیا تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ کسی بات میں دل نہیں لگ رہا۔ نہ فلم دیکھنے میں نہ کبوتر اُڑانے میں، نہ پتنگ کا پیچ لڑانے میں، نیند بھی نہیں آ رہی اور کھانے کا بھی کوئی مزہ نہیں، ہر چیز کڑوی، حلوہ بھی آخ تھو......" وہ روہانسے لہجے میں اپنے دکھ بتا رہا تھا اور گل سے مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

"گل! تھوڑا سا شربت بنا دو۔"

گل ٹیک لگا کے آرام سے بیٹھ گئی۔ پاؤں پھیلا لیے۔ ٹیپو اس کے پیروں کی جانب پلنگ پہ آ کے بیٹھ گیا۔ گل نے اپنا پاؤں اس کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تھک گئی ہوں۔ دبا دو۔"

ٹیپو نے حیرت سے اپنی گود میں رکھے اس کے پیروں کو دیکھا پھر غصے سے بولا۔

"میں کیوں دباؤں......؟ میں نے کبھی اماں کے پیر نہیں دبائے۔ تمہارے کیسے دباؤں۔"

"اماں کے پاس وہ شربت بھی تو نہیں۔"

گل کی اسی بات نے ٹیپو کا غصہ دھیما کر دیا اس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ گل کے پیروں پہ رکھے اور سہلاتے ہوئے کہا۔

"اماں کے پاس ایسے نرم نرم گورے پیر بھی تو نہیں...... ان کو پکڑ کے تو ایمان سے ایسا لگتا ہے، جیسے کبوتر ہاتھ میں لے لیا ہو۔ اتنے ہی نرم اتنے ہی گرم اور اتنے ہی......"

گل نے جھٹکے سے اپنے پیر واپس کھینچے۔ پہلی تو کیا، دوسری اور تیسری ملاقات میں بھی کبھی اسے وہم تک نہیں ہوا کہ وہ ٹیپو کے نہیں، کسی مرد کے ساتھ ہے اور پتا نہیں بات بات پہ اس کے اندر کا مرد کیسے باہر آ جاتا تھا۔ یہی جھنجلاہٹ گل کے دل میں اس کے لیے نفرت بھر رہی تھی۔ جتنی بار اسے محسوس ہوتا کہ اس نے کتنی مجبوری اور بے کسی کے عالم میں ٹیپو جیسے گاؤدی کی بیوی کہلانا منظور کیا ہے، اتنی بار دل میں اس کے لیے زہر بھر جاتا۔ حالانکہ یہ قطعی اس کا اپنا فیصلہ تھا کون سا ٹیپو گن پوائنٹ پہ اسے لے کر آیا تھا۔

"پھر پٹڑی سے اترے تم؟"

"پٹڑی......؟ میں کب چڑھا پٹڑی......؟ اماں نے بچپن میں کس کے طمانچے لگائے تھے اور ڈرایا تھا کہ ٹرین دس ٹکڑے کر کے رکھ دے گی تیرے۔ تب سے کبھی نہیں چڑھا پٹڑی

پہ۔"

"دیکھو ٹیپو......! وہ جو تمہارے شیخ صاحب ہیں ان کے پڑھائے سبق بھول جاؤ یہ یاد رکھو کہ تمہیں صرف وہ کرنا ہے جو میں کہوں سمجھے......؟"

مگر اس کا چہرہ صاف کہہ رہا تھا کہ وہ نہیں سمجھا۔

گل اٹھی اس کی جانب پیٹھ کر کے پلو سے بندھی چابی نکالی، الماری کا تالا کھولا شربت کی بوتل نکالی میز پہ رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔ ٹیپو بستر پہ لیٹ کر خوشی سے زور زور سے اچھلنے لگا۔

"آہا......شربت......مزے......"

گل نے ذرا سا اور ترچھا ہو کر اوٹ کی اور گریبان میں اڑسی پڑیا نکال کر شربت میں چھڑکی اور چمچہ ہلاتی گلاس اس کے پاس لے کر آئی۔

ٹیپو نے بے تابی سے گلاس اس سے لے لیا اور غٹا غٹ چڑھا لیا۔

"آج کے بعد مجھ سے بحث نہیں کرنا۔"

"نہیں کروں گا۔" اس نے آستین سے منہ پونچھا۔

"اور اندر کی......یعنی اس کمرے کی کوئی بات کسی کو نہیں بتانا۔"

"نہیں بتاؤں گا۔"

اس کی آنکھیں غنودگی سے بند ہو رہی تھیں۔

"اپنے اس شیخ صاحب کو تو بالکل نہیں......"

"میری توبہ......" وہ ایک جانب لڑھک گیا۔

گل نے سکون کا سانس لیا۔

☆======☆======☆

"اتنی جلدی ختم ہو گئیں؟"

رانی نے حیرت سے پوچھا۔

گل نے یہاں آنے کے بعد پہلی مرتبہ اس سے رابطہ کیا تھا، حالانکہ فون نمبر تو اس نے نکلتے وقت ہی لے لیا تھا۔

"کیا کروں روز دینا پڑتی ہے۔ حالانکہ تھوڑی سی ڈالتی ہوں مگر اب تھوڑی سے اثر نہیں ہوتا اسے......ڈھیٹ۔"

"تو نے بھی گلابو! عذاب ہی مول لے لیا ہے۔ چلا گیا تیرا بڈھا عاشق واپس اپنے

پنڈ......اب کس چیز کا ڈر ہے تجھے نکل آ......"

"نہیں رانی...... یہاں جو تحفظ ہے وہ میں نے کہیں بھی نہیں پایا۔ اپنے ماں باپ کے ساتھ بھی نہیں۔ مجھے یاسر کے آنے تک کسی نہ کسی طرح یہاں رہنا ہے۔"

"تیری مرضی یاسر کو فون کیا تھا؟"

"نہیں خط لکھا تھا اب تک تو مل گیا ہوگا۔"

"بتایا اس نے؟"

رانی کے سوال پہ وہ چپ ہو گئی۔

☆======☆======☆

یاسر نے دوبارہ سے خط کے مضمون پہ نظر دوڑائی۔

"یہ سب بہت اچھے لوگ ہیں۔ وہ رانی ہے نا۔ اس کے پرانے جاننے والے۔ بہت کھاتے پیتے بہت خاندانی لوگ۔ رانی کی اماں ان کے ہاں کام کرتی تھی لیکن انہوں نے مجھے ملازمہ نہیں گھر کے فرد کی طرح رکھا ہے۔ بس تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑا، مجھے یہ کہنا پڑا کہ میں لاوارث ہوں۔ آگے پیچھے کوئی نہیں اور تمہارے بارے میں تو ظاہر ہے کچھ بھی نہیں بتایا۔ ہاں کچھ عرصہ گزر گیا۔ تمہارے آنے کا پروگرام بنا تو کچھ کہہ دوں گی۔"

یاسر الجھ سا گیا۔

"کہاں ہے گل؟ کون لوگ ہیں یہ؟ ایسے کون کسی کو پناہ دیتا ہے اور وہ بھی چوری کے الزام میں پولیس سے بھاگی لڑکی کو، کیا کروں اگر خود جاتا ہوں تو......نہیں گل نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر مجھے اتنی بڑی رقم بھیجی ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہے گی میں واپس آ جاؤں۔ پہلے کی طرح کسی دکان پہ دو تین ہزار روپے ماہوار لے کر بیٹھنے کے لیے لیکن گل......"

اس کا دل مطمئن نہ ہو رہا تھا۔

☆======☆======☆

صغیر احمد کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹک کر رک گئے۔

حلیمہ بیڈ پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں اون اور سلائیاں تھیں...... چہرے پہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ...... مسکراہٹ تو یوں بھی اس کے سادہ سلونے چہرے کا ایک حصہ تھی...... ان گزرے بیس برسوں میں شاید ہی کبھی صغیر احمد نے اس کے چہرے کو بنا مسکراہٹ کے دیکھا ہو گا گر وہ مسکراہٹ ہمیشہ خجالت......کھسیاہٹ......یا پھر حماقت کے رنگ لیے ہوتی تھی...... مگر اس مسکراہٹ میں ایک الگ ہی اشارہ تھا......اپنے آپ میں مکمل طور پر کھو جانے کا

سرور......

یہ مسکراہٹ اس کے چہرے کی اس معصومیت کو اور بھی جلا بخش رہی تھی...... جو معصومیت عمر کے اڑتیس برس بتا دینے کے بعد بھی اس کے چہرے کا ایک حصہ تھی۔

''کیا کر رہی ہو حلیمہ؟''

انہوں نے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا، بے حد آہستہ آواز اور نرم لہجے میں پوچھا تھا لیکن اس کے باوجود وہ بری طرح اچھل پڑی۔

''آ...... آپ...... ڈرا ہی دیا......''

سینے پہ ہاتھ رکھے وہ اپنی سانسوں کو اعتدال میں لانے لگی۔

''ایسے کون سے خیالوں میں گم ہوتی ہو تم کہ نہ کسی کے آنے کی خبر ہوتی ہے، نہ جانے کا پتا چلتا ہے۔''

ان کا جی قدرے مکدر رہا۔

ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ اسے چونکایا نہ جائے، ورنہ دیر تک سہمی رہے گی مگر ہزار احتیاط کے بعد بھی ایسا ہو جاتا تھا۔

اب بھی اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

صغیر احمد کا دل پسیج گیا...... اس کی گھبراہٹ کم کرنے کی خاطر وہ کچھ اور نرم ہوئے۔

''یہ اتنی گرمی میں کس کے لیے تنگ ہو رہی ہے۔''

''منے کے لیے۔''

حلیمہ نے شرما کے سر جھکاتے ہوئے کہا تو وہ بری طرح چونک گئے۔ غور سے اس کے ہاتھوں میں موجود نمونے کو دیکھا...... چھوٹی سی اونی ٹوپی آخری مراحل میں تھی۔ ''کس کا منا؟'' مگر وہ بدستور شرمیلے انداز میں مسکراتی رہی۔

صغیر احمد کے دل میں اندیشے جاگنے لگے۔ وہ تشویش سے اسے تکتے جواب کا انتظار کرتے رہے مگر وہ اپنا شرمانے، لجانے کا شغل جاری رکھے ہوئے تھی۔

''میں نے پوچھا، کس کا منا؟'' اب کے وہ گرج کے بولے۔

''آنے والا منا!'' اس جواب نے صغیر احمد کے رہے سہے ہوش گنوا دیئے۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو حلیمہ؟''

وہ چہرے پہ گھبراہٹ کے آثار لیے پوچھ رہے تھے اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے۔

(یا اللہ! میرے واہمے کو واہمہ ہی رہنے دینا)

''اور کیا؟ ٹیپو کا بیاہ ہوا ہے، دلہن آئی ہے...... تھوڑے دنوں تک منا بھی آ جائے گا...... اس کی تیاری ہے۔''

صغیر احمد نے ایک سکون بھرا گہرا سانس لیا اور ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئے۔ وہی اندر ہی اندر لطف اندوز ہونے والی مسکراہٹ جو چند منٹ پیشتر حلیمہ کے چہرے کو رونق بخش رہی تھی، اب صغیر احمد کے ہونٹوں پہ آ سجی۔

''میں سمجھا، شاید تمہیں شوق ہوا ہے اس عمر میں منا کھلانے کا۔'' وہ بات کر تو بیٹھے...... مگر اب انہیں دیر تک پچھتانا تھا۔

''مجھے تو بہت شوق ہے منے کھلانے کا...... میں نے کبھی کوئی منا کھلایا بھی تو نہیں۔''

''ہاں......'' وہ بھی اداس سے ہو گئے مگر پھر سر جھٹک کے مسکرا دیئے۔

''منی کو تو کھلایا ہے...... اللہ کا شکر ادا کیا کرو حلیمہ!''

حلیمہ نے فوراً سلائیاں ایک طرف رکھیں اور دونوں ہاتھ اٹھا کر ہل ہل کے شکر ادا کرنے لگی۔

''اللہ میاں...... شکر ہے۔''

اچھی طرح سے شکر ادا کر لینے کے بعد اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''نمو کے ابا! ہم بھی ایک منا نہ لے لیں۔ ٹیپو کا نہیں...... اپنا والا...... بڑا دل چاہتا ہے، اللہ قسم!''

''لاحول ولا...... کیا ہو گیا ہے حلیمہ! کیا فضول سوچتی رہتی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے...... کچھ تو سوچو۔'' وہ بدک ہی تو اٹھے۔

''ہاں...... واقعی...... لوگ کیا کہیں گے...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں......'' وہ مدبرانہ انداز میں سر ہلانے لگی۔

صغیر احمد ذرا مطمئن ہوئے کہ جلدی بات سمجھ میں آ گئی اس کے۔

''میں پوچھوں لوگوں سے؟''

''کیا؟ کس سے؟'' وہ چونک اٹھے۔

''لوگوں سے...... کہ وہ کیا کہیں گے۔''

''ارے......'' ان کا اطمینان دو گھڑی کا تھا...... وہ اٹھ کے بیٹھ گئے۔

''لوگوں سے...... یعنی اماں جان، بڑی اماں، چھوٹی اماں اور نمو سے کہ وہ کیا سوچیں

گے۔"

"خبردار جو تم نے اپنے فضول خیالات کا اظہار کسی سے کیا تو۔" حلیمہ منہ بسورنے لگیں اور جھنجلا اٹھے۔

"جوان بیٹی سے تم اس قسم کی بات کرو گی؟ بے کار بیٹھی کیا کیا سوچتی رہتی ہو...... سوچنا ہی ہے تو نمو کے بارے میں سوچو۔"

"اسی کے بارے میں تو سوچ رہی تھی کہ اسے ایک بھائی مل جائے گا۔" اس نے من کرتے لہجے میں کہا۔

"یا اللہ! اس عورت کی سوئی کہیں اٹک جائے تو کئی ہفتے وہی رٹ لگائے رکھتی ہے۔ اس بار تو یہ سوئی بڑی غلط جگہ اٹکی ہے۔ کیسے دھیان ہٹاؤں اس کا۔"

پھر انہوں نے مزید سر کھپانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے پیار سے اسے رام کرنا چاہا۔

"نمو کی شادی کے بارے میں سوچو۔ وہ بڑی ہو گئی ہے۔ جوان بیٹیوں کی مائیں اپنے بارے میں نہیں بیٹی کی شادی کے بارے میں سوچتی ہیں۔" حلیمہ سر ہلا کے رہ گئیں۔

صغیر احمد دیر تک اس کا چہرہ پڑھتے رہے مگر فیصلہ نہ کر پائے کہ وہ بات سمجھی بھی ہے ایسے ہی سر ہلا دیا ہے...... دل ہی دل میں وہ دعائیں مانگتے سر دوبارہ تکیے پہ رکھ کے لیٹ گئے۔

☆======☆======☆

گل کمرے سے نکل رہی تھی جب جہاں آرا کو سامنے سے آتے دیکھ کر سنبھل کر دوپٹہ درست کرنے لگی۔ نامحسوس طریقے سے ایک ہاتھ پشت کی جانب لے جا کر ادھ کھلے دروازے کو بھیڑ دیا......

"السلام علیکم اماں جان!"

"وعلیکم السلام...... جیتی رہو...... ٹیپو اٹھا کہ نہیں۔"

ان کا رخ اسی جانب تھا...... گل گھبرا گئی۔

"جی...... جی نہیں۔"

"ذرا جگاؤں تو۔" وہ دروازے کے بالکل نزدیک پہنچ گئیں۔

"وہ...... وہ کہاں اتنی جلدی اٹھتے ہیں اماں جان!"

زبیدہ کی بات اور تھی...... مگر جہاں آرا ایک جہاں دیدہ اور زمانہ شناس عورت تھیں پل بھر میں بھانپ جاتیں کہ ٹیپو کی اتنی گہری نیندیں کس کی مرہونِ منت ہیں۔

"یہ اچھے نخرے ہیں...... اب نرمین کو کالج جانا ہے، کس کے ساتھ جائے۔"

"بہت دور ہے کالج؟"

"نہیں ہے تو قریب...... پیدل کا راستہ ہی ہے کوئی دس بارہ منٹ کا...... لیکن اکیلی لڑکی سڑکیں ناپتی پھرے یہ ہمارے ہاں کا دستور نہیں۔ اس لیے ٹیپو کو جگانے آئی تھی۔" ان کا ہاتھ دروازے کی جانب اٹھا تو وہ گھبرا کے کہہ اٹھی۔

"میں چھوڑ آتی ہوں۔"

"لو...... تم کون سا بڈھی پھونس ہو...... تم بھی تو جوان جہان حسین ہو...... وہ بیٹی ہے اس گھر کی تو تم بہو...... ہمارے لیے دونوں کی عزت ایک برابر ہے بیٹی!" گل کے دل کو عجیب سے احساسات نے آ گھیرا۔

"ٹیپو...... ارے او ٹیپو!"

وہ اندر جا چکی تھیں اور اب بے سدھ پڑے ٹیپو کو آواز پہ آواز دیئے جا رہی تھیں۔

"توبہ کیسی بے ہوش نیند ہے۔ اے اٹھو میاں!"

اب وہ اسے کاندھے سے پکڑ کر جھنجوڑنے لگیں...... چہرے پہ ناگواری اور کراہت کے تاثرات تھے۔

"توبہ...... ایسے بے سدھ پڑا ہے جیسے پتھر کوٹ کے آیا ہو۔" وہ باقاعدہ ہانپنے لگیں۔

"اب اسی چلتر چھنو کے سنگ ہی بھیجنا پڑے گا...... ایک آنکھ نہیں بھاتی یہ لڑکی مجھے...... مگر مجبوری۔"

ان کے نکلنے کے بعد گل نے سکون کا سانس لیا۔

☆======☆======☆

"چل نا نمو! دفع کر کالج کو...... کہیں اور چلتے ہیں...... کتنا اچھا موسم ہے۔"

چھنو کا دل بے ایمان ہو رہا تھا، اور وہ اسے بھی بے ایمانی پہ اکسا رہی تھی۔

"بلایا ہو گا نا کسی کو ہوٹل یا بازار؟" نرمین مشکوک نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"نہیں...... ایمان سے نہیں...... تیری قسم! وہ تو موسم ہی اتنا کمال کا ہو رہا ہے، ذرا دل نہیں چاہ رہا کالج جا کے فضول کلاسوں میں بیٹھ کے اوازار قسم کی ٹیچرز کی سڑی بسی باتیں سننے کا...... چل نا یار۔"

"پاگل ہوئی ہے...... کہاں سڑکیں ناپتے پھریں گے۔"

"کہیں بھی...... مگر کالج نہیں...... میرے پاس ڈیڑھ سو روپیہ ہے، تیرے پاس تو خیر

اچھے خاصے ہوں گے...... مارکیٹ گھومتے ہیں...... کچھ کھائیں پئیں گے، ونڈو شاپنگ
تھوڑی مستی۔"

"صبح صبح کون سی مارکیٹ کھلی ہو گی...... کیا خاکروبوں کے ساتھ مستی کرنی ہے۔ بس
بس...... زیادہ الٹے مشورے نہ دو...... اور مارکیٹ کھلی بھی ہو تو میں تو کبھی یونیفارم میں وہاں
نہ پھروں...... کالج سے بھاگنے کا چلتا پھرتا اشتہار...... اور جو کسی جاننے والے نے دیکھ لیا؟
خیر نہیں۔"

"اچھا تو کسی پارک میں بیٹھ جائیں گے...... ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس...... لارنس گارڈن
چلیں؟ واہ...... گول گپے۔"

گول گپوں کے ذکر پہ نرمین کے قدم سُست پڑے...... دل ذرا سا للچایا...... مگر پھر اس
کا بازو پکڑ کے زور سے گھسیٹا۔

"خبردار جواب تُو کچھ بولی تو...... ورنہ آئندہ کوئی بھی نہ ہوا کالج چھوڑ کے جانے والا
تب بھی گھر بیٹھ جاؤں گی مگر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی...... سمجھی۔"

"سمجھی......" چھنو نے منہ پھلا کے کہا اور جھٹکے سے اس سے اپنا بازو چھڑا کے سڑک پار
کرنے لگی۔

"چھنو...... سنو تو......" وہ گھبرا اٹھی۔ یہ اکیلے تو اس نے کبھی زندگی میں روڈ کراس نہیں
کی تھی۔ مگر چھنو بے مروتی کی انتہا کرتے ہوئے بغیر پیچھے مڑ کے دیکھے آگے بڑھتی گئی اور
دوسری جانب پہنچ کر چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھنے لگی، جو بے بسی سے اب تک
فٹ پاتھ پہ کھڑی تھی۔

اسی چڑانے والی مسکراہٹ نے نرمین کو مجبور کیا کہ وہ آج بغیر چھنو کی مدد کے، سڑک پار
کر کے دکھائے۔

اس نے ہمت کی...... بسم اللہ پڑھی اور قدم آگے بڑھا دیا...... مگر اس کی قسمت کہ عین
وسط میں پہنچتے ہی، دونوں جانب سے ہارن بجنا شروع ہو گئے۔ اس نے گھبرا کے دائیں بائیں
دیکھا...... دونوں اطراف سے دور سے ہی نظر آتی ٹریفک سے اندازہ ہو رہا تھا کہ چند سیکنڈ بعد
اس روڈ پہ کیا ہجوم لگنے والا ہے۔

اس کے پاؤں جیسے جم گئے...... دل میں عرصے سے پل رہا ٹریفک کا خوف پورے
وجود پہ حاوی ہو گیا۔ چند پل بیتے اور شاید اس کے وجود کے پرخچے اڑ جاتے، کسی نے اس
کے بازو کو کہنی کے نزدیک گرفت میں لیا اور جیسے کھینچتے ہوئے تیزی سے آگے لے گیا...... اس

کی آنکھوں کے آگے تو دھند چھائی تھی...... خوف کی دھند...... کان سائیں سائیں کر رہے
تھے۔

ہوش تب آیا، جب چھنو نے اس کا سرد ہاتھ تھاما...... دھند چھٹ گئی۔
اس نے تیزی سے پلکیں جھپک کر منظر کو واضح دیکھنا چاہا۔ چھنو کے چہرے پہ شرمندگی
کے ساتھ ساتھ پریشانی بھی تھی۔

"نمو...... سوری یار! میں تو...... لیکن تجھے کس نے کہا تھا، بیچ سڑک کھڑے ہو جانے
کو۔"

"جب دوست بے اعتبار ہو جائیں تو اپنی ذات پہ بھروسہ کرنا ہی پڑتا ہے۔" اس نے
کہہ کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

اور تب ہی نمو کو یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے بہت سختی سے اس اجنبی کی کلائی تھام رکھی
ہے...... گھبرا کے چھوڑتے ہوئے وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔

"اپنا خیال رکھنا سیکھیں...... ہر وقت امدادِ غیبی کی منتظر نہ رہا کریں...... اور نہ ہی"
اس نے چھنو پہ ایک گہری نظر ڈالی جو مسلسل اسے تکتی جا رہی تھی اور اپنی بات مکمل کی۔
"اور نہ ہی کسی ایسے دوست پہ بھروسہ کریں جو اپنی ذات کی اہمیت جتانے کے لیے
آپ کو مشکل میں اکیلا چھوڑ دے۔"

چھنو نے تلملا کے کچھ کہنا چاہا مگر وہ مسکرا کے ہاتھ ہلاتا دوبارہ سڑک پار کرنے لگا۔

☆======☆======☆

اپنا خیال رکھنا سیکھیں۔
بے حد نرم لہجہ......
بے حد شائستہ الفاظ......

ایک احساس سا نرمین کو اپنے حصار میں لیے ہوا تھا۔ وہ دیر سے ناول سینے پہ دھرے
اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ نظروں کے سامنے وہی منظر لوٹ کر آ رہا تھا،
جب وہ ہاتھ ہلاتا سڑک پار کرتے ہوئے اسے پیچھے مڑ کے دیکھ رہا تھا۔ کانوں میں وہی الفاظ
گونج رہے تھے۔

کیا مسکراہٹ تھی...... پُرخلوص...... بے ریا...... کیا آواز تھی...... سحر انگیز...... اثر
انگیز......

"اے...... کہاں کھو جاتی ہے بیٹھے بیٹھے؟" چھنو نے اس کے سینے پہ اوندھی پڑی کتاب

اٹھائی۔

''تم کب آئیں؟'' وہ چونک کر اپنے خیالوں سے باہر آئی۔

''اوہو...... ایسی بے خودی...... چکر کیا ہے؟ کل سے دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے رنگ ڈھنگ بدلے ہوئے ہیں۔ گم صم کیفیت...... کھلا کھلا سا چہرہ، آنکھوں میں گلابی ڈورے، ہونٹوں پہ مسکراہٹ...... یہ علامتیں تو کسی اور بات کی ہیں۔'' اس نے آنکھیں نچائیں۔

''کس بات کی؟''

''عشق کی...... محبت کی...... اور......''

''فضول......'' وہ جھینپ گئی۔

''تمہیں بڑا پتا ہے جیسے۔''

''کہاں یار......!'' چھنو اداس ہوگئی......

''سنا تو یہی ہے کہ پیار میں لڑکی پہ نکھار آجاتا ہے...... میں نے بڑی دفعہ کر کے دیکھا...... کوئی نہیں آیا...... الٹا اماں، ابا اور بھائیوں سے ڈر ڈر کے خون خشک ہو جاتا ہے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔''

''پھر بھی تم باز نہیں آتیں...... ویسے اس دن جو ملا تھا...... کیا نام تھا اس کا؟''

''ساجد......''

''ہاں وہی...... سچ بڑا فضول تھا...... شکل سے ہی لفنگا لگ رہا تھا۔''

''مگر ہے کھلے دل کا...... اور جی دار...... کسی سے ڈرتا ورتا نہیں ہے۔ الٹا دوسرے اس کے ساتھ پنگا لینے سے ڈرتے ہیں۔ مجھے یہی بات پسند ہے اس کی......''

''عجیب پسند ہے تمہاری...... لڑکا اور اوباش۔''

''جی دار ہو، بہادر ہو...... کسی کے باپ سے نہ دبتا ہو، اوپر سے نہ صرف پیسے والا ہو بلکہ پیسہ خرچنے کا حوصلہ بھی ہو اس میں...... اور کسی عورت کو کیا چاہیے۔''

اور...... وہ سوچنے لگی۔

ذہن میں پھر سے وہی شبیہہ بننے بگڑنے لگی۔

''تمہارا بھی تو کوئی آئیڈیل ہوگا؟''

''ہاں...... ہے تو......'' وہ مسکرانے لگی۔

''سچی...... بتا ناں...... لمبا سا ہوگا...... گورا چٹا...... نیلی آنکھیں، بھورے بال...... گھنی مونچھیں...... ولایت سے پڑھ کر آیا ہوا...... اور بڑا مغرور، بد دماغ...... بات بات پہ گلا

پیار کے ساتھ مارنے والا...... بھاری بوٹ دھم دھم کر کے چلنے والا...... ہے ناں؟''

''یہ سب تمہیں الہام ہوا ہے...... پاگل......''

وہ ہنستی چلی گئی۔

''تم سے ہی دو ایک ناول لے کر پڑھے تھے...... ان میں تھے اس قسم کے اڑیل ہیرو، مجھے تو ذرا اچھے نہیں لگتے ایسے مرد۔ ملیں تو دماغ درست کر کے رکھ دوں...... ساری فوں فاں نکال دوں۔ لیکن تم اتنے شوق سے پڑھتی ہو، اس لیے سوچا تمہیں تو بڑے پسند ہوں گے۔''

''نہیں...... مجھے بھی نہیں پسند...... صرف مرد ہی کیا...... مرد ہو یا عورت...... مجھے اپنے آپ میں رہنے والے، دوسروں کو اہمیت نہ دینے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔ میرا آئیڈیل تو وہ ہے جو بہت کیئرنگ ہو اور جو صرف مجھ سے نہیں بلکہ ہر اس شخص سے پیار کرے ان کا خیال رکھے جو مجھ سے وابستہ ہیں۔''

''اوہو...... یعنی تمہاری اماں...... ابا...... نانیاں...... دادی...... یعنی تمہیں گھر داماد قسم کا شوہر چاہیے۔''

''نہیں بدھو...... مگر وہ اتنا اچھا ہو کہ مجھے اسے پانے کے لیے انتظار نہ کرنا پڑے۔ وہ سارے گھر کے دل کو بھا جائے...... اتنا پسند آجائے سب کو کہ کوئی مخالفت نہ کرے۔''

''ارے نمو! میں بھی تو ہوں...... تمہاری بچپن کی دوست تو کیا وہ مجھ سے بھی پیار کرے گا۔'' وہ دور کی کوڑی لائی۔

''بدتمیز......'' اسے دھپ لگا کے وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ کل سے ہنسی اس کے لبوں سے جدا نہ ہو رہی تھی۔

☆======☆======☆

''یاسر...... آجاؤ......'' گل کے دل نے چپکے سے صدا دی۔

باہر سے بجلی کے کڑکنے کی آواز گونجی......

اس گونج میں بارش کی چھما چھم دب سی گئی۔

ساون کے موسم اور دل کے موسم میں عجیب ربط ہے۔ ایک برستا ہے تو دوجا آپ ہی آپ جوبن پہ آجاتا ہے۔ گل کے دل کی یہی حالت تھی۔

اسے گئے ساون کی وہ گلابی شام یاد آرہی تھی، جب دونوں ایک چھتری تلے بھیگتے، ریل کی پٹڑی کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔

بارش کا زور ایسا نہ تھا جیسا آج تھا...... مگر اس کن من پھوار نے بھی انہیں پورا سیراب

کر دیا تھا۔

''اگر ابھی کوئی ریل آ گئی تو؟''

''تو کیا؟ ساتھ مریں گے۔'' وہ لاپروائی سے ہنستی ہوئی گرما گرم مکئی پھانکتے ہوئے بولی تھی۔

''تم ہمیشہ مرنے مارنے کی کیوں سوچتی ہو...... شدت پسند۔''

''شروعات تم نے کی تھی...... ریل کے آجانے والی بات کر کے۔''

''تم یہ بھی تو کہہ سکتی تھیں کہ ساتھ ساتھ بھاگ لیں گے۔''

''میں نے سوچا، جان بچا کے بھاگنے والی بات تمہیں بری نہ لگے۔''

''وہ کس لیے؟'' وہ حیران ہوا۔

''مرد ہوناں......''

''تو کیا مردوں کو جان پیاری نہیں ہوتی۔'' وہ ہنس پڑا۔

''یا مردانگی کا ثبوت دینے کے لیے میں سامنے سے آتی ٹرین کے آگے تن کے کھڑا ہو جاؤں...... نہ بابا...... نہ مجھے تو جان بڑی پیاری ہے۔''

''مجھ سے بھی زیادہ......؟''

گل نے پھوار سے بچنے کے لیے ماتھے کے آگے ہاتھ کا چھجا سا بناتے ہوئے اسے بڑی آس سے دیکھا۔

''نہیں......'' یاسر نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں نہ لگایا تھا۔

وہ شانت ہو گئی۔

''یعنی میں تمہیں جان سے بھی زیادہ پیاری ہوں...... سب سے زیادہ پیاری؟''

یاسر کی جانب سے ایسے اظہار کم ہی ہوتے تھے، اس لیے وہ بہانے بہانے سے بات کو گھما پھرا کے اپنے مطلب کے اعتراف اس کے منہ سے اگلوا لیا کرتی تھی۔

''نہیں...... سب سے زیادہ تو نہیں...... جان سے بڑھ کر عزیز ہو...... مگر عزت تم سے بڑھ کے عزیز ہے۔''

اس نے گل کا ٹھنڈا ٹھنڈا ملائم ہاتھ تھام کے آگے بڑھتے ہوئے اپنی ذات کی ایک اور گرہ اس پہ کھولی۔

''لیکن مجھے تو تم سب سے پیارے ہو یاسر!''

تب تو وہ چپ رہی تھی شاید اس قربت کے فسوں نے کچھ کہنے کے قابل نہ رکھا تھا......

لیکن آج کئی ماہ کے بعد...... اس نے اتنے فاصلے پہ...... ٹیپو سے چند انچ کی دوری پہ لیٹے لیٹے...... شدت سے کہا۔

''سب سے زیادہ...... جان سے بھی زیادہ...... اور...... اور عزت سے بھی زیادہ''

اس نے کن اکھیوں سے نشے میں دھت خراٹے لیتے ٹیپو کو دیکھا......

''اپنی ذات سے بھی زیادہ پیارے ہو۔''

☆======☆======☆

رات کے اندھیرے میں دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز بڑی اجنبی سی لگ رہی تھی......

کان اب عادی کہاں رہے تھے ان دستکوں کے...... کال بیل کے چلانے پہ پتہ چلتا تھا، کوئی آیا ہے مگر بجلی اور بارش میں کبھی بنی ہے بھلا...... ایک آتی ہے تو دوسری جاتی ہے۔

اب بھی یہی ہوا تھا...... دو ڈھائی گھنٹوں سے بارش ہو رہی تھی اور اتنی ہی دیر سے بجلی غائب تھی...... جانے کون تھا جو دروازہ پیٹے جا رہا تھا۔

''اے حلیمہ! کیا کانوں میں تیل دیئے بیٹھی ہے یا روئی کی گانٹھ...... صغیر احمد بھیگ گیا ہوگا۔'' جہاں آرا بے تابی سے پکاریں۔

''اماں......! میں ایک قدم چلتی ہوں...... ہوا سے موم بتی بجھ جاتی ہے...... پھر جلاتی ہوں...... پھر بجھ جاتی ہے۔'' حلیمہ نے روہانسے لہجے میں کہا۔

''میں جاتی ہوں امی! آپ جائیے کمرے میں۔'' زمین ٹارچ روشن کر کے کمرے سے نکلی۔

''ہاں...... یہ اچھی ہے...... ہوا سے بجھتی بھی نہیں...... اپنے ابا سے مجھے بھی منگوا کے دے...... کتنے کی آتی ہے بھلا؟''

حلیمہ بچوں کے سے اشتیاق سے اس کی ٹارچ چھو چھو کر پوچھنے لگی...... زمین نے ایک عجیب سی نظر ماں پہ ڈالی...... اور دوسری آنگن کی جانب...... جہاں دستک کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

وہ سر جھٹک کے چھتری کھولتی آنگن میں اتر گئی۔

''کمال ہے...... آج نمو کے ابا نے سکوٹر کی پیں پیں نہیں بجائی...... شاید وہ بھی بجلی سے چلتی ہے اس لیے۔'' حلیمہ بڑبڑاتی ہوئی اندر مڑ گئی۔

بارش سے بچ بچ کر پھسلواں ٹائلوں پہ سہج سہج چلتی زمین کو متواتر بجتے دروازے سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ جلدی سے آنگن پار کر وہ دروازے تک گئی اور کھولتے ہی اسے اتنا اندازہ

تو پل بھر میں ہو گیا کہ سامنے اس کے ابا نہیں ہیں...... لیکن اس سے اگلا پل اس سے انکشاف لیے ہوئے تھا۔

سامنے وہی تھا۔ اس دن والا......

نرم مسکراہٹ، مہربان لہجے والا......

وہی اجنبی...... جو انجان ہو کر بھی اپنا اپنا سا لگا تھا۔ وہی جو بے گانہ ہو کر بھی شناسا محسوس ہو رہا تھا۔

''اندر آنے کو نہیں کہیں گی...... بھیگ رہا ہوں۔''

سامنے کھڑی بت بنی لڑکی کے لیے اس اجنبی مہمان کی آنکھوں میں شناسائی کے کوئی رنگ نہیں تھے۔

''آ...... آپ؟'' وہ ششدر تھی...... کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ...... جو سر راہ اتفاق سے مل گیا تھا...... اور جس نے تب سے دل و دماغ پہ غلبہ کیا ہوا تھا وہ یوں بن مانگی دعا کی طرح پورا ہوتا اسی کی دہلیز پہ کھڑا ہو گا۔

''جی...... میں...... یاسر!''

''مگر......'' وہ گھبرا کے پیچھے مڑ کے دیکھنے لگی...... جانے کوئی آنگن کے پار برآمدے میں کھڑا تھا کہ نہیں...... اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں صغیر احمد کے سکوٹر کا مخصوص ہارن بجا۔ اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

''آپ...... آپ جائیں پلیز۔''

''ارے...... یہ تو پوچھیں یہاں کس لیے آیا ہوں...... کس سے ملنا ہے...... چھوٹتے ہی جانے کا کہہ رہی ہیں۔''

''ابا آ گئے ہیں۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''تو ٹھیک ہے میں ان سے......''

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے عقب میں کوئی کھڑا ہے، وہ مڑا تو صغیر احمد کو تشویش سے تکتے پایا۔

ایک اجنبی جوان مرد...... رات کا وقت...... اندھیرا...... بارش، ان کے گھر کا داخلی دروازہ...... اور دروازے کی جانب بیٹی۔ صغیر احمد کا تشویش میں مبتلا ہونا فطری تھا۔

زمین بھی باپ کو دیکھ کے بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی اور اپنا دوپٹہ درست کرنے لگی۔

''کیا بات ہے، کس سے ملنا ہے؟'' صغیر احمد نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... ابا...... مم...... میں...... میں سمجھی...... آ...... آپ ہیں...... اس لیے۔''

یاسر کے جواب دینے سے پہلے ہی زمین نے اپنی پوزیشن واضح کرنا زیادہ بہتر جانا۔

''میں نے تم سے پوچھا ہے۔ کس سے ملنا ہے؟''

صغیر احمد نے بیٹی کی بات نظر انداز کی اور پھر سے اس اجنبی سے سوال کیا جو ایک ٹک سامنے دیکھے چلا جا رہا تھا۔

''اس سے......''

اس نے ہاتھ اونچا کیا اور انگلی کا اشارہ سامنے کی جانب کیا...... صغیر احمد کی نظریں اس کے تعاقب میں زمین کے چہرے تک گئیں اور پھر وہاں سے پھسلتی زمین سے دو گز کے فاصلے پہ کھڑے سیاہ پوش وجود پہ گئیں۔

بجلی ایک بار پھر زور سے چمکی اور گل کا چہرہ واضح ہوا...... حیران...... پریشان...... ویران چہرہ۔

☆======☆======☆

اسے بے معنی سی بے چینی نے گھیر لیا...... عجیب سی گھٹن کا احساس جب بڑھنے لگا تو اٹھ کے بیٹھ گئی۔ دو گلاس پانی پینے کے بعد بھی وہی گھٹن...... وہی بے تابی۔

وہ سینہ مسلتے آنگن میں آ نکلی...... شاید کھلی فضا اور برستی بوندیں گھٹن کی اس دیوار کو گرا سکیں...... اور آنگن کے پار پچھلی گلی میں کھلتے لکڑی کے سال خوردہ دروازے کے پاس کھڑی زمین کو دیکھ کر وہ حیران ہوئی۔

رات کے اس وقت وہ بھی لائٹ جانے کے بعد زمین یہاں کیا کر رہی ہے؟ ٹارچ کی روشنی میں زمین کا ہراساں چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور سوچتی...... صغیر احمد کے سکوٹر کے ہارن نے جیسے سارا مسئلہ سلجھا دیا لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی...... مسئلوں کا ایک پٹارا اس کے لیے اب کھلنے والا تھا۔

ٹارچ کی روشنی جیسے ہی پھسلتی ہوئی زمین کے مدِ مقابل کھڑے دونوں چہروں تک گئی۔ تب تک گل نے دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے۔

اور پھر اس کے قدموں کو زمین نے جکڑ لیا......

☆======☆======☆

''یہ...... یہ یاسر ہے...... میرے ماموں کا بیٹا!''

یاسر جو ایک کرسی پہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ چونک کر گل کو دیکھنے لگا جو پورے آستینوں کی

ڈھیلی ڈھالی قمیص میں...... سلیقے سے دوپٹہ سر پہ لیے، نظریں جھکا کے دھیمے سُروں میں با
کرتی، بڑی اوپری اوپری سی لگ رہی تھی۔

اتنا اندازہ تو اسے ہو گیا تھا کہ گل وہاں کسی ملازمہ کی حیثیت سے نہیں رہ رہی...... او
لوگ بھی شریف اور خاندانی ہیں......

"ہوں......" صغیر احمد کا انداز جتا رہا تھا کہ وہ مزید تفصیل جاننے کے خواہش مند ہیں۔

"ماموں...... وہ مجھے بہت چاہتے تھے۔ امی کے جانے کے بعد انہوں نے میرا بہت
خیال رکھا۔ بہت بچائے رکھا مجھے دوسری امی سے...... مگر سال پہلے ان کی وفات کے بعد میں
جیسے سوتیلوں کے رحم و کرم پہ آگئی۔"

گل کی زبان ایک بار چلی تو روانی سے جھوٹ اگلنے لگی۔ یاسر نے کوفت سے پہلو بدلا۔
اسے زیادہ بیزاری ان تین عمر رسیدہ عورتوں کی چبھتی نظروں سے ہو رہی تھی، جو ایک
ساتھ سامنے والے تخت پہ چڑھی بیٹھی تھیں اور مسلسل اسے تنقیدی نظروں سے گھورے چلی جا
رہی تھیں۔ پورا عدالت کا سا ماحول تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اسے کٹہرے میں کھڑا رکھنے کے
بجائے بید کی کرسی پہ بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی اور بال خشک کرنے کے لیے ایک تولیہ بھی
عنایت کر دیا گیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر گل کا عجیب و غریب رویہ اسے الجھن میں مبتلا کر رہا
تھا۔ ٹھیک ہے وہ یہاں اپنے مشکل وقت میں پناہ لیے ہوئے تھی۔ انسانی ہمدردی اور خداترسی
کے نام پہ یہ بھلے لوگ اس کے کام آئے تھے لیکن پھر بھی...... اتنے جھوٹ وہ کس مصلحت کے
تحت بول رہی تھی...... سیدھا سیدھا بتائے......

وہ ہر کام سیدھا سیدھا کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے یہ ٹیڑھا پن اس کی سمجھ میں نہ آر
تھا۔

"یہ دو سال سے ملک سے باہر تھے۔ میرا ان کا رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔"
وہ اب تک کہانی بُن رہی تھی۔

"لیکن پھر بھی انہیں میری بڑی فکر تھی...... ماموں کو میں بہت عزیز تھی اس لیے
آخری وقت میں انہیں نصیحت کر کے گئے تھے۔ میرا ہر حال میں خیال رکھنے کو...... یہاں آ
کے بعد میں نے ہی یاسر سے رابطہ کیا تھا اور انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا......
اور...... اور آپ سب کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ کہ...... کہ آپ کتنے اچھے اور محبت کر
والے لوگ ہیں۔"

"مگر تم تو کہتی تھیں پچھلوں کو پیچھے چھوڑ آئی ہو اور کبھی پلٹ کے نہیں دیکھو گی۔" جہا

آرا نے نکتہ اٹھایا۔

"جی...... میں نے ایسا کہا تھا کیونکہ وہ میرے خیر خواہ نہیں تھے...... لیکن...... یاسر......"

"دراصل میں، میں نے سوچا۔"
یاسر نے کھنکھارتے ہوئے بیان میں اپنی جانب سے اضافہ کیا۔

"جا کے خود ملوں، آپ سب سے اور شکریہ ادا کروں کہ اس مشکل وقت میں آپ لوگ
گل کے کام آئے...... اسے سہارا دیا۔" اور اس میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ اس لڑکی نے بھی بڑی ہمت کی جو کنویں سے بچتے ہوئے کھائی میں
چھلانگ لگا دی۔" جہاں آرا کی بات پہ گل نے گھبرا کر یاسر کو دیکھا کہ وہ اس بات کے معنی نہ
اخذ کرنے لگ جائے۔

"تو کون سا کارنامہ کیا بھابی! جو ہفتے بھر سے یہی راگ الاپے جا رہی ہو۔" جنت
نے ناک بھوں چڑھائی۔

"لو...... بھلا گھر سے بھاگنا بھی اب ہمت دکھانے کا کام ہو گیا کہ اس پہ شاباشیاں
ملیں گی۔"

گل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں یاسر سے منظر سے غائب ہو جانے کی استدعا کی۔
یاسر نے بیگ فرش سے اٹھایا اور کھڑا ہو گیا۔

"مجھے بس یہ تسلی کرنا تھی کہ گل محفوظ ہاتھوں میں ہے یا نہیں۔ وہ خوش ہے، میرے لیے
اتنا کافی ہے...... میں چلتا ہوں اب۔"

"رکو......" صغیر احمد کی آواز پہ اس کے بڑھتے قدم رکے۔

"اماں! پیچھے والا کمرہ کھلوا دیجیے...... آپ یہیں رہ لیں۔"

"یاسر یہاں۔" گل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"مگر......" جہاں آرا بھی متذبذب تھیں۔

"نہیں...... میرا خیال ہے، میرا جانا ہی ٹھیک رہے گا۔" یاسر خود بھی ہچکچا رہا تھا۔

"موسم ٹھیک نہیں ہے اور آپ بہت سفر کر کے آئے ہیں۔ جائیے آرام کیجیے۔ کہاں جانا
ہے یہ فیصلہ صبح کر لیجیے گا۔"

یاسر نے ایک نظر گل کی جانب دیکھا...... وہاں واضح تنبیہہ تھی، جو یاسر کی سمجھ سے بالاتر
تھی...... وہ تو اندازے لگاتا آیا تھا کہ شاید اسے یوں اچانک سامنے دیکھ کر اس کے پیر ہی
زمین پہ نہ لگیں...... لیکن اس کے محسوسات بالکل ساکت و جامد تھے۔ جیسے بہت مشکل سے

بڑے جتن کر کے اس نے خود پہ بند باندھے ہوں۔

''گل......اور خود پہ بند باندھے؟ ناممکن......''

اور اس ناممکن کو ممکن اس نے کس مجبوری کے تحت بنایا ہے، اس سوال کا جواب جانے کے لیے اس نے صغیر احمد کی پیشکش قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔

گل سے نظریں چراتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا بیگ نیچے رکھا......اور گل کا دل بھی نیچے......کہیں بہت نیچے اتر گیا۔

اپنے پیروں کی لرزش پہ قابو پاتی، وہ چپکے سے جہاں آرا کے پیچھے چل دی۔

''آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے اس گھر کا......ہر ایرے غیرے کو اندر گھسائے لے رہے ہیں گھر میں۔''

جنت کی بڑبڑاہٹ نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔

☆======☆======☆

جہاں آرا، گل کی مدد سے مہینوں سے بند پڑے کمرے میں سے فالتو سامان اٹھوا رہی تھیں۔

''یہ نئی چادر بچھا دینا اور غسل خانے میں ضرورت کی سب چیزیں رکھ دینا۔''

''ان سب کی ضرورت نہیں ہے اماں جان!''

وہ جھنجلا رہی تھی......یاسر پہ بھی غصہ آ رہا تھا، جو اس کے اشاروں کو نظر انداز کرتا مزے سے رک گیا تھا۔

''بارش بند ہوتے ہی چلے جائیں گے وہ......یا زیادہ سے زیادہ رات بھر......''

''تمہارے میکے سے پہلی بار کوئی آیا ہے......اور پھر آیا بھی پردیس سے ہے......بے چارے کی نہ ماں......نہ باپ......نہ گھر بار......نہ رشتے دار......اب اس کنڈا لن کے پاس تو جانے سے رہا......تمہاری سوتیلی ماں کے ہاں......میں تو کہوں گی صغیر احمد سے کہ جب تک بچہ یہاں اپنے کام سے رکا ہے، ہمارے ہی ہاں ٹھہر جائے......اتنی بڑی حویلی کس کام کی جو سمدھیانے کو بھی نہ ٹھہرا سکیں۔'' انہوں نے گل کی سانس تک بند کر دی۔

''نمو......ارے نرمین......تولیہ دے کر آئی یا نہیں؟'' انہوں نے گل کی حالت پر توجہ دیے بغیر نرمین کو پکارنا شروع کیا۔

''لو......یہ دھرا ہے......میں اپنے ساتھ ہی لے آئی۔''

وہ تولیہ اٹھا کے باہر گئیں اور گل کا بس کسی اور پہ نہ چلا تو وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔

''یا اللہ! اگر یاسر کو پتہ چل گیا کہ میں یہاں کس حیثیت سے رہ رہی ہوں تو......تو؟''

☆======☆======☆

''یہ تولیہ......''

وہ صحن میں کھڑا، سر اونچا کر کے آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جاگرز گیلے ہو جانے کی وجہ سے اتار کے ننگے پیر تھا......جینز بھی بھیگی ہوئی تھی......اس کے پائنچے اس نے اوپر کی جانب فولڈ کر رکھے تھے۔

وائٹ شرٹ پہ جا بجا کیچڑ کے چھینٹوں کے نشانات تھے۔ چہرے پہ سفر کی تھکان......سوچ کی پرچھائیں......بال بکھرے ہوئے۔

ان سب کے باوجود وہ نرمین کو اب بھی سب سے اچھوتا لگ رہا تھا......وہ کسی دلفریب منظر کی طرح اسے تکے جا رہی تھی۔

یاسر کے مڑ کے دیکھنے پہ اس نے نظریں جھکا لیں۔

''دادی اماں نے کہا ہے، آپ کو دے آؤں۔''

''آپ کے گھر سے آسمان دور تک نظر آتا ہے۔''

اس نے تولیہ تھامتے ہوئے دوبارہ اوپر نظر کی۔ نرمین نے بھی نظریں آسمان کی جانب کیں۔

''ہاں......واقعی......''

''ارے......آپ کا گھر ہے اور آپ نے ابھی تک غور ہی نہیں کیا۔''

''کبھی دھیان ہی نہیں گیا اس جانب۔''

''لیکن اس گھر میں داخل ہونے کے بعد میرا تو پہلا دھیان ہی اس جانب گیا تھا۔ اصل میں میری نظر ہمیشہ اوپر......بہت اوپر ہوتی ہے۔''

☆======☆======☆

''یہ شلوار قمیص پہنو۔ بھائی صاحب نے بھجوایا ہے۔''

گل نے سنجیدگی سے ایک تہہ شدہ، استری شدہ، سوٹ اس کی جانب بڑھایا۔

''بڑے مہربان ہیں تمہارے بھائی صاحب۔ خیر تو ہے۔'' یاسر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہتے ہوئے چھیڑا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو یاسر؟''

وہ اس کا مذاق نظر انداز کرتے ہوئے بدستور سنجیدہ تھی اور وہ اسی طرح مذاق کے موڈ

میں۔

''تمہارے بھائی صاحب کا یہ شلوار قمیص پہننے۔''

''آنے سے پہلے بتا تو دیتے لیکن آنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اب واپس جا بھی تو گے یا نہیں؟''

''شاید نہیں۔'' پہلی بار سنجیدہ نظر آیا۔

''تو ضرورت کیا تھی منہ اٹھا کے چلے آنے کی۔'' وہ درشت لہجے میں بولی یاسر کے ماتھے بل آ گیا۔

''میں تمہارے لیے آیا ہوں گل! اور تم یہ بات جانتی ہو۔ اس کے علاوہ یہاں کچھ نہیں ہے میرا جو بھاگا آتا۔''

''اور میں بھی تمہارے لیے یہاں......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ پھر اس کا بگڑتا موڈ دیکھ کر نرم پڑی۔

''تمہیں پتا ہے کہ تمہیں بھیجنے کے لیے میں نے دل پہ پتھر رکھا تھا کہ تم وہاں چند سال ٹکے رہو۔ کچھ جوڑ سکو، کچھ پیسہ کما سکو۔ اس کے لیے میں نے کتنا ترس لیا۔ پولیس تھانے تک کے چکر میں پڑی اور تم آ بھی گئے۔ چند سال کی تو بات تھی یاسر! صرف چند سال کی۔''

''دو سال میں میں جتنا کما سکتا تھا گل! اتنا ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

''کیا؟ کیسے؟''

''میرا وہ ایکسیڈنٹ...... میں وہ کیس آخری وقت میں جیت گیا۔ کیونکہ جس سے میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا، یہ بات ثابت ہو گئی کہ ایکسیڈنٹ کے وقت وہ نشے میں تھا اور اس حادثے میں زخمی وہی ہوا اور میں بالکل ٹھیک رہا، لیکن چونکہ میری ملازمت گئی۔ میں تھانے میں بند رہا مجھے ہرجانے کے طور پہ مالک کو گاڑی وغیرہ کا نقصان بھرنا پڑا، اس لیے اپنے دوست کے کہنے پہ میں نے اس شخص کے خلاف کیس کر دیا اور ہرجانے کے طور پہ مجھے اتنی رقم ملی ہے کہ کہیں۔''

''یاسر!'' گل اپنا چکراتا سر تھام کے بیٹھ گئی۔

اس کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔

''تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟''

''ہاں ہوئی ہے، لیکن یہ سب تم...... مجھے کچھ پہلے بتا دیتے۔ کچھ ماہ پہلے تو شاید......''

''ابھی دو ہفتے پہلے تو فیصلہ میرے حق میں ہوا ہے اور رقم ملتے ملتے کچھ دن اور لگ

ئے۔ ملتے ہی میں واپس لوٹ آیا شاید اتنی جلدی لوٹنے کا فیصلہ نہ کرتا۔ مگر تمہارے لیے فکر ند تھا۔ تشویش ہو رہی تھی کہ تم کن لوگوں کے ساتھ ہو، اب پتا چل گیا تو دل کو اطمینان ہو رہا ہے۔''

''ابھی کہاں پتا چلا ہے تمہیں۔'' وہ بڑبڑا کے رہ گئی۔

''پہلے تو میں ان لوگوں کے منہ پہ یہ رقم ماروں گا جن کا زیور......''

''اس کی اب ضرورت نہیں ہے۔ شوکے، میرا مطلب ہے میرے بہنوئی نے ان کا نقصان بھر دیا تھا۔''

''تو تم نے اپنا گھر کس لیے چھوڑا؟''

''کیونکہ وہ بے غیرت کا بچہ، اب اپنا نقصان مجھ سے بھرنا چاہ رہا تھا اور میرے ماں باپ اس پہ راضی تھے۔''

وہ پھٹ پڑی۔ دل کا غبار کسی نہ کسی طرح تو نکالنا تھا۔

''چلو چھوڑو۔'' یاسر نے اس کا شانہ تھپکا۔

''اب بھول جاؤ وہ سب۔ شاید ہمیں اب بڑی خوشی ملنے سے پہلے یہ آزمائش لکھی تھی مقدر میں۔ اب ہم دونوں اس آزمائش کی بھٹی سے تپ کر نکل آئے ہیں۔ اب آگے کا سفر طے کرنا ہے گل! پچھلا سب کچھ بھلا کے۔'' وہ خالی خالی نظروں سے اسے تکنے لگی۔

''ہم صبح ہی ان سے اجازت......''

''مجھے تم سے کچھ کہنا ہے یاسر!'' دل کڑا کر کے اس نے کہہ ہی دیا۔

''بلکہ...... کچھ بتانا ہے۔''

یاسر لہجے سے ہی اس بات کے غیر معمولی ہونے کا اندازہ کرتے ہوئے سنجیدگی سے اسے دیکھنے لگا۔

''یہاں پہ میں......''

''دلہن...... دلہن......''

حلیمہ کی آواز پہ گل گھبرا کے پلٹی۔ ابھی وہ ساری حقیقت خود یاسر کو بتانے جا رہی تھی۔ لیکن اب خوف زدہ نظروں سے حلیمہ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے سہمے ہوئے انداز میں یاسر کو دیکھا کہ ''دلہن'' لفظ پہ وہ چونکا یا نہیں۔

''ارے...... نمو کے ابا کے کپڑے۔'' حلیمہ یاسر کو دیکھ کر ساری بات وات بھول گئی۔

''وہ آ...... آپا، انہوں نے خود دیئے تھے۔''

"اس جوڑے میں بڑے جچتے ہیں۔" حلیمہ دوپٹے کا کونا دانتوں میں دبا کے شرمائی۔

"کون...... میں؟" یاسر مسکرایا۔

"نہ نمو کے ابا!" وہ شرما کے پلٹ گئی۔

"کہو کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"میں کچھ...... کچھ بھی تو نہیں...... میرا مطلب ہے کچھ خاص نہیں۔" اس نے ارادہ بدل دیا۔ ابھی ایک لمحے پہلے جس شدید خوف نے اسے جکڑا تھا، اس کے بعد حوصلہ نہ ہوا دوبارہ ایسی جسارت کرنے کا۔

"تم سو جاؤ...... صبح ہوتے ہی نکلنا ہوگا تمہیں۔"

"اکیلے۔"

اس کے معنی خیز سوال پہ وہ جاتے جاتے رکی مگر بغیر پلٹے مختصر سوال کا مختصر جواب دیا۔

"فی الحال۔"

☆======☆======☆

اور اس نے واقعی صبح ہوتے ہی جانا چاہا۔ وہ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ گل کیوں یہ چاہتی ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلا جائے صرف اتنا اندازہ لگا پایا کہ یہ لوگ روایتی اور رکھ رکھاؤ والے ہیں۔ جدیدیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ روشن خیالی کے نام پہ مغربیت کے اطوار انہوں نے ابھی تک نہیں پالے اس لیے گل نے اسے ماموں کا بیٹا بتلایا ہے۔ اصل تعلق واضح نہیں کیا۔ اور جب انہ جانے ہو کر بھی وہ لوگ اس کے لیے اتنے مددگار ثابت ہوئے ہیں تو وہ بھی اپنے محسنوں کا دل برا نہیں کرنا چاہتی ہوگی۔ جاتے جاتے بھی ان سے آئندہ تعلق برقرار رکھنے کی ایک راہ کھلی چھوڑنا چاہتی ہوگی۔

"کوئی مضائقہ بھی نہیں...... نہ میرا کوئی آگے پیچھے نہ گل کا کوئی والی وارث، ایسے میں نئے گھر اور نئے خاندان کی بنیاد رکھتے ہوئے ایک شریف اور عزت دار گھرانے کی دعائیں اور خلوص مل جائے تو کیا برا ہے۔ گل نے مجھے اپنا کزن ظاہر کیا ہے۔ میں اسی حیثیت میں دوبارہ آؤں گا اور ان کے سامنے تجویز رکھوں گا گل کے اور میرے بزرگ بنتے ہوئے وہ ہمارا نکاح کرا دیں۔ کیونکہ ہم دونوں کا اب ایک دوسرے کے سوا کوئی اور نہیں رہا اور بغیر کسی شرعی رشتے کے ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اتنا سرمایہ تو ہے میرے پاس کہ چھوٹے موٹے کاروبار کا آغاز کر سکوں۔ کرائے پہ مناسب سا گھر لے سکوں۔ باقی جو نصیب......"

اس کا نقطہ نظر ہمیشہ صاف اور واضح رہا تھا۔

خواب اور ارادے بھی سیدھے جاتے تھے لیکن اسے نہیں پتا تھا کہ ان میں کہاں کہاں ٹیڑھ پیدا ہو چکی ہے۔

جہاں آرا نے بصد اصرار اسے ناشتے پہ روک لیا۔ اور گل جو اسے بیگ اٹھائے نکلتے دیکھ کر قدرے شانت ہوئی تھی پھر سے جلے پیر کی بلی بنی گھومنے لگی۔ کبھی باورچی خانے میں جاتی۔ ناشتہ دیکھتی۔ کبھی بے تابی سے گول کمرے کے چکر، حیرت انگیز طور پہ اب تک یہ راز، راز میں ہی تھا۔ اگر باتوں باتوں میں کوئی ایسا اشارہ ملا بھی تو یاسر نے اپنی دھن میں مگن اس پہ غور ہی نہیں کیا۔

"آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی والدہ یاد آ گئیں۔"

وہ ٹیپو پہ نظر ڈال کے دوبارہ گول کمرے کی جانب آئی۔ تو یاسر کو کہتے سنا...... ٹیپو رات دیر سے سویا تھا۔ نیند آور گولیوں کی مقدار بھی گل نے زیادہ دی تھی۔ اس لیے اب تک دھت تھا۔

"وہ بالکل آپ جیسی تھیں۔ سرتاپا دعا...... سب کے لیے مامتا سے بھری۔ مہربان......"

"اطوار سے بھی کسی نیک ماں کی اولاد ہو، بڑے بختوں والی ہوں گی مرحومہ......"

یاسر متانت سے مسکرایا اور چور نظروں سے گل کی جانب دیکھا جو جھک کر برتن سمیٹ رہی تھی۔ عجلت اس کے انداز سے اور گھبراہٹ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"چائے......"

اگلے ہی پل وہ چائے کے کپ آگے دھر رہی تھی۔ بس نہ چل رہا تھا کپ خود اٹھا کے یاسر کے لبوں سے لگا دے اور گرما گرم ہی اس کے اندر انڈیل دے تاکہ وہ جلدی سے یہاں سے رخصت ہو۔

لیکن ابھی یاسر نے پہلا گھونٹ بھی نہ بھرا تھا کہ ٹیپو بکھرے بالوں اور میلے کپڑوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

آنکھیں پوری طرح کھلی نہ تھیں۔ ایک ہاتھ سر میں گھسا کھجانے میں مصروف تھا۔ یاسر نے ایک ناپسندیدہ سی نظر اس پہ ڈالی۔

"آپا بتا رہی ہیں مہمان آیا ہے۔" اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ بایاں ہاتھ اب سر سے نکل کر کرتے کے اندر گھسا پیٹ کھجا رہا تھا۔

"ہاں...... یہ ہے یاسر۔ گل کے ماموں کا لڑکا۔"

"ماموں کا لڑکا؟ یہ کہاں سے اُگ آیا؟"

اس کے بدتمیزی سے بات کرنے پہ یاسر کی ناپسندیدگی واضح ناگواری میں بدل گئی جسے چھپانے کے لیے اس نے چائے کا کپ آگے کرلیا۔ یہ سوچ کر کہ نہ جانے یہ نو وارد اس گھرانے سے کیا تعلق رکھتا ہے۔ کہیں ناگواری کا یہ اظہار انہیں برا نہ لگ جائے۔

"یہاں کیوں آیا ہے؟ گل کو لے جانے؟" وہ مسلسل یاسر کو گھورے جا رہا تھا۔

"کیا اناپ شناپ بکے جا رہے ہو؟ گل اس کے ساتھ کیوں جانے لگی بھلا ویسے ہی ملنے چلا آیا بچہ۔ اس بے چاری کو تو دیکھو۔ بن ماں کی بچی کو...... خوشی سے پیر زمین پہ نہیں ٹک رہے۔"

"ہاں اماں کہتی ہیں۔ میکے کا طوطا بھی پیارا لگتا ہے۔"

ٹیپو کی بات پہ پہلی بار یاسر چونکا۔ اس نے غور سے اسے دیکھا جس کے چہرے پہ دیوانگی کے رنگ واضح تھے۔ پھر اس نے جہاں آرا کا چہرہ کھوجنا چاہا کہ اگر اس نیم دیوانے نے پاگل پن میں کوئی اوٹ پٹانگ بات کر بھی دی ہے تو اس پر ان کا کیا ردِعمل ہوگا۔ لیکن جہاں آرا کا چہرہ نارمل تھا، ہر قسم کے تاثرات سے عاری جیسے ٹیپو نے کوئی غیر معمولی بات نہ کی ہو۔

ٹیپو کی آواز سنتے ہی گل زبیدہ کے لیے ڈالا پراٹھا توے پہ چھوڑ کر بھاگتی آئی...... اور پھر کمرے کے دروازے کے عین وسط میں جم کے رہ گئی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اندر موجود تینوں نفوس پہ ٹکی تھیں۔ جو فی الحال چپ تھے۔ خاموش مگر اس سکوت میں ایک وحشت تھی۔ جسے صرف اس کا دل محسوس کر رہا تھا۔

"یاسر میاں! یہ ٹیپو یعنی طلعت منیر ہیں۔" یاسر نے رواداری میں مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"صغیر میاں کے سالے لگتے ہیں اور تمہارے......"

"جیسے تم میرے سالے۔" ٹیپو نے جہاں آرا کی بات مکمل کی۔

یاسر کا جی چاہا، چائے کا کپ اس بدتمیز پہ الٹ دے...... پھر اس کی دماغی حالت کا لحاظ کر کے ضبط کر گیا۔

وہ کھی کھی کر کے ہنستا، پیلے بھدے دانتوں کی نمائش کر رہا تھا۔ گل نے آگے بڑھ کے اسے متوجہ کیا۔

"آپ وہاں آجائیں۔ کچن میں ناشتہ تیار ہے۔"

"میں تو یہیں کروں گا۔" وہ وہیں پھسکڑا مار کے بیٹھ گیا۔

"ارے بیٹھا رہنے دو...... اس کا کوئی خاص رشتے دار پہلی بار ملنے آیا ہے۔" جہاں آرا نے اپنی جانب سے شرارت کرنا چاہی۔

"یاسر میاں! تم شاید پہچانے نہیں اسے......" گل کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ پیچھے کی جانب ہٹی۔

"تب ہی...... ورنہ ڈھنگ سے ملے ہوتے۔"

اس کا دل چاہا، کانوں پہ ہاتھ رکھ دے۔ اپنے نہیں یاسر کے کانوں پہ۔

"یہ گل کا شوہر ہے اور تمہارا بہنوئی۔"

یاسر کے گلے میں پھندا لگ گیا۔

☆======☆======☆

اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔

اپنی آنکھوں سے گل کا نظریں چرانا دیکھا تھا۔

یہ وہم نہیں تھا...... حقیقت تھی...... ایک جان لیوا حقیقت......

اس کو یقین نہیں آرہا تھا مگر یقین کرنا تو تھا......

"یہ گل کا شوہر ہے...... تمہارا بہنوئی!"

ابھی تک یہ الفاظ بازگشت کی مانند اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

"یاسر......!" گل کی مدھم سرگوشی پہ وہ پلٹا۔ وہ فق رنگت لیے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔

"اگر ایک اور نیا جھوٹ گھڑ کے اپنے اس فن کی داد لینے آئی ہو تو پلیز۔ پلیز چپ رہو۔ میں اتنے زیادہ جھوٹ نہیں سن سکتا۔"

وہ ضبط کھو بیٹھا...... اور اس کی معمول سے اونچی آواز سن کر گل نے گھبرا کے دروازہ بند کیا۔

"یاسر......! تمہیں میری پوری بات سننا ہوگی۔"

"پوری بات یا پورا جھوٹ؟" وہ پھٹ پڑا۔

"ہاں بولا تھا میں نے جھوٹ، کیونکہ یہ ضروری تھا۔ میں جس قسم کے حالات میں گھری تھی۔ ان میں سوائے جھوٹ بولنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا میرے پاس۔"

"تمہارے پاس ویسے بھی جھوٹ کے علاوہ بولنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ جب سے تم سے ملا ہوں...... ہر بار ایک نیا روپ دیکھتا ہوں تمہارا...... کئی بار خود پہ حیرت ہوتی ہے کہ میں سب

جانتے، بوجھتے...... کیسے تمہاری محبت کے چکر میں پڑ گیا...... اور کبھی حیرت تم پہ ہوتی ہے...... کہ تم ہو کیا چیز...... جو منٹوں میں ایک مرد کے ہوش وحواس مٹھی میں کر کے اسے بے بس کر دیتی ہو...... اس بار مجھے حیرت نہیں ہو رہی گل......! صرف افسوس ہو رہا ہے۔"

"افسوس تو تمہیں بعد میں ہوگا یاسر! بعد میں...... جب تمہیں پتا چلے گا کہ ٹیپو نام کی گھنٹی میں نے کس لیے اپنے گلے میں باندھی ہے...... صرف اور صرف تمہارے لیے...... تم سے وعدہ کیا تھا میں نے کہ تمہارا انتظار کروں گی۔ سوائے تمہارے کسی اور کی نہیں ہوں گی۔ یہ وعدہ نبھانے کے لیے...... اپنا آپ تمہارے لیے بچا کے رکھنے کی خاطر میں نے یہ جوا کھیلا ہے۔"

وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆======☆======☆

"ایک طریقہ ہے گلابو! اس مسئلے سے چھٹکارا پانے کا۔"

رکشے میں بیٹھے بیٹھے ہی رانی کو خیال سوجھا۔

"وہ کیا؟"

"پتا نہیں...... تُو مانے گی یا نہیں......" وہ متذبذب تھی۔

"کسی طرح یہ بلا میرے سے ہٹ جائے...... میں کرلوں گی جو بھی کرنا ہوگا۔"

"اس سائیں لوک سے شادی کرے گی؟"

"کیا؟" وہ ڈنک کھا کے اچھلی۔

"سوچ لے...... اچھے گھر کا لگتا ہے...... شوکے کی پہنچ سے دور ہوگئی تو ہاتھ کیسے ڈالے گا تجھ پہ؟"

"پاگل تو نہیں ہوئی...... میں اور اس چھچھوندر سے......" اس نے کراہیت بھری نظر ٹیپو پر ڈالی جو اس ساری گفتگو سے بے نیاز سڑک پہ رواں دواں ٹریفک دیکھنے میں مگن تھا۔

"اور میرے ماموں کو بھی اعتراض نہیں ہوگا...... مولوی ٹائپ بندہ ہے...... ایسے ہی تو گھر میں پناہ نہیں دے سکتا کسی انجان لڑکی کو...... اور جو تیرا بہنوئی پیچھے پیچھے آ گیا تو اس نے تو تیرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔"

"تو میں نہیں جاتی وہاں...... رکواؤ رکشہ......"

"پاگل ہوئی ہے...... پیچھے وہ پاگل کتا لگا ہوا ہے...... جہاں تجھے اکیلا دیکھا...... کاٹ کھائے گا۔"

گل ذرا ٹھنڈی پڑی۔

"جتنا بھی بڑا پھنے خان رہا ہو شوکا...... یہ لاہور ہے...... یہاں کتنی پھوں پھاں دکھا سکتا ہے......؟ اور وہ بھی کسی دوسرے کی بیوی پہ۔ ویسے بھی یہ کون سا پورا پاگل ہے جو تجھے آسانی سے جانے دے گا۔ میرا مطلب ہے کچھ تو سہارا...... تھوڑا سا آسرا تو ہوگا اس کے دم سے۔"

"میں...... رانی! تُو جانتی ہے میں کسی اور سے محبت......"

"تو اسے بلا لے...... وہ سنبھالے تجھے۔"

"نہیں آ سکتا وہ۔" گل جھنجلا گئی۔

"تو خود کو بچانے کی ذمے داری اکیلے تیرے سر ہے۔"

"تُو سمجھتی کیوں نہیں...... میں اس سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔"

"نہ کر...... صرف خود کو شوکے سے بچا...... اور اپنے آپ کو بچانے کے لیے تو قتل تک کرنا جائز ہوتا ہے۔ رہا اس لم ڈھینگ کو قابو کرنے کا معاملہ...... تو وہ معمولی بات ہے۔"

اور اس شام...... ٹھیک ڈیڑھ گھنٹے بعد رانی کے مولوی ماموں نے اس کا اور ٹیپو کا نکاح پڑھایا...... گل نے اپنا نام ماہ گل بتایا...... ولدیت تک غلط لکھوائی...... خود کو لاوارث اور یتیم ظاہر کیا...... رانی کے منت سماجت کرنے پہ اس کا ماموں یہ نکاح پڑھانے پہ بھی رضا مند ہو گیا اور گواہ بھی اس نے خود ہی ڈھونڈ ڈھانڈ کے نکالے۔ ٹیپو اس ساری کارروائی کے دوران دانت نکالے تالیاں پیٹتا رہا تھا۔

☆======☆======☆

"اگر میں ایسا نہ کرتی تو شوکے کے گھر بیٹھی ہوتی...... اس کی بیوی بن کے...... اور اگر اس کے ہاتھ نہ لگتی تب بھی کسی نہ کسی اور مردود کے ہتھے چڑھ چکی ہوتی...... ایک جوان لڑکی کب تک فٹ پاتھ پہ زندگی بسر کرتی...... بے سہارا......"

"مگر...... یہ...... ٹیپو......!"

ساری تفصیل سن لینے کے بعد بھی اس کا گلہ تو دور نہ ہوا تھا...... مگر طیش ضرور......

"معصوم...... سیدھا سادا...... اس سے مجھے کیا خطرہ ہو سکتا تھا...... ہاں مگر شوکا...... ایک بار اس کے ہاتھ آ جاتی تو پھر ہمارا ملنا ناممکن تھا۔"

"اب ممکن ہو گیا ہے؟"

وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولا۔ اور ایک تواتر اور جوش کے ساتھ اپنی صفائیاں پیش کرتی گل چپ کی چپ رہ گئی...... پھر ذرا سنبھل کے کہا۔

"اس بھنور سے نکلنا میرا کام ہے...... تم فکر مت کرو۔"

"میں فکر نہ کروں......" وہ تلخی سے ہنس پڑا۔

"زندگی میں پہلی بار کسی سے محبت کی...... اس نے مجھے شکست کا مزہ چکھا دیا...... پہلی بار کسی کی ذات پہ اعتماد کیا...... اس نے مجھے ہی اندھیرے میں رکھ کے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا...... پہلی بار کسی سے امید لگائی۔ اس نے ساری آس اور توقعات توڑ ڈالیں...... اور زندگی میں پہلی بار کسی کے ساتھ خواب دیکھے...... جس کو ساتھ دیکھنا چاہا...... وہی صدیوں کے فاصلے پہ کھڑا ہے۔"

"نہیں یاسر......! میں تم سے یہ سب چھپانے کی خطاوار ضرور ہوں لیکن صرف اس لیے کہ میں تمہیں پردیس میں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تم پہلے ہی پس رہے تھے حادثات کی چکی میں...... اور مجھے پتہ ہوتا کہ اللہ اتنا کرم کرنے والا ہے تم پہ تو میں کچھ انتظار کر لیتی۔"

"ہاں یہ غلطی تو ہوتی ہے ہم انسانوں سے...... سب کچھ نظر میں رکھتے ہیں...... سارا حساب کتاب...... سارا نفع نقصان...... ایک بس اللہ کے کرم کی امید نہیں رکھتے...... تم نے بھی اپنی حفاظت کے لیے ایسے بودے سہارے تلاشنے کے بجائے اللہ سے آس لگائی ہوتی تو......"

"جو ہو گیا یاسر......! اسے چھوڑو...... آگے کی سوچو۔"

"میرا تو دماغ ماؤف ہو کے رہ گیا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کے بیٹھ گیا۔

"تم بس میری طرف سے دل صاف کر لو...... باقی میں جانوں اور میرا کام۔"

اس پر یاسر نے ایسی شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ نظر چرا کے رہ گئی۔

"دلہن...... کہاں رہ گئی گل؟"

جہاں آرا کی آواز پہ دونوں جیسے کسی خواب سے باہر آئے...... اب گل کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ یاسر کے ساتھ کسی اور جگہ موجود ہے...... اسی چھت کے نیچے...... جہاں اس کا نام نہاد شوہر رہتا ہے۔

"جی...... آئی...... بڑی اماں......!" اس نے قدرے سنبھل کے پکارا۔

یاسر چڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"یاسر...... تم کہو تو ابھی سب چھوڑ چھاڑ تمہارے ساتھ چل پڑوں......"

"اور وہ نکاح نامہ؟"

یاسر کے یاد دلانے پہ وہ لبوں پہ قفل لگا کے سر جھکا گئی۔

"اب تو یہاں سے نکلنے کی ایک صورت ہے۔ تمہاری اور نیبو کی طلاق۔"

"میں اس سے......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں۔ بولو۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟ اس سے بات کرو گی؟ اس نیم پاگل سے؟ تم کہو گی اور وہ طلاق دے دے گا؟ کچھ ہوش میں ہوتا تو شاید غیرت میں آ کے ہی دے دیتا......" یاسر نے زہر میں بجھے الفاظ اگلے۔

"میں اس کے گھر والوں سے بات کروں گی۔ وہ قدرے معقول لوگ ہیں۔"

"معقول بھی...... اور بے ضرر شریف لوگ بھی...... مجھے تو سوچ سوچ کے شرم آ رہی ہے کہ یہ لوگ جو کل رات سے مجھے تمہارے میکے سے آیا فرد جان کے اتنی محبت اور عزت و تکریم کے ساتھ پیش آ رہے ہیں...... انہیں میں اتنا بڑا شاک پہنچانے والا ہوں...... اور تم بتاؤ گی یہ سچ نہیں؟ اتنی اخلاقی جرأت ہے تم میں؟"

"پتہ نہیں......" وہ انگلیاں مسلنے لگی...... ایک کے بعد ایک چہرہ نظروں کے سامنے آنے لگا۔

جہاں آرا بیگم...... وہ طرح دار خاتون...... جو مزے سے رہنے کی عادی تھیں، انہوں نے کس فراخدلی سے اس جیسی کم مایہ لڑکی کو گھر میں ہی نہیں خاندان میں بھی جگہ دی تھی۔

صغیر احمد۔ وہ بارعب نظر آنے والا مگر اندر سے بے حد حساس اور نرم خو شخص...... جس عزت سے اسے نظر جھکا کے مخاطب کرتا تھا...... اسے گویا پر لگ جاتے تھے۔

حلیمہ کا سادہ، بے ریا معصوم چہرہ...... اپنے بھائی کے حوالے سے ہی سہی...... مگر اسے کتنا عزیز رکھتی تھی وہ کم فہم عورت جیسے گل اس کی ماں جائی ہو...... دلہن کہتے حلق خشک ہوتا تھا اس کا۔

"پتا نہیں...... کہہ پاؤں گی یا نہیں...... مگر کہنا تو ہے۔"

"کیا ملے گا کہہ کر...... جو اعتبار بنایا ہے اسے بھی کھو دو گی۔ یہ بھول جاؤ کہ وہ لوگ اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کریں گے۔ انہوں نے نہیں کروائی اپنے بیٹے کی شادی تم سے...... شریف انسان سے ہر بار شرافت کی توقع مت رکھو۔ یہ نہ ہو کہ جوش سے کام لے کر کسی نئی مصیبت میں پھنسا لو خود کو۔"

یاسر اسے جن نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ سب کہہ رہا تھا...... وہ نظریں گل سے برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔

کیا نہیں تھا ان نظروں میں......

ملامت...... گلہ...... شکوہ...... ناراضی۔

وہ اس کا تلخ سے تلخ لفظ برداشت کرسکتی تھی مگر یہ کڑی نظریں...... ان کی تاب لانا مشکل تھا۔

''دلہن!'' اس بار آواز دینے والی حلیمہ تھی......گل نے جلدی سے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

''تم نے بہت برا کیا گل...... بہت برا۔''

اپنی پشت پہ اس نے یاسر کا ٹوٹا ہوا لہجہ سنا......وہ پھر سے وہیں پتھر ہوگئی۔

''تم میرے ساتھ رابطے میں رہنا...... میں جلد ہی اس طوق کو گلے سے اتار پھینکوں گی۔''

اس نے مڑ کے دیکھے بغیر اس سے کہا تھا اور دہلیز پار کر کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ وہ دیکھ بھی نہ پائی تھی کہ یاسر نے ہاتھ میں پکڑا بیگ نیچے رکھ دیا تھا۔

☆======☆======☆

دل میں کھد بدسی ہو رہی تھی اور وہ بڑے ضبط کے ساتھ خود کو باورچی خانے کی چوکی سے باندھے سویاں بٹ رہی تھی......نظریں بار بار برآمدے کی جانب بھٹکتیں...... یاسر کو گھر سے نکلنے کے لیے یہیں سے گزرنا تھا......مگر دو گھنٹے سے اوپر ہوئے اس نے یاسر کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی...... اوپر سے یہ نئی مصیبت......سویاں......اس نے کوفت سے سینی میں رکھے ڈھیر کو دیکھا۔

''مصیبت......عذاب......دس بارہ روپے کا پیکٹ بازار میں عام ملتا ہے...... لے کر میرے دو ڈھائی گھنٹے برباد کر دیئے......ایک تو یہ اماں کے نخرے......گھر کی بنی سویاں...... ہونہہ......''

وہ سارا غصہ سینی پہ ہاتھ جھٹک جھٹک کر سویاں اتارتے نکال رہی تھی۔

''اے گل......سن تو......''

سونے پہ سہاگہ، ٹیپو کی آمد...... پہلے سے جلے بھنے مزاج پہ بےزاری کا مزید تڑکا۔

''کیا ہے؟'' وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

''سب کے سامنے طلعت جی...... طلعت جی...... آپ جناب کہتی ہے، اکیلے میں بدتمیزی کرتی ہے میرے ساتھ......''

اس کی بھی حسیات کبھی کبھار ہی کام کرتیں۔

''بتاؤں تمہیں کیا ہوتی ہے بدتمیزی؟''

گل نے پنجے دکھائے۔ اس کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کے وہ بوکھلا کے پرے ہٹا۔

''پیچھے کر......چھل پیری......ڈریکولن...... میں تو بھائی میاں کا پیغام لے کر آیا تھا...... دو کپ چائے بنا کے بھجوا دے ان کے کمرے میں...... وہاں سالا بیٹھا ہے ناں...... اس کے ساتھ پئیں گے۔''

''کون؟'' وہ ٹھٹکی۔

''سالا...... اور کون...... وہی تیرا ماموں کا لڑکا...... دیکھو ذرا...... سالا میرا اور یاری گانٹھ رہے ہیں بھائی میاں......''

وہ تو پیغام دے کر چلتا بنا اور گل کے ہاتھ پیر پسیجنے لگے...... دل ڈوبنے لگا۔

''گیا کیوں نہیں اب تک یاسر! کیا چاہتا ہے؟ اتنی تفصیل سے ساری بات سمجھا تو دی ہے اسے۔ ہاں...... ابھی بھی ناراض ہوتا تو ناراضی دکھانے کے لیے فوراً بیگ اٹھا کے چل پڑتا...... یہ کون سا طریقہ ہے ناراضی جتلانے کا کہ یہیں جم کے رہ گیا...... اللہ جانے کیا ہے اس کے دل میں؟''

وہ ان گنت وسوسوں کے جال بننے لگی۔

''ہوسکتا ہے صغیر بھائی صاحب نے بصد اصرار روک لیا ہو۔'' ایک خیال یہ بھی آیا...... مگر منفی سوچوں نے اسے بھی جھٹک دیا۔

''ایسا کون سا پیار اُمڈا جا رہا ہے یاسر کے دل میں ان کے لیے جو ان کی بات ٹال نہ سکا...... جانا چاہتا تو چاہے کوئی پیر پڑتا......تب بھی چلا جاتا......اور جہاں تک میں یاسر کو جانتی ہوں میرا ان لوگوں سے تعلق جاننے کے بعد تو ایک پل رکنے کا روادار نہ ہوتا۔ کیا وجہ ہے اس کے یہاں رکنے کی۔''

''ان ہی سوچوں میں گم اس نے چائے کے کپ ٹرے میں رکھے اور ٹیپو کو بلا کے دینے کے بجائے خود وہاں تک لے کر گئی۔ ہلکی سی دستک کے بعد اس نے نیم وا دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔

صغیر احمد بہت ہلکے پھلکے موڈ میں سگریٹ کے کش لیتے کوئی خالص کاروباری گفتگو کر رہے تھے جبکہ مکمل انہماک کا مظاہرہ کرتا یاسر اندر سے کتنا منتشر تھا۔ یہ گل ایک نظر میں بھانپ گئی تھی۔ دونوں کے درمیان اخبار کا درمیانی صفحہ...... جو اشتہارات اور ٹینڈر نوٹس وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے، کھلا پڑا تھا۔

''شیئر مارکیٹ میں کچھ نہیں رکھا...... الٹا اس کی وجہ سے لوگوں کو عارضہ قلب یا فشار

خون میں مبتلا ہوتے دیکھا ہے۔ جوان آدمی ہو۔ حوصلہ بھی ہوگا آگے بڑھنے کی لگن بھی۔ ا[پنا]
کاروبار کیوں نہیں کرتے؟ دھیان بٹا رہتا ہے، ترقی کا نشہ بھی حوصلے کو دگنا چوگنا کرتا رہتا
ہے۔"

پہلی بار گل نے انہیں کوئی اتنی مکمل اور طویل بات کرتے سنا تھا اور وہ بھی اتنے دوستانہ
انداز میں۔

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ...... لیکن اس سے پہلے کسی کاروبار کا تجربہ نہیں ہوا مجھے۔
بلکہ مجھے کیا، میرے باپ دادا نے کبھی کاروبار میں ہاتھ نہیں ڈالا۔" وہ شاید خود پہ ہنسا تھا۔

گل نے ٹرے دونوں کے سامنے رکھی اور پنجوں کے بل نیچے بیٹھ کہ چائے میں چینی
ڈالنے لگی۔

"تجربہ خودبخود چل کے نہیں آیا کرتا اسے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ ابھی تمہارے پاس عمر
ہے، آگے بڑھ کے حاصل کرلو۔"

"میرے پاس عمر ہے۔ سرمایہ ہے اور تجربہ آپ کے پاس آپ کیوں نہیں مجھے گائیڈ
کرتے؟"

گل کے لیے اس کا یہ مطالبہ بہت غیر متوقع تھا۔ وہ نظر اٹھا کے تعجب سے اسے دیکھنے
لگی۔ مگر وہ دانستہ اس سے بے اعتنائی برت رہا تھا اور مکمل طور پر صغیر احمد کی جانب متوجہ نظر
آنے کی اداکاری کررہا تھا۔

"ضرور۔ کیوں نہیں......"

جلتی بھنتی وہ چمچہ زور سے ٹرے میں پٹخ کر وہاں سے اٹھ گئی۔ یاسر نے اپنے تپتے دل
پہ چھن سے کچھ ٹھنڈے چھینٹے پڑتے محسوس کیے۔

"جانتا ہوں میرے یہاں رہنے سے تمہیں الجھن ہوگی لیکن مجھے اتنی بے چینی دینے
کے بعد یہ ذرا سی الجھن تمہارا حق بنتی ہے گل!"

اس نے خود اذیتی کی انتہا پہ جاتے ہوئے سوچا۔

"ہر تکلیف...... ہر دکھ۔ ہر آزمائش کو ایک ساتھ جھیلنے کے وعدے کیے تھے ہم نے۔
پورا کرو اب وہ وعدہ۔ میں یہاں سے نکل کر پل پل مرتا۔ یہ سوچ کر کہ میری گل کسی اور چھت
کے نیچے کسی اور کی بیوی بن کے رہ رہی ہے تو تم اس درد سے ناآشنا کیوں رہو؟ تم بھی میرے
ساتھ اتنی ہی تکلیف دہ سانسیں لو گل!" وہ سوچ گیا۔ "میرے سامنے کسی کی بیوی بن کر رہ[نا]
تمہارے لیے بھی کم تکلیف دہ نہ ہوگا۔"

☆======☆======☆

نہ جانے یاسر اور صغیر احمد کے کون سے سُر ملتے تھے جو عمر کے دس بارہ شاید اس سے
زیادہ فرق کے باوجود دونوں میں پہلی ملاقات میں ہی گاڑھی چھننے لگی۔

صغیر احمد نے اسے کاروبار شروع کرنے پہ آمادہ کرلیا اور اپنے ہاں روک بھی لیا۔ جو وہ
کچھ پس و پیش کے بعد مان گیا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر کاروبار شروع ہوتے ہی میں کوئی کرائے کا گھر دیکھنا چاہوں گا۔ فی
الحال مجھے آپ کی گائیڈنس کی ضرورت ہے۔ اس لیے یہ پیش کش مان لیتا ہوں۔"

"برخوردار! کرائے کا گھر نہیں ہوتا، مکان ہوتا ہے۔"

"گھر ہوسکتا ہے۔ کبھی کبھی فٹ پاتھ پہ بھی گھروں کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور کبھی عالی
شان محل اور حویلیاں مکان تک نہیں کہلاتے...... محض سرائے بن کے رہ جاتے ہیں جہاں لوگ
صرف سر چھپانے کے لیے یا کوئی طوفانی رات گزارنے کے لیے پناہ حاصل کرنے رکھتے
ہیں۔"

"بہت گہری گفتگو کرتے ہو۔"

"جب دکھ گہرے ملیں تو باتیں بھی گہری ہوجاتی ہیں۔"

ان دونوں کو اتنی دیر سے باتیں کرتا سن کر صرف گل ہی نہیں کلس رہی تھی...... اور بھی کوئی
تھا جسے یہ گٹھ جوڑ بری طرح کھٹک رہا تھا۔

اور وہ تھیں جنت بیگم۔

"ذرا دیکھ تو خورشید! کیسا گھٹنے سے گھٹنا بھڑا کے بیٹھا ہے لونڈا اپنے صغیر میاں سے۔"

"ہور کی۔ چلو رات بارش زیادہ تھی۔ رہ لیا، سولیا سویرے سویرے ناشتہ کر اور نکل۔ پر
ناں جی۔"

"کسی رذیل خاندان کے لگتے ہیں دونوں...... ورنہ بھلے لوگوں میں تو جہاں بہن بیٹی
بیاہی ہو وہاں کا پانی بھی نہیں پیتے۔ یہ موج کررہا ہے رات سے، کوئی آٹھواں پیالہ چائے کا
چڑھا رہا تھا۔"

"ہورے کون سے روپے پیسے کے خواب دکھا رہا ہے۔"

"رہنے دے خورشید! میرے صغیر احمد کی آنکھوں میں پیسے کی حرص نہیں ہے۔ وہ کیوں
آنے لگا اس کی لچھے دار باتوں میں۔"

"میں نے خود سنا ہے کسی کاروبار شاروبار کی بات ہورہی ہے۔"

"اوئی......میا! یہ کیسا کاروبار کرے گا۔ کسی گھسیارے کی اولاد لگتا ہے۔ ذرا چائے پینے کا طریقہ تو دیکھو۔ کیسے پیالہ منہ کے اندر گھسیڑ کے شڑوں شڑوں کر رہا ہے۔ ہائے صغیر! اس کی باتوں میں نہ آ جائیں جیسے میرا ٹیپو اس ڈائن کے چنگل میں آ گیا۔ ارے خورشید ایک اور خیال آیا ہے۔"

وہ چونک کر اچھلیں۔

"یہ دونوں گروہ کی صورت تو کام نہیں کرتے لوگوں کو لوٹنے کا؟ پہلے یہ کسی بھولے بھالے لڑکے کو پیچھے لگا کر اس کے گھر میں نقب لگا کے گھستی ہو۔ پیچھے پیچھے اسے بلا لاتی ہو مال سمیٹنے کے لیے۔ اللہ توبہ، بچانا ایسے لوگوں سے۔"

"یہاں ہے کیا جو کوئی سمیٹے گا۔" خورشید نے مکھی اڑائی۔

"ارے ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہم۔ کیا بات کرتی ہے۔"

"اوہو میرا مطلب ہے سب کچھ تو تمہارے سیانے جوائی نے بینکوں میں دبا رکھا ہے۔"

"پھر سے وہی بے پر کی ہوائی۔ کتنی بار کہا ہے۔ اس مردودنی بھابھی بیگم کو جو مرضی کہہ لیا کر مگر میرے داماد کی شان میں، خبردار جو کوئی گستاخی کی تو۔ وہ بہت صاف دل اور صاف نیت کے ہیں۔"

"اچھا بابا! معاف کر۔" خورشید نے منہ بنا کر کہا۔ "اور وہ دیکھ...... ہو رے کون سے کاغذ پہ دستخط بھی کروا رہا ہے۔ کہیں یہ گھر اپنے نام نہ کروا لے۔"

"پاگل ہوئی ہے۔ ایسا بھی اندھیر نہیں......مگر کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے ضرور......"

دونوں تخت پہ بیٹھی اپنے اپنے اندازے لگا رہی تھیں اور یاسر کو گھورنے کا شغل بھی جاری تھا۔

☆=====☆=====☆

"لگتا ہے اس سکوٹر کو ایک بار پھر ورکشاپ کی سیر کرانی ہوگی۔ تنگ کرنے لگا ہے۔"

صغیر احمد ساڑھے نو، دس بجے تک سٹور پہ چلے جاتے تھے۔ آج معمول کے خلاف ایک بجے کے قریب نکل رہے تھے اور سکوٹر تھا کہ سٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

"باہر گاڑی آپ کی ہی کھڑی ہے؟"

یاسر نے دریافت کیا تو وہ شرمندہ سی ہنسی ہنس دیئے۔

"ہاں مگر اصل میں مجھے کار چلانی نہیں آتی۔"

انہوں نے جھینپتے ہوئے اعتراف کیا۔

"ارے، کمال ہے۔ کبھی سیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"فرصت نہیں ملتی۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ چلیں میں سکھاتا ہوں۔ دو دن میں ٹرینڈ نہ کر دیا تو نام بدل دیجیے گا۔"

وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور خورشید نے جتاتی نظروں سے جنت بیگم کو دیکھتے ہوئے ٹھوکا دیا جو پہلے ہی کینہ توز نظروں سے ان دونوں کو گھورے جا رہی تھیں۔

"ہوں...... دیکھ رہی ہوں اور سمجھ بھی رہی ہوں۔" ان دونوں کے نکلنے کی دیر تھی کہ جنت بیگم نے واویلا مچا دیا۔

"غضب خدا کا......اندھیر ہے اندھیر گھسائے چلے جا رہے ہیں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو۔ چاہے وہ اچکا سب لوٹ کر چلتا بنے۔"

"کیا واہی تباہی بکے جا رہی ہو۔"

جہاں آرا نے ناگواری سے ٹوکا۔ اور دوپہر کے کھانے کی تیاری کرتی گل نے تو اپنے چہرے کے بگڑے زاویے چھپانے کے لیے باقاعدہ منہ پھیر لیا۔

"صحیح کہہ رہی ہوں۔ صغیر احمد مرد ہیں ان نزاکتوں کو نہیں جانتے۔ تم تو بڑی سیانی بنی پھرتی ہو۔ تم ہی کچھ ہوش سے کام لو بھابھی! نہ جان پہچان، نہ واقف کاری نہ رشتے داری۔ انجان مرد کو زبردستی کا مہمان بنا لیا ہے اور صغیر میاں کو دیکھو۔ اس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کے چلے بھی گئے۔ اللہ جانے اس کی کیا نیت ہو؟ کہیں موٹر سمیت کہیں اور نہ لے جائے۔"

"سٹھیا گئی ہو جنت!" جہاں آرا نے کوفت سے سر جھٹکا۔

"رشتے داری تو ہے۔ میرے یا صغیر میاں سے زیادہ تمہارے ساتھ ہے۔ آخر کو تمہاری اکلوتی بہو کے میکے کا اکلوتا رشتے دار ہے۔"

"ارے دور کے ساتھ سلام ایسی راہ چلتی بہو کے میکے والے کو۔" جنت نے ہاتھ جوڑ کے ماتھے سے لگائے۔

"تم سلام بھیجو یا لعنت، اب اس حقیقت سے انکار تو ممکن نہیں کہ گل ٹیپو کی بیوی ہے۔ تم تسلیم کرو نہ کرو مگر تعلق تو جڑ چکا ہے۔ اس سے بھی اور اس کے عزیزوں سے بھی۔"

جہاں آرا کو لطف آ رہا تھا جنت بیگم کو کلسانے میں۔ ورنہ ایسا کوئی خاص نرم گوشہ ان کے دل میں بھی نہیں تھا یاسر کے لیے۔ آخر رات بھر کی تو جان پہچان تھی۔

"ویسے بھی اتنی عمر کے بعد انسان میں دوسرے کو پرکھنے کا سلیقہ آ جانا چاہیے۔ صورت

سے، گفتگو سے، سبھاؤ سے، طور طریقوں سے۔ ہر لحاظ سے لڑکا اچھے کردار اور خاندان کا لگ
ہے۔"

"دفع دور۔" خورشید نے ہاتھ جھٹکا۔

اس ساری بک بک کو مشکل سے برداشت کرتی گل نے بہتر جانا کہ وہ یہاں سے اٹھ جائے۔ ورنہ قریب تھا کہ وہ ضبط کھو دیتی اور جنت بیگم یا خورشید میں سے کسی ایک کا سر توڑ دیتی۔

"سر نہ سہی...... یہ تو پھوڑ سکتی ہوں۔"

راہداری میں سے گزرتے اس کی نظر جنت بیگم کے کمرے کے کھلے دروازے سے اندر رکھے گھڑے پہ پڑی۔

"بڈھی ڈائن! کیسے منہ بھر بھر کے یاسر کو کوس رہی تھی۔ مر جائے اللہ کرے۔"

دل کی ساری کھولن۔ ساری بھڑاس، اس نے پیتل کا بھاری گلاس گھڑے پر مارتے ہوئے نکالی اور خود جلدی سے کمرے سے نکلی اور بھاگتی ہوئی راہداری کے دوسری سمت جاتے دروازے سے غائب ہو گئی۔ جانتی تھی اس چھناکے پہ سب لوگ اس جانب آنے والے ہیں۔

☆======☆======☆

پھر رات تک وہ یہی دعائیں مانگتی رہی کہ یاسر کا ارادہ بدل گیا ہو۔ صغیر احمد گھر لوٹیں تو اکیلے۔ اس اطلاع کے ساتھ کہ یاسر کو کوئی پرانا واقف کار مل گیا اور وہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

یا پھر...... یاسر کسی ضروری کام سے شہر سے باہر چلا گیا...... یا اتنا ہی کہ اس نے خود یہاں رہنے سے معذرت کر لی ہے۔ مگر ہر بار اس کا کالا چرمی بیگ منہ چڑاتا نظر آ جاتا۔

اور پھر یہ امید بھی دم توڑ گئی۔ رات آٹھ بجے کے قریب جب صغیر احمد کی واپسی ہوئی تو یاسر ہمراہ تھا۔

گل اس وقت صحن میں موجود دھلے ہوئے کپڑے اکٹھے کر رہی تھی۔ سارے دن کی مانگی دعائیں یوں رد ہو جانے پہ اس کا دل ڈوب سا گیا۔ ناراضی کے اظہار کے طور پہ اس نے رخ پھیر لیا لیکن یونہی اسے شک سا ہوا کہ یاسر نے اسے رخ بدلتے دیکھ کر مسکراہٹ چھپائی ہے۔

"کیا اسے مزہ آ رہا ہے مجھے ستا کے؟"

وہ نئے سرے سے سلگنے لگی۔

جیسا تیسا کھانا ہی بن سکتا تھا، اتنے بے چین دل کے ساتھ، سو ویسا ہی بنایا اور دسترخوان چننے لگی۔

"گل! دال کو بگھار لگانا بھول گئی تھی کیا؟"

جہاں آرا نے تعجب سے بدرنگ سی دال کو دیکھا۔

"اوہ...... شاید دھیان نہیں دیا۔"

وہ اپنی بے قراری کو کوستی جلدی سے ڈونگا اٹھا کے کچن کی جانب مڑی۔

یاسر اسے یکسر نظرانداز کیے چاول نکالنے میں مصروف تھا۔ اس نے دال کو بگھار لگانے کے بعد بطور خاص ڈونگا یاسر کے سامنے رکھا۔ شاید اسے اپنا روٹھا روٹھا چہرہ دکھانا مقصود تھا۔ بار بار یاسر اس پہ نظر ڈالنے سے باز نہ رہ سکا۔ اس کی روئی روئی سی آنکھیں دیکھ کے دل دکھا تھا۔ لیکن جو وہ چاہتی تھی، وہ کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ اس معاملے سے منہ...... موڑ کے مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔

اس نے یہی سوچا تھا کہ اگر گل اسے اپنا کزن بتا ہی چکی ہے تو وہ اس جھوٹ کو نبھائے گا اور اسی حیثیت میں یہاں رہ کر گل کو ایسے حالات پیدا کرنے میں مدد دے گا جس سے وہ ٹیپو جیسے نیم دیوانے سے طلاق لینے میں کامیاب ہو سکے اور اس سلسلے میں اس کے سامنے سب سے ضروری...... سب سے آسان اور سب سے جائز حل یہی تھا کہ وہ صغیر احمد اور جملہ گھر والوں کے دل میں اتنی جگہ بنا لے کہ اس کی درخواست پہ وہ اس بے جوڑ رشتے کو ختم کرنے کا فیصلہ خود ہی کر لیں...... اور اگر اس کے اس عمل سے گل کو تکلیف ہو رہی تھی تو وہ اپنی جگہ حق بجانب تھا۔ اسے اس تکلیف میں مبتلا دیکھتے رہنے پہ۔

☆======☆======☆

ان جانے گھر میں یوں دندناتے پھرتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے بہت خجالت کے عالم میں وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے راہداری سے گزر کے باورچی خانے کے دروازے تک آیا۔ اس کی توقع کے عین مطابق گل اسے سامنے ہی آتا دیکھتی نظر آ گئی۔ پہلے وہ اسے آواز دے کر مخاطب کرنے لگا پھر پتا نہیں کیا جی میں آئی کہ کھنکارے سے اپنی جانب متوجہ کیا۔

گل نے اس پہ ایک اجنبیت بھری نظر ڈالی اور تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ سر جھٹکا کے وہ آگے بڑھا اور ابھی پہلا قدم ہی کچن کے اندر دھرا تھا کہ گل کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پہ کھڑی جہاں آرا کو دیکھ کے وہیں کا وہیں رہ گیا۔

''کچھ چاہیے تھا بیٹے؟''
وہ نئے ڈنر سیٹ کی پلیٹیں کپڑے سے خشک کر کے الماری میں سجا رہی تھی۔
''جی...... پانی...... چاہیے تھا۔'' وہ بوکھلا کے رہ گیا۔
''کمال ہے۔ تمہارے کمرے میں کسی نے پانی ہی نہیں رکھوایا۔ گل! چھوڑو کام پہلے یاسر بھائی کے لیے پانی بلکہ شربت بناؤ۔''
''خالہ جان! رات کے اس وقت شربت کی بالکل بھی خواہش نہیں ہے۔ سادہ چاہیے۔''
''اس وقت میں خاص طور پر صغیر احمد کے لیے بادام والا دودھ کاڑھ کے رکھتی ہوں۔ وہ لے لو ایک گلاس۔ گل ذرا نکالنا تو......''
گل آٹا کپڑے سے ڈھانپ کر سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔
''خالہ جان! مجھے اتنے لاڈ اٹھوانے کی عادت نہیں آپ میری عادتیں نہ خراب کریں۔ پردیس میں کون بنا کے دے گا مجھے بادام والا دودھ۔''
اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو گل نے دزدیدہ نظروں سے اس پہ اپنی خفگی جتلائی۔ یاسر کو ان سنگین حالات میں بھی یہ سوچ کر ہنسی آ گئی کہ ناراض ہونا تو اسے چاہیے اور رہی ہے گل۔
''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ پردیس میں تمہارا دانہ پانی ختم ہو چکا ہو اور اب اس لاڈ کی تمہیں عادت ڈالنی پڑ جائے۔ مستقل۔''
یاسر صرف مسکرا کے رہ گیا۔ گل نے دودھ کا بھرا گلاس اس کے سامنے کیا اور غیر ارادی طور پہ یاسر کی انگلیاں گلاس لیتے ہوئے گل کی انگلیوں سے ذرا سی مس ہو گئیں۔
اس کے گرد بنا خفگی کا یہ قلعہ پل بھر میں زمین بوس ہو گیا۔
وہ پل میں پگھل کے رہ گئی۔ اور اس پہ ایک نظر ڈالنے کے بعد تیزی سے پلکیں جھپکا کر اپنے امڈتے ہوئے آنسو پیچھے دھکیلتی وہاں سے ہٹ گئی۔
لیکن یہ ایک نظر یاسر کو یقین دلا گئی کہ دھند اب چھٹ گئی ہے۔ وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگا۔

☆======☆======☆

''اس وقت کیا کرنے آئی ہو؟''
رات کے ڈھائی بجے ہلکی سی نامانوس دستک پہ دروازہ کھولتے ہوئے گل کو سامنے دیکھ

کر وہ حیران رہ گیا۔
''تم سے بات کرنی تھی۔ دن میں درجن بھر لوگوں کے سامنے تو کرنے سے رہی۔''
وہ اس کے کہے بغیر اندر چلی آئی۔
''گل! تمہیں اس طرح رات کو میرے کمرے میں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' اس کی پیشانی شکن آلودہ ہو چکی تھی۔
''کیوں؟''
''اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا سوچے گا میرے اور تمہارے متعلق۔''
''ظاہر ہے کہ برا اور غلط ہی سوچے گا۔''
وہ مزہ لینے والے انداز میں مسکرائی۔
''سو چند دو...... اچھا ہے۔ چوٹی سے پکڑ کے نکال باہر کریں...... یہ اور بھی اچھا ہوگا خود ہی جان چھوٹ جائے گی۔''
''تمہیں ٹیپو سے ہر حال میں طلاق لینی ہے۔ یہ طے ہے۔ مگر گل! یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اپنے ذاتی مفاد اور مقصد کے حصول کے لیے اتنے سادہ دل اور معصوم لوگوں کے جذبات سے کھیلیں۔ تھوڑی حکمت عملی سے کام لو۔ یہ اچھے لوگ ہیں بہت جلدی میں انہیں یہ احساس دلانے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ تمہارا اور ٹیپو کا رشتہ محض مجبوری کا بندھن ہے۔ وہ خود تمہیں اس سے آزادی دلائیں گے۔ بس کچھ دن......''
''بھاڑ میں جائیں سادہ اور معصوم لوگ۔'' وہ پھنکاری اور پھر پھپھک کے رو دی۔
''میرے دل پہ کیا گزر رہی ہے۔ اس کی پرواہ ہے تمہیں؟ ان کی بہت فکر ہے۔ اس سے پہلے میں بھی تیل اور تیل کی دھار دیکھتے ہوئے ان کی جوتیاں تک سیدھی کرنے پہ تیار تھی کہ یہاں سے نکل کے جاؤں گی کہاں لیکن اب تمہارے آنے کے بعد مجھ سے ایک منٹ بھی صبر نہیں ہو رہا۔ دل چاہتا ہے سارے گھر پہ لعنت بھیجوں اور تمہارا ہاتھ تھام کے ان لوگوں کا منہ چڑاتی ہوئی نکلوں یہاں سے۔''
''احسان فراموشی اور طوطا چشمی شاید اسی کو کہتے ہیں۔'' یاسر نے طنز کیا۔
''کہتے ہوں گے۔ مجھے نہیں ثابت کرنا خود کو مخلص، بے ریا اور فلاں ڈھمکاں مجھے صرف اپنی محبت کو سچا ثابت کرنا ہے۔''
''تو ٹھیک ہے پھر کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔''
''یاسر!'' اس نے احتجاج کرنا چاہا۔

"گل! محبت میں مطلق العنانی نہیں چلتی۔ ہماری زندگی سے متعلق ہر فیصلہ تم نے اکیلے کیا۔ دل دینے کا فیصلہ بھی تمہارا، میرا دل لینے کا فیصلہ بھی تمہارا۔ مجھے ملک سے باہر بھیجنے کا فیصلہ بھی تمہاری خواہش کے پیشِ نظر ہوا۔ ان حالات میں بھی تم اپنی ہی غلطیوں کے ہاتھوں دھنستی چلی گئی ہو۔ اب میں تمہاری اس خودسر محبت کا مزید ساتھ نہیں دے سکتا۔ یا تو تم میری بات مان لو یا پھر یہ مان لو کہ ہم اب ایک ساتھ نہیں......"

"نہیں۔" گل نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور پھر اس سے لپٹ کر رو دی۔

"ایسا مت کہو یاسر! میں مر جاؤں گی۔"

یاسر کو عجیب سے احساسات نے آن گھیرا۔

اتنے مہینوں کی جان لیوا جدائی کے بعد اس کا قرب۔ اس کا لمس لیکن پورے وجود پہ جیسے برف آن گری تھی۔ عجیب بددیانتی کا سا احساس من میں جاگ رہا تھا۔

"ہوش کرو گل!" وہ اسے خود سے الگ کرنے لگا۔

"ہوش کا کیا کام محبت میں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے مزید قریب ہوئی۔

یاسر نے ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کیا۔

"کیا کر رہی ہو گل! میں جانتا ہوں۔ یاد ہے مجھے کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو مگر محبت جتانے کے لیے نہ یہ وقت مناسب ہے نہ یہ جگہ۔"

"محبت مناسب، نامناسب کب دیکھتی ہے یاسر! بہت مشکل ہے اب خود پہ بند باندھنا۔"

"مشکل میں تو ہم پڑ جائیں گے گل! اگر اس وقت کوئی دوسرا آ گیا تو۔"

یاسر اسے بازو سے پکڑ کے باقاعدہ دروازے سے باہر دھکیلنے لگا۔

"کوئی دوسرا؟" گل نے نکلتے نکلتے استہزائیہ انداز میں کہا۔

"دوسرا کوئی آ کے تو دکھائے۔"

اس کے چہرے پہ ایک چیلنج تھا۔

☆======☆======☆

"کیا بنی رہتی ہے ہر وقت......"

خورشید نے حلیمہ کو لتاڑا جو تیل کی شیشی ہاتھ میں لیے اس سے مالش کروانے آئی تھی۔

"میں تو حلیمہ ہوں۔ کچھ بھی نہیں بنتی۔"

"جب دیکھو تیل سر میں انڈیلا ہوتا ہے۔ سارا منہ چپ چپا ہو رہا ہوتا ہے نہ میں پوچھتی ہوں اور کچھ لگانے کو جی نہیں چاہتا تیرا۔ کوئی سرخی پاؤڈر۔ کوئی لالی، کوئی بندہ ٹیکا۔ نرا تیل ہی تیل ہے تیرے پاس۔"

خورشید نے اسے ڈانٹا تو وہ منہ بسورتی واپس پلٹنے لگی۔ خورشید نے بازو سے کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"چل بیٹھ ادھر۔ بوتھا نہ سجا کتنی عقل سکھاتی ہوں میں لیکن تیرے پلے کچھ پڑتا ہی نہیں۔ بیاہتا زنانی ہے تُو اور عمر کون سا چالیس پینتالیس ہو گئی ہے۔ تیری عمر کی زنانیوں کی گودی میں کاکے ہوتے ہیں۔ وہ تو شادی نکی عمر (چھوٹی عمر) سے ہو گئی تھی۔ اس لیے دھی جوان ہو گئی ہے لیکن دھی جوان ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تُو بوڑھی ہو گئی ہے۔ جب تک مرد کا سایہ سلامت ہے سمجھو تب تک زنانی جوان ہے۔ آیا کچھ پلے کہ نہیں۔"

حلیمہ انکار میں سر ہلا کے رہ گئی۔

"ہائے ہائے......سیاپا!" خورشید نے ماتھے پہ زور سے ہاتھ مارا۔

"ذرا اپنے پہ توجہ دے...... یہ تیل چھوڑ کے بال شیمپو سے دھو کر کھلے چھوڑا کر۔"

"اماں جان کہتی ہیں کھلے بال رکھنے سے گھر میں سے برکت اٹھ جاتی ہے۔"

"تیری اماں جان خود کیوں نہیں اٹھ جاتی۔" خورشید نے منہ بگاڑا۔

"نہ میک اپ کرتی ہے نہ کوئی زیور۔ ادھر آ میں تجھے طریقے بتاؤں۔ کیسے مرد کے دل پہ راج کرتے ہیں۔"

"کون سے مرد کے دل پہ؟"

"کوڑھیے۔ اپنے مرد کے اور کس کے؟"

خورشید نے اس کے تیل سے لپے سر پہ دھپ لگائی۔

"کپڑے دیکھ کیسے پہنتی ہے جھلیوں والے۔"

حلیمہ مسکراتے ہوئے اپنی آستینیں ٹھیک کرنے لگی یوں جیسے خورشید نے اس کی خوش لباسی کی شان میں قصیدہ پڑھ دیا ہو۔

"کوئی ساڑھی پہنا کر، کتنی تو ساڑھیاں ہیں تیرے پاس۔"

"پہنتی تو ہوں...... پہنی تھی اس دن خالدہ کے بیاہ پہ۔"

"خالدہ کو تو طلاق ملے چار سال ہو گئے۔ اب کیا دوبارہ ساڑھی اس کے دوسرے ویاہ پہ پہنے گی۔ گل سن، یہ جو بندے ہوتے ہیں نا شادی بے شک گھریلو سیدھی سادی شریف لڑکی

سے کرتے ہیں۔ پر اندر ہی اندر ان کے دل میں کسی طوائف کے نخرے اٹھانے کی حسرت بھی رہتی ہے اسی لیے عقل مند بیویاں ان کے جی کی مانتے ہوئے خود ہی تھوڑی بہت طوائف بن جاتی ہیں۔''

''ہا......'' حلیمہ نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے شرم اور حیرت کا ملا جلا اظہار کیا۔

''صحیح کہہ رہی ہوں...... تھوڑا نخرہ...... تھوڑا فیشن...... تھوڑی چٹک مٹک...... یہ اگر گھر بیٹھی بیوی میں مل جائے تو بندہ باہر کیوں جھانکے۔ بس آج سے میری بات پہ عمل شروع کر دے۔''

اس کے بعد وہ تفصیل سے حلیمہ کو صغیر احمد کا دل جیتنے کے گُر بتانے لگی۔

☆======☆======☆

''اب تک ناراض ہو؟''

وہ کپڑوں کا ایک ڈھیر سامنے رکھے برآمدے میں استری کرنے بیٹھی تھی۔

''نہیں ہونا چاہیے۔ میری مانتے نہیں ہو۔ اپنی زبردستی منواتے ہو۔'' وہ پلک لگانے لگی۔

''جو کر رہا ہوں اپنی اور تمہاری بہتری کے لیے...... جو طریقہ تم بتا رہی ہو اس میں نری ذلالت ہے۔ کیا ہم زندگی کی شروعات بدنامی اور رسوائی کے بوجھ تلے دب کر کریں گے؟''

اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا گل کے پاس......

کیونکہ وہ ایسی باتوں کا مطلب ہی نہیں سمجھتی تھی۔

زندگی کا فلسفہ اس کی نظر میں کچھ اور تھا...... یاسر کی نظر میں کچھ اور......

وہ محبت اور دل کی خوشی کو ترجیح دیتی تھی جبکہ یاسر کے لیے عزت اور وقار سب سے اہم تھا۔

''میری شرٹ بھی پریس کر دو......''

اس کے اتنی اپنائیت سے کہنے پہ ایک بار پھر گل کی خود ساختہ ناراضی بھاپ بن کے اُڑ گئی۔ وہ نثار ہوتی نظروں سے اسے دیکھتی اس سے شرٹ لینے لگی۔

''تمہاری تو سب سے پہلے...... ویسے جا کہاں رہے ہو؟''

''ایک دو دکانیں دکھانی تھیں صغیر بھائی نے...... وہی دیکھنے جا رہا ہوں۔''

''دکان کھولو گے؟''

''ہاں...... اسپیئر پارٹس کی...... میرا تو ارادہ تھا یہ نیا کاروبار کرائے کی دکان میں شروع

...ؤں...... اور بجائے دکان خریدنے میں رقم خرچ کرنے کے، کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع
...وں۔''

''ہاں...... صحیح تو ہے...... پھر کیوں جا رہے ہو؟''

''صغیر بھائی کا کہنا ہے کہ نیا کاروبار جمنے میں وقت لگے گا ایسے میں ہر ماہ کرائے کی رقم ...شروع شروع میں خاصا مشکل ثابت ہوگا اور اپنی دکان ہونے کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ...فرض کاروبار میں ناکامی ہو بھی گئی تو جائیداد تو اپنی ہے۔ وہی دکانیں کرائے پہ چڑھ جائیں ...ل اور پھر ہر مہینے معقول کرایہ مل جائے گا۔''

''بات تو یہ بھی ٹھیک ہے بلکہ زیادہ ٹھیک۔''

وہ بڑی محبت...... بڑی عقیدت سے شرٹ کی ایک ایک سلوٹ ہاتھ سے دور کرتی اس ...ر استری پھیر رہی تھی۔

''اسی لیے تو ہر بات میں ان سے مشورہ کر رہا ہوں۔ ان کا تجربہ ان معاملات میں زیادہ ہے اور آدمی بھی پُر خلوص ہیں ورنہ آج کل کے زمانے میں کون کسی کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ ...بر اان کا رشتہ ہی کیا ہے جو میرے لیے اپنا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔''

''ہائے......'' اس نے درد سے دھری ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ بغل میں دبایا۔

یاسر کو بولتے سننا کافی نہیں تھا اس کے لیے، ایک ٹک اسے دیکھتی بھی جا رہی تھی اور اسی انہاک اور بے خودی کے عالم میں اس نے گرم استری سے اپنی انگلیاں جلا لی تھیں۔

''دکھاؤ تو سہی...... زیادہ جلا ہے......؟''

لیکن اس سے پہلے کہ وہ گل کا ہاتھ تھام کر چیک کرتا...... وہاں سے گزرتے ٹیپو کے کان میں بھنک پڑ گئی۔

''جل گیا......؟ کیا جل گیا......؟ گل تُو جلی ہے؟''

وہ تیزی سے بھاگا آیا۔ گل کا ہاتھ کھینچا اور الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ لال سرخ ہوتی انگلیاں دیکھ کے وہ جیسے پاگل ہی ہو گیا۔

''گل کا ہاتھ جل گیا...... ذلیلو...... کمینو! اپنے کپڑے خود استری کیا کرو۔ جلا دیا ناں میری بیوی کو......''

چلا چلا کے کہتا...... وہ آنسو بہا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ہذیانی انداز میں اس کے ہاتھ میں پھونکیں مار رہا تھا۔ یاسر دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا اور گل...... وہ گھبراہٹ کے عالم میں اپنا ہاتھ ٹیپو کی گرفت سے کھینچنے کی کوشش بھی کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ یاسر کو بھی دیکھ رہی تھی جس کے

چہرے کا رنگ دم بدم بدلتا جا رہا تھا۔

پھر وہ جھٹکے سے مڑا اور جاتے جاتے اپنی شرٹ کھینچ کر تیز تیز قدموں سے منظر سے غائب ہوگیا۔

"آرام آیا؟"

ٹیپو نے ہتھیلی سے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اس نے پوری طاقت سے اپنا ہاتھ کھینچا۔

"لیکن تیرا ہاتھ......"

"اسی الٹے ہاتھ کی ایک پڑے گی۔"

وہ دبک کے وہیں چپ کا چپ رہ گیا۔

☆======☆======☆

صغیر احمد نماز کی جالی والی سفید ٹوپی اتارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تو حلیمہ کو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھا دیکھ کر چونک گئے۔ ان کے چونکنے کی واحد وجہ اس کا ڈریسنگ کے سامنے بیٹھنا نہیں تھا۔ حالانکہ یہ بھی ایک وجہ ضرور تھی...... حلیمہ کو آئینہ دیکھنے کا نہ تو شوق تھا نہ ضرورت۔

چونکنے کی دوسری اور سب سے بڑی وجہ حلیمہ کا حلیہ تھا۔ اس نے تیز نارنجی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اگرچہ اسے پہننے اوڑھنے کا خاص سلیقہ نہیں تھا اس کے باوجود جہیز میں اور بری میں اور اس کے بعد بھی جنت بیگم اور جہاں آرا اس کے لیے بیش قیمت لباس تیار کرواتی رہی تھیں۔ اور زری و پوت کی یہ ساڑھی بھی ضرور خاصی قیمتی رہی ہوگی لیکن بے ڈھنگے سے حلیمہ کے ڈھیلے ڈھالے جسم پہ لپٹی عجیب سی لگ رہی تھی۔ اسی اناڑی پن سے اس نے میک اَپ تھوپ رکھا تھا۔ گہرے سبز رنگ کا آئی شیڈ شاید انگلی کی پور سے پپوٹوں پہ ملا گیا تھا۔ آدھے چہرے پہ پھیلا بلش آن...... میرون لپ اسٹک ہونٹوں کے ساتھ ساتھ دانتوں پہ بھی لگی تھی۔ بھاری گلوبند، ہاتھوں میں چوڑیاں، بالوں میں گلاب کا پھول اٹکایا ہوا۔

وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے جھمکے پہن رہی تھی۔ اتنی محویت کے ساتھ کہ اسے صغیر احمد کے آنے کی خبر بھی نہ ہوسکی۔

"حلیمہ......!" اس کے پکارنے پہ وہ پلٹی۔

"آپ آ گئے...... اوہو...... ابھی تو اتنا تیار ہونا تھا...... چلو...... کوئی بات نہیں ہاں

کل......"

ساڑھی کی فال درست کرتی وہ اٹھی تو صغیر احمد کو لگا ابھی اگلے قدم پہ الجھتے ہوئے زمین بوس ہوجائے گی۔

"رات کے اس وقت کہاں جا رہی ہو تم......؟ کوئی شادی ہے؟" وہ جانتے تھے کہ ایسا کوئی پروگرام نہیں...... نہ ہی برآمدے میں بیٹھی جہاں آرا نے اس قسم کا کوئی ذکر کیا تھا اس کے باوجود پوچھ بیٹھے مگر وہ کوئی جواب دیئے بغیر اٹھی اور مسکراتے ہوئے ان کے پاس آنے لگی۔ صغیر احمد کی حیرت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ جب اس نے بالکل نزدیک آنے کے بعد شرماتے ہوئے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو تم؟"

"اوہو...... ہاتھ ہٹائیں نہ میرے...... ہٹائیں بھی......"

بند ہاتھوں کی اوٹ سے وہ جھنجلاتے ہوئے منمنائی۔

"کیا حرکت ہے یہ......؟ خود ہٹاؤ۔"

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے ناگواری سے سر جھٹک کر بیڈ کی جانب بڑھ گئے۔ حلیمہ نے مایوس ہوتے ہوئے خود کو ہی ہاتھ ہٹائے اور آہستہ سے بولی۔

"نہیں ہٹائے...... اچھا...... یہ تو دیکھیں۔"

بیڈ پہ بیٹھ کر موزے اتارتے صغیر احمد کے چہرے کے سامنے اپنی کلائیاں کر کے اس نے کانچ کی چوڑیاں چھنکائیں۔

"دیکھیں...... کیسے چھن چھن کر رہی ہیں؟"

"ہاں...... اچھی ہیں۔"

بادل نخواستہ انہوں نے اچٹتی سی نظر ڈالی اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹنے لگے۔ حلیمہ اتنی سی تعریف سن کے ہی خوش ہوگئی اور ان کی نظروں کے سامنے چوڑیاں مزید زور سے چھنکانے لگی۔ ساتھ ساتھ ہلکی ہلکی گنگناہٹ......

"چھن چھن...... میری چوڑیاں چھن چھن......"

"کیا کر رہی ہو حلیمہ......!"

انہوں نے گھبرا کے اس کی چوڑیوں بھری کلائی تھام لی۔

"باہر تک آواز جا رہی ہوگی...... سب کیا سوچیں گے۔"

مگر وہ اس سوال کا جواب دینے کے بجائے پنجوں کے بل زمین پہ بیٹھ گئی اور اس کی گود

میں سر رکھ دیا۔

''حلیمہ......!'' وہ ششدر رہ گئے۔ لیکن ابھی پے در پے حیرت کے مزید حملے ہونا تھے۔

وہ اچانک اٹھی، ساڑھی کا پلو چٹکی میں بھرا......اور لہراتے ہوئے بل کھانے لگی۔

''چاندنی راتیں......ہو ہو......چاندنی راتیں......''

''حلیمہ......!'' اب کے وہ گرج کر بولے......لیکن اس کے کان شاید بند تھے وہ بدستور لہراتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔

''سب جگ سوئے......ہم......''

اور اس کے ساتھ ہی اس کا پیر ساڑھی میں اٹکا اور وہ پوری کی پوری صغیر احمد کی گود میں آن گری۔ انہوں نے کوفت سے اسے پرے کیا۔

''یہ تم کر کیا رہی ہو؟''

''آپ کو خوش کر رہی ہوں۔''

''لاحول ولا......'' وہ منہ بناتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

''اسی لیے کہتا ہوں فلمیں کم دیکھا کرو۔ اس عمر میں چلی ہیں بابرہ شریف بننے......کس نے بھرا ہے یہ خناس تمہارے دماغ میں۔''

''آپ خوش نہیں ہوئے؟''

ان کے ڈپٹنے پہ وہ سہم کے دبک گئی۔

''اماں تو کہتی تھیں آپ خوش ہوں گے۔''

وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا تو حلیمہ کو رونا آ گیا۔

''کیا مصیبت ہے۔ اتنے بھاری جھمکے بھی پہنے۔ اتنی گرمی میں یہ موٹا بلاؤز بھی۔ ساری کمر چھل کے رہ گئی۔ اور پاؤں میں بھی موچ آ گئی۔ پھر بھی آپ خوش نہیں ہوئے۔ سب ٹھیک کہتے ہیں مجھے کچھ بھی نہیں آتا۔''

''بند کرو یہ رونا دھونا......''

صغیر احمد کو سر میں شدید ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوئیں اور وہ روئے چلی جا رہی تھی۔ آخر انہوں نے بے چارگی سے اسے دیکھا۔

''حلیمہ! خدا کا واسطہ ہے۔ اٹھو......کپڑے بدلو اور منہ ہاتھ دھو کر آؤ......میں کہتا ہوں اٹھو......''

وہ آنسو پونچھتی......ساڑھی سے الجھ الجھ کر چلتی واش روم میں جا گھسی......اور صغیر احمد نے ایک سرد آہ بھری۔

''مجھے خوش کرنے کا خیال دل سے نکال دو حلیمہ......! یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔''

☆======☆======☆

رہ رہ کے اسے وہ منظر یاد آ رہا تھا جب اس کا ہاتھ ٹیپو کے ہاتھ میں تھا اور وہ بے بسی سے دیکھتے رہنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہوئی۔

''کیوں پڑ گیا ہوں میں اتنا کمزور......کیوں......؟ کیا محبت انسان کو اتنا بے بس کر دیتی ہے۔ یہ کیسی محبت ہے جس نے میرے ہاتھ پیر باندھ کے رکھ دیئے ہیں؟ یہ کیسی محبت ہے جو مجھے بے غیرتوں کی طرح سب کچھ برداشت کیے جانے پہ مجبور کر رہی ہے؟''

وہ الجھتا جا رہا تھا۔

تب ہی دروازے پہ ہلکی دستک نے اسے چونکایا۔ وہ دروازے کی جانب دیکھنے لگا مگر چند سیکنڈ تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب دوبارہ دستک نہ ہوئی تو اسے لگا اسے وہم ہوا تھا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے لیٹنے ہی لگا تھا کہ وہی نامحسوس سی دستک پھر سے ہوئی جیسے کسی نے دروازے کے پٹ کو انگلیوں سے ہولے سے بجایا ہو۔

اس نے دروازہ کھولا تو سامنے زرمین تھی۔ ہلکے آسمانی جوڑے میں ملبوس......ہلکے گلابی سوتی دوپٹے کے ہالے میں نظریں جھکائے......ہاتھ میں ٹرے جس میں پانی کا بھرا جگ اور شیشے کا گلاس تھا۔

''وہ......یہ......پانی......دادی اماں نے بھجوایا تھا۔''

''شکریہ......!'' اس سے ٹرے لیتے ہوئے اس نے خشک لہجے میں کہا۔ اندر اتنی کھولن تھی کہ کسی سے سیدھے منہ بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

''اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔''

جبکہ زرمین کا دل چاہ رہا تھا کسی بھی طرح بس وہ اس سے بات کرتا جائے۔

''نہیں......ضرورت تو نہیں......لیکن......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''جی......کہیے۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''نہیں......کچھ نہیں۔'' وہ ٹرے بیڈ کے سائیڈ پہ رکھی تپائی پہ رکھنے لگا۔

''پلیز آپ کو جو چاہیے بے تکلف بتائیے۔''

ادھر وہ مصر تھی۔ آخر وہ متذبذب سے انداز میں بتانے لگا۔

''چاہیے تو کچھ نہیں لیکن...... کیا میں...... میرا مطلب ہے کہ صرف آج کی رات میں
آنگن میں......'' کہتے کہتے وہ رک گیا۔

''آپ صحن میں سونا چاہتے ہیں......؟''

اس کے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی نرمین نے بھانپ لیا۔

''کھلے آسمان کے نیچے......؟''

''ہاں...... بند کمرے میں مجھے گھٹن ہوتی ہے۔''

''موسم بدل رہا ہے۔''

''نہیں...... گرمی ہے...... بہت شدید گرمی۔''

اپنا سینا مسلتے ہوئے وہ بہت بے چین، بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔

''میں دادی اماں سے کہہ دیتی ہوں۔ وہ باہر انتظام......''

''اس کی ضرورت نہیں...... انتظام کیا کرنا ہے...... میں کرلوں گا خود ہی کچھ نہ کچھ......
صرف آپ کی دادی اماں کی اجازت درکار تھی۔''

''آپ اس گھر کو اپنا سمجھئے۔''

اس کے جانے کے بعد بھی دیر تک یاسر کے کانوں میں یہی الفاظ گونجتے رہے۔

''آپ اس گھر کو اپنا سمجھئے۔''

''اپنا سمجھنا تو بہت دور کی بات ہے۔ میں اسے گھر ہی سمجھ لوں تو عجیب بات ہوگی۔ یہ
میرے لیے گھر نہیں یہ ایک تجربہ گاہ ہے۔ ایک اذیت کدہ ہے۔ ایک عجائب خانہ ہے۔ جہاں
میں اپنی زندگی کے سب سے عجیب...... سب سے کٹھن دور سے گزر رہا ہوں۔''

وہ کھلے آسمان کے نیچے...... اوس میں بھیگتے ہوئے ساری رات سگریٹ پھونکتا رہا۔
گل بار بار کھڑکی کھولتی...... اس کی بے چینی اور رت جگا اسے بھی ایک پل چین نہ لینے
دے رہا تھا۔

اِدھر یہ پگھل رہی تھی۔

اُدھر وہ جل رہا تھا۔

یہاں کچی اینٹوں کے صحن میں راکھ گر گر کے جمع ہو رہی تھی۔

وہاں اندھیرے گھٹن زدہ کمرے میں دھواں پھیل پھیل کے فضا کو بوجھل کرتا تھا۔

☆=====☆=====☆

''اماں......!''

حلیمہ کی مریل سی آواز پہ پاندان صاف کرتی جنت بیگم نے اسے دیکھا اور طنزیہ ہنکارا
بھرتے ہوئے کہا۔

''آ گئی میا کی یاد...... مل گئی فرصت ساس کی خدمت کرنے سے......''

''اماں......! نمو کے کرتے کاٹ دو...... میں سلائی کروں گی۔'' وہ سست انداز میں
اماں کے سامنے بیٹھی اور ہاتھ میں گٹھری کی صورت اٹھائی ساڑھیاں وہاں ڈھیر کر دیں۔

''ان ساڑھیوں کے......؟ مگر خورشید تو کہہ رہی تھی تم یہ خود پہنو گی۔''

''میں نے کب کہا تھا۔'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''وہی کہہ رہی ہیں...... پہنو...... پہنو...... اچھی لگو گی۔ صغیر میاں دیکھیں گے تو خوش
ہوں گے۔''

''تو کیا غلط کہہ رہی تھی۔ نگوڑی نے پہلی بار تو کوئی ڈھنگ کی بات کی تھی۔''

''ہونہہ......!'' حلیمہ نے گردن ایک جانب پھیری جنت بیگم نے ذرا غور سے اس کی
اتری اتری صورت اور بے زار رنگ ڈھنگ ملاحظہ کیے۔

''پہن کے تو دیکھتیں۔'' وہ ٹٹولنے لگیں۔

''پہنی تھی...... یہ نارنجی والی۔''

حلیمہ نے نارنجی ساڑھی کا گولہ سا بنا کے پرے پھینکا۔

''پھر......؟''

''وہ بہت غصہ ہوئے۔'' حلیمہ کی آواز بھرا گئی۔

''اے لو...... وہ کیوں بھلا......؟''

''پتہ نہیں۔'' اس سوال کا جواب تو وہ خود ڈھونڈ رہی تھی۔

''شاید...... ہاں شاید غصہ آ گیا ہو کہ نمو کے کرتے کیوں نہیں بنائے۔ ان کو نمو سے......
بہت پیار ہے ناں اس کے ابا کو۔''

''ایسا ہی کوئی اونگا بونگا ارشاد کیا ہوگا میاں کے سامنے۔'' وہ ماتھے پہ ہاتھ مار کے رہ
گئیں۔ ''جب بے چارے کو غصہ آ گیا۔''

''ہاں...... ہیں تو بے چارے...... خوش ہی نہیں ہوتے۔''

وہ فوراً متفق ہو گئی۔

''تو خوش رکھا کر...... سر تاج ہے۔''

''ہیں اماں......!'' وہ پُر اسرار طریقے سے مسکرائی۔

''انہوں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں یعنی ان کو خوش کرنے کی
کوشش کرنے کی۔''

''اچھا.....؟ ایسا کہا؟''

''ہاں..... وہ کہہ رہے تھے میں انہیں خوش کر ہی نہیں سکتی۔'' جنت دکھ کے ساتھ
دوپٹہ انگلی پہ مروڑ مروڑ کے شرماتے ہوئے دیکھتی رہیں..... پھر دوپٹہ آنکھوں پہ رکھ کے رو
دیں۔

''اماں! اماں! کیا ہوا؟''

''میری ہیرا سی بچی..... اس کی قدر نہ کی صغیر میاں نے..... ہائے بیرسٹر صاحب!
کہاں ناقدروں میں رول گئے، آپ اپنی بٹیا کو۔''

''کیوں رو رہی ہیں اماں.....!'' وہ جنت بیگم کو سسکتے دیکھ کر پریشان ہو اٹھی۔

''اچھا پہن لوں گی ساڑھی..... نہیں بناتی نمو کے کُرتے..... بس اب رونا نہیں۔''

وہ جنت بیگم کے آنسو ہتھیلیوں سے صاف کرتے ہوئے بہلانے لگی۔

''اچھا اماں.....! ایک ساڑھی کا کُرتا تو بنا دو؟ بے چاری نمو خوش ہو جائے گی..... اور
بے چارے اس کے ابا بھی..... اور اماں جب وہ خوش ہوں گے تب میں پوچھوں گی کہ اب
میں نے خوش کیا کہ نہیں۔''

وہ داد طلب نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی۔ جنت بیگم نے اس کا ماتھا چوم لیا۔

☆======☆======☆

''نمو..... او نمو..... کہاں.....!''

چھنو حسبِ عادت گلا پھاڑتی..... رسی تڑائی گائے کی طرح سیدھی اندر گھسی آئی مگر
کیاری کے پاس کھڑے یاسر کو دیکھ کر وہیں جم گئی۔

''یہ تو..... اس دن والا..... وہی ہے..... پکا پکا وہی ہے۔'' اس کی بڑبڑاہٹ پہ یاسر
نے جو پہلے اسے اندر گھستے دیکھ کر رخ موڑ کے گلاب کی تازہ کلیوں کا جائزہ لینے لگا تھا..... پھر
سے اس کی جانب متوجہ ہوا..... اس بار وہ بھی اسے پہچان گیا، یہ وہی تھی..... زمین کی وہی
دوست..... جو کہیں سے بھی اس کی دوست نظر نہ آتی تھی..... اور جان بوجھ کے اسے بیچ
ٹریفک میں چھوڑ کے چلی گئی تھی۔

یاسر کے چہرے پہ کچھ ناگوار سے تاثرات ابھر آئے۔ وہ دوبارہ پودوں کی جانب متوجہ
ہو چکا تھا..... چھنو کی جان جل کے رہ گئی۔ بے اعتنائی کے اس مظاہرے پہ۔

''آ گئی تُو سویرے سویرے..... حلوہ پوری کی خوشبو آ گئی ہو گی.....'' خورشید نے کھلم کھلا
طنز کیا۔

''نمو کہاں ہے نانی؟''

''اندر..... پوریاں تل رہی ہے..... اور سن!''

اسے لپک کے باورچی خانے کی جانب جاتا دیکھ کر خورشید نے تنبیہہ کرنا ضروری
سمجھا۔

''خبردار جو تُو نے ابھی ایک پوری کو بھی ہاتھ لگایا تو..... بڑا بے برکتا ہاتھ ہے تیرا.....
جس چیز پہ پڑ جائے وہ ختم ہو جاتی ہے۔''

''اوہو نانی..... بڑے چھوٹے دل کی ہو ایمان سے۔''

وہ تلملا کے کہتی وہاں سے رفو چکر ہوئی..... یاسر کے سامنے اس عزت افزائی پہ کٹ
کے رہ گئی تھی۔

''اے نمو.....! اس دن بتایا کیوں نہیں کہ یہ ہیرو تیرا رشتے دار ہے۔''

وہ اسے چٹکیاں لے لے کر پوچھ رہی تھی۔

''کون..... کس کی بات کر رہی ہو؟''

''چل اب بن مت..... وہی جو باہر کھڑا ہے..... جو اس دن بازوؤں میں بھر کے
تجھے.....''

''ہشت..... چپ.....'' زمین نے گھبرا کے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

''زبان ہے کہ ماچس..... نری آگ نکالنی آتی ہے تجھے۔ ابھی کوئی سن لیتا تو۔''

''بتا تو..... یہ آیا کہاں سے؟''

''ملک سے باہر تھا..... کچھ دن پہلے آیا ہے۔''

''کیا لگتا ہے رشتے میں؟''

''ماموں کا بیٹا!'' نمو نے شرارتی مسکراہٹ چھپائی۔

''ہیں؟ ماموں کا بیٹا؟'' وہ ہونق نظر آنے لگی۔

''تیرا تو ایک ہی ماموں ہے..... ہے وہ ٹیپو باؤلا..... اتنا بڑا اس کا بیٹا کیسے ہو سکتا
ہے..... یہ تو اس سے بھی دو چار سال.....''

زمین ضبط نہ کر سکی اور کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

''میرے نہیں..... مامی کے ماموں کا بیٹا..... انہی کا رشتے دار ہے۔''

''اچھا......تو یہاں کیسے؟''

''ملنے آئے ہیں۔''

''اوہو......آئے ہیں۔'' چھنو نے اَبرو نچائے۔

''مگر کس سے؟ اپنی کزن سے یا تجھ سے؟''

''چل......بدتمیز۔'' وہ سرخ پڑ گئی۔

☆======☆======☆

''یاسر......!'' وہ آج بھی صحن میں چارپائی پہ سیدھا لیٹا سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا جب اسے اپنے عقب میں گل کی سرگوشی سنائی دی۔

''اس وقت......خدا کا واسطہ ہے گل......جاؤ تم۔''

اس نے بند کھڑکیوں کی جانب نظر ڈالی......جو ساری کی ساری صحن میں کھلتی تھیں۔

''یہی تمہیں کہنے آئی ہوں......جاؤ تم......خدا کے لیے۔''

''کیوں؟ کیوں نکالنا چاہتی ہو تم مجھے یہاں سے؟ تاکہ میں تمہارے اس شوہر......؟''

''تمہیں میری قسم ہے یاسر! اسے میرا شوہر مت کہا کرو......دل پھٹنے لگتا ہے میرا۔''

''اور میں......میرا جی چاہتا ہے زمین پھٹ جائے......سمجھی......؟''

''تم مجھے یہاں سے لے جا نہیں سکتے تو جاؤ......کہیں اور جا کے میرا انتظار کرو......میرا یقین کرو......میں آجاؤں گی تمہارے پاس۔''

''یقین......؟ تم پہ یقین کرنے کے لیے ہی تو میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''

''مجھ پہ یقین کرنے کے لیے؟''

کچھ دیر تو گل سمجھ ہی نہ سکی اس کی بات کا مطلب......اور جب سمجھ میں آیا تو زمین کے اندر دھنستی چلی گئی۔

''تمہیں اب تک میری بات کا اعتبار نہیں؟ میری زبان کافی نہیں، خود یقین دلانا چاہتے ہو اپنے آپ کو؟''

مگر اس کے ان سوالوں کا جواب دینا یاسر نے مناسب نہیں سمجھا اور اسی طرح کالے آسمان پہ کہیں کہیں ٹمٹماتے ستاروں کو دیکھ کے دھواں پھونکتا رہا۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب'' اپنے شکستہ دل کی کرچیاں سمیٹتی ان ہی......شکستہ قدموں پہ واپس لوٹ گئی۔

☆======☆======☆

''اللہ جانے کہاں گئی دلہن؟ ٹیپو کہہ رہا ہے اماں کی ٹانگیں دبانے گئی ہے لیکن میں اماں

کمرے سے ہی تو آرہی ہوں۔ وہاں نہیں تو پھر کہاں گئی۔''

حلیمہ اپنے آپ سے الجھتی، بڑبڑاتی برآمدے سے نکلتی آنگن کی جانب آرہی تھی...... کے ہاتھ میں مٹی کی پیالی تھی دودھ سے آدھی بھری۔ اچانک کھٹکے کی آواز پہ وہ مسکرائی۔

''آگئی میری مانو بلی......اسے دودھ کی خوشبو......ارے......گل تو۔'' سامنے سے آتی گل بھی اسے دیکھ کر سٹپٹا کے رہ گئی۔

''تم......تم تو اماں کے۔''

''وہ میں......وہ کچن سے کھانا لینا تھا......ٹیپو کے لیے۔''

''مگر اس نے تو دب کے کھایا تھا......ساری دال، سارے چاول، قیمے کے ساتھ ...رہ چپاتی اور سویوں کا زردہ بھی۔''

''دوبارہ بھوک لگی ہے اسے۔''

گل نے غصہ دبا کے کہا......اسے ڈر تھا، اس بک بک کی آواز سن کر کوئی دوسرا بھی نہ آ ...ئے......دوسرا کوئی ایسا جو حلیمہ سے زیادہ خطرناک سوال کرنے والا ہو۔

''اچھا......اچھا دوبارہ۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے آگے قدم بڑھائے سو گل کی جان ...جان آئی لیکن سکون کا سانس ابھی حلق میں اٹکا ہی تھا کہ حلیمہ نے دوبارہ آواز دی۔

''لیکن گل! کھانا لینے تم آنگن میں کیوں آئی ہو؟ باورچی خانے میں جاؤ۔''

''وہیں جا رہی ہوں......آپ جائیں نا دودھ لے کر آپ کی مانو واپس چلی جائے گی۔'' اس نے کہہ کر جان چھڑائی۔

''ارے ہاں۔'' وہ فوراً برآمدے کی سیڑھی اتری مگر آنگن میں چارپائی پہ سایہ سا دیکھ کے ٹھٹک کے رک گئی......کوئی پیٹھ موڑے بیٹھا تھا اور دھواں فضا میں اٹھتا کتنا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔

''اماں......بھوت۔''

سسکی اس کے لبوں سے نکلی اور مٹی کا پیالہ چھوٹ کر کچی اینٹوں کے فرش پہ۔

یاسر نے پلٹ کے دیکھا اور مارے گھبراہٹ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆======☆======☆

جہاں آرا بیگم کسی کُرتے کی تُرپائی میں مصروف تھیں اور حلیمہ ان ہی کے کمرے میں موجود جھاڑ پونچھ کا کام کر رہی تھی۔ ایک گلدان کو ہاتھوں میں لیے جھاڑن کو آہستگی سے اس پہ پھیرتے وہ نہ جانے کس گہری سوچ میں تھی......نیم وا لبوں کے گوشوں پہ رال جمع ہو رہی تھی۔

جہاں آرا کی نظر پڑی تو انہوں نے کراہیت سے ناک سکوڑی۔

''او بقراطن!''

حلیمہ بری طرح چونکی...... گلدان چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

''ہمیشہ کام کے وقت ہی مراقبے میں جاتی ہو۔ جب تک کوئی چیز نہ ٹوٹے، منہ ذائقہ نہیں آتا تمہارے...... ارے ہاں رات کو کیا ٹوٹا تھا؟ آنکھ لگی ہی تھی کہ چھناکے کی آ پہ کھل گئی...... سوچا تمہارے علاوہ کون ہوگا جو اتنی رات کو اس قدر اہتمام کرے مجھے جگا کے لیے۔''

کہتے کہتے وہ حلیمہ کی مسکراہٹ دیکھ کے اور زچ ہو اٹھیں۔

''ارے میں کیا قصیدے پڑھ رہی ہوں تمہاری شان میں، ٹوٹا کیا تھا؟''

''مانو کا پیالہ......''

''بس ساری عمر ننھی بنی رہنا...... گھر بھر سو رہا ہے اور یہ بی بی بلیوں کی پیٹ پوجا کر رہی ہیں۔''

''نہیں...... سارا گھر تو نہیں سو رہا تھا۔''

حلیمہ کچھ سوچ کر بولی۔ اسی اثناء میں گل ہاتھ میں تیل کی شیشی اور لکڑی کا کنگھا لیے اندر داخل ہوئی۔

''میں جاگ رہی تھی۔ ٹیپو جاگ رہا تھا گل جاگ رہی تھی اور یاسر میاں جاگ رہے تھے۔''

گل گھبرا سی گئی جبکہ جہاں آرا حلیمہ کی بات پر توجہ دیئے بغیر اسے دیکھ کے نہال سی ہو گئیں۔

''جیتی رہو...... سر بھاری سا ہو رہا تھا۔''

''ہاں...... یاسر'' وہ اپنی بات میں کھوئی حلیمہ ہلکا سا چلائی۔ جیسے کوئی نکتہ سمجھ میں آیا ہو۔

''ایسی مالش کروں گی آپ کی کہ سارا بھاری پن غائب ہو جائے گا۔'' گل نے تیز تیز کہتے ہوئے ان کی چٹیا کھولتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... اماں یاد آیا...... مانو کا پیالہ میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا وہ تو یاسر میاں اچانک سامنے۔''

''اماں جان...... آپ خاموشی سے آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیں۔ پھر دیکھیں میرے ہاتھوں کا کمال۔''

وہ ہر صورت ان کی توجہ حلیمہ سے ہٹانا چاہتی تھی۔

''میرے نصیب میں کہاں خاموشی اور سکون اب سنو اس کی چپڑ چپڑ۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں اماں...... اندھیرے میں انہیں دیکھ کے میرا دل دھک سے رہ گیا اور پیالہ چھوٹ گیا۔''

''تمہارے کلیجے کی دھک تو چوبیسوں گھنٹے چلتی رہتی ہے اور ہاتھوں سے چیزیں بھی چھوٹ چھوٹ کر گرتی رہتی ہیں لیکن یہ یاسر میاں اتنی رات کو وہاں کیا کر رہے تھے۔''

''مجھے کیا پتا گل سے پوچھیں۔''

گل کی گھبراہٹ دوچند ہوگئی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے جہاں آرا کے بالوں میں چلنے لگے۔

''گل؟'' جہاں آرا چونک کر رہیں...... بالآخر۔

''مجھے...... مجھے کیا پتہ ہوگا کوئی کام شاید نیند نہ آ رہی ہو یا کھلے آنگن میں سونے کے عادی ہوں، مجھے کیا پتہ میں تو رات کو جلدی سو جاتی ہوں۔''

''لیکن کل تو جاگ رہی تھیں۔ یاد نہیں جب ٹیپو کے لیے دوبارہ کھانا لینے گئی تھیں۔''

''پتا نہیں آپ کب کی بات کر رہی ہیں...... میں تو۔''

''لو...... میں کیا جھوٹ کہہ رہی ہوں۔ تم صحن سے آ رہی تھی یاسر وہیں بیٹھے سگریٹ پھونک رہے تھے اور میں۔''

جہاں آرا کچھ الجھن بھری نظروں سے گل کی جھنجلاہٹ اور گھبراہٹ دیکھ رہی تھیں، جب ٹیپو سر کھجاتا اندر آیا۔

''ناشتہ ملے گا؟''

''کیوں رے ٹیپو! کہاں تو دو دو دن کچھ کھاتا نہیں...... کہاں رات کو دوسری بار گل کو کھانا لینے بھیجا۔''

''کھانا......'' دوسری بار وہ ہونق سا ہو کر ایک ایک کے چہرے کو تکنے لگا۔

گل نے نظروں ہی نظروں میں اسے سخت قسم کی تنبیہہ کی۔

''دیکھو ٹیپو! کتنی جھوٹی ہے تمہاری دلہن، کہتی ہے میں رات کو جلدی سو گئی تھی، جب میں تمہارے کمرے میں آئی تھی تو یہ اندر تھی کوئی؟''

ٹیپو نے گل کی نظروں کا پیغام پڑھا اور گڑبڑا کے بولا۔

"تو......تو اور کہاں تھی......وہیں تو سوئی پڑی تھی۔"

گل کے ہونٹوں پہ ایک اطمینان بھری مسکراہٹ آئی اور تیل لگاتے اس کے ہاتھوں کی اضطراری کیفیت میں بھی ٹھہراؤ آ گیا۔

"جواب نہیں تمہارا حلیمہ......اب دن کو بھی خواب دیکھنے لگیں۔" جہاں آرا نے اب کافی دیر تک حلیمہ کے لتے لینے تھے۔

☆======☆======☆

"تمہاری سہیلی نہیں آئی؟"

ساجد نے چھنو کی کلائی سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کوئی کام تھا اس سے؟"

اس نے ناراضی کے اظہار کے طور پر فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ بوکھلا کے رہ گیا۔

"ارے...... مجھے کیا کام ہوگا اس سے، بھلا ویسے بھی عشق میں انسان کسی کام جوگا رہتا بھی کب ہے۔"

"انسان......تم انسان ہو؟" وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑی......اردگرد کے بہت سے لوگ مڑ کے دیکھنے لگے۔ اسے بجائے شرمندگی ہونے کے فخر کا احساس ہوا......لوگوں کو متوجہ کرنا اس کے نزدیک ایک فن تھا۔ چاہے انداز کوئی بھی ہو۔

(تم خود تو انسان کیا جانور کہلانے کے لائق بھی نہیں، ہڈیاں تک چبا کے ڈھیر لگا دیا ہے میز پہ۔)

دل ہی دل میں اسے آئینہ دکھانے کے بعد وہ اندازِ دلربائی دکھاتی مسکرائی۔

"نہیں......انسان نہیں میں تو پروانہ ہوں اپنی اس شمع کا۔"

"ہائے سچی۔"

"دیکھنے میں تو کتے لگتے ہو، وہ بھی خارش زدہ۔"

"ہائے تمہاری یہ ادائیں۔" اس نے دل پہ ہاتھ رکھا جو مسلسل اس کے بارے میں [illegible] اگل رہا تھا۔

(چھچھوری کیا فلمی پوز مار رہی ہے سالی)

"چل......جھوٹے۔" اس نے اس کے دل پہ رکھے ہاتھ پہ ہلکی سی چپت لگائی۔

(کیا راجیش کھنہ والے ایکشن مار رہا ہے کمینہ)

"اب میں چلتی ہوں......امی دروازے پہ کھڑی راستہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"ٹھہرو نا کچھ دیر......" (اونہہ تمہارے جیسوں کی امیاں یہ راہ دیکھ رہی ہوتی ہیں کہ پھوپی آج کیا بٹور کے لاتی ہے۔)

"بہت دیر ہوگئی ساجد۔"

(اور زیادہ رک کر تو نے کون سا تاج محل بنوا دینا ہے بخیل کہیں کے......ایک ذرا سا کھانا کھلا دینے کے بعد ہی جیب جواب دے گئی بھوکے ننگے کی۔)

"چلو......جیسی تمہاری مرضی سرکار۔" (جان بخشو)

وہ ساجد کے ساتھ ہوٹل سے نکل رہی تھی، جب سگنل پہ رکے یاسر کی نظر اس پہ پڑی کچھ جانی پہچانی سی شکل دیکھ کے وہ چونکا......تھوڑا سا غور کیا تو یاد آ گیا...... یہ نرمین کی سہیلی تھی۔ اس معصوم سی سادہ سی لڑکی نرمین کی سہیلی جس نرمین کے گھر کا وہ آج کل مہمان تھا۔

☆======☆======☆

"اے......شش، شش۔"

وہ چھت پہ کھڑا ٹیپو کے پالے کبوتر دیکھ رہا تھا، جب برابر کی چھت سے اسے متوجہ کرنے کے لیے آوازیں نکالی گئیں۔

مڑ کے دیکھا......چھنو آدھی لٹکی اسے اشارے کر رہی تھی...... یاسر کے منہ کا ذائقہ کڑوا ہوگیا۔

"دانے ڈال رہے ہو؟"

وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"وہ تو تم ڈال رہی ہو......میں تو پرواز کی داد دے رہا ہوں۔ مجھے اُڑان اچھی لگتی ہے۔"

"ہائے......پنکھ ہوتے تو اُڑ آتی۔"

وہ بھونڈے طریقے سے گنگنائی تو یاسر کا جی اور مکدر ہوگیا۔ وہ سر جھٹک کے سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔

"شرماتے بالکل لڑکیوں کی طرح ہو۔"

چھنو نے اس کی پشت پہ جملہ کسا۔

"اور تم وہ جسے دیکھ کے لڑکیوں کو لڑکی ہونے پہ ہی شرم آ جائے۔"

یاسر کا کوئی حق نہ بنتا تھا، اس انجانی لڑکی کو اتنی سخت بات کہنے کا......لیکن وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ چھنو دیر تک سلگتی رہی۔

☆======☆======☆

"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو یاسر؟"
وہ دیوانی بنی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔
"تم جو مرضی کرتی پھرو...... میرے سوچنے پہ بھی پابندی ہے۔"
"میں نے جو بھی کیا...... تمہارے لیے کیا تم سمجھ تو گئے تھے، میری بات کو...... پھر اب نئے سرے سے۔"
"سمجھا نہیں تھا تم نے زبردستی سمجھانا اور منوانا چاہا تھا نہیں گل! اتنا آسان نہیں ہے یہ۔"
وہ منہ موڑ کے کھڑا ہو گیا۔
"آسان تو کچھ بھی نہیں ہے یاسر!"
گل نے طیش میں آ کے اس کا بازو کھینچ کر اپنی جانب کیا۔
"بے غیرت لوگوں کی بیٹی بن کے جینا...... اتنا عرصہ محبت کے نام پہ خود کو بچائے رکھنے کی کوشش کرنا...... ایک پاگل سے شادی کرنا...... گھر چھوڑ کے میلوں دور کہیں منہ چھپا کے...... شناخت کھو کر بیٹھنا...... آسان تو کچھ بھی نہیں یاسر...... کچھ بھی نہیں۔"
وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی...... اور ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یاسر اس کے آنسوؤں کے آگے ہار گیا۔
"تم نے خود کو اتنی مشکل میں ڈالا کیوں گل؟"
"تمہارے لیے، کتنی بار بتاؤں۔"
"میں جانتا ہوں......" وہ انگلیوں کی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگا۔
"مگر...... مگر میں کیا کروں؟ جب تمہیں اس شخص کے ساتھ دیکھتا ہوں تو...... وہ پاگل نہیں ہے گل! ذرا بے وقوف سہی مگر مرد ہے اور جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ کوئی نشہ وغیرہ بھی کرتا ہے اور نشے کی حالت میں تو انسان۔"
"نشے کی حالت میں ہی تو وہ میرے قابو آتا ہے۔ کیونکہ نشہ وہ کرتا نہیں ہے، میں کراتی ہوں۔"
یاسر بے یقینی سے اسے تکتا رہ گیا۔
مگر گل کے چہرے پہ مذاق کی رمق تک نہ تھی...... وہ داد لینے کے انداز میں اسے دیکھتی کہہ رہی تھی۔
"رانی کے کہنے پہ میں نے بالیاں بیچ کر ذرا سی افیون لی تھی...... پھر یہاں تو پیسے مل ہی

...بھی کسی کے کہیں رکھے، کبھی کسی اور کے کہیں اور رکھے...... ہفتے دس دن میں لے ...تے ہیں۔
...تی ہوں۔"
یاسر کی نگاہوں میں تاسف بھر گیا۔
پھر ان میں ملامت بھرنے لگی۔
وہ ایک جھٹکے کے ساتھ مڑا اور وہاں سے نکل گیا۔
"یاسر۔" وہ ہکا بکا رہ گئی۔
بار بار ریشم کے دھاگے کی طرح سرا ہاتھ سے کھو دیتی تھی۔

☆======☆======☆

"نشہ تو میں خود کراتی ہوں اسے۔"
یاسر کی نظریں آنگن میں کیاریوں کے پاس بیٹھے، کنچے کھیلتے ٹیپو پہ مرکوز تھیں، جبکہ کانوں میں گل کی باتیں گونج رہی تھیں۔
آج پہلی بار ٹیپو کو دیکھتے ہوئے اس کے دل میں حسد، رقابت اور نفرت کی بجائے، جذبہ ترحم پیدا ہوا۔
"میرے لیے صرف میری خاطر گل اس بے ضرر اور معصوم انسان کی صحت اور زندگی سے کھیل رہی ہے۔ قسمت نے اسے پہلے ہی ہاتھ تنگ کر کے دیا ہے، جو ہے وہ بھی گل لینے کے درپے ہے...... کیا صرف میرے لیے یا پھر اپنے دل کی خوشی کے لیے۔"
اس کی نگاہوں کے حصار میں کنچے کھیلتا ٹیپو تھا...... مگر وہ نرمین کے پس منظر میں چلا گیا۔
نرمین جو تار پہ بستر کی دھلی چادریں پھیلا رہی تھی۔
ایک الوہی معصومیت...... کچا پن...... انجانی سی بے خبری۔ یہ وہ رنگ تھے، جو اس کے کمسن چہرے پہ چھائے ہوئے تھے اور گل کے دلکش نقوش والے چہرے پہ ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے تھے۔
یاسر نے اپنی نظروں کی بے اختیاری سے خائف ہو کر اپنا رخ ہی پھیر لیا۔
پھر کچھ خیال آنے پہ دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔
"بات سنیے......"
نرمین نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اتنے دنوں میں پہلا موقع تھا، جو وہ اسے خود مخاطب کر رہا تھا۔
"جی!" وہ کچھ جھجک سی گئی۔ حالانکہ اس کا اندازِ تخاطب اور نظریں دونوں بے حد

شائستہ تھیں۔

یاسر نے اسے دوپٹہ درست کرتے اور غیر ارادی طور پر دو قدم مزید پیچھے ہٹتے دیکھا تو محظوظ انداز میں مسکرا دیا۔

"آپ دیگر معاملات میں اتنی احتیاط کا مظاہرہ کرتی ہیں تو پھر دوستوں کے معاملے میں کیوں نہیں؟"

"جی..... کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں۔"

"میرا مطلب آپ کی اس دوست سے ہے۔"

یاسر نے برابر والے گھر کی جانب اشارہ کیا۔

"وہ..... چھنو..... وہ تو میری۔" وہ اس سے اپنی سالوں پرانی دوستی کا اعتراف کرتے ہوئے ہچکچا اٹھی۔

"وہ آپ کی دوستی کے قابل نہیں ہے۔"

وہ فقط اتنا کہہ کر مڑنے والا تھا کہ کچھ سوچ کر رکا اور وضاحت پیش کی۔

"میرا مقصد اور کچھ نہیں صرف اتنا ہے کہ آپ اس معصومیت کو کھو نہ دیں۔ یہ چیز بار بار نہیں ملتی۔"

☆======☆======☆

"سچی..... اتنا مزہ آیا کہ میں بتا نہیں سکی۔"

چھنو اس سے تقریباً لٹکی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔ نرمین نے کوفت سے اپنے کاندھے سے اس کا وزن جھٹکا اور ناگواری سے کہا۔

"تو نہ بتاؤ..... یہاں کون مرا جا رہا ہے سننے کے لیے۔"

"بڑی ذلیل ہو تم..... بچپن کی سہیلی ہو اور اتنا نہیں کہ میرے دل کا حال ہی سن لو۔"

"تمہارے دل کو چین ہے بھی یاد نہیں..... میں کون سا حال سنوں؟ ہر دوسرے دن تو حال بدلا ہوتا ہے تمہارے دل کا۔"

نرمین نے پیاز کاٹتے ہوئے مذاق اڑاتے لہجے میں کہا۔

"کل تک قاسم دل کو بھا رہا تھا، آج ساجد کے گن گائے جا رہے ہیں۔"

"میرا دل ہر اسٹیشن پکڑتا ہے۔ تمہاری طرح اس کی سوئی ایک ہی چینل پہ نہیں اٹک جاتی۔" اس نے آنکھ دبائی۔

"یہ تو دم پہ لگ گئے..... سلاد بھن بن گیا، میں ذرا دادی جان سے پوچھ کے آتی ہوں

کھانا اب تک لگانا ہے۔ تم ایسا کرو، وہ اوپر والے خانے سے بڑی والی ڈش نکالنا ذرا۔"

"وہاں سے..... میرا ہاتھ نہیں پہنچتا۔"

"تو نہ سہی۔" نرمین لاتعلقی سے کہتی کچن سے نکلی اور تب چھنو نے پہلی بار محسوس کیا کہ وہ اسے کچھ کھنچی کھنچی سی ہے۔ محض اسے خوش کرنے کے لیے چھنو جیسی کام چور اور ہڈ حرام نے سٹول کھینچا اور اس پہ چڑھ گئی۔

"کہاں ہے۔ کون سی ڈش..... مصیبت۔"

ناکام ہو کے اترنے ہی والی تھی کہ کچن کے باہر سے گزرتے یاسر پہ نظر گئی جو کچھ شاپنگ بیگز اٹھائے جا رہا تھا۔

چھنو کی آنکھیں چمکیں..... اور وہ ذرا سا ڈگمگانے کے انداز میں لہرا کے پکاری۔

"ارے..... میں گری پکڑو..... ارے۔"

یاسر نے اندر جھانکا اور اطمینان سے اسے نیچے گرتے دیکھتا رہا۔ دھڑام سے زمین بوس ہونے کے بعد وہ کراہ کے اسے غصے سے گھورنے لگی۔

"زیادہ تو نہیں لگی؟" یاسر نے سرسری سا پوچھا۔

"اب پوچھنے کا فائدہ؟ دو قدم آگے ہو کر مجھے بچا نہیں سکتے تھے۔"

"بچا سکتا تھا..... مگر فائدہ؟"

چھنو غصے سے کھڑی ہو گئی اور کمر سہلانے لگی۔

"الٹا نقصان ہی ہوتا..... وہ بھی میرا اگر تم میرے اوپر گرتیں دوسری بات یہ کہ میرے ہاتھ فارغ نہیں تھے اور......"

کچھ توقف کے بعد وہ دل جلانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ہوتے بھی تو شاید نہ بچاتا۔"

چھنو تلملا کے رہ گئی۔

"کیونکہ میں آسان کیچ چھوڑ دیا کرتا ہوں۔"

اس کی باتیں ایک کے بعد ایک کر کے چھنو کے اندر آگ بھڑکاتی جا رہی تھیں۔

"بائی داوے..... جھولی میں خود بخود گر جانے والا پھل، عام طور پر گلا سڑا ہوتا ہے۔ اتنا زیادہ کہ شاخیں خود اسے گرا دیتی ہیں سمجھیں؟"

چھنو پیر پٹختی وہاں سے نکلی۔ نکلتے نکلتے اس کا ٹکراؤ گل سے ہوا، گل نے بڑی گہری نظروں سے اس کا لال بھبھوکا ہوتا چہرہ جانچا۔

"کیا کہہ رہی تھی؟"

"اس قسم کی چیزیں کہتی کچھ نہیں صرف کرتی ہیں۔"

"کیا؟"

"بکواس۔"

"چیر کے رکھ دوں گی حرام۔"

"اوں...... گالی نہیں۔" یاسر نے ناگواری سے گھورا۔

"میری زبان خراب ہے مگر تمہاری نیت خراب ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں...... اتنا بڑا اٹیسٹ بھی نہیں ہے میرا۔"

"ہاں...... تمہاری نظر تو ہمیشہ اوپر...... بہت اوپر ہوتی ہے...... یہی کہتے ہو ناتم۔"

"راستہ دو...... جانے دو مجھے۔"

"کھڑے رہو نا میرے سامنے، دیکھنے دو کچھ دیر اور۔"

اس نے ترسے لہجے میں کہا۔

"کوئی آ جائے گا۔"

"آنے دو...... مجھے ڈر نہیں ہے کسی کا۔"

"اپنے شوہر کا بھی نہیں، جس کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر بیٹھی تھیں۔"

اور یہاں آ کے گل کا سارا طنطنہ ہوا ہو جاتا تھا...... یہی وہ کمزور رگ تھی، جو یاسر اس بری طرح اور بے دردی سے دباتا تھا کہ وہ اُف تک نہ کر پاتی تھی۔

"وہ...... وہ نظر کا دھوکا تھا۔"

یاسر نے نظر اٹھا کے دیکھا اس کے سامنے گل کا چہرہ تھا...... پیچھے سے نرمین آتی نظر آ رہی تھی، جو کچن کے دروازے میں ان دونوں کو ایستادہ دیکھ کے چند قدم پیچھے وہیں رک گئی تھی۔

یاسر نے اپنے چہرے کے بالکل سامنے نظر آتے گل کے واضح اور روشن چہرے کو دیکھا۔ جس کے پس منظر میں نرمین کا دوپٹے سے لپٹا چہرہ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

"پتہ نہیں...... ان نظروں نے اور کتنے دھوکے دینے ہیں۔"

اس نے پلکیں جھپکتے ہوئے کہا۔

پلکوں سے اوس چھٹتے ہی اب گل کا چہرہ دھندلا رہا تھا اور پس منظر میں نرمین کے نقوش واضح ہو کر ابھر رہے تھے۔

گل نے اس کی نظروں کے تعاقب میں گردن گھمائی۔ پیچھے نرمین تھی...... گل نے حیران ہو کر دوبارہ سامنے دیکھا۔

یاسر اب نظریں چرا رہا تھا۔

"کیا بات ہے نمو؟" گل کے لہجے میں خشکی اتر آئی۔

"وہ...... دادی اماں کہہ رہی تھیں کہ کھانا لگا دوں۔"

"میں ہوں ناں...... لگا دیتی ہوں۔"

گل کا لہجہ کچھ نرم ہوا...... مگر نظروں کی درشتی کو وہ قابو میں نہ کر پائی۔

"تم جاؤ شاباش...... جا کے سو جاؤ، صبح کالج جانے کے لیے جلدی اٹھنا ہے، اچھے بچے رات کو دیر تک نہیں جاگتے۔"

"جی ممانی۔" وہ حیران سی واپس پلٹ گئی۔

گل دوبارہ یاسر کی جانب متوجہ ہوئی۔

"اب مجھے بھی اجازت ہے؟"

"تمہیں تو ساری اجازتیں ہیں۔"

وہ نچھاور ہو جانے والے انداز......

"اندر جانے کی۔" یاسر نے ایک گہری سانس بھری۔

"دل کے اندر تک تو اتر چکے ہو۔ بڑی گہرائی میں اترے ہوئے ہو اور کتنا اندر جاؤ گے؟"

"اپنے کمرے میں...... پلیز گل۔"

وہ اکتایا ہوا سا نظر آیا۔

گل ایک جانب ہٹ گئی۔

"جاؤ۔"

"مہربانی۔" وہ آگے بڑھا۔

"سنو......" وہ رکا۔

"نظروں کا تو کام ہی دھوکا دینا ہے...... مگر تم ان نظروں کے بہکاوے میں مت آنا۔" اس کے لہجے میں ایک کھلی وارننگ تھی۔

☆======☆======☆

خورشید اور جنت بیگم دونوں دبے پاؤں اندر داخل ہو رہی تھیں۔ جنت بیگم نے برقع
اوڑھ رکھا تھا، جبکہ خورشید نے بڑے بڑے نارنجی پھولوں والی سبز قمیص اور نارنجی شلوار پہنی
رکھی تھی۔ فٹنگ والی قمیص...... چنا ہوا دوپٹہ کس کے چٹیا...... موٹے ہونٹوں پر گھسا گھسا کے
لگائی لپ سٹک اس کے ہاتھ میں ایک شاپر بھی تھا۔

"اری خورشید...... اندر چلنے کی کریو ادھر کاہے ٹھہر گئی ہے۔ ابھی وہ آ گئی ناں......
بھابھی جہاں آرا کو تو الن...... تو ستر سوالوں کا جواب دینا پڑے گا۔"

"اکو جواب کافی ہے میرا...... بڑی آئی ستر سوال کرنے والی۔"

دونوں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔

"پھر بھی...... بتائے گی کیا کہ کہاں سے آ رہی ہے؟"

"کہہ دوں گی...... حکیم کے پاس گئی تھی...... تُو اتنا ڈرتی کیوں ہے آپا...... مرد بن
مرد۔"

"اے ہئے ہوش کر...... یہ کاہے کو بننے لگی مرد...... تُو بن سکتی ہے...... موچنے سے نکالتی
ہے پھر بھی چوتھے دن...... مسیں پھوٹ پڑتی ہیں تیری۔"

پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی دونوں اپنے کمرے میں آ گئیں۔ خورشید نے آتے ہی
شاپر کھول کر سموسہ نکالا۔

"تُو پھر چرنے بیٹھ گئی۔ پیٹ بھرا نہیں تیرا؟"

"نرے نرگس کے ٹھمکے دیکھنے سے تو پیٹ نہیں بھرتا۔ ویسے آپاں...... شان بچتا بڑا ہے
کالی مونچھوں میں۔"

"رہنے دے...... مجھے نہ بھاویں یہ ذرا ذرا سے...... لونڈے...... اے ہیرو تو ہوتے

تھے اپنے زمانے کے...... اچکن شیروانی میں...... سفید کھڑے پاجامے میں...... جما کے بال
بنائے...... سلیقے سے بولتے، دھیمے سے چلتے تمیز طریقے والے واہ کیا شاندار لگا کرتا تھا وہ
سنتوش...... اور وہ درپن۔"

"رہنے دے آپاں...... اپنے انیس سو پچاس والے مامے چاچے ڈھیلے خمیر آٹے۔"

"بکواس نہ کر...... ارے پھر تو تجھے بیرسٹر صاحب بھی اچھے نہ لگتے ہوں گے۔ وہ بھی تو
جوانی میں ہو بہو سنتوش کی تصویر تھے۔"

"ہک ہا۔"

خورشید نے ایک آہ بھری۔

"میں نے کہاں دیکھی بیرسٹر صاحب کی جوانی، میرے حصے میں تو گنڈیری کا پھوک آیا
تھا۔"

"غارت ہو...... بے حیا۔"

☆======☆======☆

زمین اپنے کمرے میں فریم پہ سفید کاٹن چڑھائے اس پہ سفید ہی دھاگے سے مہین
کڑھائی کر رہی تھی...... ہونٹوں پہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ۔

"لو...... تم یہاں رضیہ بانو بنی سلائیاں کر رہی ہو، میں سارا دن کالج میں اکیلی بور ہوتی
رہی۔"

چھنو حسبِ عادت دندناتی ہوئی اندر گھسی۔

زمین نے ہاتھ روک کر اسے دیکھا...... اور پھر سے اپنا کام کرنے لگی...... اسی مگن انداز
میں روکھا سا جواب دیا۔

"کام تھا مجھے۔"

"مجھے تو بتا دیتیں......" وہ پاس بیٹھ گئی۔

"ہر بات بتانی ضروری ہے۔" اس کے چبھتے لہجے پہ چھنو نے کچھ حیرت سے اسے
دیکھا۔ پھر سر جھٹک کے کہنے لگی۔

"کیا سی رہی ہو؟"

"ہر بات پوچھنا ضروری ہے۔"

اس بار چھنو سے ضبط نہ ہو سکا۔

"دماغ خراب ہو چکا ہے تمہارا...... ہوا کیا ہے تمہیں؟"

لیکن اب نرمین نے کسی بھی قسم کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور پورے انہماک سے کام کرتی رہی۔

"بڑے دماغ ہیں تمہارے...... میں ہی پاگل تھی جو آ گئی۔"

وہ تڑپ کے اٹھی...... اوپر سے نرمین کا ٹھنڈا ٹھار جواب......

"تو نہ آتی...... کس نے بلایا ہے۔"

"میری آتی ہے جوتی۔"

وہ پیر پٹختی چلی گئی۔

نرمین نے سر اٹھا کے بھی نہ دیکھا اور بہت آہستگی سے فریم پہ ابھرے سفید کڑھے ہوئے پھول پہ انگلیاں پھیرتی ہوئی مسکرائی۔

یہ کُرتا یاسر کے لیے کاڑھنے کا حکم اسے دادی اماں سے ملا تھا...... اور وہ جی جان سے اس میں جت گئی...... ساری رات جاگ کر پھر کالج سے بھی چھٹی کی تھی اب کہیں جا کے کام ختم ہوا تھا وہ انگلیاں سہلاتی وہاں سے اٹھی۔

گل کچن میں بگھار لگا رہی تھی...... نرمین نے فریج سے آئس کیوب نکالی اور اپنی پوروں پہ ملنے لگی۔

"جلا ہے کیا؟" گل نے پوچھا۔

"نہیں...... بڑی باریک کڑھائی کی ہے...... انگلیاں چھلنی ہو گئیں۔"

"مجھے بھی دکھا نا قمیص کاڑھی ہے یا دوپٹہ؟"

"نہیں وہ تو دراصل وہ اماں، دادی اماں نے کہا تھا ان کے لیے، وہ آپ کے ماموں زاد بھائی ہیں نا ان کے لیے کُرتا تو میں۔"

نرمین کچھ تو گل کی نظروں سے خائف ہو رہی تھی...... کچھ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یاسر کے بارے میں کیسے بتائے نہ خالی نام لیا جا رہا تھا...... نہ بھائی کا اضافہ کرنے پہ دل مان رہا تھا۔

اس کی جھجک اور چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کے گل کی پیشانی شکنوں سے اٹ گئی۔

"اتنی محنت کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیتیں۔ اس کی ساری پسند ناپسند پتا ہے مجھے...... اور وہ کُرتا بھی نہیں پہنتا۔"

نرمین کا چہرہ اتر گیا...... اور مرے مرے لہجے میں بولی۔

"اچھا...... مگر۔"

"بے کار میں تھکیں تم...... انگلیاں زخمی کیں...... اتنی بھی تابعداری ٹھیک نہیں۔" گل کے چہرے پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اور لہجے میں پھنکار سی تھی۔

"یہ کیا...... کہ دادی اماں نے بات منہ سے نکالی اور تم نے رات بھر میں کُرتا تیار بھی کر دیا۔"

☆======☆======☆

"یہ...... یہ کُرتا اماں جان۔"

وہ متذبذب سا ہاتھ میں سفید کُرتا لیے جہاں آرا کے سامنے کھڑا تھا۔

"یہ شاید صغیر بھائی کا کُرتا ہے میرے کپڑوں میں ساتھ آ گیا۔"

"یہ صغیر میاں کا کُرتا نہیں۔" وہ مسکرائیں۔

"میرا بھی نہیں ہے...... میں نے بھی کبھی کُرتا نہیں پہنا۔"

"تو اب پہنو...... بھئی کہتے ہیں کھاؤ من بھاتا، پہنو جگ بھاتا اور ہمیں تو یہی پوشاک بھاتی ہے مردوں پہ...... یہ موئی پتلونیں تو ذرا رعب داب نہیں پیدا کرتی مردوں میں۔"

"آپ نے زحمت کیوں کی؟" اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"میں تو آپ کو اپنے کپڑے دھلوانے اور استری کرانے کی زحمت بھی نہیں دینا چاہتا...... کئی بار کہلوایا ہے کہ آپ اتنا تردد نہ کیا کریں...... میں لانڈری سے کروا لوں گا۔ ایک دو دن کا مہمان تو ہوں نہیں اب۔ صغیر بھائی کی محبت نے روک رکھا ہے...... نہ جانے کب تک۔"

"کیسا تردد...... کیسی زحمت...... میں کون سا خود دھوتی ہوں ماسی دھو جاتی ہے۔ رہا استری...... تو بھئی خوش رہو میاں...... ہمارا کوئی احسان تمہارے سر نہیں۔ تمہاری بہن گل کرتی ہے۔"

ان کے سادہ الفاظ یاسر کو بچھو بن کے ڈنک مار گئے۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ دم توڑ گئی۔

"بس یہ قلق ہے کہ تم کو کُرتا پسند نہیں آیا۔"

"نہیں، نہیں یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔"

"تم ہی تو کہہ رہے تھے کہ کبھی پہنا نہیں۔"

"جی...... واقعی کبھی پہنے نہیں کیونکہ کبھی کسی نے پہنائے ہی نہیں۔"

وہ مسکراتا ہوا ان کے قریب ہوا اور جھک گیا۔

جہاں آرا کا ہاتھ بے اختیار اس کے سر کی جانب بڑھ گیا......اور وہ خیال جو ایک آدھ روز سے انہیں بار بار اکسا رہا تھا......مزید پختہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

وہ نہا کر سفید شلوار کے ساتھ یہ کُرتا پہن کر کمرے سے نکلا......رخ صغیر احمد کے کمرے کی جانب تھا......آج اتوار کا دن تھا دونوں نے دکان کے سودے کے لیے نکلنا تھا......صحن میں گل تخت پہ بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ اسے دیکھ کے چونک اٹھی......اس کے بدن پہ وہی کُرتا تھا......جو نرمین کو بہت افسردگی سے اس نے تہہ کرتے دیکھا تھا، جب گل نے اسے یاسر کی اس قسم کے کپڑوں کے بارے میں ناپسندیدگی بتلائی تھی۔ گل سر سے پیر تک سلگ اٹھی۔ اس نے اندر کی کھولن نکالنے کے لیے سبزی زور زور سے کاٹنی شروع کر دی۔ غصہ ضبط کرنے کے لیے اس نے اپنے ہونٹ دانتوں میں دبا رکھے تھے۔ نظریں اس کے بڑھتے قدموں پہ تھیں۔ پتہ ہی نہ چلا کب چھری شلجم کے بجائے اس کی انگلی پہ پھر گئی۔

سسکی کی آواز پہ یاسر نے پلٹ کر دیکھا......وہ اپنی انگلی زور سے دبائے ہوئے تھی......خون کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

"یہ کیا کیا ہے؟"

وہ تشویش سے کہتا اس کی جانب بڑھا مگر اگلے ہی پل اس کا گریبان گل کے ہاتھ میں تھا......وہ جو جھک کر اسے دیکھ رہا تھا......لڑکھڑا گیا......دوسرے ہاتھ سے گل نے اس کے بے داغ دودھیا کرتے پہ خون مل دیا۔

"پاگل ہوئی ہو؟" اس نے غصے سے اپنا گریبان ایک جھٹکے سے چھڑایا۔

"یہ کیا حرکت ہے۔ سارے کپڑے خراب کر دیئے۔"

اس نے سیدھا ہوتے ہوئے پہلے دائیں بائیں محتاط نظروں سے دیکھتے ہوئے، کسی کے نہ ہونے کا اطمینان کیا اور پھر آواز دبا کے غرایا۔ وہ اس کے کپڑوں پہ خون کے داغ دیکھ کے مسکرا رہی تھی۔

"جاؤ......بدل کے آؤ اب۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا، اگر اچھا نہیں لگ رہا تو منہ سے کہہ دیتیں اپنا ہاتھ کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ اس کا زخمی ہاتھ پکڑ کے دیکھ رہا تھا......گھاؤ کافی گہرا تھا۔

"اور تمہیں کیا شوق ہوا ہے کُرتے پہننے کا۔"

"اچھا نہیں لگ رہا۔"

"زہر لگ رہے ہو......بہت چاؤ چڑھا تھا تو مجھ سے کہتے اس گھنی صورت نمو کے ہاتھ کے کُرتے پہننے کے لیے کیوں مرے جا رہے تھے۔"

"نمو؟" وہ چونکا۔ "میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ......پتہ نہیں تم کیا کیا سوچتی ہو......چلو اٹھو کچھ لگاؤ ہاتھ پہ۔ اتنا خون بہہ رہا ہے۔"

"ابھی تو تمہارا کُرتا خون خون کیا ہے......دوبارہ کچھ ایسا کیا نا تو خون سے نہلا دوں گی۔"

گل نے ہاتھ میں پکڑی چھری اس پہ تانی۔

"کس کے خون سے؟" وہ مزہ لینے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"اپنے بھی اور تمہارے بھی۔"

گل نے غصے سے لہو رنگ ہوتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کے، چھری اس کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے کہا، یاسر کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"پتا نہیں کون سی گجر مار کہ فلمیں دیکھتی رہتی ہو سارا دن۔" اس نے اس کا چھری والا ہاتھ مکمل گرفت میں لیا اور کلائی سے موڑ کے نیچے کر دیا۔ گل کی ایک اور سسکی نکل گئی۔

عین اسی وقت اپنے دھیان میں وہاں آتی حلیمہ ٹھٹک کے رکی......اس کے چہرے پہ ہراس پھیل گیا۔

وہ دونوں حلیمہ کی آمد سے بے خبر تھے۔

"سمجھ میں نہیں آتا......کس بلا سے دل لگا بیٹھا ہوں۔ خون پینے والی جونک ہو یا خون کو زہر بنا دینے والی ناگن۔"

یاسر نے ایک جھٹکا دے کر اسے چھوڑا اور وہ سیدھی تخت پہ آن گری......حلیمہ کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی۔ دونوں نے مڑ کے اسے دیکھا۔

"تیری جلد بازیاں مروائیں گی کسی دن۔"

اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ گل، حلیمہ کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ تخت پہ بیٹھ کر سبزی بنانے لگی۔

حلیمہ ٹکر ٹکر کبھی اسے......کبھی اس کی انگلی پہ جمے خون کو دیکھ رہی تھی۔

"خو......خون......خون۔"

☆======☆======☆

"اتنی رات کو چائے کیوں پیتے ہیں آپ؟"

صغیر احمد فون پر کسی سے بات کرنے کے بعد ریسیور رکھتے ہوئے سیدھا ہو کے بیٹھے حلیمہ کو سر پر موجود پایا۔

"کام ہے آج رات۔"

"کام تو میں بھی کرتی ہوں...... لیکن کام کرنے کے لیے چائے پینا کیوں ضروری ہے...... اس سے کام اچھا ہوتا ہے کیا؟"

"ایک کپ چائے بنوانے کی غلطی ہوگئی ہے۔ معاف کر دو۔" صغیر احمد نے بے بسی سے ہاتھ جوڑے۔

"نہیں...... میں تو۔"

"اب تم سو جاؤ...... مجھے کام کرنے دو۔"

"آپ آج کل بہت کام کرتے ہیں۔" وہ برابر میں بیٹھ گئی۔

"ہاں...... نیا کام شروع کرنے سے پہلے اتنی محنت تو کرنا پڑتی ہے...... یاسر کا یہ پہلا تجربہ ہے اور اسے کاروباری معاملات کی زیادہ سوجھ بوجھ بھی نہیں ہے۔"

"آ...... آپ...... یاسر کے ساتھ کام کریں گے؟"

وہ یک دم ہراساں نظر آنے لگی۔

"ہوں......"

"نہیں...... نہ کریں۔" وہ بے حد گھبرا کے دونوں ہاتھ ہلا کے کہنے لگی۔ "وہ بہت غصے والے ہیں بازو مروڑ دیتے ہیں اور پتہ نہیں کیا۔"

"کیا فضول باتیں کر رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں اور وہ گل ہے نا وہ اور بھی غصے والی ہے۔ ایسے چاقو چلاتی ہے۔"

اس نے چاقو تاننے کی اداکاری کی، جس پہ صغیر احمد چڑ گئے۔

"دماغ خراب ہو چکا ہے تمہارا...... اماں بتا رہی تھیں پرسوں بھی تم کچھ ایسی ہی بکواس کر رہی تھیں۔ زیادہ سونے اور زیادہ ٹی وی دیکھنے سے یہی حال ہوتا ہے۔"

"مگر میں......"

"خدا کا واسطہ ہے حلیمہ...... اب کوئی اور نئی کہانی نہ گھڑنے بیٹھ جانا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے، تمہاری الف لیلہ سننے کے لیے۔"

"لیکن مجھے تو الف لیلہ کی کہانی نہیں آتی...... میں تو۔"

"تم سو ہی جاؤ تو بہتر ہے۔"

صغیر احمد نے اس کی بات پوری سننے کی زحمت کیے بغیر جہان بھر کی بے زاری اور کوفت چہرے پہ سجا کے کمبل اوپر تک کر لیا۔

☆======☆======☆

"پتا نہیں، میری بے اختیاری مجھے کہاں تک لے کر جائے گی۔" دھوئیں کے مرغولے پہ نظریں جمائے وہ دیر سے سوچ رہا تھا۔

"کیسی ساکت...... جامد مگر شانت زندگی تھی میری، ایک وہ ہے بلبل جس کے آنے کی ...ی اور تب سے لے کر اب تک ایک ہنگامہ ایک ہلچل سی مچی ہے اس زندگی میں...... میں کبھی کسی کے سامنے اتنا بے اختیار نہیں ہوا جتنا اس پانچ فٹ چار انچ کی سانولی سی لڑکی کے سامنے ہو جاتا ہوں...... کیا اسے ہی محبت کہتے ہیں...... کیا دل کے آگے گھٹنے ٹیک دینا ہی محبت ہے؟ کیا محبوب کی ہر جائز، ناجائز بات کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ہی محبت ہے...... کیا محبت ٹھیک، ناٹھیک کا فرق مٹا دیتی ہے...... کیا محبت سوائے طلب کے...... اور ہر احساس کو ...اسے مٹا دیتی ہے۔"

وہ اندھیری چھت پہ کھڑا آسمان کو تکتا، ان سوالوں کے جواب کھوج رہا تھا۔

آج نہ آسمان پہ کوئی ستارہ تھا۔ نہ ان سوالوں کا کوئی جواب۔

چوڑیوں کی کھنک پہ وہ پلٹا۔

کبھی اسے نظر کے سامنے پا کے مسکراہٹیں خود بخود لبوں پہ جگہ بنا لیا کرتی تھیں۔

اور آج اسے سامنے پانے کے بعد ایک احساسِ جرم نظریں چرانے پہ مجبور کر رہا تھا۔

"تمہیں چین کیوں نہیں ہے؟"

وہ خفت سے دوچار نظر آتا چور نظروں سے کسی کے نہ ہونے کا اطمینان پانے کے لیے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

ایک طرف اس پہ غصہ آتا...... جس کی وجہ سے وہ اس صورتِ حال میں گھرا تھا۔

کبھی خود پہ تاؤ آتا...... کہ جس کی وجہ سے وہ اس الاؤ میں کود پڑی تھی۔

کبھی اس سے محبت ہونے پہ شرمندگی ہوتی۔

کبھی اس بات پہ شرمندگی ہوتی...... کہ وہ جو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے...... اس کے بارے میں ایسی سوچ

"چین ہو نہ ہو......بس تم ضرور ہو۔"

گل نے بے قرار ہو کے اس کے کاندھے پر سر رکھا۔

وہ بے چین ہوا تھا......لیکن اسے خود سے الگ کرنے کی ہمت بھی نہ کر پا رہا تھا۔

"اس طرح ہم نظر میں آسکتے ہیں گل......روز روز مت آیا کرو میرے پاس۔"

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔"

وہاں وہی......کچھ نہ سمجھنے والا انداز تھا۔

"اس حلیمہ آپا کی فکر مت کرو......" اپنے بھائی سے دو ہاتھ آگے ہی ہے اس کی بات پہ کوئی غور نہیں کرتا۔"

"کوئی اور بھی تو دیکھ سکتا ہے۔"

"تو دیکھ لے......" وہ پرے ہٹی......غصے کی جھلک چہرے کی سنولاہٹ میں لالی سی پیدا کر رہی تھی۔

"بات بگڑ جائے گی۔"

"بگڑ جائے۔"

"تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا مگر مجھے پڑتا ہے گل!"

وہ زچ ہوا تھا تو گل نے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"کیوں، چار دنوں میں یہ زیادہ سگے ہو گئے ہیں تمہارے؟"

"بات یہ نہیں ہے......میں ساری جمع پونجی داؤ پہ لگا چکا ہوں۔"

"اور میری ساری زندگی داؤ پہ لگی ہے۔ تمہیں کس نے کہا تھا، یہ بکھیڑا شروع کرنے کو......یہاں سے چلے جاتے، جان چھوٹ جاتی......کرتے رہتے اپنا کاروبار۔"

"میرے باپ دادا نے کبھی کاروبار نہیں کیا......ساری رقم ڈوب جاتی......زندگی ایسے موقع بار بار نہیں دیا کرتی۔ یہاں صغیر بھائی ہاتھ پکڑ رہے تھے تو سوچا۔"

"تو بھگتو اب......اور پکڑاؤ ہاتھ......"

یاسر کے دل میں بڑا سخت جواب آیا۔ مگر وہ اس کے ردِعمل سے ڈرتا تھا......انگلی پہ بندھی پٹی کچھ یاد دلا رہی تھی، اس لیے ضبط کر کے ایک اور سگریٹ سلگانے لگا......پہلے والی انگلیوں میں دبی دبی راکھ ہو چکی تھی۔

"ساری حرکتیں خود کو نقصان پہنچانے والی......کیوں یہ پی پی کے اپنا دل جلاتے

ہو......چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

گل نے اس کی انگلیوں میں دبا سگریٹ چھینا......یاسر نے اس کا وہی ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"دل تو تم بھی کم نہیں جلاتیں......تمہیں بھی چھوڑ دوں۔"

گل کا ہاتھ بری طرح کسمسا رہا تھا، اس کی مضبوط گرفت میں یہ بات سن کر ساکت سا ہوا......اور پھر اچانک یاسر کے چہرے کی جانب بڑھا اور اس کے کچھ سوچنے سمجھنے یا مزاحمت کرنے سے پیشتر گل جلتا سگریٹ یاسر کے رخسار سے چھو چکی تھی......وہ سی کر کے ایک قدم پیچھے ہٹا اور خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورنے لگا، جو منہ پہ ہاتھ رکھ کے ہنسی روک رہی تھی۔

"چھوڑ کے دیکھو......بھسم کر دوں گی۔"

"سچ کہتی ہو۔" یاسر نے اپنا رخسار سہلایا۔

"بالکل سچ......خود کو نقصان پہنچانے والی چیزوں کو بڑا سر چڑھا رکھا ہے میں نے۔"

"خاک سر چڑھا رکھا ہے......میری بات کو اہمیت دیتے تو اس عذاب میں نہ پھنستے......ابھی بھی وقت ہے یاسر......! چھوڑ دو سب کچھ بھاگ چلتے ہیں یہاں سے کہیں دور۔"

"نہیں گل......میں کسی کی بیوی کو بھگا کر لے جانے کا الزام سر پہ لے کر نہیں جینا چاہتا۔"

"لیکن یاسر! میں اس کی۔"

"دیکھو گل! نہ میری کوئی دنیا......نہ تمہاری......نہ میرا کوئی آگے پیچھے نہ تمہارے......ہم نے جو گھروندہ بنایا وہ بڑا کچا ہوگا......مت بھولو کہ تم ایک شخص کے نکاح میں ہو، اس حیثیت میں میرے ساتھ......گھر سے نکلو گی تو ہم دونوں کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ میں پہلے ہی جیل اور کچہری بھگت چکا ہوں۔ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں حدود کے مقدمے میں کیا کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔"

"تو کیا کروں میں؟"

"اس رشتے سے آزادی۔"

"وہ تو چٹکی بجاتے ہوئے جائے گا۔"

"اتنا آسان نہیں ہے۔ طلاق دینے یا لینے......دونوں کے لیے کسی معقول وجہ کا ہونا

کیونکہ وہ ذہنی لحاظ سے پسماندہ شخص ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم نے شادی اپنی مرضی سے ہوش وحواس کی ہے۔ جو لوگ اس شادی میں شامل ہی نہ تھے۔ ان سے تم کیسے درخواست کر سکتی ہو کہ وہ تمہیں اس رشتے سے آزادی دلائیں...... صرف یہی ایک صورت ہے کہ تم اور میں دونوں ان کے اتنے قریب ہو جائیں۔ ان کا اعتماد اس حد تک جیت لیں کہ وہ خود تمہاری بھلائی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کریں۔''

''تمہاری باتیں مجھے سمجھ نہیں آتیں۔''

گل نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

☆======☆======☆
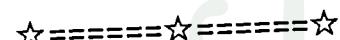
یاسر اور صغیر احمد کا کام تیزی سے جاری تھا صغیر احمد نے عرصے بعد اپنے کاروبار سے ہٹ کر کچھ اور کیا تھا...... ورنہ وہی گھر سے سٹور...... سٹور سے گھر۔

ان کی دلچسپی اتنی بڑھی کہ اس نے یاسر کو بتا کر کچھ اپنا سرمایہ بھی انویسٹ کر دیا۔ اب وہ بزنس پارٹنر بھی تھے۔ یہ خبر سن کر گل اور بھی کلس گئی تھی...... یاسر کے لیے تو یہ اس گھر میں رکنے کا ایک اور مضبوط جواز تھا...... دوسرے وہ جانتا تھا کہ زندگی گزارنے کے لیے صرف محبت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہی عمر تھی کہ وہ اپنے پیروں پہ مضبوطی سے کھڑا ہو جاتا، سو وہ گل کا سارا چڑچڑا پن، ساری جھنجلاہٹ اور ساری خفگی نظرانداز کرتا صرف اور صرف اپنے مقصد کے حصول میں جتا ہوا تھا...... گل سے احتیاط کی مزید توقع رکھنا عبث تھا۔ اسی لیے اس نے خود ہی گھر میں کم سے کم وقت گزارنا شروع کر دیا۔

کام سے اس کی لگن دیکھ کے صغیر احمد بہت متاثر تھے اور جہاں آرا بیگم تو خیر ویسے ہی یاسر پہ ریشہ خطمی ہو چکی تھیں۔

''صغیر میاں...... تم تو سارا دن یاسر کے ساتھ رہتے ہو، کیسا پایا ہے تم نے اسے؟''

''بہت محنتی اور دیانت دار لڑکا ہے، ان شاء اللہ بہت آگے تک جائے گا۔''

''ہاں...... پیشانی تو روشن ہے اس کی...... محنت تو ضروری ہے ہی آگے بڑھنے کے لیے...... مگر دیانت داری کے بغیر کامیابی زیادہ دیر پاس رہتی نہیں ہے اور بتاؤ کچھ اس کی عادتوں وغیرہ کے بارے میں۔''

''آپ کو یکایک اس سے اتنی دلچسپی کیسے ہو گئی ہے۔'' صغیر احمد نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''ساتھ جوڑنے کے لیے سب کچھ جاننا ضروری ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے...... شراکت داری میں کاروبار کرنا ہو تو سب کچھ دیکھنا بھالنا پڑتا ہے لیکن ہمارے معاملے میں اس کی ضرورت اسے ہے کیونکہ اس نے سارے اختیارات مجھے دے رکھے ہیں...... زیادہ پرانی واقف کاری نہ ہونے کے باوجود بہت بڑا اعتبار کیا ہے اس نے مجھ پہ۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن کبھی کاروبار سے ہٹ کر بھی کچھ سوچ لیا کرو۔''

''مثلاً میں سمجھا نہیں۔''

''مثلاً بیٹی کے باپ ہو کبھی اس کے حوالے سے بھی کوئی فکر کر لیا کرو۔''

''زمین کے بارے میں فکر کرنے کے لیے اس کے بڑے موجود ہیں آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''پھر بھی...... باہر کے معاملات تو مرد ہی دیکھتے ہیں۔ آج کل تمہارا دن رات کا ساتھ ہے یاسر میاں کے ساتھ...... تم سے زیادہ کون جانے گا ان کے بارے میں۔''

''یاسر کا یہاں کیا ذکر؟'' وہ الجھے۔

''دیکھو صغیر میاں...... ویسے تو میں اس معاملے میں کچھ اور سوچ رکھتی تھی...... ہمارے ہاں بیٹی دیتے یا بیٹی لیتے ہوئے پورا شجرہ کھنگالا جاتا ہے۔ ہڈی بوٹی ایک کی جاتی ہے...... اور بھرے پُرے کنبے میں بیٹی بیاہنا زیادہ افضل سمجھا جاتا رہا ہے لیکن اب تو اب زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ شجرے کھنگال بھی لو تو کیا ضمانت ہے کہ کرکری نہیں نکلے گی...... کس کا اصل کیا ہے، پتہ ہی نہیں چلتا۔ چمار نواب بنے بیٹھے ہیں اور امراء گداگر بنے ہیں اور دوسرے یہ کہ تمہیں اللہ نے ایک ہی اولاد دی۔ وہ بھی بیٹی، اولاد تو مجھے بھی ایک ہی ملی۔ مگر بیٹا جسے رخصت کر کے مجھے اپنی آنکھوں کا نور اور گھر کی رونق کھونا نہیں پڑی...... لیکن تمہیں دل پہ پتھر رکھ کے ایسا کرنا پڑے گا۔''

صغیر احمد کے سینے میں کسک سی اٹھی...... ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا...... کتنا تکلیف دہ تھا صرف سوچنا بھی اور جب یہ مرحلہ آتا تب...... وہ بے چین ہوا تھا۔

''لیکن مجھے لگتا ہے کہ اگر اس کا کوئی نعم البدل ہو سکتا ہے تو اس کے بارے میں سوچنے میں کیا مضائقہ ہے۔''

''یعنی؟'' وہ اب بھی کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

''یعنی یہ کہ زمین کو رخصت کر کے کیا اس بڑی سی حویلی کو بالکل ہی کھنڈر بنانا ہے...... کیوں نہ ہم کوئی ایسا داماد ڈھونڈ لیں جو اس گھر کو اپنا لے۔''

"یعنی گھر داماد؟" صغیر احمد نے ناگواری سے کہا۔

"یہ لفظ خاصا ناگوار گزرتا ہے طبع پہ...... سنتے ہی کسی کاہل، بے غیرت قسم کے شخص کا تصور آتا ہے لیکن اگر کوئی بے حد غیور، خوددار اور محنتی، اپنے بازوؤں پہ کامل بھروسہ کرنے والا شخص ہو تو۔"

"لیکن سوال یہ ہے کہ غیور اور خوددار شخص کسی کا گھر داماد کیوں بنے گا؟"

"بنے گا...... اگر اس کا اپنا گھر بار اور گھر والے نہ ہوں۔ وہ روپے پیسے یا اینٹوں گارے کی حویلی کے لالچ میں نہیں۔ اس چار دیواری میں بسنے والے لوگوں کی محبت کی چاہ میں یہاں آئے۔ جس کا اپنا کوئی نہ ہو...... وہ ہمیں اپنانے کو غنیمت سمجھے گا۔"

بات کچھ کچھ صغیر احمد کی سمجھ میں آنے لگی۔

"کیا یاسر میاں نے ایسا کوئی اشارہ دیا ہے؟"

"نہیں...... وہ خود سے اشارہ کرتا تو شاید میں اس کے بارے میں رائے بدل دیتی۔ لیکن اس نے کبھی آنکھ اٹھا کے کسی کی جانب نہیں دیکھا...... بہت شریف لڑکا ہے۔"

"عزت بھی بہت کرتا ہے میری۔" وہ متفق تھے۔

"تو بات کرو اس سے۔"

"کیا میں؟" وہ بدک اٹھے۔

"میں خود بات کروں ان سے اپنی بیٹی کے لیے؟"

"کیا حرج ہے اس کا کوئی بڑا ہے تو نہیں جو بات کرے۔"

"لیکن اماں جان...... یہ مناسب نہیں لگتا۔"

"ٹھیک میں خود بات کرلوں گی۔"

"نہیں...... مناسب یہ بھی نہیں بات میں کروں یا آپ معاملہ تو ہماری بیٹی کا ہے۔ ہم اپنی بیٹی کے لیے خود سوال کرتے اچھے نہیں لگتے...... یہ شرفاء کا شیوہ نہیں ہے۔"

"تو پھر ایک طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"گل کو ٹٹولتی ہوں...... اس کے کانوں میں بات ڈال دیتی ہوں...... وہ خود اپنے ڈھنگ سے یاسر سے بات کرلے گی۔"

صغیر احمد سوچ میں پڑ گئے اور پھر کچھ دیر بعد انکار میں سر ہلایا۔

"اب اس میں کیا قباحت ہے؟" وہ چڑ گئیں۔

"وہ اس گھر کی بہو ہیں، کہیں یہ نہ سمجھیں کہ سسرال والے ان پہ دباؤ ڈال رہے ہیں یا کسی قسم کی شرط عائد کر رہے ہیں۔"

"نہیں سوچتی، بہت معقول لڑکی ہے۔ نہ جانے اس گاؤدی کے نصیبوں میں کیوں لکھی گئی۔"

ان کا گلہ ایک بار پھر صغیر احمد کو ایک عجیب سی خلش میں مبتلا کر گیا۔ ایک ایسی خلش...... جو ہمیشہ اس وقت گھیر لیتی جب جب بھی وہ گل کو دیکھتے تھے۔

☆======☆======☆

"یہ موسمی کا جوس پی لو بیٹا۔"

جہاں آرا کا اس پہ التفات بڑھتا جا رہا تھا۔

"جی شکریہ بڑی اماں! آپ آرام سے ناشتہ کیجیے میں لے لوں گا۔"

"ہاں ہاں وہ لے لے گا بھابھی۔" خورشید نے منہ سے موسمی کا بیج پرے تھوکا۔

"تکلف تو اس نے پہلے دن نہیں کیا تھا۔"

یاسر نے اس دبے دبے طنز کو مسکرا کے پیا۔

"تکلف وہاں ہوتا ہے جہاں اپنائیت نہ ہو، جبکہ اس گھر میں پہلا قدم رکھتے ہی مجھے گلے لگا لینے والی اپنائیت ملی تھی۔"

چائے کے کپ میں چینی گھولتی نرمین کے ہاتھ میں بڑی واضح لرزش نظر آئی۔

یاسر کے اس گھر میں پہلا قدم رکھنے کے بعد وہی تو ملی تھی اسے۔

"تے جناب، ساری گلہ ایہہ جے۔" (تو جناب ساری بات یہ ہے۔)

اس کے پنجابی لہجے پہ خورشید نہال ہوگئی۔

"ہائے...... تُو تو میرا گرائیں لگتا ہے...... ہمارے پنڈ کی طرف ایسی ہی بولی بولی جاتی ہے۔"

پنجابی پنجاب کے مختلف علاقوں میں الگ الگ لہجے اور تلفظ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ گوجرانوالہ کی پنجابی کا لہجہ اور فیصل آباد کی پنجابی کا لہجہ یکسر مختلف ہے، اسی طرح پنڈی اور ملتان میں ایک الگ ہی لب و لہجہ سننے کو ملتا ہے جو کسی انجانے شخص کے لیے ایک جیسا ہو گا...... مگر پنڈی اور ملتان کے پنجابی بولنے والے جانتے ہیں کہ ان کے لہجے ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔

اس اردو اسپیکنگ فیملی میں خورشید واحد پنجابی تھی، وہ یہاں بولتی تو اردو تھی۔ مگر اپنی

پنجابی کی آمیزش کے ساتھ اور اس کے اردو کے لہجے میں بھی اس کے علاقے کی مخصوص جھلک نظر آتی تھی، جو یاسر نے پہلے ہی دن جانچ لی تھی۔

اب وہ اس کے ساتھ بیٹھی ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھیں...... گل کو الجھن سی ہونے لگی۔

''دلہن! کچھ تو کھاؤ۔'' جہاں آرا نے اسے برتن سمیٹتے دیکھ کر ٹوکا۔

''جی نہیں چاہ رہا بڑی اماں۔''

وہ بڑے ادب سے کہہ رہی تھی مگر انداز میں ایک دبی دبی سی ناراضی تھی، جو صرف یاسر کو جتلانا مقصود تھی۔ جو کہ کئی دنوں سے بالکل اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

''ایسے کیسے جی نہیں چاہ رہا دن بھر کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی ہو تمہیں تو ہم سب سے زیادہ قوت بخش غذا کی ضرورت ہے۔ لو یہ انڈہ کھاؤ۔''

ابلا انڈہ اپنی جانب بڑھتے دیکھ کے اس کا جی متلانے لگا...... انڈہ کبھی بھی اسے مرغوب نہیں تھا۔

''لو شاباش...... منہ کھولو۔''

دوسری جانب جہاں آرا کی اس پہ عنایتیں اور کرم بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ خصوصاً یاسر کے سامنے ایک تو یاسر کی خوشنودی مقصود تھی کہ بہرحال وہ گل کے میکے سے تھا، دوسرا گل سے ایک کام بھی تو لینا تھا۔

پہلا لقمہ لیتے ہی اس کی متلی نے کام کر دکھایا۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے ابکائی روکتی وہاں سے بھاگی۔

باتوں میں مگن خورشید اور یاسر نے چونک کر اسے کمرے کے اندر جاتے دیکھا۔

جہاں آرا بیگم ہاتھ میں ادھ کھایا انڈہ لیے حیران پریشان بیٹھی تھیں۔

''کیا ہوا میری دلہن کو۔''

ناشتے میں بری طرح غرق ٹیپو نے استفسار کیا۔

''ٹھونس لیا ہوگا رات کو اوقات سے زیادہ۔''

خورشید نے بے زاری سے کہا۔

''خبردار جو میری دلہن کے کھانے پینے پہ نظر لگائی تو...... بے چاری کے ایک ایک نوالے پہ نظر رکھتی ہو، ابھی تو الٹی کرنے گئی ہے وہ تمہاری تو نظر ہی پتھر پھاڑ ہے...... آئندہ سے میں اسے کمرے میں بٹھا کے کھلایا پلایا کروں گا۔''

''چپ کر...... اب تو عقل کر اور یہ بے سروپا باتیں چھوڑ دے ٹیپو۔''

جہاں آرا گھٹنوں پہ وزن ڈال کے اٹھتے ہوئے بولیں۔ اندر سے گل کی ابکائیوں کی مسلسل آتی آواز یاسر کے دل کو پنکھے لگا رہی تھی۔ بس نہ چل رہا تھا خود وہاں چلا جائے۔

''اب کچھ ہوش مندوں والی بات کیا کر...... بچہ نہیں رہا...... بچے کا باپ بننے والا ہے۔''

''ہیں بھابھی سچ؟''

خورشید نے چمک کر پوچھا۔ یاسر ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔

''اے تو اور کیا...... میں تو کل سے اس کی پیلی رنگت دیکھ کے بھانپ گئی تھی کہ اس کا پاؤں بھاری لگتا ہے۔''

یاسر کے پیٹ میں ایک کھینچ سی پڑی۔ کسی نے اندر سب کچھ مروڑ کے رکھ دیا ہو جیسے۔

☆======☆======☆

''اے خورشید تو پوچھ ذرا...... کتنے دن چڑھے...... کون سا مہینہ ہے مجھے تو بچیوں سے ایسی بات کرتے لاج آتی ہے۔''

''تو بھابھی میں کیا بے شرم ہوں؟''

''یہ کوئی کہنے کی بات ہے۔'' وہ بڑبڑائیں۔

''ہونہہ...... ایسی لاج آتی ہے تو خود کیوں پیدا کیے۔'' وہ ناک سکوڑتی اندر بڑھی...... تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی ادرک، پودینے کا قہوہ سامنے رکھا تھا۔

''ہائے میں مر جاواں...... شالا میرا ٹیپو جیوندا رہے۔'' خورشید نے اسے ساتھ لگا کے چٹاچٹ بلائیں لیں اور گریبان سے پچاس کا مڑا تڑا نوٹ نکالا۔

''یہ میں وار کے کھسرے کو دوں گی...... اس کی دعاؤں سے بیٹا ہوگا ان شاء اللہ۔''

گل تو پہلے لاڈ کے اس بے محل مظاہرے پہ ہی حیران تھی، اوپر سے یہ بیٹے کی پیش گوئیاں۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''کون سا مہینہ ہے، پہلا یا دوسرا؟''

''آخری...... دسمبر کا۔''

''دور فٹے منہ...... میں سال کے مہینے کا نہیں اس مہینے کی بات کر رہی ہوں۔''

خورشید نے اس کے پیٹ پہ ہاتھ لگا کے پوچھا اور گل، یہ جیسے پوری چھت کی چھت آن

گری۔

☆======☆======☆

"یاسر...... یاسر...... میری بات تو سنو۔"

وہ اس کے پیچھے دیوانوں کی طرح گھوم رہی تھی مگر وہ اسے ہاتھ کے ایک جھٹکے سے پرے کرتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

سارا دن گل کا ایک پیر دہلیز پہ رہا...... دوسرا گھر کے اندر لیکن اس نے گھر کی جانب مڑ کے نہ دیکھا تھا۔

☆======☆======☆

"گل...... دیکھو...... یہ دیکھو۔"

وہ تو نہ آیا...... مگر مغرب سے ذرا پہلے کھلونوں سے لدا پھندا ٹیپو باچھیں چیرتا اس کے سامنے تھا۔

"یہ لال عینک...... پیلی نیکر اور نیلی موٹر منے کے لیے...... اور یہ گلابی فراک، یہ مزے تازی گڑیا منی کے لیے اور یہ نرم نرم گیند دونوں کے لیے...... جو بھی آئے گا اس سے کھیلے گا۔"

گل کا بس نہ چل رہا تھا وہ دونوں ہاتھوں سے ٹیپو کی چٹنی بنا کے رکھ دے...... وہ ایسا کر بھی گزرتی...... اگر جہاں آرا پاس نہ ہوتیں۔

"ارے جاؤ باؤلے...... دل نہ جلاؤ بڑھیا کا۔" انہوں نے بری طرح ٹیپو کو لتاڑا۔

"میرا ہی دماغ خراب تھا جو ایسی انہونی سوچ بیٹھی...... تم آئے دن مصیبتیں تو مزید پیدا کر سکتے ہو مگر بچہ نہیں۔"

ٹیپو پریشان سا ہو کے اپنے وحشی دیدے گھمانے لگا۔

گل نے ان کے لہجے میں ترحم ٹھاٹھیں مارتا محسوس کیا تو یاسر کے انداز [illegible] لگے...... وہ اور بھی مسکین سی شکل بنا کے دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کے گوشوں میں نادیدہ آنسو خشک کرنے لگی۔

"دیکھا...... رلا دیا نا میری دلہن کو۔"

ٹیپو نے تاؤ کھا کے اسے بازو کے گھیرے میں لینا چاہا وہ تڑپ کے پرے ہٹی۔

"ہٹ پرے...... نگوڑے بے حیا...... بھاگ یہاں سے۔" انہوں نے چپل اٹھا لی تو

کھلونے سمیٹتا باہر بھاگا۔

"اپنی آپا کو بھی کھلا لینا...... اللہ ملائی جوڑی۔"

انہوں نے جلے ہوئے انداز میں پیچھے سے پکارا پھر دوبارہ گل پہ نظر کی، جو ملول سی نظر آ رہی تھی۔

"اللہ جانے یہ جوڑی کیسے بنی۔"

وہ پھر سے تاسف کا اظہار کرنے لگیں پھر اسے بغور دیکھ کے پوچھنے لگیں۔

"پچھتاوا تو ہوتا ہوگا، اس جلد بازی کے فیصلے پہ۔"

"پہلے تو نہیں...... بلکہ ایک طرح سے شکر ادا کرتی تھی اللہ پاک کا کہ اس نے عزت سے رہنے کے لیے چار دیواری دی، چاہے کسی کو بھی وسیلہ بنایا ہو...... مگر اماں جان...... انسان ہے آخر اب کبھی رہ رہ کے دل میں پچھتاوا تو ہوتا ہے...... مگر کیا کیا جا سکتا ہے۔" اس نے ان کا ردِ عمل جانچنے کے لیے نظریں اٹھائیں۔

"ہاں...... واقعی کیا کیا جا سکتا ہے۔"

وہ ایک گہری سانس بھر کے مصلہ بچھانے لگیں۔

گل تلملا کے رہ گئی۔

"ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے مگر تم لوگ مطلبی بے حس، خود غرض کچھ سوچو تو تب نا؟"

وہ دل ہی دل میں کوسنے لگی۔

☆======☆======☆

گل کو تو صبح سے کام ہی ایک تھا۔

آنگن میں پڑی دروازے پہ نظر ٹکائے ہوئے تھی کہ کب وہ آئے گا...... کچھ دیر پہلے بڑے دروازے کی دستک پہ لپک کر اٹھی تھی...... مگر سامنے چھوٹی تھی...... ہمیشہ کی طرح اسے دیکھ کر ناک چڑھائی...... برے برے منہ بناتی وہ بغیر سلام دعا کے اندر بڑھ گئی تھی مگر پھر اسی طرح برے منہ بناتی دو منٹ بعد ہی نمو کے کمرے سے نکلی تھی۔

"زمین سے ملنے آئی تھی؟"

"ہونہہ...... دماغ خراب تھا میرا...... میری توبہ...... جو آج کے بعد اس کے گھر کی طرف منہ کر کے تھوکا بھی تو۔"

اس کے منہ سے دھواں نکلتے دیکھ کے گل کو مزہ آ گیا۔

"یہ کیا بات ہوئی...... مزہ تو تب ہے جب اس کی طرف منہ کر کے اس کے منہ پر تھوکا جائے جس پہ غصہ ہو۔"

چھنو ٹھٹکی...... بات شاید اس کے دل کو لگی تھی۔

''آ...... بیٹھ......'' گل اسے کبھی اتنا سر نہ چڑھاتی...... اگر دل کو پنکھے نہ لگے ہوتے...... اسے تو ڈر تھا اگر کسی سے بات نہ کی تو کہیں دل پھٹ نہ جائے۔

''نہ کوئی جھگڑا نہ کوئی اور بات ایسے ہی منہ پھلائے پھر رہی ہے نواب زادی۔''

چھنو اس کے سامنے دل ہلکا کرنے لگی۔

''میں تو صاف کہتی ہوں...... یہ جو تمہارے ماموں کا لڑکا ہے یہ دماغ خراب کر رہا ہے اس کا۔''

گل بھرپور طریقے سے چونکی۔

''کون...... یاسر؟''

''ہاں تو اور کتنے ماموؤں کے لڑکے یہاں وہاں چھوڑ رکھے ہیں تم نے؟ ایک ہی تو ہے۔''

''لیکن وہ نرمین کو کیسے؟''

''میرے خلاف پٹی اس نے پڑھائی ہوگی...... اس دن بھی مجھے دیکھ کے بک بک کر رہا تھا۔''

پھر اسے غور سے دیکھ کر بولی۔

''ویسے ایک بات تو بتاؤ مامی!''

''میں تمہاری مامی نہیں......'' گل نے ناگواری سے ٹوکا۔

''ہاں...... نمو کی ہو اور سہیلی کی ممانی، ممانی ہوتی ہے۔''

''اور اگر سہیلی ہی سہیلی نہ رہے تو؟''

گل نے گہری نظروں سے اسے دیکھ کر پوچھا تو وہ کھلکھلا اٹھی۔

''زبردست...... یہ تو صحیح ہے...... پھر تو کوئی مامی، شامی نہیں تم۔''

''وہ بات تو رہ گئی، جو تم پوچھ رہی تھیں۔''

''ہاں...... میں یہ کہہ رہی تھی کہ جب تمہارے ماموں کا لڑکا اچھا بھلا تھا...... تو یہ ٹیپو کی چیونٹیاں جھاڑنے کی کیا سوجھی تمہیں۔''

''بس...... قسمت کی شامت...... ویسے بھی یاسر کون سا یہاں۔'' بات کرتے کرتے وہ گھبرائی۔

''نہیں خیر...... اس کا کیا ذکر اس سارے معاملے میں۔'' بہت کچھ کہنے سے قبل ہی اس

خود کو سنبھال لیا۔

''ارے...... مجھ سے کیا پردہ...... ویسے بھی اب میں نہ نمو کی سہیلی رہی...... نہ تم میری ...''

چھنو نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

''طبیعت تو تمہاری میری میل کھاتی ہے۔ اس سُستی مار کہ پروین ٹائپ نمو سے نہیں، ...کرتی ہے دوستی؟''

گل نے کچھ سوچ کر اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

رانی نے بہت طریقے سے اس سے گلوخلاصی کرالی تھی۔ اسے سیالکوٹ میں کسی بہت ...بر گھرانے میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ اپنا پتہ دیئے بغیر رفو چکر ہوئی تھی اور اب گل کو بہت ...ے معاملات کو سنبھالنے کے لیے ایک راز دار کی ضرورت تھی ایسے راز دار کی جو نہ اس گھر کا ...... نہ یاسر کی طرح اس گھر اور اس گھر کے رہنے والوں کا ہمدرد۔

☆======☆======☆

''یہ ساجد ہے۔''

چھنو نے ریسٹورنٹ کے اندر قدم رکھتے ہوئے گل کے کان میں سرگوشی کی۔ گل نے ...ک اچٹتی سی نظر اس لوفر سے لڑکے پہ ڈالی۔ اس کی بے تاب نگاہیں تو بار بار گھڑی پہ جا رہی ...تھیں، جن کی سُست بے کار سوئیاں کب سے گیارہ اور بارہ کے درمیان لٹک رہی تھیں...... ...سے ملنے کے لیے اس نے ایک بجے کا وقت طے کیا تھا۔

''یہ تمہاری نئی سہیلی ہے؟'' ساجد نے دانت نکالتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... نئی مگر سب سے اچھی...... سب سے دلدار؟''

ساجد نے گہری نظروں سے اس بے حد عجیب سی لڑکی کو دیکھا سیاہ چادر کا پلو عجیب بے ...انداز میں سر پہ پڑا سرک رہا تھا لاتعلق سا انداز نہ گریز، نہ شرم، نہ جھجک نہ کوئی دلچسپی نہ ...تفات، برف کی سل ہو جیسے۔

''اور کیا......؟ آج تو میری سہیلی کی پسند سے آئے گا کھانا کیوں گل...... بتانا کیا لے ...گی؟''

''تمہیں پتا ہے، افیون یا چرس کہاں سے ملے گی؟'' گل نے بنا کسی تمہید کے ساجد کو ...طب کیا۔

ساجد تو ساجد...... چھنو کا منہ بھی کھلے کا کھلا رہ گیا تھا...... پھر وہ بھونڈے طریقے سے

ہنس دی۔

''تُو چرس پیتی ہے......شاباش بھئی، مجھے پتا ہی نہیں چلا، اچھی سہیلی ہے۔''

گل نے چھنو کو نظر انداز کرتے ہوئے ساجد سے اپنا سوال دہرایا۔ اس کے انداز میں بے تکلفی یا دوستانہ پن کے بجائے ایک تحکمانہ پن چھلک رہا تھا۔ ساجد گڑبڑا کے رہ گیا۔ چھنو اب تک ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ویسے اس صاحب، جناب والے تمیز دار گھر کے اندر تُو سُٹے کیسے لگاتی ہے؟''

''مجھے اپنے لیے نہیں چاہیے۔'' گل نے اس کی بے سروپا باتوں اور بے ہنگم ہنسی سے اکتا کر جھنجلاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

''ایک جگہ ہے تو سہی مگر وہاں عورتوں کا جانا ٹھیک نہیں، تم کہو تو میں لا دوں۔''

''ہاں......لا دو اتنی کہ ہفتہ دس دن نکل جائیں۔''

گل نے چادر کے پلو کی گرہ کھول کر پیسے نکالنے چاہے۔

''ارے رے رہنے دو، تم سے پیسے لیتا کیا اچھا لگوں گا میں تم تو......''

وہ کچھ کہتے کہتے رکا......پھر چھنو پہ نظر ڈال کے بات بدلی۔

''چھنو کی دلدار سہیلی ہو آخر۔''

''یہ لو......اور جب چھنو کے لیے لانا تب بے شک اس سے پیسے مت لینا۔''

گل نے پیسے میز پہ رکھے اور اٹھی۔

''تم کہاں جا رہی ہو؟ کھانا تو کھالو۔''

''یہ کون سا وقت ہے کھانے کا......تم بیٹھو کھاؤ بھی اور جی بھر کے باتیں بھی کرو......
میں سڑک کے اس پار والے پارک میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''اکیلی؟''

چھنو کے اس سوال پہ وہ چڑ سی گئی۔

''اکیلی کیوں؟ بھرا ہوا ہے پارک......تم جب تک دل چاہے یہاں بیٹھو میری فکر مت کرنا مجھے اکیلے رہنا اچھا لگتا ہے۔''

اس کے جانے کے بعد چھنو نے شانے اچکائے اور گردن موڑی تو ساجد اب تک منہ اٹھائے گل کو باہر نکلتے دیکھ رہا تھا۔

''اے......'' چھنو نے اس کے چہرے کے سامنے چٹکی بجائی......وہ خجل سا ہو گیا۔

''عجیب کریکٹر ہے یہ بھی......''

''تیرے سے کم۔''

☆======☆======☆

''اب یہاں تو اتنی اکڑ نہ دکھاؤ۔''

گل نے یاسر کا بازو کہنی سے پکڑ کے ہلایا۔

''وہاں تو کسی کے دیکھنے......نہ دیکھنے کا بہانہ ہوتا ہے۔ اب یہاں بھلا کون دیکھ رہا

''کیوں یہاں سب اندھے پھر رہے ہیں آس پاس؟''

تپا بیٹھا تھا لہجہ لپکے دے رہا تھا۔

''اندھے ہوں یا لنگڑے ہمیں کیا؟ ہمارا کیا واسطہ ان سے، خیر واسطہ تو ان سے بھی تم ہی تاریں جوڑے بیٹھے ہو۔''

مگر یاسر نے اس کی بات کا جواب دینا گوارا نہیں کیا۔ وہ مسلسل اکڑے ہوئے اجنبی بنا بیٹھا رہا......گل اس کی اس ادا پہ مسکرائی اور ذرا سا پاس سرک کر اس کا بازو تھام کے ناچاہا وہ کترا کے پرے ہو گیا۔

''چلو......اب بس بھی کرو۔ اب تو تمہیں پتہ چل گیا ہے کہ وہ سرپھری خبطی بڑھیا ال کر رہی تھی۔ ایسی کوئی بات ہی نہیں۔''

''نہیں ہے مگر ہو بھی سکتی ہے۔''

اس کے سرد لہجے نے اب تک منت سماجت کر کے مناتی گل کو جیسے آگ لگا دی۔

''کیسے ہو سکتی ہے؟ جان نہ نکال کے رکھ دوں میں اس ٹیپو کے بچے کی ہاتھ تو لگا کے دے۔''

''لگا سکتا ہے ہاتھ......شوہر ہے وہ تمہارا......شرعی اور قانونی حق رکھتا ہے تم پہ......
نے پہ آیا تو تم روک سکتی ہو اسے؟''

''ایسی کی تیسی اس کے حق کی۔'' گل نے دانت کچکچائے۔

''کس کے آگے دہائی دو گی، سب تم پہ ہنسیں گے۔ وہ پاگل ہے دیوانہ ہے نشئی ہے مگر نے مجبور نہیں کیا تھا، تمہیں اس کے ساتھ شادی کرنے پہ کسی نے تمہیں زبردستی اس کی نہیں بنایا تھا۔ پھر کیوں کوئی تمہارے ساتھ ہمدردی کرے گا، تم نے اپنی مرضی سے ا۔''

''کوئی نکاح وکاح نہیں ہوا۔'' وہ پھٹ پڑی۔

یاسر ششدر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

''کیسے ہوسکتا ہے نکاح...... نہ میرا نام پورا تھا نکاح نامے پہ...... نہ ولدیت صحیح لکھی تھی۔ نہ گواہ اصلی تھے، نہ میں نے دستخط ٹھیک کیے تھے......اور زبان تو میری ہلی تک نہیں تھی مولوی کے سوال پر...... کیسے ہوگیا میرا نکاح؟ کیسے بنی میں اس کی بیوی؟''

''گل...... تم......'' یاسر اپنا جملہ پورا نہیں کر سکا۔ مگر اس کی نظروں میں کراہیت اور اجنبیت اس قدر تھی کہ گل کو اپنا سارا وجود ٹھٹھرتا محسوس ہوا۔

''یاسر......! میرے دل نے اسے قبول نہیں کیا...... پھر کیسے ہوسکتا ہے ہمارا نکاح جب میری نیت......''

''تمہاری ان باتوں پہ کون اعتبار کرے گا گل!'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر رہ گیا۔

''تم...... تم کرو اعتبار...... باقی جائیں بھاڑ میں مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔''

''مگر مجھے ہے...... میں تمہارا اعتبار کر بھی لوں تو تمہیں زمانے کی نظروں سے چھپا کے...... کسی گڑھے میں دبا کے تو نہیں رکھ سکتا، سو سوالوں کے جواب دینا ہوں گے اور صرف ایک جواب ہی ایسا ہے جو عزت بچا سکتا اور وہ ہے طلاق۔''

''اب کیا اس کا ٹینٹوا دبا کے طلاق لوں اس سے؟''

وہ بپھر کے بولی تھی اور یاسر تاسف سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆======☆======☆

چھنو نے پارک میں داخل ہوتے ہی نظریں دوڑا کے اسے تلاشنا چاہا...... دوپہر کے دو بجے پارک اتنا ہی ویران اور سنسان نظر آ رہا تھا، جتنا کہ ہونا چاہیے تھا...... اکا دکا لوگ نظر آ رہے تھے...... زیادہ تر کالج سے بھاگے لڑکے لڑکیاں...... جن پہ چھنو کو ہمیشہ سے ہنسی بھی آتی اور حیرت بھی ہوتی بھلا گھاس پہ بیٹھ کے نری باتیں بگھارنے سے کون سی عاشقی نبھائی جاتی ہے۔ مزہ تو ہوٹلوں میں بیٹھ کے کھانے پینے یا پھر شاپنگ مالز کے چکر لگانے میں ہے۔ بندہ بھرے پیٹ اور بھرے تھیلوں کے ساتھ گھر لوٹے۔

ایک درخت کے چوڑے تنے کے پیچھے سے اسے گل کی سیاہ چادر کا پلو پھڑ پھڑاتا ہوا نظر آیا۔ چھنو آگے بڑھی اور اسے ڈرانے کے لیے آواز نکالی۔

''ہاؤ۔''

گل نے کسی رد عمل کے بغیر آہستگی سے گردن موڑ کے اسے دیکھا۔ چھنو بدمزہ سی ہو

گئی۔

''تم کیا ڈرو گی...... خود بدروح لگ رہی ہو ایمان سے کیا بھٹکی آتما والا پوز مار کے کھڑی تھیں۔''

پھر دونوں باتیں کرتے باہر کی جانب نکلنے لگیں۔ گل کا انداز ہنوز کھویا کھویا سا تھا...... وہ صرف ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔

''یہ دیکھو...... دو سوٹ لے کر دیئے ہیں ساجد نے، ریڈی میڈ...... تمہیں کیسا لگا؟''

''اچھا رنگ ہے تم پہ اٹھے گا۔''

''میں ساجد کی بات کر رہی ہوں۔''

''ہاں...... ٹھیک ہے وہ بھی...... میرا کام کیا اس نے؟''

''کل لا دے گا۔'' چھنو سرشار سی ہو گئی۔ کسی سہیلی نے تو اس کی پسند کی داد دی تھی۔ ورنہ اب تک ساری اس کے عاشقوں میں کیڑے ہی نکالتی رہی تھیں، خاص طور پہ نمو تو خار کھاتی تھی۔

''تم بور تو نہیں ہوئیں؟''

''نہیں۔'' گل نے مختصر جواب دیا۔ اتنا بھی کہنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن چھنو کے مزید اور تابڑ توڑ سوالوں سے بچنے کے لیے بہتر تھا کہ ان نسبتاً کم خطرناک سوالوں کا ہی جواب دے دیا جائے۔

''کتنی اچھی ہو نا تم...... تم ساتھ نہ آتیں حکیم سے دوائی لینے کا بہانہ کر کے...... تو مجھے بھی کون آنے دیتا...... یہ بھابیاں کم بختیں بڑی جاسوسی کرتی ہیں۔ تھینک یو گل!''

''محبت کرنے والوں کے لیے گل کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

اس نے ہلکا سا مسکرا کے کہا تو چھنو چونکی اور تجسس سے پوچھا۔

''تم نے کبھی محبت کی ہے گل۔''

''کب نہیں کی۔'' وہ چلتے چلتے رکی اور دوبارہ سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''جیسے تسبیح کے دانے گرتے ہیں نا ایسے ہی ہر سانس کے ساتھ میرے اندر اس کی محبت کا ایک اور دانہ گرتا ہے۔''

''بڑی طوفانی محبت ہے۔'' چھنو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ''کس سے کرتی ہو؟''

گل جواب دیئے بغیر ان سنا کرتی چلتی رہی۔ چھنو نے خود ہی قیاس آرائی کی۔

☆======☆======☆

"اب کام شروع کرنے میں دیر کرنا بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔ کل جمعہ ہے...... کسی بھی نئے کام کے آغاز کے لیے سب سے مبارک دن، میں نے ٹھیکیدار کو بلوا کے تخمینہ لگوا دیا ہے۔ ان شاء اللہ کل ہی کنسٹرکشن کا کام شروع ہو جائے گا۔ نیچے دو دکانیں کرائے پہ...... اوپر تمہارا دو بیڈ رومز کا فلیٹ...... چھت اپنی ہوگی اور ہر ماہ دو دکانوں کے کرائے کی رقم بھی معقول آمدنی کی صورت آ جائے گی تو کاروبار پہ توجہ بھرپور انداز میں دے سکو گے، کیونکہ ابتدائی کچھ ماہ تو کاروبار کو اٹھنے میں لگتے ہی ہیں...... اللہ نہ کرے کہ کچھ وقت زیادہ بھی لگا تو خیر...... دکانوں کے کرائے سے بینک کے قرضے کی قسط تو آسانی سے نکل ہی جایا کرے گی۔"

"ٹھیک کہا آپ نے جمعے کا دن مناسب ہے اس کام کے لیے بھی اور......"

"اور کیا؟" صغیر احمد نے دریافت کیا۔

"میں...... میں نے سوچا ہے کہ...... دراصل ایک مختصر سا فلیٹ دیکھا تھا میں نے، ایک کمرے کا سوچ رہا تھا جب تک اپنا مکمل نہیں ہوتا، تب تک وہاں شفٹ ہو جاؤں۔ ابھی کچھ ماہ تو لگیں گے اسے مکمل ہونے میں۔"

"مگر کیوں؟ کیا یہاں کوئی......"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں آپ لوگوں سے مجھے جتنا خلوص اور اپنائیت ملی ہے، وہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔"

"پھر کیا وجہ ہے اس اچانک فیصلے کی؟"

"اچانک تو نہیں صغیر بھائی۔ مہمان بن کے آیا۔ رہا بھی، مگر کب تک؟ زندگی مہمان بن کے تو گزاری نہیں جا سکتی۔"

"تو بھائی...... گھر بن رہا ہے تمہارا...... چند مہینے اور رک جاتے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے...... ایسا نہ ہو تب تک میں بھرے پُرے کنبے میں رہنے کا اتنا عادی ہو جاؤں کہ بعد میں اکیلا گھر کاٹنے کو دوڑے۔"

صغیر احمد پُرسوچ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا رہے تھے اور کانوں میں جہاں آرا کی باتیں گونج رہی تھیں۔

☆======☆======☆

"تو یہ تھا وہ فیصلہ جو تم مجھے بتانے والے تھے۔"

وہ پیکنگ کر رہا تھا، جب گل دروازہ دھڑ سے کھولتی طوفان کی مانند کمرے میں داخل

ہوئی۔

یاسر نے ایک گہرا سانس لیا اور دوبارہ سے سر جھکا کے بیگ میں کپڑے رکھنے لگا۔

"کیوں جا رہے ہو تم؟"

وہ سامنے آ کے سوالیہ انداز میں دیکھنے لگی۔ یاسر رخ بدل کے ہاتھ میں پکڑی قمیص تہہ کرنے لگا۔ گل پھر اس کے سامنے آئی۔ اس کے ہاتھ سے قمیص چھین کر پرے پھینکی اور کاندھے سے پکڑ کے جھنجھوڑا۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے۔"

"آہستہ بولو۔" وہ بےزاری سے کہنے لگا۔

"آج میری آخری رات ہے، اس گھر میں اور میں عزت کے ساتھ یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔"

"مگر تم جانا ہی کیوں چاہتے ہو؟"

"تو کیا چاہتی ہو تم کب تک یہاں پڑا تمہارے اور تمہارے اس نام نہاد شوہر کے ڈرامے دیکھتا رہوں۔"

"میں نے کب کہا یہ سب دیکھنے کو اور برداشت کرنے کو...... میں تو تیار ہوں تمہارے ساتھ جانے کے لیے۔ تم کہہ کے تو دیکھو۔"

"یہ ممکن نہیں۔" یاسر نے نظریں چرائیں۔

گل کو اس صاف جواب کی امید نہیں تھی۔ یاسر کا کالر مضبوطی سے پکڑے اس کے ہاتھ سُست ہو کر نیچے آن گرے اور وہ بےیقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"ممکن نہیں......" اور پھر چلا اٹھی۔

"کیوں ممکن نہیں ہے۔"

"چلاؤ مت......" یاسر نے آواز دبا کے گھُرکا۔

"تم جانتی ہو میری پوزیشن...... میں نے نیا نیا کاروبار شروع کیا ہے اور سب دیکھ دیکھ......"

"تو نہ کرتے...... میں نے منع کیا تھا نا...... کیا تمہیں پتا نہیں تھا کہ صغیر احمد کے ساتھ کاروبار شروع کرنے سے تم پھنس سکتے ہو...... لیکن مجھے تو لگتا ہے تم جان بوجھ کے پھنسنا چاہتے تھے۔ اب تمہاری بے وقوفی اور غلطی کی سزا میں کیوں بھگتوں۔"

"اور میں تمہاری بے وقوفیاں اور غلطیاں خوشی خوشی بھگتتا رہوں کس لیے؟"

وہ لاجواب ہوگئی...... پھر ذرا توقف کے بعد لہجہ نرم کر کے کہا۔

"چھوڑ دو سب کچھ یاسر! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔"

"سب کچھ تم اپنے ہاتھوں سے بگاڑ چکی ہو۔"

"مجھے تو لگتا ہے جیسے بزنس کا یہ بہانہ تم نے مجھ سے جان چھڑانے کے لیے گھڑا ہے۔"

یاسر نے گل کے اس الزام کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور منہ پھیر کے الماری سے مزید کپڑے نکالنے لگا۔ گل تلملا کے رہ گئی اور اس کے اور الماری کے کھلے پٹ کے درمیان تن کے کھڑی ہوگئی۔ چند سیکنڈ یاسر کے تنے ہوئے اجنبی تاثر والے چہرے کو غصے سے گھورتے رہنے کے بعد وہ بے بس پڑ گئی...... اور رو دی۔

"یاسر......! تم تو مجھے لینے آئے تھے نا...... یاد کرو...... پھر تم ایسے کیسے جا سکتے ہو۔ میں تمہارے لیے ہی تو اس دلدل میں اتری ہوں یاسر! تم مجھے ایسے چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔"

یاسر کمزور پڑنا نہیں چاہتا تھا مگر پڑ رہا تھا۔ گل کے آنسو ہمیشہ اس کی کچی دیواریں ڈھا دیتے تھے۔

"یہ گھر چھوڑ کے جا رہا ہوں...... تمہیں نہیں۔"

اس کے چہرے سے نظر ہٹا کے بیگ میں کپڑے رکھتے ہوئے وہ بولا...... تو گل یہ غور کیے بغیر کہ اس کے اس جملے میں نہ روح ہے نہ شدت سنبھل سی گئی اور آنسو صاف کرتی اس کے پاس آ کے بڑی آس سے پوچھنے لگی۔

"مجھے بھی لے جاؤ نا۔"

یاسر نے ہاتھ روک کے اسے دیکھا پھر طنزیہ کہا۔

"کسی کی بیوی بھگا لینے پہ کیا سزا ملتی ہے...... پتا ہے؟"

"میں اس کی بیوی نہیں ہوں۔"

"چلو مان لیا...... یہ بھی مان لیا کہ اس نکاح نامے کی کوئی حیثیت نہیں...... اور یہ بھی مانا کہ تین مہینے اس کے ساتھ رہنے کے باوجود تمہارا اور اس کا کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں...... مگر یہ بات اور کس کس سے منواؤ گی تم۔"

گل خاموش کھڑی رہی۔

"اگر تم یہ اعلان کر دیتی ہو کہ تم اس کی بیوی نہیں ہو اور یہ نکاح جھوٹا ہے تو سب سے پہلی دفعہ تم پہ نافذ ہوگی۔ دھوکا دہی کی اور جعلی نکاح نامہ تیار کروانے کی۔"

گل لڑکھڑا کے ایک قدم پیچھے ہٹی۔

وہ کہتا رہا۔

"اور اس کے ساتھ ساتھ بغیر نکاح کے...... بغیر کسی شرعی رشتے کے ایک کمرے میں ایک چھت کے نیچے کسی غیر مرد کے ساتھ راتیں گزارنے کا گندا اور مکروہ الزام بھی لگے گا اور ان سب سے بچنے کے لیے اور مجھے بچانے کے لیے تم اس جھوٹے نکاح پہ سچ کا پردہ ڈال رکھنا چاہتی ہو تو تمہیں اتنا انتظار تو کرنا ہوگا۔"

گل تھکے ہارے انداز میں پلنگ کے ایک کونے پہ ٹک گئی، اس کی نظریں زمین پہ گڑی تھیں...... پھر اس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔

"کتنا انتظار؟"

"نکاح کا جھانسا دے سکتی ہو تو طلاق بھی دلوا لو اس کے منہ سے۔" یاسر نے بیگ کی زپ بند کی۔

"مگر وہ تو......"

"مشکل ہے؟" یاسر نے اسے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔

"میں جانتا ہوں...... مگر اس کے علاوہ اور کوئی حل مجھے قبول نہیں۔"

"ہاں...... مشکل ہے۔" وہ اٹھی ایک عزم ایک جنون اس کے اندر انگڑائی لے رہا تھا۔

"مگر ناممکن نہیں۔"

"بیسٹ آف لک۔" یاسر نے بیگ کاندھے پہ ڈالا۔

"لیکن میں تب تک یہاں بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ جب کام ہو جائے...... تو بلوا لینا مجھے۔"

"رکو یاسر!"

گل کے پکارنے پہ وہ دروازے کے پاس جاتا جاتا رکا مگر مڑ کے اسے دیکھنا گوارا نہیں کیا۔

"چار دن...... صرف چار دن دو مجھے...... چار دن کے اندر اندر میں تمہاری یہ فرمائش پوری کر دوں گی...... اور اس کے بعد بھی تم مجھے لینے یہاں مت آنا۔"

یاسر مڑ کے اسے دیکھنے پہ مجبور ہو ہی گیا۔

"اب گل تمہارے پاس آئے گی۔ تمہیں لینے، چار دن یاسر! صرف چار دن۔"

☆======☆======☆

ٹیپو دونوں گھٹنے پیٹ کے ساتھ لگائے زمین پہ سکڑا بیٹھا تھا۔ بڑے بڑے دیدے اندر کو دھنسے ہوئے تھے، جسم کپکپا رہا تھا وہ نشہ ٹوٹنے کی حالت میں تھا اور گل اس کے بالکل

سامنے صوفے پہ بیٹھی سکون سے اسے دیکھتی سیب کھا رہی تھی۔

''گل! تھوڑا سالا دے...... بس تھوڑا سا۔''

''لے یہ سیب لے لے۔''

''نہیں یہ نہیں وہ لا دے۔'' وہ گڑگڑا رہا تھا۔

''کھانا ختم ہوگیا۔''

''تو لے آؤ بازار سے...... یا مجھے بتا دو میں خود لے آؤں۔'' وہ سسکیاں لے لے کر

زاری کر رہا تھا۔

''شور مت کرو...... میرے سر میں درد ہے۔''

''اور میرے سارے جسم میں درد ہے...... دیکھو اللہ کے واسطے تھوڑا سا ذرا

دے۔''

''اب کون اتنی رات کو نکلے۔''

گل نے تھکن بھرے لہجے میں کہتے انگڑائی لی۔

''میں لے جاؤں گا تجھے بتا...... کہاں سے ملے گا؟''

وہ خود کو گھسیٹتے ہوئے اس کے پاس آیا۔

''بتا دوں؟''

''ہاں...... ہاں۔''

''وہ تو...... ہاں وہ نہیں۔'' گل کچھ سوچنے کی اداکاری کرنے لگی۔

''اوہو بھول گئی۔''

ٹیپو غصے سے اسے دیکھتا گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گل نے اسے تپانے کے

مسکرا کے پچکارا تو طیش میں آ کے اس نے پاس رکھا گلاس اٹھا کے پھینک دیا۔

''اتنا غصہ...... اوہو اب تو تمہاری بات ماننی پڑے گی۔'' گل نے کہتے ہوئے

سے ایک پڑیا نکالی، جسے دیکھ کے ٹیپو کی وحشت بھری آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی

سے اس کی جانب لپکنے لگا۔ گل نے فوراً بند مٹھی پیچھے کر لی۔

''یہ تمہیں دوں گی تو مجھے کیا دو گے؟''

''جو تُو کہے گی دوں گا۔''

''اور اگر نہ دوں تو؟'' وہ مزے لے رہی تھی۔

''تو ماروں گا تجھے۔'' وہ وحشت سے یا۔

''واقعی...... باپ رے...... پھر تو......''

اس نے پڑیا کھولی اور ٹیپو کے چہرے کے سامنے کر کے پھونک مارتے ہوئے سب اُڑا

دی۔

☆======☆======☆

حلیمہ، جہاں آرا کی ٹانگیں دبا رہی تھی اور ان ہی کے لحاف میں دبکی بیٹھی تھی، صغیر احمد

نزدیک ہی کرسی پہ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''پھر کیا سوچا تم نے؟''

''غور کر رہا ہوں اماں!''

''اتنا غور و فکر کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ جتنا چھانو گے اتنے کنکر نکلیں گے۔''

''پھر بھی...... بیٹی کا معاملہ ہے میں کچھ تذبذب......''

''مجھ سے زیادہ دنیا دیکھی ہے تم نے؟''

''نہیں اماں...... میں تو صرف......'' وہ الجھے تھے۔

''مجھے تو یاسر میاں کے علاوہ نرمین کے لیے کوئی مناسب لگ ہی نہیں رہا۔''

''مگر اماں...... وہ؟ وہ تو۔''

حلیمہ سن کر پریشان ہو اٹھی۔

''کیا وہ تو؟'' جہاں آرا نے گھور کے دیکھا۔

''خبردار، جواب کوئی الٹی سیدھی ہانکی تو۔''

''وہ بہت غصے والے ہیں۔''

''مرد ذات کو غصہ جچتا ہے۔ اور پھر یاسر میاں کو تو میں نے ہمیشہ بہت تحمل سے بات

کرتے دیکھا ہے...... تم نے کب غصہ دیکھ لیا...... کیا خواب میں؟''

''نہیں خواب میں تو نمو کے ابا آتے ہیں بس۔'' وہ شرما کے بولی۔

''اوہو...... چپ رہو تم باؤلی...... بیچ میں دخل مت دو۔ ہاں تو صغیر میاں تم بات کر کے

تو دیکھو، بہانے سے ٹٹولو۔''

''دیکھتا ہوں اماں!'' وہ ٹالنے لگے۔ ''ابھی تو اس کا ارادہ پھر سے ملک سے باہر جانے

کا ہے۔''

''جا رہا ہے؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''مگر وہ تو یہیں رہنے والا تھا۔''

"کچھ دنوں کے لیے جائے گا۔ دو تین ہفتوں کے لیے شاید...... دراصل ویزا اس کا ہوا ہے، کچھ جان پہچان کے لوگ بھی ہیں اس کے وہاں اس لیے میں نے ہی کہا کہ مشینری اور دوسرا سامان چائنا سے گھٹیا منگوانے کے بجائے خود جا کے وہاں سے خرید لاؤ...... بینک سے رقم ملتے ہی چلا جائے گا یہی کوئی بیس پچیس دنوں تک۔"

"ہوں تو پھر دیر مت کر...... جلدی سے بات کر ڈال۔ پردیس کا کیا بھروسہ...... ہفتوں میں جانے کیا سے کیا ہو جائے۔ ایسے لڑکے جن کے نہ کوئی آگے ہو نہ پیچھے اور پیروں پہ بھی کھڑے ہوں، بہت سے لوگوں کی نظروں میں ہوتے ہیں۔"

اس وقت باہر سے کچھ عجیب سی آوازیں آئیں...... جیسے کچھ گرا ہو...... بہت سے قدموں کے بھاگنے کی آوازیں۔

حلیمہ نے سہم کے...... اور صغیر احمد اور جہاں آرا نے حیرت اور تشویش سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر گل کے چیخنے پہ صغیر احمد نے بوکھلا کے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ رکھا اور باہر لپکے...... حلیمہ نے سہم کر ساس کے پیچھے دیکھنا چاہا مگر وہ اسے پرے ہٹاتیں خود بھی پلنگ سے اترنے لگیں۔

☆======☆======☆

"یہ کام تُو یہاں بیٹھے بھی کر سکتا ہے یار......! میں بھجوا دیتا ہوں مال۔"

اس کے دوست نے مشورہ دیا۔ جو پردیس میں واحد واقف کار تھا...... اور جس سے رات کے اس پہر وہ فون پہ بات کر رہا تھا۔

"اس کے لیے تمہارا آنا ضروری نہیں، بے کار میں ٹکٹ پہ خرچہ کرو گے۔"

"بعض اوقات بڑے نقصان سے بچنے کے لیے چھوٹے چھوٹے نقصان کرنے پڑتے ہیں۔"

"کھل کے بات کرو یار!"

"کچھ باتیں نہ ہی کھلیں تو اچھا ہے...... بس یہ سمجھ لو میرا فرار بہت ضروری ہے۔"

"تم شادی کر لو۔" دوست نے ہنس کر مشورہ دیا۔

"پھر اِدھر اُدھر فرار کے لیے بھاگنا نہیں پڑے گا...... پکی زنجیر پاؤں میں پڑ جائے گی۔"

"بعض زنجیریں پاؤں میں نہیں...... گلے میں پڑ جاتی ہیں۔"

"لگتا ہے آج تمہارا ارادہ مجھے بور کرنے کا ہے۔ خیر ایک دفعہ پھر مشورہ دوں گا کہ ایک...

...جاؤ...... ابھی جو کاروبار شروع بھی نہیں کیا، جس گھر کی ابھی بنیادیں اٹھائی ہیں۔ ان کو کسی دوسرے کے آسرے نہ چھوڑو۔"

"مشورے کا شکریہ۔"

"یعنی تم نہیں مانو گے۔ ویسے ایسا کیا ہونے والا ہے وہاں، جو تم بھاگ کے یہاں آنا ...ہے ہو۔"

اس کے سوال کا جواب دینا یاسر کے لیے ممکن نہیں تھا، اس لیے اس نے ریسیور رکھ دیا ...کے رہ گیا۔

"ہونے تو والا ہے...... میں یہاں رہوں نہ رہوں مگر کم از کم کچھ عرصہ منظر سے غائب ...ہے میں اس ذلت کا حصہ دار تو نہ بنوں گا۔"

☆======☆======☆

صغیر احمد نے آنگن میں کھڑے ٹیپو کو وحشیانہ انداز میں چلاتے اور چیزیں اٹھا اٹھا کے ...دیکھا۔ پھر ان کی نظریں فرش پہ اوندھی گری گل پہ پڑیں۔ جو اونچی آواز میں رو رہی ...ٹیپو نے اسے بے تحاشا گالیاں دیتے ہوئے پاس رکھی کرسی اٹھائی اور قریب تھا کہ گل پہ ...مارتا کہ صغیر احمد نے تیزی سے آگے بڑھ کے اس کے ہاتھ سے لے کر پرے پھینکی۔

"پاگل ہوئے ہو؟"

مگر وہ ناقابلِ فہم آوازیں نکالتا دوبارہ کرسی اٹھانے لگا۔ صرف صغیر احمد ہی نہیں...... اپنے کمروں میں سونے کی تیاری کرتے باقی نفوس بھی آ چکے تھے اور حیرت سے یہ تماشا ...رہے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جہاں آرا نے گرج کر کہا۔ مگر اب ٹیپو صحن میں رکھی کچھ اینٹیں ...بھاگ کر اٹھانے لگا اور ایک ایک کی جانب پھینکنے لگا۔ سب چیخیں مارتے پیچھے ہٹے۔ ...احمد خود کو بچاتے آگے بڑھے، جہاں آرا نے گل کو زمین سے اٹھانے کی کوشش کی۔

"کیا ہوا ہے اس کٹ کھنے کو؟"

گل نے سسکی دباتے ہوئے...... لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ صحن کا رخ کیا، جہاں ...احمد ٹیپو کے بازو پیچھے کی جانب موڑ کے اسے قابو کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے ...اینٹ تھی، ٹیپو نے گل کو اپنی جانب آتے دیکھا تو پوری وحشیانہ شدت کے ساتھ خود کو ...تے ہوئے اینٹ گل کو دے ماری۔ وہ ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے درد سے چلاتی نیچے بیٹھ گئی۔

"ہائے...... مار ڈالا غریب کو۔"

جہاں آرا سینے پہ ہاتھ رکھ کے لہرا کے ایک طرف گرنے لگیں۔ کچے صحن کی مٹی پر
خون کے قطروں نے صغیر احمد کو بے چین کر دیا اور انہوں نے ایک زور کا تھپڑ ٹیپو کو دے مارا

☆======☆======☆

چھنو برگر کھاتے ہوئے ساجد کے ساتھ جڑ کے بیٹھی، اس کے ہاتھ میں پکڑے مو
فون کو دیکھ رہی تھی۔

"یہ دیکھو...... کیسی زبردست تصویر آئی ہے۔"

"میں ہوں ہی زبردست۔" وہ اترائی۔

"وہ تو میں مانتا ہوں...... اور ایک ایک سے منواؤں گا۔"

"ایک ایک سے؟" وہ چونکی۔

"تمہاری تصویر دکھاؤں گا...... اپنے دوستوں کو اور اتراؤں گا...... کہ کیا معشوق
ہے میں نے۔"

"تمہیں کون سا قدر ہے اپنی معشوق کی...... ہو تو بڑے کنجوس...... مجھے بے کار
سے تحفے اور اپنے پاس دیکھو ذرا کیمرے والا موبائل وہ بھی اتنا مہنگا۔"

"میں ہمیشہ اچھی چیز رکھتا ہوں۔"

وہ پُراسرار طریقے سے مسکرایا۔

"یہ مجھے دو...... اپنی تصویریں لوں گی۔" وہ موبائل چھیننے لگی۔

"آں...... ہاں ابھی نہیں۔" اس نے ہاتھ پرے کیا۔

"بس؟ اتنا سا دل ہے؟"

"دل کی بات نہ کرو...... دل کہاں سے بیچ میں آ گیا۔"

"تمہاری یہی بات اچھی لگتی ہے مجھے...... ورنہ لڑکے توبہ ہاتھ پکڑا اور
لگتے ہیں۔ سیدھے شادی تک جا پہنچتے ہیں۔ بھلا بغیر کسی کو جانے پرکھے شادی ہو سکتی
میں تو خوب ٹھونک بجا کے پرکھوں گی۔ پھر یہ فیصلہ کروں گی۔"

"اچھا...... وہ جو تمہاری سہیلی تھی۔ وہ نہیں آئی دوبارہ۔"

"میرا نکلنا پھر بھی آسان ہے۔ اس کا نہیں شادی شدہ ہے وہ۔"

"شادی شدہ لگتی تو نہیں۔"

"کیوں شادی کے بعد سینگ نکل آتے ہیں عورتوں کے اور تم کیوں اتنی

"مجھے تو پڑی ہو...... میں تو سوچ رہا تھا اپنے کسی دوست سے سیٹنگ کرادوں اس کی۔"

"اگر وہ پہلے ہی کسی کے ساتھ سیٹ ہے، ویسے ہی گھنی...... بتاتی کچھ نہیں، ارے
نے ایک خوراک اور منگائی ہے۔"

"پیسے بھجوائے ہیں یا؟"

"ہاں بھجوائے تو تھے مگر...... خرچ ہو گئے مجھ سے۔"

وہ کہہ کر ناز سے اسے دیکھنے لگی۔

ساجد دل ہی دل میں تلملایا تو بہت...... مگر مسکراہٹ میں کڑواہٹ کو لپیٹ گیا۔

"کسی دن تُو خرچ ہو جائے گی میرے ہاتھ سے۔"

☆======☆======☆

"آپاں! کہاں غائب ہو صبح سے؟"

خورشید نے تولیے سے منہ خشک کرتی جنت کو مخاطب کیا جو افسردگی سے آہ بھر کے رہ

"یہیں ہوں صبح سے، مصلے پہ بیٹھی دعائیں مانگ رہی ہوں۔"

"اپنی نوں کے لیے؟"

"بھاڑ میں جائے کلموہی!"

جنت بیگم کے لہجے کی رقت غائب ہو گئی۔

"دعائیں اور اس کے لیے میں تو اس کے منہ پہ تھوکتی بھی نہیں۔"

"بے چاری کا سر پھٹ گیا ہے میں ابھی دیکھ کے آ رہی ہوں۔" خورشید نے افسوس

جنت بیگم سر جھٹکتے ہوئے بیٹھ گئیں۔

"برا لگتا ہے آپاں...... تجھے بھی جا کے پوچھنا چاہیے۔ اس کا حال پتا کرنا چاہیے۔ صغیر
کروا کے لایا ہے۔"

"تو میرے سرہانے بیٹھ کے اس کی میت کیوں پیٹنے لگی ہے۔ خدا کی پھٹکار اس پہ
آئی ہے میرا بچہ آدھا ہو کے رہ گیا ہے۔ چہرے کی رونق ختم ہو گئی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ بھی متفق تھی۔

"ٹیپو اب وہ ٹیپو نہیں رہا۔ اس نے رات کو جو کچھ کیا، وہ پہلے کبھی نہیں کیا...... ہورے کیا
اٹھا اٹھا کے چیزیں مار رہا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے جن آ گیا تھا اس پہ۔"

"جن نہیں چڑیل ایسی چمٹی ہے وہ ڈائن کہ......"

"ویسے آپس کی بات ہے آپاں! صغیر احمد کو میرے ٹیپو پہ ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ وہ بھی ہے وہ بے چارہ ہے تو اللہ لوک...... اسے اتنی عقل کہاں...... میرا تو کلیجہ کانپ گیا جب اس کے گال پہ چپیڑ پڑی۔"

"کتنی بار کہا ہے خورشید! کہ ماں سے زیادہ لاڈ جتانے والی پھاپھا کٹنی ہوتی ہے۔ جب میرا کلیجہ نہیں پھٹا تو تیرا کیوں کانپے جائے ہے۔ نوٹنکی۔"

پھر ذرا سمجھانے کے انداز میں کہنے لگیں۔

"اور صغیر میاں بڑے بہنوئی ہیں...... باپ کی جگہ ہیں۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو ایک کے بجائے دس لگاتی۔ وہ دھواں دار پٹیتی کہ سارا باؤلا پن بھول جاتا۔"

"جواب نہیں آپاں تیرا...... لوٹا بننے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگتی تجھے۔ ابھی ٹیپو کے لیے اتھرو بہا رہی تھی، اب ٹُٹ لگانے کے پروگرام بن رہے ہیں۔"

"میں کہے دیتی ہوں خورشید......! مت لگو میرے منہ۔" جنت بیگم نے جائے نماز بچھاتے ہوئے تنبیہ کی۔

"پہلے ہی دل کباب ہو رہا ہے میرا۔"

اور ان کے نیت باندھتے ہی خورشید بھی گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھی۔

"کباب کھائے بھی کتنے دن ہو گئے۔ منحوس وہی مونگ کی دال پتلی بچ بچی...... روز ہی پک جاتی ہے۔"

☆======☆======☆

چوڑیوں کی آواز پہ ٹیپو نے سر اٹھایا۔

سامنے گل کھڑی تھی...... ماتھے پہ پٹی بندھی...... کہنی پہ لال دوائی لگی تھی...... آنکھوں کے نیچے حلقے...... چہرے کی رنگت زرد...... وہ پریشان ہو گیا۔

"مم...... میں نے...... میں نے کچھ نہیں کیا۔"

گل ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"اچھا تو کس نے کیا ہے؟"

"میں نے نہیں مارا اللہ قسم۔"

"مت کھاؤ جھوٹی قسمیں...... سارے گھر نے دیکھا ہے تمہیں مجھے مارتے ہوئے بھی میں ابھی تک میرے خون کے قطرے گرے ہیں۔"

"خو...... خون؟"

"ہاں...... خون۔" گل نے ماتھے پہ بندھی پٹی پہ ہاتھ پھیرا۔ ٹیپو ذرا سا آگے سرکا ڈرتے ڈرتے ہاتھ آگے کر کے گل کے زخم کو چھونا چاہا۔

"یہ...... یہ میں نے...... میں نے مارا تمہیں؟"

اس کی آواز کپکپا گئی جیسے زور کا رونا آ رہا ہو۔ گل کے اثبات سے سر ہلانے پہ وہ بلک کے رو دیا اور روتے روتے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔

"میں نے کیسے مارا تمہیں؟ کیسے خون نکالا تمہارا...... میں تو پیار کرتا ہوں تم سے۔ اللہ قسم! میں نے کیوں مارا مجھے معاف کرو گل معاف کر دو۔"

گل نے اپنی گود سے اس کا سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کر دیا......"

"سچی......؟" وہ آنسو پونچھنے لگا۔

"کتنی اچھی ہو تم۔"

"مگر باقی لوگ اتنے اچھے نہیں...... وہ شاید تمہیں معاف نہ کریں۔"

ٹیپو کے چہرے پہ پھر سے گھبراہٹ اور سراسیمگی نظر آنے لگی۔

☆======☆======☆

"کمرے میں داخل ہوتے ہی صغیر احمد ٹھٹک کے رہ گئے۔ حلیمہ چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا؟" وہ پاس بیٹھ گئے۔

"بتاتی کیوں نہیں...... کہیں درد ہے؟"

حلیمہ نے روتے ہوئے انکار میں سر ہلایا۔

"پھر...... اماں نے کچھ کہا؟"

دوبارہ انکار میں سر ہلایا گیا۔

"اماں نے کہا ہوتا تو تم فخریہ انداز میں مسکرا رہی ہوتیں۔ جیسے کوئی تمغہ سینے پہ سج گیا ہو۔" اپنے آپ سے بڑبڑا کے کہنے کے بعد صغیر احمد نے ذرا ڈپٹ کے کہا۔

"تکلیف کیا ہے حلیمہ؟"

"آپ نے ٹیپو کو مارا۔"

"تم تب سے رو رہی ہو؟ کل رات سے۔"

''نہیں ابھی رونا آیا ہے۔''

''حد ہے۔'' وہ چڑ کے اٹھے۔ ''رونا تو مجھے بھی آتا ہے۔ اپنی قسمت پہ۔''

''اسے بھی تھپڑ پڑا ہے؟'' حلیمہ نے تعجب سے پوچھا۔

''نہیں اسے تھپڑ نہیں دھکا لگا ہے۔ اندھی کھائی میں گری ہوئی ہے بائیس سالوں سے۔''

اور کھڑکی کے پاس جا کے سگریٹ سلگانے لگے۔ صحن کے اندھیرے میں درخت کے پاس گل بیٹھی نظر آئی۔ جھکے سر کے ساتھ اپنی چوڑیوں سے کھیلتی کچھ سوچ رہی تھی...... صغیر احمد دھوئیں کے مرغولے کے پار نظر آتے اس کے ہیولے کو تاسف سے دیکھ رہے تھے کہ حلیمہ کے اندر تجسس جاگا۔

''باہر کیا ہے؟''

''میری ہی طرح کوئی اور......'' صغیر احمد نے آہستہ آواز میں کہا۔

''اس کی قسمت بھی اندھی کھائی میں جا گری ہے۔''

☆======☆======☆

یاسر الجھی نظروں سے اپنے سامنے کھڑی گل کو دیکھ رہا تھا۔ ماتھے سے پٹی اتر چکی تھی۔ مگر زخم کا نشان موجود تھا۔ مرہم کے لیپ کے نیچے سے بھی جھانک رہا تھا۔ ہونٹ کے پاس ایک نیلا نشان اور فخریہ انداز میں اپنا بازو اس کے سامنے کیے وہ کہنی کا زخم دکھا رہی تھی...... وہ دو تین دن سے صغیر احمد کے ہاں نہیں گیا تھا، اس لیے تازہ ترین حالات سے ناواقف تھا۔

''اب یہ کون سا نیا ڈرامہ ہے؟''

گل کی داد طلب مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

''ڈرامہ...... میں تو......''

''خدا کے لیے گل...... کم از کم مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرنا۔''

''میں تم سے جھوٹ بولوں گی...... میں تمہارے لیے تو سو جھوٹ بول سکتی ہوں یاسر! گل تم سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔ تمہیں میرا یقین نہیں ہے۔''

''تھا...... ایک وقت تھا گل...... جب مجھے خود سے زیادہ تم پہ، تمہاری محبت پہ یقین تھا لیکن اس اعتبار کو تم نے خود کھویا ہے گل! تم سر سے پیر تک جھوٹ میں لتھڑ گئی ہو۔ میں نے جس گل کو چاہا تھا، وہ تم نہیں ہو...... وہ گل تو بہت خالص تھی۔ تم میں ملاوٹ ہو چکی ہے۔''

''میں آج جو بھی ہوں جیسی بھی ہوں۔ تمہاری وجہ سے ہوں، تمہاری محبت نے کر دیا

پھر یہ حال۔''

''اگر میری محبت نے تمہیں اس طرح برباد ہی کرنا ہے تو......'' یاسر نے ایک گہری سانس لی اور اس سے نظر چراتے ہوئے فقرہ مکمل کیا۔

''تو پھر چھوڑ دو مجھ سے محبت کرنا۔''

گل سکتے میں آ گئی...... کسی بت کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

یاسر نے رخ موڑا...... وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا پا رہا تھا، اس سے قدم بہ قدم دور ہوتے ہوئے کہنے لگا۔

''کیا دیا ہے اس محبت نے تمہیں کیا ملا ہے؟ بولو۔''

گل تڑپ گئی اور بھاگ کر یہ چند قدم کا فاصلہ طے کرتے ہوئے اس کی پشت سے لگ گئی۔

''تم...... تم ملے ہو مجھے۔''

یاسر نے اپنے کاندھے سے اس کے ہاتھ ہٹائے اور پلٹ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اور مجھے، مجھے کیا ملا؟''

گل ششدر رہ گئی۔

☆======☆======☆

صغیر احمد پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ جہاں آرا فکر مندی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ دور ٹیپو کے بند کمرے سے اس کے چلانے اور رونے پیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا...... اس لڑکے کو ہوا کیا ہے؟''

''میں تو دیکھتی ہوں...... کھسکا ہوا تو وہ شروع سے تھا۔ اب شاید پاگل پن پوری طرح ابھر آیا ہے اس کا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ اتنا خطرناک دورہ صرف اس کی بیوی کے لیے ہی نہیں۔ ہم سے کسی کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔''

''مجھے تو فکر لاحق ہو گئی ہے کہ اب ہو گا کیا......''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں اسے۔''

''اے لو میاں!'' وہ بگڑ گئیں۔ ''مجھے اس کے علاج کی فکر کا ہے کو ہونے لگی۔ مجھے تو نمو لگی ہے۔''

"نمو کی؟"

"ساری ذات برادری، آس پڑوس کی خبر ہے کہ حلیمہ کا اور اس کے بھائی کا پیدائشی دماغ کمزور ہے۔ اب اگر ماموں پاگل بھی مشہور ہو گیا تو لوگ یہی سوچیں گے کہ اس خاندان میں یہ مرض ہے آج بھائی پاگل ہوا ہے۔ کل بہن کو دورے پڑیں گے اور کیا پتہ ماں سے بیٹی میں......"

"آپ اتنا دور تک کیوں سوچ رہی ہیں؟" صغیر احمد نے ناگواری سے ٹوکا۔

"سوچنا پڑتا ہے میاں...... جب بیاہنے کے لائق بیٹی گھر بیٹھی ہو تو بہت آگے کا سوچنا پڑتا ہے۔"

صغیر احمد پیشانی پہ بل لیے کسی گہری سوچ میں چلے گئے۔

"اس سے پہلے کہ یہ بات پھیلے...... میں تو کہتی ہوں کہ نمو کے بارے میں کوئی فیصلہ کر لو۔"

☆======☆======☆

"اب احساس ہو رہا ہے تمہیں کہ مجھ سے محبت کر کے تمہیں کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔"

گل کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور لہجے میں بھی آنسوؤں کا گیلا پن تھا۔

"کیا محبت کچھ حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے یاسر؟"

"نہیں...... لیکن محبت سب کچھ کھو کر خالی ہاتھ ہو جانے کے لیے بھی نہیں کی جاتی۔"

"میں دوں گی تمہیں یاسر!" گل نے اس کا ہاتھ تھام کر منت کی۔ "سب کچھ دوں گی۔ یاد ہے تمہیں، تم کہا کرتے تھے کہ مجھے پا کے تمہیں دو جہانوں کی دولت مل گئی ہے۔"

"وہ کل کی بات تھی گل! آج کی بات کرو۔"

"اور آج کی بات یہ ہے کہ گل تمہیں آج بھی پانا چاہتی ہے۔ ہر حال میں، ہر قیمت پہ۔"

"یہ جو ہر حال میں اور ہر قیمت پہ اپنی منوانے کی عادت ہے ناں تمہاری یہی بری لگتی ہے مجھے۔"

"کبھی میری ان ہی عادتوں سے تمہیں محبت تھی۔"

"اب نہیں ہے۔" یاسر نے منہ پھیر لیا۔ یہ وہی جانتا تھا یہ تین الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے اس کا دل کتنی شدت سے احتجاجاً پھڑپھڑایا تھا۔

"محبت بھوک نہیں ہے جو کبھی لگی اور کبھی نہیں لگی۔"

وہ حلق پھاڑ کے چلائی ویسے بھی یہاں کس کے سننے کا ڈر تھا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" وہ بھی چلایا۔

"محبت ہے گل محبت، بھوک نہیں ہے جسے ہر حال میں ہر قیمت پہ کچھ بھی کر کے مٹانا ہے۔"

"محبت اور جنگ میں سب جائز ہے یاسر!"

"یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں...... میں محبت کو جنگ سے الگ سمجھتا ہوں، تم بھی محبت اور جنگ میں فرق کرنا سیکھو۔"

"سیکھ لوں گی، جو تم کہو گے وہ کروں گی۔ بس یوں آدھے راستے میں ہاتھ نہ چھڑاؤ مجھ سے، دیکھو یہ دیکھو یہ زخم دیکھو میرے یہ سب تمہارے لیے ہی برداشت کر رہی ہوں میں...... بڑا سا انتظار، تھوڑا سا صرف چار دن تو مانگے تھے تم سے یاسر...... چار دن! اور ابھی ایک دن باقی ہے پورا ایک دن۔"

یاسر نے ایک نظر اس کے زخموں پہ ڈالی وہ پگھلنے لگا تھا۔ نہیں جانتا تھا وہ کیا کر رہی تھی، جو بھی کر رہی تھی اسے پسند نہیں تھا۔ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا لیکن...... لیکن وہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔

☆======☆======☆

ٹیپو تکیہ سینے سے لگائے، اکڑوں بیٹھا، ناخن چباتا سخت دہشت زدہ لگ رہا تھا۔

گل نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی۔

"یقین نہیں آ رہا، نہ مانو تب پتہ چلے گا جب......"

"چل چل...... جا یہاں سے جھوٹی۔"

ٹیپو سراسیمہ ہو کر دونوں ہاتھوں سے اسے پیچھے کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"ابھی میں جھوٹی ہوں، جب پاگل خانے کی گاڑی آئے گی اور صغیر احمد تمہیں اٹھا کے اس میں ڈالیں گے اور پاگل خانے والے تمہیں ڈنڈوں سے مارتے لے جائیں گے، جا کے وہاں کی یہ موٹی موٹی زنجیروں سے جکڑیں گے تا کہ تم بھاگ نہ سکو تب میری بات یاد آئے گا۔"

"پاگل خانے کی زنجیریں ڈنڈے۔"

"ہاں میں نے خود سنا ہے...... سب تمہیں وہاں بھیجنے کا پروگرام بنا رہے ہیں، وہاں

تمہیں بند کر کے رکھا جائے گا۔ یہ لمبے لمبے ٹیکے لگیں گے، نہ کھانے کو کچھ ملے گا، نہ پینے کو......ایسی ایسی مار لگے گی کہ بس۔"

"مجھے نہیں جانا میں نہیں جاؤں گا۔" وہ رونے لگا۔

"سب تمہیں بھیج کے رہیں گے پتا ہے کیا۔ کوئی نہیں چاہتا تم میرے ساتھ رہو، جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہاری بیوی ہوں۔ تمہاری ایسی ہی شامت آئی رہے گی۔"

ٹیپو نے چونک کر بے یقینی سے اسے دیکھا۔

گل نے لوہا گرم دیکھ کے مزید ہمدردی جتلائی۔

"میری مانو تو دفع کرو مجھے، پیچھا چھڑا لو کسی طرح مجھ سے، تم خوب صورت ہو۔ جوان ہو ایک سے ایک لڑکی ملے گی تمہیں ریما اور صائمہ جیسی خوب صورت ان سے زیادہ اچھا ڈانس کرنے والی، جان بچاؤ بس کسی طرح اپنی۔"

ٹیپو سر ہلانے لگا۔

گل نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

"شکر ہے بات اس کی موٹی عقل میں اتری تو......بس کسی طرح سارے گھر کے سامنے تین لفظ کہہ دے مجھے، خیر ابھی اسے رٹا دوں گی طوطے کی طرح بولنے لگے گا تین بار کیا، تین سو بار کہے گا۔"

☆======☆======☆

"آپ بلا جھجک کہیے...... برا ماننے والی کیا کبھی آپ نے صغیر بھائی، میں اور آپ کی کسی بات کا برا مانوں گا؟"

یاسر نے ان کے سامنے کولڈ ڈرنک رکھتے ہوئے کہا۔ وہ پہلی بار اس کے فلیٹ پہ آئے تھے اور بات کرتے جھجک رہے تھے۔

"اصولاً تو بیٹی کا باپ ہونے کے ناطے مجھے یہ بات خود نہیں کہنی چاہیے مگر چونکہ میں دل سے تمہیں اپنا بھی مان چکا ہوں۔ اس لیے تکلف میں پڑنے کی بجائے سیدھے سادے الفاظ میں پوچھتا ہوں۔"

وہ اتنا کہہ کے رکے یاسر دم بخود سن رہا تھا۔

"میں تمہیں اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں اور میرا ہی نہیں ہمارے پورے گھر کا خیال ہے کہ ہمیں اپنی بیٹی کے لیے تم سے بہتر اور کوئی نہیں مل سکتا، تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میں...... میں خوش قسمت ہوں۔ جو آپ نے میرے بارے میں سوچا لیکن مجھے

سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔"

"ضرور......ضرور جتنا جی چاہے وقت لو۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اپنی الجھنوں میں گرفتار یاسر انہیں بیٹھنے پہ اصرار تک نہ کر سکا۔

"سوچنے کے لیے وقت۔"

ان کے جانے کے بعد وہ چونکا۔

اپنی ہی بات یاد آئی تو پھر سے الجھ گیا۔

"کیا سوچنے کے لیے؟ کیا گل کے ہوتے ہوئے کسی اور کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہے؟"

اس نے سگریٹ سلگا رکھی تھی۔ مگر اپنے خیالوں میں گم وہ اسے یکسر بھول چکا تھا۔ انگلی کا جلا تو چونک اٹھا اور سگریٹ پرے پھینک کر اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے۔

"یہ کیا کیا میں نے صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ میں یہ نہیں کر سکتا کیوں نہ انکار کیا؟ یا صرف اس لیے کہ میں صغیر بھائی کی عزت کرتا ہوں یا کیا اس لیے کہ میں ان کے ساتھ کاروبار کر رہا ہوں کیا مجھے اپنے سرمائے کے حوالے سے خدشات تھے جو میں صاف انکار کرتے ہوئے گھبرا گیا؟ یا پھر یا پھر؟"

اس یا پھر کے آگے جو سوالیہ نشان تھا وہ اسے اپنے آپ سے نظریں چرانے پہ مجبور کر رہا تھا۔

"میں......میں منع کر دوں گا۔"

اس نے مضبوطی سے سوچا۔

"تو وہ یہ نہ کہیں گے کہ انکار ہی کرنا تھا تو پہلے سوچنے کا وقت کیوں مانگا۔"

اندر سے کسی نے اسے کمزور کیا۔

"یہ کہہ دوں گا کہ......کہ......کہ......"

مگر بہت سوچنے کے بعد بھی کوئی بہانہ کوئی جواز ذہن میں آیا جسے وہ اپنے گریز کی وجہ کے طور پہ بیان کر پاتا۔

"بہت غلطی کی میں نے فوراً معذرت پیش کر دیتا تو شاید نہ کسی بہانے کی ضرورت پڑتی تھی......لیکن۔"

وہ اتنا الجھ چکا تھا کہ ذہن اپنی ہی کسی بات کسی خیال پہ ٹھہر نہ رہا تھا۔

☆======☆======☆

آج گل نے کمال مہربانی کرتے ہوئے ٹیپو کو ذرا سی خوراک دے ہی دی تھی ویسے بھی وہ کافی حد تک اسے راہ پہ لا تو چکی تھی۔ نشہ نہ ملنے کی وجہ سے پہلے وہ وحشی ہوا پھر بے بس ہو کر اس نے گل کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

گل اس کے لیے دودھ گرم کر کے کمرے میں لے جا رہی تھی سوچا تھا گرم دودھ کے ساتھ میٹھا ٹھنڈا گجریلا کھلا کے اسے اس بات پہ رضامند کر لے گی کہ سب کے سامنے بس یہ تین لفظ چلائے وہ سب کے سامنے اُگل دے کسی کو یہ بتائے بغیر کہ یہ بات گل نے سکھائی ہے اور اسے پوری امید تھی ٹیپو ایسا ہی کرے گا...... پاگل خانے لے جانے کی دھمکی ہی کافی تھی۔

ٹرے لے کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو ٹیپو کہیں نہیں تھا۔

''کہاں گیا مصیبت کہیں اِدھر اُدھر بیٹھا بے پَر کی نہ ہانک رہا ہو مشکلوں سے اس کا دماغ لائن پہ لگایا تھا کہیں پھر سے نہ الٹ جائے۔

وہ ٹرے تپائی پہ رکھ کے باہر جانے کے لیے مڑی مگر پھر ٹھٹک کے رک گئی۔ تعجب سے الماری کے کھلے پٹ دیکھے ٹیپو کے کپڑوں کا خانہ سارے کا سارا خالی تھا۔

☆======☆======☆

کہاں جانا ہے؟''

کنڈیکٹر اس اول جلول سے حلیے والے لڑکے سے پوچھ رہا تھا جو بڑا سا پھولا ہوا بیگ گود میں رکھے خوف زدہ سا نظر آ رہا تھا۔

''او بھائی! کدھر جانا ہے؟ جانا بھی ہے یا نہیں؟''

''نہیں......نہیں جانا۔''

وہ خوف زدہ سا نظر آتا انکار میں سر ہلاتا کہنے لگا۔

''نہیں جانا؟ تو ویگن میں کیا جھولے لینے بیٹھا ہے؟'' کنڈیکٹر کو بھی اندازہ ہو گیا کہ لڑکا ذرا کھسکا ہوا ہے اس لیے مزے لینے لگا۔

''پاگل خانے نہیں جانا۔''

''یہ ویگن پاگل خانے جا بھی نہیں رہی گولڑہ شریف جا رہی ہے۔''

''کس کے ساتھ دماغ کھپا رہے ہو؟ پاگل لگ رہا ہے یہ، تم اپنا کام کرو بھائی کب ٹکٹیں کٹیں گی۔ کب ویگن چلے گی۔'' کسی سواری نے کہا۔

''پاگل نہیں نشئی ہے آنکھیں دیکھو تو۔''

کسی اور نے توجہ دلائی۔

''اتار واسے......فیملی والے لوگ بیٹھے ہیں نشے والے کا کیا بھروسہ کب کیا کر بیٹھے۔''

اب ایک دو نہیں چھ سات اکٹھے زور دینے لگے۔ کنڈیکٹر نے ٹیپو کو بازو سے پکڑ کر نیچے

''نہیں پاگل خانے نہیں جانا مجھے۔''

اس کے دماغ کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

''تو پھر جلدی سے اتر جا۔ کیونکہ یہ ویگن پاگل خانے ہی جاتی ہے۔''

یہ سن کر ٹیپو نے بیگ سمیت باہر چھلانگ لگائی۔

''نہیں مجھے نہیں جانا مجھے نہیں مار کھانی مجھے نہیں زنجیروں میں بندھنا۔''

وہ بیگ وہیں چھوڑ کے بھاگ گیا۔

''اوئے یہ تھیلا تو لیتا جا۔''

مگر وہ سنے بغیر اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔

☆======☆======☆

منیر احمد نے چند محلے داروں کے ساتھ مل کے آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا تھا میں اعلان کروا دیا تھا دور پرے کے جاننے والوں میں فون بھی گھما دیئے گئے لیکن اس کا پتا نہ چلا۔

''کوئی بات تو نہیں ہوئی گھر میں؟''

انہوں نے فرداً فرداً سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ گل نے گھبرا کے نظریں جھکا لیں۔ کی ہتھیلیاں پسیجی ہوئی تھیں۔

''میں نے کیا کہنا ہے کسی کو اور جب سے اسے دورہ پڑا ہے...... میں تو سامنا ہی نہیں کر تی۔''

جہاں آرا بیگم نے سب سے پہلے صفائی پیش کی۔

''اور میں نمانی کیا کہوں گی میری تو جان اٹکی ہے اس شہدے میں۔''

خورشید نے آنسو بہاتے ہوئے کہا وہ تو ٹیپو کے نہ ملنے کی پہلی خبر سنتے ہی دل چھوڑ بیٹھی

''آپاں سے شاید کوئی بات ہوئی ہو...... آپاں کو خار بھی بڑی تھی اس پہ۔''

''اوقات میں رہ خورشید...... پہلے ہی کہا تھا میں نے کہ مت بھول، اس کی ماں میں

ہوں میں، میں کیوں اپنے بچے کو کوئی بات کہنے لگی اور بھلے کہہ بھی دوں میرا بیٹا ہے وہ میری بات دل پہ نہیں لیتا، ویسے بھی اسے عادت ہے بتائے بغیر کئی کئی روز گھر سے غائب رہنے کی۔"

"پہلے کی بات اور تھی چچی جان!"

"فی الوقت اس کی دماغی کیفیت ٹھیک نہیں تھی۔"

پھر ان کی نظر گل کے رنگ اُڑے چہرے پہ پڑی، جس کا یہ سوچ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اگر ٹیپو پھر سے کئی ہفتے یا کئی مہینوں تک گھر نہ لوٹا تو کیا ہوگا وہ تو لٹک گئی درمیان میں۔

"آپ سے کچھ کہا ٹیپو نے؟" گل چونکی۔

بجلی کی طرح ایک خیال کوندا اس کے ذہن میں۔

"جی۔" اس کے کپکپاتے لبوں سے اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا؟"

"وہ...... وہ جاتے جاتے مجھے......"

اس نے آنسو بھر کے اپنی نظریں اٹھا کے سب کے سوالیہ چہروں کی جانب دیکھا۔

"مجھے...... مجھے طلاق دے گئے۔"

☆======☆======☆

وہ گہری نیند سو رہا تھا، جب فون کی گھنٹی نے اس کے اعصاب کو جھنجوڑ ڈالا...... چند ثانیے تک وہ نیند کے غلبے سے ہی نہ نکل پایا۔ کانوں میں گھنٹی گونج رہی تھی۔ مگر سکت نہیں تھی، پلک سے پلک جدا کرنے کی۔

گھنٹی بج بج کے خود بند ہوگئی...... اس سے پہلے کہ وہ پھر بے خبر ہو جاتا...... اس کے تکیے کے ساتھ رکھے سیل فون نے اودھم مچانا شروع کر دیا...... یہ نزدیک ترین آواز اسے جگانے میں کامیاب ٹھہری۔

بدمزہ سے انداز میں کروٹ لیتے ہوئے اس نے فون کان سے لگایا۔

"ہیلو!" دوسری جانب صغیر احمد تھے، جو اس کی نیند میں ڈوبی بوجھل آواز پہچان نہ پائے۔

"جی...... یاسر بول رہا ہوں......"

کچھ کچھ حواسوں میں آتے ہوئے اس نے تصدیق کرائی، مگر ان کی اگلی ہی بات نے حواسوں کو پھر سے معطل کر دیا۔

"کیا؟"

"مگر...... وہ ہے کہاں؟"

دوسری جانب مختصر جواب کے بعد فون کاٹ دیا گیا تھا مگر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ فون کان سے لگائے اب تک اسی کیفیت میں بیٹھا تھا۔

کمرے کی نیم تاریک خنک فضا میں گل کی ٹھہری ہوئی آواز راستہ بناتی آئی۔

"صرف چار دن یاسر...... صرف چار دن...... چار دن دو مجھے، تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گی میں......"

☆======☆======☆

وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت بیٹھی تھی...... آس پاس کا سارا شور اسے مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند محسوس ہو رہا تھا۔

"سدا کا باؤلا تھا، نہ جانے جنت بیگم کو کیا سوجھی...... کہ ایک جیتی جاگتی لڑکی کو اس کی ... کی بھینٹ چڑھا دیا۔"

کسی دور پرے کی عزیزہ نے کہا، جو اتفاق سے یونہی چلی آئی تھیں اور سامنے یہ تماشا ... تھا۔

"اے ہے تو ماں کے...... ارمان جاگے ہوں گے، آخر نسل بڑھتے دیکھنے کا شوق کسے ... ہوتا۔"

ان کے ہمراہ آئی ایک اور واقف کار نے کہا۔

"رہنے دو کوثر...... اور کون سے ارمان پورے کر دیئے اس نے...... پڑھ لکھ کے نہ ... ٹک کے نہ بیٹھا...... دمڑی کما کے نہ دی...... ایک یہی ارمان رہ گیا تھا پورا کرنے ... اس بے چاری کی تو زندگی برباد ہوئی۔"

جہاں آرا پہلو بدل کے رہ گئیں...... زبان سچ اگلنے کو بے تاب ہو رہی تھی، مگر موقع کی ... چپ رہنے پہ مجبور کر رہی تھی...... وہ ٹھوکے دیتی نظروں سے جنت بیگم کو دیکھے گئیں۔

"ہے کیسی ملوک...... نہ جانے کون سنگ دل ماں باپ تھے جنہوں نے اول جلول سے ... کے ساتھ نکاح پڑھا دیا۔ غربت بھی تھی تو ایسا کیا اندھیرا پڑا تھا...... غریب بھی اپنی ... کو اندھے کنوئیں میں نہیں دھکیلتے۔"

وہ مسلسل ہرزہ سرائی میں مصروف تھیں...... آخر جہاں آرا سے رہا نہ گیا۔

"کیوں اس غریب کو اور اس کے ماں، باپ کو کوس رہی ہو اور جنت دکھیاری کا بھی کیا

دوش...... یہ خود گیا تھا اسے بیانے، ہماری منشا ہوتی تو کبھی ایک ہوش وحواس والی لڑکی کی آونہ سمیٹتے باؤلا خود بیاہ لایا تھا۔''

''ہا......'' دونوں عورتوں نے منہ پہ ہاتھ رکھ لیے۔

''بھاگ کے آئی تھی؟''

''آئے ہائے...... عشق کرنے کو یہی ملا تھا؟''

''اب بھگتو پھر...... لو بھئی...... ہم ایسے ہی ہمدردی میں دبلے ہورہے ہیں...... یہ تو خود کشی کا کیس ہے۔''

اپنی اپنی ہمدردیوں کے ٹوکرے سمیٹتے وہ سب رخصت ہوگئیں۔

''کچھ منہ سے پھوٹو تو سہی...... ہوا کیا تھا؟''

جنت بیگم صبح سے دسویں بار اس پہ پھٹ پڑی تھیں۔

''مجھے نہیں پتا۔''

نو بار اس نے یہ جواب دیا تھا...... مگر اس بار جواب میں صرف خاموشی تھی...... دل میں یہ ڈر تھا کہ اتنا بڑا جھوٹ کہہ تو دیا ہے اگر وہ پھر سے کہیں سے مٹر گشت کرتا نکل آیا تو کیا ہو گا...... سب سچ بتا دیا تو کیا بنے گا؟

سب اس کی بات پہ یقین کریں گے، یا ٹیپو کی......؟

☆======☆======☆

اس کا سامان سڑک پہ کھلا رہ گیا تھا اور وہ سرپٹ بھاگ رہا تھا۔

بھاگتے بھاگتے ٹانگیں شل ہوگئیں تو رک کر ہانپنے لگا۔ اجنبی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا...... نہ جانے کون سا شہر تھا...... کون سی جگہ...... وہ بری طرح گھبرا گیا۔

حالانکہ کسی بنجارے کی طرح اسے نگر نگر گھومتے رہنے کی عادت تھی...... انجانی جگہوں پہ مزے سے کئی کئی دن گزار دیا کرتا تھا لیکن نشے نے اس کے اعصاب کو کمزور کر دیا تھا اور گل کے بٹھائے ہوئے خوف نے بے حد بزدل بنا دیا تھا۔

''بھائی...... بات سنو......''

اس نے کسی راہ گیر کو روکا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

جواب دینے کے بعد وہ بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔

''راستہ بھولے ہو؟''

وہ جلدی سے پہلے اثبات میں، بعد میں انکار میں سر ہلانے لگا۔

''بھوکے ہو؟''

اس بار اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا...... موٹی موٹی وحشت زدہ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔

''چلو میرے ساتھ......''

''کھانا دو گے؟''

''ہاں...... بہت سارا...... اور جب مانگو گے، ملے گا۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں سچ کہہ رہا ہوں...... جب جب جو جو مانگو گے، وہ ملے گا...... بس مانگنے کا طریقہ آنا چاہیے۔''

وہ عجیب طریقے سے مسکرایا۔

☆======☆======☆

یاسر جب سے آیا تھا...... اس کی متلاشی نظریں پورے گھر میں گردش کر رہی تھیں...... سب موجود تھے ماسوائے گل کے......

وہ اس سے ملنا چاہتا تھا...... اس کے چہرے سے حقیقت کھوجنے کے لیے...... مگر وہ نہ جانے کہاں چھپی بیٹھی تھی۔

''لیکن ہوا کیا تھا؟''

اس نے صغیر احمد سے ہی تفصیل جاننا چاہی۔

''یہ تو وہی بتا سکتا ہے...... وہ نہ جانے کہاں منہ چھپائے بیٹھا ہے۔''

''بتانے کو تو گل بھی بتا سکتی ہے، لیکن اس نے بھی منہ میں گھنگھنیاں ڈال رکھی ہیں۔''

جہاں آرا نے کوفت سے کہا اور پھر کوئی خیال آنے پہ یاسر سے کہنے لگیں۔

''اے میاں...... تم کیوں نہیں پوچھتے؟ تمہاری سگے والی ہے۔'' اور یاسر تو جیسے اسی بات کا منتظر تھا۔

☆======☆======☆

''تم آم کھاؤ...... پیڑ کیوں گنتے ہو؟''

گل نے ہلکی سی...... مگر تھکی ہاری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے اسے کس طرح مجبور کیا؟''

''کوئی کسی کو کس طرح مجبور کرتا ہے؟''

گل نے الٹا سوال کیا۔

''بولو..... تم تو جانتے ہی ہوگے؟ تمہیں تو مجبور کرنا بہت اچھی طرح آتا ہے یاسر!''

''بات کو بدلو مت..... میں صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ آخر تم نے اس کے ساتھ ایسا کیا، کیا کہ وہ گھر چھوڑ کے چلا گیا۔''

''اسی سے پوچھو جا کے..... میں صرف اپنے عمل کی جواب دہ ہوں..... اس نے کیا، کیا، کیوں کیا..... میری جانے جوتی۔''

''گل! خدا کے لیے بتا دو..... کہ وہ کہاں ہے؟''

اب وہ منت سماجت پہ اتر آیا۔

''اس کی ماں کی حالت دیکھو ذرا..... اس کی بہن تڑپ رہی ہے۔''

''عادت ہے ان دونوں کو تڑپنے کی..... سال کے آٹھ مہینے وہ یونہی دربدر رہتا ہے۔ مجھے بھی تو ایسے ہی گلیوں کی خاک چھانتے ملا تھا۔''

''وہ تب اپنی خوشی سے جاتا تھا..... اب نہ جانے کس کیفیت میں نکلا ہے جو تمہیں طلاق بھی.....''

پھر چونکا..... اور اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''تم نے اسے طلاق دینے پہ راضی کیسے کیا؟'' وہ چپ رہی۔

''ڈرا دھمکا کے؟..... یا..... بہلا پھسلا کے؟''

''تمہیں کیا؟'' وہ اس بے جا تفتیش سے جھنجلا اٹھی۔

''اگر اس نے پورے ہوش و حواس میں یہ تین لفظ نہیں کہے یا تمہارے دباؤ میں یا کسی لالچ میں آ کے کہے ہیں تو خدا جانے یہ طلاق ہوئی بھی ہے یا نہیں..... کسی مفتی یا عالم سے.....''

''خدا کے لیے یاسر.....! اب مجھے نئے جھنجٹ میں مت ڈالو۔'' وہ زچ ہو اٹھی..... اور اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''پتا نہیں کہاں سے تمہارے دماغ میں ایسے الٹے سیدھے سوال آتے ہیں..... پہلے ضد تھی طلاق لو..... اب لے لی ہے تو اس کا پوسٹ مارٹم کرانے نکلے ہو..... تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ یا پھر مجھ سے چھٹکارا پانے کا..... مجھے ٹالنے کا ایک سے ایک نیا بہانہ ہے یہ۔''

یاسر چپ کر گیا..... اس کا نظریں چرانا یہ ظاہر کر رہا تھا کہ گل نے اس کے دل کا چور پکڑ

تب ہی دروازے پر بڑی بے چین سی دستک ہوئی..... اور صغیر احمد دستک کا جواب بغیر ہی اندر آئے۔

گل نے سر سے پھسلتے دوپٹے کو درست کیا اور چہرے کے برہم تاثرات چھپانے کے لیے رخ ذرا سا موڑ لیا۔

''خیریت صغیر بھائی؟''

یاسر کو ان کے چہرے کی سراسیمگی سے خدشہ سا ہوا۔

''نہیں..... خیریت ہی تو نہیں ہے۔''

دل شکستگی سے کہے الفاظ نے گل کو متوجہ ہونے پہ مجبور کیا۔

''تھانے سے فون آیا ہے..... ٹیپو کے بارے میں بتانے کے لیے.....''

یاسر نے بے ساختہ گل کی جانب دیکھا..... جس کا دل دھک سے رہ گیا تھا اور جھوٹ کے کھل جانے کے خوف نے خون نچوڑ کے رکھ دیا تھا..... اسے اندازہ نہیں تھا کہ ٹیپو کی اتنی جلدی واپسی کا کوئی امکان بھی ہو سکتا ہے..... اس نے تو سوچا تھا، جب تک وہ دردر کی خاک چھان کے مہینوں بعد لوٹے گا، تب تک وہ یاسر کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات بھی کر چکی ہو گی..... مگر کم بخت نہ جانے کہاں سے پولیس کے ہتھے لگ گیا۔

یاسر اس کے چہرے کی اڑی رنگت اور ماتھے کے پسینے سے بہت سے مطلب اخذ کر رہا تھا جب صغیر احمد نے قدرے توقف کے بعد بات مکمل کی۔

''جی ٹی روڈ میں ایک ٹرالر اور ویگن کے تصادم کے نتیجے میں بیالیس افراد کی موت ہو گئی..... اور..... پولیس کو وہاں سے ٹیپو کا سامان اور شناختی کارڈ ملا ہے..... لاش کی شناخت کے لیے بلایا ہے۔''

یاسر نے دفعتاً گل کے چہرے پہ سکون اور اطمینان کے رنگ اترتے دیکھے..... زندگی میں پہلی بار وہ اسے بدصورت لگی.....

وہ ایک پل کے لیے وہاں نہ رکا۔

☆======☆======☆

''ماں صدقے..... مینوں اپنے شہزادے دا منہ ویکھن دو.....''

خورشید کے بین کلیجہ چیرے دیتے تھے۔

''صبر..... خورشید..... صبر.....''

جنت بیگم کا سینہ بھی دھواں دے رہا تھا، مگر وہ کمال ضبط سے آنسو پونچھتے ہوئے مسلسل اسے اور حلیمہ کو سنبھالے جا رہی تھیں۔

ایکسیڈنٹ خاصا زبردست تھا...... اور نصف سے زیادہ لاشوں کی شناخت محال تھی...... ٹیپو کو صغیر احمد نے اس کے لانبے قد...... گھنگریالے بالوں اور پیر کی چپل سے پہچانا تھا...... اس کا سامان غالباً ایکسیڈنٹ کے وقت اچھل کے سڑک پہ آن گرا تھا، اس لیے جلنے سے محفوظ رہا اور اسی کی بناء پہ پولیس نے ایکسیڈنٹ ہو جانے کے چودہ گھنٹے بعد لواحقین کو فون کیا تھا۔ لاشوں کے مسخ ہو جانے کی وجہ سے ڈاکٹروں کے مطابق نعش کو زیادہ دیر رکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے جیسے ہی میت گھر لائی گئی...... اسے تجہیز و تکفین کے لیے اٹھایا جانے لگا۔

''ہائے...... ابھی تو میں نے اپنے سوہنے سے گل بات کرنی تھی...... اس کا ماتھا چومنا تھا۔''

خورشید کرلائے جا رہی تھی۔

''ہوش کر خورشید...... مت بَین ڈال...... میرے بچے کو تکلیف ہوتی ہوگی۔''

''وقت ضائع نہ کریں...... اسے اس کے آخری سفر پہ جانے دیں۔'' صغیر احمد نے خورشید کو میت سے پرے کیا۔

''مجھے اس کا مکھڑا تو دیکھنے دو...... اسے سہرا تو باندھنے دو۔''

''خورشید! اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ یادوں میں رکھ...... اس حالت میں دیکھنے کی ضد مت کر۔''

جنت بیگم نے اتنا کہہ کر دوبارہ ہل کے سپارہ پڑھنا شروع کیا...... آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کے چادر میں جذب ہو رہے تھے...... دھندلی آنکھوں کو بار بار پلو سے صاف کر کے سپارہ شروع کرنے سے پہلے ایک ممتا بھری نظر ٹیپو پہ ڈال لیتیں، جس کا وجود سفید چادروں سے ڈھکا ہوا تھا...... پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔

''وے...... وے ٹیپو...... ماں صدقے...... ادھر تک ویکھ وے۔''

''خورشید! میں کہہ رہی ہوں نا...... مت کر......''

وہ چادر ہٹانے لگی تھیں کہ جنت بیگم نے آگے بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھ جکڑ لیے۔

''چھوڑ دے آپا مجھے...... آج نہ آنا میرے اور میرے پتر کے بیچ۔ بڑا لحاظ کر لیا میں نے۔''

انہوں نے بری طرح جنت بیگم کو دھکیلا اور منہ ٹیپو کے پاس لے جا کے سرگوشیاں

کرنے لگیں۔

''ویکھ وے...... میں ہوں نا تیری ماں...... نہیں...... میں تیری ماں نہیں...... میں تو تیری سہیلی ہوں...... گوڑی سہیلی۔''

''خورشید......! وہ اب کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہا......''

جنت بیگم نے سسکیاں روکیں۔

''تیری نہیں سنتا...... میری تو بڑی سنتا ہے...... اکیلے میں مجھے اصلی والی ماں بھی کہتا ہے...... تجھے کچھ نہیں پتا۔''

''بہو کہاں ہے؟''

کسی ہمسائی نے جہاں آرا سے پوچھا۔

''اندر ہے غریب...... رات سے سکتے میں ہے۔ آسمان ہی تو ٹوٹ پڑا ہے اس پہ۔''

''باہر لاؤ اسے...... رلانے کی کوشش کرو۔''

''ساری عمر رونا ہے دکھیاری نے...... کوئی آج کی بات ہے۔''

''پھر بھی...... شاید میت کے سامنے آ کے اس کا سکتہ ٹوٹ جائے۔''

''ڈاکٹر نے سکون کا ٹیکہ لگایا ہے شاید نیند کے بہلاوے میں آ جائے۔''

☆======☆======☆

گل غنودگی میں تھی...... مگر ایسی غنودگی جس میں بجائے سکون اور بے خودی کی کیفیت کے...... ایک عجیب سی بے چینی نظر آ رہی تھی۔

وہ نیند میں بار بار سر جھٹک رہی تھی...... اسے اپنے چہرے کے بالکل سامنے ٹیپو کا چہرہ نظر آ رہا تھا...... جو اس پہ جھکا جا رہا تھا...... وہ ڈر کے مارے سمٹی...... سکڑی...... ہٹتی جا رہی تھی...... پھر وہ جیسے دیوار سے جا لگی۔

ٹھنڈی برف کی سل جیسی دیوار......

اور چہرے کو چھوتی ٹیپو کی جھلستی...... گرم گرم سانسیں۔

اس کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

''مامی......!'' کسی نے اسے بازو سے پکڑ کے جھنجوڑا۔

وہ بری طرح ہڑبڑا کے اٹھی۔

زرمین ستا ہوا چہرہ لیے اس کے سامنے تھی...... اور کہنی سے اس کا بازو تھام کے اسے اٹھا لیا۔

ڈولتے قدموں اور بھاری ہوتے سر کے ساتھ وہ اٹھی...... زرمین نے بڑھ کے اس کا دوپٹہ اٹھایا۔ اس کے بکھرے بال سمیٹ کر کانوں کے پیچھے اڑسے اور سر پہ دوپٹہ اوڑھا کے اپنے ساتھ باہر لے گئی۔

☆======☆======☆

جی بھر کے بَین ڈالنے کے بعد، اب جیسے خورشید خالی ٹھس ہو کر بیٹھی تھی...... اس کے ہونٹوں پہ زرد پیپڑیاں جمی تھیں اور ساکت پتلیوں کے سامنے کوئی بھولا بسرا منظر گردش کر رہا تھا۔

''بس کر آپا...... رہنے دے۔''

خورشید نے جنت بیگم کو ٹیپو کو بازوؤں سے جکڑ کے اس پہ کچھ پڑھتے اور پھونکتے دیکھا تو کہے بغیر نہ رہ سکیں۔ اور ٹیپو کو ان کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے ہاتھ میں پکڑا شربت کا گلاس ایک طرف رکھا۔

''توبہ...... پتا نہیں کون کون سے منتر پھونکتی رہتی ہے اس پہ...... ستیاناس کر کے رکھ دیا ہے نمانے کا۔''

''نامراد...... وظیفہ پڑھا ہے میں نے...... اس کی عقل ٹھکانے کے لیے، ستیاناس تو تُو کر رہی ہے...... نہ جانے کہاں کہاں سے تعویذ لا کے شربتوں میں گھول گھول کے پلاتی ہے۔''

''بس کرو دونوں......''

وہ بے زاری سے دونوں کو پرے کرتا اٹھا۔

''ادھر وہ کھینچتی ہے...... ادھر وہ کھینچتی ہے...... دو ملاؤں میں بے چارہ ٹیپو حلال ہو جائے گا۔''

اس نے گردن پہ چھری پھیرنے کا اشارہ کیا تو خورشید نے اسے زور کی دھپ لگائی۔

''دفع دور...... کیسی منحوس باتیں کرتا ہے۔ سب وظیفوں کے الٹے اثرات ہیں۔''

''تیرے تعویذوں کے بداثرات ہیں۔''

جنت بیگم کیوں پیچھے رہتیں۔

''صلح صفائی سے طے کر لو میرا مسئلہ ایسے ہی لڑلڑ کے تم دونوں نے ابا ہاتھ سے گنوایا ہے۔ شاید یہی تعویذ اور وظیفے میرے ابا کو کھا گئے ہوں گے۔ میں نہیں پیتا یہ شربت...... اور نہ مجھے پھونکیں لینی ہیں...... پرے ہٹو۔''

خورشید نے سسکی لی اور نئے سرے سے رونے لگیں۔

''نہیں جاتی تجھے سوہنیا...... اک واری مڑ آ۔''

تب ہی زرمین نے گل کو وہاں لا کے بٹھایا......

سب عورتوں کی کریدتی نظریں اس پہ جمی تھیں۔

گل ایسے سکڑ کے بیٹھی تھی جیسے میت کے ابھی اٹھ کر اس پہ جھپٹ جانے کا خوف طاری ہو۔

اسے اپنی اور ٹیپو کی آخری ملاقات کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''چلا جاؤں......؟ دور......''

وہ ناخن چباتا کہہ رہا تھا۔

''اس سے کیا ہوگا...... کوئی اور طریقہ سوچتی ہوں۔''

وہ اسے جس طرف لانا چاہ رہی تھی...... وہ اس کے بالکل برعکس ایک الگ حل نکالے بیٹھا تھا۔

''میں دور چلا جاؤں گا تو کوئی مجھے پاگل خانے نہیں بھیجے گا...... کوئی مجھے زنجیروں میں نہیں باندھے گا، لیکن...... میں چلا گیا تو...... تو...... سب تیرے پیچھے پڑ جائیں گے...... کہاں ہے ٹیپو؟ پوچھ پوچھ کے تیرا بھیجہ کھائیں گے۔''

''تم میری فکر میں کیوں ہلکان ہو رہے ہو؟ اپنی جان بچاؤ۔'' وہ زچ ہو اٹھی۔

''کیوں نہ کروں؟ تُو بھی تو میری اتنی فکر کرتی ہے۔'' اس نے گل کے رخسار پہ پیار سے ہاتھ رکھا۔

''میں یہاں رہا تو پاگل خانے...... نہیں نہیں...... میں نہیں جانے والا لیکن نہ گیا تو...... وہ سارے تجھ سے پوچھ پوچھ کے تجھے پاگل کر دیں گے۔ اماں کا تو ہاتھ بھی بڑا بھاری ہے۔''

''اوہو......'' گل نے ماتھے پہ ہاتھ مارا...... ''میں نہیں جانتی تھی کہ تم اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی اس مصیبت سے نکالنے کے لیے یہ قدم بھی اٹھا سکتے ہو۔''

گل نے سفید چادر کے نیچے چھپے وجود کو تکتے ہوئے سوچا۔

''اے کوئی حلیمہ کو تو لاؤ باہر بھائی کا آخری دیدار کر لے۔''

کسی کی آواز پہ سب نے حلیمہ کو ڈھونڈنا چاہا۔

اور کچن کے ٹھنڈے ننگے فرش پہ بیٹھی حلیمہ نے یہ سن کر گھٹنے اور بھی پیٹ کے ساتھ لگا

لیے۔

اس کا جسم اتنی سردی میں بھی پسینے سے تر بتر تھا۔ چہرے پہ خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔

کچن کا ادھ کھلا دروازہ چرچرایا اور صغیر احمد اندر داخل ہوئے۔ انہیں اپنی جانب بڑھتے پا کے حلیمہ خوف زدہ ہو کر انکار میں سر ہلانے لگی۔

''نہیں...... نہیں......''

''اس طرح چھپ کے حقیقت سے نظر نہیں چرائی جا سکتی حلیمہ...... آؤ...... باہر آؤ...... ٹیپو کے پاس۔''

انہوں نے ہاتھ بڑھایا۔

''ٹیپو کے پاس...... مگر وہ...... وہ تو......''

اس نے تعجب سے دہرایا، پھر بلک کے رو دی۔

''وہ تو اب ہے ہی نہیں...... ٹیپو نہیں ہے اب۔''

صغیر احمد نے اسے اپنے ساتھ لگا کے تسلی دی...... اور بہت نرمی سے تھامتے ہوئے باہر لے جانے لگے۔

''نہیں...... میں نے نہیں جانا......''

اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں...... انگلیاں مڑ رہی تھیں...... آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی جا رہی تھیں۔

زرمین نے جلدی سے آگے بڑھ کے ایک جانب سے سہارا دیا۔

''حلیمہ! بچے آ جا...... بھائی تیرے انتظار میں رکا ہوا ہے اب تک۔''

کسی کے دہائی دینے پہ حلیمہ چیخ مار کے خود کو چھڑاتی پھر سے پلٹنے لگی، مگر زرمین اور صغیر احمد نے اسے دوبارہ پکڑ لیا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے میت کے پاس لانے لگے۔

چند مردوں نے آگے بڑھ کر جنازے کو اٹھایا تو صغیر احمد، حلیمہ کا بازو چھوڑ کے کاندھا دینے آگے بڑھے اور حلیمہ کھڑے قد کے ساتھ اسی جگہ گر گئی۔

زرمین اسے بازوؤں کے حلقے میں لے کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

سفید دوپٹے کے ہالے میں وہ بڑی اجنبی اجنبی سی لگ رہی تھی۔

کالی چادر کے سائے میں ہمہ وقت لپٹا اس کا گہرا گندمی چہرہ بڑا اجلا لگا کرتا تھا، لیکن اس وقت سفید آنچل میں لپٹا سنولاہٹ مائل لگ رہا تھا۔

جہاں آرا نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے تاسف بھری نظریں ڈالیں۔

''بیوگی کا دکھ کیا ہوتا ہے؟ یہ میں بھی جانتی ہوں، جنت بھی...... اور خورشید بھی...... جانے اس گھر کے آنگن کو سفید دوپٹوں سے اتنا لگاؤ کیوں ہے......''

پھر ایک توقف کے بعد اس کے ڈھلکے شانے پہ ہمدردی بھرا ہاتھ رکھ کے کہنے لگیں۔

''مگر جس غضب کی جوانی میں تم پہ بیوگی کا غضب ٹوٹا ہے، شاید ہم اس کا اندازہ نہ کر سکیں۔''

پھر شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''تم نے اب خود کو سنبھالنا ہے...... اپنی امید خود بننا ہے...... پھر بھی خود کو اکیلا کبھی مت سمجھنا...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔'' اور گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھیں۔ جاتے جاتے رک کر کہنے لگیں۔

''تم سوچ رہی ہو گی میں تمہیں بار بار بیوہ کیوں کہہ رہی ہوں، مرنے والا تو سب رشتے تمام کر کے رخصت ہوا تھا، لیکن بات یوں تو ایک ہی ہے...... سہاگ اس طرح بھی اجڑا...... اس طرح بھی...... مگر دنیا بیوہ کے ساتھ تو بڑی ہمدردی کرتی ہے...... طلاق یافتہ کے ساتھ نہیں...... اسی لیے میرے کہنے پہ ہی سارے گھر نے یہ بات پی لی...... سب کی طرح تم بھی بھول جانا۔''

گل کوئی بھی جواب دیئے بغیر...... کسی بھی قسم کا ردِعمل ظاہر کیے بنا ساکت بیٹھی تھی۔

''میں زرمین کو تمہارے پاس بھیج دیتی مگر اس کی اپنی ماں کی طبیعت بھلی نہیں...... بے چاری حلیمہ کی پٹی سے لگی ہے اور صغیر احمد دن میں چار پانچ بار تو میرے کمرے میں آتا ہے، کسی نہ کسی بات کو لے کر۔ ورنہ میں تمہیں اپنے کمرے میں لے جاتی یا یہاں سو جاتی...... اکیلا نہ چھوڑتی...... عدت میں ہو اب تم...... نامحرم سے پردے کا خیال رکھنا ہو گا۔''

پہلی بار گل نے نظریں اٹھا کے انہیں دیکھا...... اس کی نظروں میں الجھن اور بے چینی تھی...... جہاں آرا جا چکی تھیں اور جاتے جاتے دروازہ بند کر دیا تھا۔

گل نے دہشت سے پھیلی آنکھیں چاروں طرف گھمائیں۔ ہر کونے میں ٹیپو دانت کوسے نظر آیا۔

☆======☆======☆

یاسر اور صغیر احمد آنگن میں بیٹھے تھے...... رات کے اندھیرے میں دونوں کے ہاتھوں میں دبے سگریٹ جلتے بجھتے نظر آ رہے تھے۔ صغیر احمد کے چہرے پہ گہری یاسیت اور رنج نظر

آ رہا تھا۔

"میں نے کبھی کہا نہیں مگر...... مگر یہ سچ ہے کہ وہ جب تک گھر پہ ہوتا تھا مجھے بہت حوصلہ رہتا تھا اور اور جب...... وہ عادت سے مجبور ہو کر گھر سے نکل جاتا تھا، تب مجھے ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا، جیسے...... جیسے اس گھر کی اور اس گھر کی پانچوں عورتوں کی ذمہ داری مجھ اکیلے پہ آ گئی ہو...... اس کا نہ ہونے کے برابر وجود کتنا بڑا سہارا تھا...... آج احساس ہو رہا ہے۔"

صغیر احمد نے اپنی آنکھوں کے گوشے بے دردی سے مسلے۔

"میں اس سے چڑتا تھا...... اس کی بے ضرر ہستی کبھی کبھی مجھے ناگوار لگنے لگتی تھی...... پھر بھی میں نے کبھی اس سے بے زاری نہیں جتائی...... پتا نہیں کیسے اس دن میرا ہاتھ اس پہ اٹھ گیا...... میں نے اسے مارا...... بہت مارا۔ زندگی میں پہلی بار...... اور آخری بار......"

ان کی آواز بھرا گئی اور اٹھ کے ٹہلنے لگے۔

"شاید اسی وجہ سے......"

"ایسا کیوں سمجھتے ہیں آپ؟ اس کی عمر ہی اتنی تھی۔"

"نہیں......" وہ تاسف سے سر ہلانے لگے۔

"شاید ایسا نہ ہوتا، اگر میں اس دن آپے سے باہر نہ ہوتا۔ کہیں نہ کہیں اس کی موت کا ذمے دار میں ہوں۔ میری وجہ سے ہی وہ......"

"یہ آپ کی غلط فہمی ہے، آپ اس احساس کو دل سے نکال دیں...... اگر اس کی موت کا کوئی وجہ ہے بھی......"

وہ رکا اور معنی خیز لہجے میں بات مکمل کی۔

"تو وہ آپ نہیں ہیں۔"

پھر اٹھ کے انہیں شانے سے تھاما۔

"آپ یہ بے کار کی سوچیں جھٹک دیں اور آرام کیجیے۔"

"کس کس سوچ کو جھٹک دوں...... سوچا تو میں نے یہ بھی تھا کہ ہمارے درمیان دوہرے رشتے قائم ہو جائیں گے، مگر دوسرا رشتہ بننے سے پہلے پہلے تمہارا پہلا رشتہ ہی ختم ہو گیا۔"

یاسر کے وضاحت طلب انداز میں دیکھنے پہ انہوں نے مزید کہا۔

"ٹیپو کے نہ ہونے سے گل کا بظاہر تو کوئی رشتہ نہیں رہا اس گھر سے......"

☆======☆======☆

حلیمہ کچن میں تھی...... توے سے پراٹھا اتار رہی تھی، جب جہاں آرا اندر داخل ہوئیں۔ تسلے میں گوندھنے کی غرض سے آٹا نکالتے نکالتے رک کر پھر اسے دیکھا...... وہ پچھلے پراٹھے پہ ملائی لگا رہی تھی...... وہ سر جھٹک کے رہ گئیں۔

آٹا لے کر مڑیں تو وہ اب ملائی لگے پراٹھے پہ چینی چھڑک کر رول کر رہی تھی۔

"باؤلی ہو گئی ہو؟ ہفتے بھر سے یہی لگا رکھا ہے۔ بھلا چڑیاں بھی کبھی مکھن، ملائیاں کھاتی ہیں؟ رزق کا زیاں......"

وہ ان سنی کرتی صحن میں نکلی اور اپنے پسندیدہ مقام پہ بیٹھ کر پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے ذرے توڑ کے صحن میں پھینکنے لگی۔

"لو...... کھاؤ......" وہ سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی۔

"اوپر جا کے ٹیپو کو بتانا...... تمہاری آپا نے تمہارے واسطے ملائی چینی کا پراٹھا بنایا تھا...... لو...... اور کھاؤ......"

☆======☆======☆

یاسر اپنا پاسپورٹ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا...... ٹیپو کی وفات کی وجہ سے اس کے جانے کا پروگرام آگے ہو گیا تھا اور اب وہ سوچ رہا تھا کہ جائے یا نہ جائے...... جس مقصد کے لیے وہ منظر سے غائب ہو کر گل کو کچھ کرنے اور خود کو کچھ سوچنے کی مہلت دینا چاہتا تھا، وہ مقصد تو خود بخود حل ہو چکا تھا۔

لیکن ابھی اور بہت سے مسئلے تھے...... جو حل طلب تھے۔ دروازے پہ ہلکی سی دستک پہ اس نے سر اٹھایا۔

نرمین ایک ہینگ کیا ہوا سوٹ ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔ ٹیپو کی وفات کے بعد سے اب تک...... گزشتہ ایک ہفتے سے وہ صغیر احمد کے اصرار پہ یہیں رہ رہا تھا۔

"یہ...... آپ کے کپڑے......"

"آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں؟ میں نے کتنی بار کہا ہے آپ سے کہ میں لانڈری سے کروا لوں گا۔"

"جب تک یہاں ہیں تب تک تو......"

بات ادھوری چھوڑ کے اس نے سر جھکا لیا...... اور اپنے ہاتھ بے چینی سے مسلنے لگی۔

یاسر نے ہینگر اس سے لیتے ہوئے ایک گہری نظر ڈالی، بیڈ پہ کپڑے رکھنے کے بعد دوبارہ نظر ڈالی تو وہ اب تک ویسی ہی مضطرب نظر آئی۔

''کچھ کہنا ہے آپ کو؟''

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا......اس جھجک......اس گریز نے یاسر کی دلچسپی بڑھا ہی دی۔

''کہیے......'' وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''میں نے سنا ہے آپ ملک سے باہر جا رہے ہیں؟''

''جی......مگر صرف کچھ عرصے کے لیے......زیادہ سے زیادہ دو، تین ماہ لگیں گے۔''

''کیا جانا بہت ضروری ہے؟''

وہ اتنی آہستہ آواز میں کہہ رہی تھی کہ اگر ماحول میں مکمل خاموشی نہ ہوتی......وہ اتنے نزدیک نہ کھڑی ہوتی......اور وہ اتنا دھیان دے کر نہ سن رہا ہوتا تو کبھی سن نہ پاتا۔

''ضروری تو ہے، مگر......آپ......کیا آپ نہیں چاہتیں کہ میں یہاں سے جاؤں۔''

''وہ......دراصل آپ کے یہاں سے ہونے سے......''

اتنا کہہ کے وہ ذرا سا رکی اور نظریں پھر سے جھکا لیں۔ یاسر کی دھڑکنیں ایک لمحے کے لیے رک سی گئیں۔

''نہ جانے میں کیا سننے والا ہوں۔''

''آپ کے ساتھ ہونے سے ابا کو بڑا سہارا ہے۔ میں نے کبھی انہیں کسی سے دل کی بات کہتے نہیں دیکھا......لیکن آپ سے......آپ سے وہ ہر بات شیئر کرنے لگے ہیں......اور آج کل گھر کے جو حالات ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ ڈسٹرب بھی بہت رہنے لگے ہیں......آپ ہوں گے تو وہ جلدی اس کیفیت سے نکل آئیں گے۔''

یاسر حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا......جیسے سننے کی توقع نہ ہو۔

''آپ کے ابا بہت حوصلے والے ہیں۔ خود کو بھی سنبھال سکتے ہیں اور آپ سب کو بھی۔ اچھی بات ہے کہ آپ کو ان کی فکر ہے، لیکن ابھی آپ کی عمر یہ فکریں پالنے کی نہیں ہے۔''

وہ کہتے کہتے رکا......پھر اس کے نوعمر چہرے کی سنجیدگی دیکھ کے ذرا شرارت پہ مائل ہوا۔

''ویسے کیا صرف اسی ایک وجہ سے آپ نہیں چاہتیں کہ میں جاؤں؟''

نرمین گھبرا کے اسے دیکھنے لگی اور پھر اس کی شرارت بھانپ کے شرماتی ہوئی کمرے سے نکل گئی......یاسر کی مسکراہٹ ایسے سمٹ گئی جیسے کوئی بددیانتی کرتے کرتے پکڑے جانے کا خوف لاحق ہو گیا ہو۔

☆======☆======☆

چھنو پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ اس سیل فون کی اسکرین کو گھور رہی تھی، جو ساجد کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ ہی تو بیٹھے تھے۔

''کہو......؟ کیسا لگا؟''

چھنو نے نظریں اس کریہہ منظر سے ہٹا کے ساجد پہ ڈالیں......وہ بھی کم کریہہ نہیں لگ رہا تھا۔

''اسکرین بیوٹی کمال کی ہے تمہاری۔''

وہ قہقہہ لگا کے ہنسا تو چھنو یک دم شاک کی کیفیت سے نکلی اور اس سے فون چھیننے کی کوشش کی......مگر وہ غچہ دے گیا......وہ بھپر اٹھی۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے ساجد؟''

''بدتمیزی تو تم کر رہی ہو میری جان! ایسے چھینا جھپٹی کرنا......ہاتھا پائی پہ اتر آنا......یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔''

''یہ......یہ فلم کیوں بنائی تم نے؟''

''بس......ایسے ہی......تمہارے ساتھ گزارے چند خوشگوار لمحات کو یادگار بنانے کے لیے۔''

''تمہیں ایسی گھٹیا حرکت کرتے شرم نہیں آئی؟''

''کون سی گھٹیا حرکت......یہ والی؟''

وہ فون اس کی آنکھوں کے آگے نچانے لگا۔

''یہ والی گھٹیا حرکت تو تم بھی کر رہی ہو۔'' وہ پھر سے ہنسا۔

''کمینے......ذلیل......میں نے تم پہ اعتبار کیا تھا۔''

''دوبارہ کر لو......قسم سے......یہ صرف میں نے اپنے لیے بنائی ہے......کسی کو دکھاؤں گا تو نہیں۔''

''تمہارا کوئی بھروسہ نہیں......لاؤ......دو مجھے......میں delete کرتی ہوں اسے۔''

''کر دینا......بلکہ میں خود کروں گا، تمہارے سامنے، مگر ابھی نہیں، ذرا ایک آدھ بار اور دیکھ لینے دو......کتنی خوبصورت لگ رہی ہو تم اس میں......واہ......''

''تم اتنے سیدھے نہیں ہو ساجد! جتنے بن رہے ہو۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہارا۔''

''اتنا جانتی تھیں تو اعتبار کیا سوچ کے کیا تھا۔''

وہ لہجہ بدل کے غرایا...... اب اس کے تیور یکسر بدلے ہوئے تھے۔

''بہر حال مجھے اس ڈیڑھ منٹ کی فلم کو رکھ کے کیا کرنا ہے، ایسی بھی تو ایشور یہ را۔ نہیں ہو کہ چوبیس گھنٹے تمہیں تکتا رہوں گا...... کروں گا delete...... مگر پہلے میرا ایک کا کرنا ہوگا۔''

''کیا؟''

''میرے ساتھ چلو......''

''چلو......'' وہ تفصیل میں جانے کے بجائے اٹھی۔

''ابھی نہیں...... کل رات......''

''رات؟ تمہیں پتا تو ہے کہ میں رات کو نکل نہیں سکتی۔ اس وقت تو کالج کے بہانے آئی ہوں۔''

''چھپ کے آ جانا۔''

''یہ ناممکن ہے...... سیدھی طرح یہ فون میرے حوالے کرو۔''

''ناممکن کچھ نہیں ہے میری جان...... گھر پہ کسی سہیلی کی شادی وغیرہ کا بہانہ کر دو...... شادیاں تو رات کو ہی ہوتی ہیں۔''

''بھائی کو پتا چل گیا تو ہڈیاں توڑ دے گا میری۔''

''اور بھائی نے یہ فلم دیکھ لی تو کیا توڑے گا؟''

چھنو چپ کی چپ رہ گئی...... پھر کچھ سیکنڈ بعد بولی۔

''تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟''

''نہیں یار...... اتنے گھٹیا الزام نہ لگاؤ...... میں تو کچھ وقت سکون سے تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں...... وہ بھی اکیلے میں۔''

''بکواس مت کرو...... یہاں کون سی بھیڑ لگی ہے۔ تم بس مجھے تنگ کرنا چاہ رہے ہو۔''

''یہی سمجھ لو...... پھر آ رہی ہو کل رات......''

وہ بے بسی سے اس کے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھنے لگی۔

☆======☆======☆

''میں کہاں جا رہا ہوں اور کیوں جا رہا ہوں، یہ سوال پوچھنے کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔''

یاسر نے پتھریلے لہجے میں اس سے کہا۔

''مجھے حق نہیں ہے؟''

گل کے اندر سے بے یقینی ابل ابل رہی تھی۔

''ہاں...... جب میں نے تم سے کوئی سوال نہیں کیا، تو تم کیوں کر رہی ہو؟''

پھر ایک لمحہ بھرپور طنزیہ نظر اس پر اچھال کر کہا۔

''اگر میں نے کوئی سوال کر دیا تم سے...... تو کہاں سے لاؤ گی تم جواب۔''

''میری زندگی کا کوئی سچ ایسا نہیں ہے یاسر! جو تمہارے کسی سوال کا جواب نہ بن سکے۔''

''اچھا...... تو پھر بتاؤ...... ٹیپو کے ساتھ کیا کیا تم نے؟'' گل سکتے میں آ گئی۔

یاسر اسے لاجواب کر دینے کے بعد فاتحانہ انداز میں مسکرایا اور الماری کی جانب مڑا...... جہاں سے وہ اپنے کپڑے نکال کر پیکنگ کرنے کی نیت سے بیڈ پہ رکھ رہا تھا...... گل نے اسے کاندھے سے پکڑ کے اپنی جانب کیا۔

''کیا کہا تم نے......؟ میں...... میں نے کیا کیا اس کے ساتھ؟ مطلب کیا ہے تمہارا؟''

''مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے مارا کیسے؟''

''میں اسے کیوں ماروں گی؟''

''میں نے کیوں مارا ہے...... نہیں پوچھا...... اس کا جواب میں جانتا ہوں۔ میں نے تو صرف یہ پوچھا ہے کہ کیسے مارا؟ مجھے بھی تو پتا چلے کہ تم میں اور کتنی صلاحیتیں ہیں۔''

''یاسر...... تم نے اتنی بڑی بات سوچی بھی کیسے؟''

''تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا بھی کیسے گل...... صرف...... صرف اور صرف چار دن کے اندر خود کو آزاد کرانے کے چیلنج کو پورا کرنے کے لیے...... اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم اپنی بات پوری کرنے کے لیے ایک جیتے جاگتے انسان کو...... ایک بے قصور انسان کو موت کے منہ میں دھکیل دو گی تو میں کبھی تمہیں اس سے الگ ہونے کا مشورہ نہ دیتا۔ کہیں نہ کہیں اس کی موت کا ذمے دار میں بھی ہوں۔ میں نے ہی تمہیں یہ احساس دلایا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے تم اور میں کبھی ایک نہیں ہو سکتے، لیکن میں نہیں جانتا تھا تم...... تم اس حد تک آگے جا سکتی ہو۔''

''اور میں بھی نہیں جانتی تھی کہ تم میرے بارے میں اس حد تک بدگمان ہو سکتے ہو۔''

وہ افسوس اور دکھ سے چور ہو کر بولی۔

''محبت بدگمان نہیں ہوتی یاسر......''

"ہاں...... محبت بدگمان نہیں ہوتی...... اگر ہو تو......" گل نے تڑپ کے اسے دیکھا، جو بے رحمانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"لیکن جہاں محبت کا وجود ہی نہ ہو صرف پا لینے کا جنون اور حاصل کر لینے کی ہوس ہو، وہاں بدگمانیوں کی کائی جم جایا کرتی ہے۔"

"تمہیں تو گالی دینا بہت برا لگا کرتا تھا یاسر......!"

گل کے آنسو پورے چہرے پر پھیل گئے۔

"مگر تم نے ایک سانس میں مجھے اتنی گندی گندی گالیاں کیسے دے لیں؟ میری محبت کو ہوس اور میری طلب کو جنون تک کہہ دیا۔"

"اصل میں گل...... کیا ہے کہ مجھے ابھی تک وہ گالی سوجھ ہی نہیں رہی جو تم پہ پوری اترتی ہو۔"

وہ تو کہہ کر پرے ہٹ گیا، مگر گل کے اندر بھانبڑ جل اٹھے۔ وہ تیر کی طرح لپکی...... اور اس کا بازو دونوں ہاتھوں سے تھام کر گڑگڑانے لگی۔

"تمہیں بہت بڑی غلط فہمی ہو رہی ہے یاسر......! میں ٹیپو کو کیسے مار سکتی ہوں...... اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے...... وہ بھی اس شہر سے کوسوں دور...... اور اس کے گھر سے جانے میں بھی میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا...... وہ خود گیا تھا...... اپنی مرضی سے...... مجھے بتائے بغیر...... یقین کرو یاسر......!"

"تم پہ یقین کرنے کے موسم گزر گئے گل......"

اس نے رکھائی سے اپنا بازو چھڑایا۔

"محبت اور یقین کی رُت تو سدا بہار ہوتی ہے یاسر! کیا تمہارے اور میرے درمیان جو کچھ تھا۔ وہ اتنا ہی ناپائیدار تھا۔"

"کچھ جذبے فصلی ہوتے ہیں۔ اس رشتے کو بھی تم موسمی پھل یا فصلی جذبہ سمجھ لو۔ جیسے ایک کمند لگا کے تم میرے دل پر براجمان ہوئی تھیں، اسی طرح ایک ایک سیڑھی کر کے نیچے اتری ہو۔"

گل کے قدم لڑکھڑا گئے...... دو قدم پیچھے ہٹی۔

"اتنی پیچھے...... کہ اب دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہیں۔"

وہ دو قدم اور پیچھے ہٹی۔

یاسر اس کی جانب دیکھے بغیر رخ بدلے بے گانگی سے کہتا جا رہا تھا۔

"وہ یاسر جو تمہاری محبت کا دم بھرتا تھا وہ کوئی اور تھا...... وہ گل جو اس کے لیے سب کچھ کوئی اور تھی۔ زندگی کا وہ موڑ کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ محبت، عشق، خواب...... سب ہ گیا ہے...... اگلے موڑ کی ضرورتیں کچھ اور ہیں...... اب یہ یاسر بھی اور ہے اور اس کی جیحات بھی اور ہیں۔"

"ضرورتیں؟ ترجیحات......؟"

گل آہستہ سے بڑبڑائی۔

"اب مجھے اس محبت کی ضرورت نہیں، جس سے رسوائی اور ذلت لپٹی ہو۔ عمر کے اس پہ مجھے ایک مضبوط بنیادوں پہ بنا اور عزت کی چھت دینے والا گھر چاہیے اور بس......"

"اور بس؟" گل نے دیوار کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے روکا......

الفاظ اس کے منہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر...... اور آواز حلق سے پھنس پھنس کر نکل رہی تھی۔

"گل تو اب بھی اسی موڑ پہ کھڑی ہے یاسر! جس موڑ پہ تم نے تین سال پہلے چھوڑا ...... اگلے موڑ پہ...... اس سے اگلے موڑ پہ...... ہر موڑ پہ اس کی ضرورت بھی تم ہو گے اور بھی۔"

"تمہارے اور میرے راستے اب الگ الگ ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی نہیں...... اس حقیقت کو تم بھی جتنی جلدی قبول کر لو...... اتنا اچھا ہے۔ مجھے بھی اس کا س دیر سے ہوا ہے، مگر شدت سے ہوا ہے...... میں...... میں شادی کر رہا ہوں۔"

اور سہارا لے کر کھڑے ہونے کے باوجود وہ ڈگمگا گئی۔

"ایک شریف اور خاندانی لڑکی سے...... جو کسی بھی مرد کی خواہش ہوتی ہے، تاکہ زندگی ساتھی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کے چلتے ہوئے اسے کوئی شرمندگی کا سامنا نہ کرنا ...... کسی بے اعتبار عورت کو زندگی کا ساتھی بنا کے میں اپنی آنے والی نسلیں خراب نہیں کر "

☆======☆======☆

گل لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ یاسر کے کمرے سے نکلی تھی...... اس کے کانوں نے سنا تھا...... اس کی تاب نہ لا کے وہ سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ایک شور سا اس کے ر برپا تھا۔

پٹہ گھسٹ کر پیروں تک رُل رہا تھا...... لٹے پٹے انداز میں بے ترتیب قدم اٹھاتی وہ سط میں پہنچی...... سر اٹھا کے اوپر دیکھا...... آسمان بے حد سیاہ تھا...... دور تک کوئی

ستارہ نظر نہیں آ رہا تھا...... کپکپاتے جسم کو دونوں بازوؤں میں بھینچ کر اس نے آسمان کی جا
منہ اٹھا کے ایک زوردار چیخ ماری۔ حسبِ عادت صبح کی اخبار کا رات کو سونے سے پہلے ا
بار پھر مطالعہ کرتے صغیر احمد......

بلڈ پریشر کی دوا کھاتی جہاں آرا بیگم......

اونگھتی ہوئی جنت بیگم......

تکیے پہ سر رکھے ٹیپو کی کسی بات کو یاد کرتے ہوئے نم آنکھوں کے ساتھ مسکر
خورشید......

زمین سے اپنا دکھتا سر دبواتی حلیمہ...... سب ہی ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھے...... چند سیکنڈ
غور سے اس گریہ وزاری کو سنتے ہوئے وجہ سمجھنے کی کوشش کرنے سب اپنے اپنے کمرے
نکلے اور صحن کی جانب آئے، جہاں صحن کے بیچوں بیچ گھٹنوں کے بل فرش پہ بیٹھی گل او
میں دھاڑیں مار کے رو رہی تھی......

"ہائے اللہ...... لگتا ہے اب اثر دکھایا ہے صدمے نے......" جہاں آرا نے تڑپ
کہا اور اسے سنبھالنے کو آگے بڑھیں۔

"رونے دیں اسے اماں......" صغیر احمد نے اس کی آہ و بکا پہ دل کو گداز ہوتے پا
نرمی سے کہا۔

"جی بھر کے رو لینے دیں...... ایک ہفتے کا غبار بھرا ہے اس کے اندر...... منا لینے
اسے سوگ......"

☆======☆======☆

چھنو زار و قطار رو رہی تھی۔

گھر سے سہیلی کی شادی پہ جانے کا بہانہ کر کے نکلی تھی...... اس لیے بہانے میں ذ
رنگ بھرنے کے لیے کپڑے بھی بھڑکیلے پہنے تھے اور میک اپ بھی جی بھر کے تھوپا تھا......
اب وہی میک اپ آنسوؤں کے ساتھ سانولے چہرے پہ بہہ کے مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

کمرے میں شراب اور چرس کے دھوئیں کی بو پھیلی تھی...... جگہ جگہ بوتلیں لڑھک
تھیں...... ساجد کا ایک دوست صوفے پہ دھت پڑا نہ جانے نشے میں کیا واہی تباہی بک
تھا...... دوسرا سانڈ نما دیہاتی مرد اس قدر مدہوش تھا کہ دو بار ساجد اس کے اوپر سے پاؤں
رکھ کے گزرا، مگر اسے ہوش نہ تھا...... منہ سے رال بہہ بہہ کے کشن کو بھگو رہی تھی۔

روتے روتے چھنو نے گھٹنوں سے سر اٹھا کے ایک نظر نفرت بھری اس پہ ڈالی

ی کھا گئی......

"یہ گندہ...... غلیظ...... بدبودار...... اور میں...... مجھے......" وہ نئے سرے سے رونے

"چل چپ کر جانا...... بس بھی کر......"

ساجد نے بے زاری سے کہتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر زور کا ٹھوکا دیا۔

"سالی کا بیک گراؤنڈ میوزک ہی نہیں بند ہو رہا۔"

"ساجد! تُو نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔"

"تو تُو نے بڑا اچھا کیا ہے؟ دو آدمی نہ سنبھالے گئے تجھ سے۔ ویسے تو بڑی ادائیں
تی ہے...... جیسے بڑی تجربے کار ہو...... اور نکلی پھُس کی پھُس۔"

"تُو نے مجھے کوٹھے والی بنایا ہے ساجد۔"

"اچھا...... تو پہلے تُو کیا تھی...... ماسٹرنی؟ تسبیاں بیچتی تھی، مزار کے سامنے......
...... احسان نہیں مانتی میرا...... کہ کیسا تیرا ریٹ لگوایا ہے...... ورنہ تُو تو مفت میں خوار ہو
ی...... کنگلوں کو خوش کر رہی تھی...... یہ لے سنبھال۔"

اس نے ہزار ہزار کے دو نوٹ نکال کر اس کی جھولی میں پھینکے۔

"تیرا حصہ ہے...... حالانکہ...... جتنا تُو نے فساد مچایا ہے تیرا حق بنتا تو نہیں تھا...... لیکن
ں...... آدمی ایمان دار ہوں۔ کبھی کسی کا حق کھایا نہیں۔"

"ساجد! رحم کر...... مت کر میرے ساتھ ایسا......" چھنو نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"میں بدنام ہو جاؤں گی۔"

اس بات پہ وہ بے ہنگم طریقے سے ہنسنے لگا۔

"ہا...... ہا...... ہو...... بدنام...... بدنام ہو جاؤں گی...... واہ۔ اچھا لطیفہ ہے۔"

ہنستے ہنستے وہ صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔

"اچھا...... یہ تو بتا...... پہلے کون سا تمہارے نام کی مثالیں دیتے ہیں لوگ...... آ کے
ے کے ہار پہناتے ہیں۔"

"مر جا اللہ کرے...... ذلیل انسان...... تجھے گدھ بھی نہ نوچے۔" بے بس ہو کر، وہ
نے لگی۔

☆======☆======☆

جہاں آرا بیگم نے حلیمہ کی مدد سے نیم بے ہوش گل کو بستر پہ ڈالا۔ حلیمہ سہمی ہوئی نظر آ

رہی تھی۔

''حلیمہ......! تم آج رات اسی کے پاس رک جاؤ۔''

حلیمہ نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

''ہا...... ہا...... بے چاری...... یہ غم تو اسی طرح اسے رہ رہ کے تڑپائے گا۔ کوئی ایک دن کا تو رونا ہے نہیں، جو سارے آنسو آج ہی رو لے۔''

اور افسوس سے سر ہلاتی کمرے سے نکل گئی۔ حلیمہ، گل کو غور سے دیکھتی اس کے پاس آئی۔ بے ہوش چہرے پہ بھی غم اور زبان کا تاثر با آسانی پڑھا جا سکتا تھا...... چہرے پہ آنسوؤں کے نشان خشک ہو رہے تھے...... بکھرے بال پورے تکیے پہ پھیلے ہوئے تھے۔ حلیمہ کی آنکھوں میں محبت جاگ اٹھی...... وہ لاڈ سے اس کے بال سمیٹنے لگی۔ گل بے ہوشی کی کیفیت میں ذرا سا کسمسائی۔

''میرا ٹیپو کتنا پیار کرتا تھا تم سے اور تم...... تم بھی کتنا پیار کرتی ہو اس سے وہ چلا گیا...... بہت دور چلا گیا، مگر تم...... تم ابھی بھی اسے یاد کرتی ہو۔ اس کے لیے روتی ہو...... وہ کتنا خوش ہوتا ہوگا۔''

گل کے لب ذرا سے ہلے۔

''مجھے مت چھوڑ کے جاؤ...... میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر......''

حلیمہ کی آنکھیں بھر آئیں...... وہ اس کا ماتھا انگلیوں سے سہلانے لگی۔

گل کی پلکیں ہلکی ہلکی کپکپا رہی تھیں۔

''اب نہیں آئے گا وہ گل...... کبھی نہیں......'' حلیمہ کی آواز بھرا گئی...... وہ اس کا ماتھا چومنے کے لیے جھکی۔

''یاسر...... مت جاؤ......''

حلیمہ وہیں کی وہیں رک گئی۔

اب اس کی آنکھوں میں ترحم، ہمدردی اور اپنائیت کے بجائے الجھن نظر آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

''واپس کر دیا کھانا؟''

خورشید نے نرمین کو جنت بیگم کے کمرے سے ٹرے جوں کی توں لے جاتے دیکھا تو رک کر پوچھنے لگیں۔

''پتا نہیں کیا ہو گیا ہے نانی اماں کو...... خود ہی کہہ رہی تھیں کہ بھوک لگی ہے، پھر خود ہی

کھانا واپس کر دیا۔''

خورشید نے پلیٹ سے ڈھکن اٹھا کے دیکھا، پھر اداسی سے مسکرا دیں۔

''مجھے پتا ہے کیا ہوا ہے آپا کو...... کوفتے ٹیپو کو بڑے پسند تھے نا۔ دل نہ مانا ہوگا اس کے بغیر کھانے کو۔''

اور دوپٹے کے کونے سے اپنی گیلی آنکھیں رگڑ کے صاف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔

''لا...... میں کھلاتی ہوں آپا کو......''

اور ٹرے لے کر اندر چلی گئیں...... جنت بیگم تسبیح کے دانے بھی گرا رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ایک ایک کر کے آنسو بھی گراتی جا رہی تھیں...... خورشید نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر بشاشت لہجے میں بھرتے ہوئے چہک کر کہا۔

''سواد آ گیا...... کیا کوفتے بنے ہیں آپا! میں تو آٹھ کے آٹھ کھا گئی اور جو بھابھی ڈیلے لال کے گھور نہ رہی ہوتی تو میں نے تین چار اور پھڑکا لینے تھے۔''

جنت اسے دکھ سے دیکھ کے رہ گئیں...... تسبیح کے دانے کچھ زیادہ تیزی سے گرنے لگے۔

''لے آپا...... کھا لے اپنے حصے کے۔ پھر نہ کہنا خورشید نے نیت خراب کر لی...... لے کھائے گی، پئے گی تو جان بنے گی...... پھر کر سکے گی میرے جیسی تگڑی سوکن کا مقابلہ...... آہو......''

''بک بک نہ کر یو میرے سرہانے...... جا اٹھا کے لے جا......''

''کیا ہے آپا...... سڑی رہتی ہو ہر وقت۔ چل کیا یاد کرے گی۔ آ، تیرا موڈ اچھا کرنے کے لیے تجھے پاپڑی چاٹ کھلا کے لاتی ہوں...... سیر کی سیر ہو جائے گی اور ایک ایک نواں سوٹ بھی لے لیں گے بازار سے...... کی خیال اے؟''

''بس کر خورشید......!'' جنت بیگم غصے سے بولیں۔

''ابھی اس کا چہلم گزرے دو دن نہیں ہوئے اور تو...... کوئی لاج لحاظ نہیں آتا تجھے...... جوان بیٹا مرا ہے اور تو بازاروں، میلے، ٹھیلوں میں پھرنے کی باتیں کر رہی ہے۔ نئے کپڑے بنانے کی سوچ رہی ہے۔''

''ناراض کیوں ہوتی ہے آپا...... میرا مطلب تھا کسی کے جانے سے روٹی پانی تو نہیں چھوٹ جاتا...... جانے والا چلا گیا...... اب کیا تو خود کو......''

"بس بس...... زیادہ سبق نہ پڑھاؤ مجھے...... میرے کلیجے کو ہاتھ پڑا ہے۔ میں ہی جانتی ہوں کہ کیسے سانسیں لے رہی ہوں...... کیسے چلتی پھرتی نظر آ رہی ہوں...... تُو اس درد کو کیا سمجھے گی۔ کوکھ جلی......"

خورشید کے لب سل گئے۔

"مگر مچھ کے آنسو بہاتی رہی چار دن...... جہاں دو لوگ جمع دیکھے...... چھاتی پیٹ کر بَین کر ڈالے اور بعد میں کوفتے ٹھونستی ہے۔"

"آ...... آپا! میں...... میں...... تو......"

انہوں نے بہت تکلیف کے عالم میں کہنا چاہا۔

"ہونہہ......! تُو کیا جانے گی اولاد کا درد...... ٹیپو تیرا جنا ہوتا تو دیکھتی آج کیسے تیرے حلق سے اترتے کوفتے...... کیسے تُو نئے جوڑے لینے جاتی۔ آخر ہے نا سوتیلی...... دوہرا بانجھ...... اپنی اولاد ہوتی تو پتا چلتا اولاد کا بچھڑنا کیا ہوتا ہے؟"

وہ غصے میں کہتی چپلیں پاؤں میں اڑس کے باہر نکل گئیں۔ یہ دیکھنے کی زحمت کیے بغیر کہ خورشید کے بدن سے ساری جان نکال کے لے جا رہی ہیں۔

وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے خالی کمرے کو تک رہی تھیں۔

☆======☆======☆

"رجو بدبخت...... اگر میرے کہنے پر تُو روز کے دھلے کپڑے استری کر کے رکھ دیا کرتو یہ حال نہ ہوا کرے الماری کا۔"

جہاں آرا الماری کے دونوں پٹ کھولے اس بے ترتیبی کو کوفت سے دیکھ رہی تھیں۔

"خدا کی مار...... ایسا لگتا ہے جیسے اندر بلیاں بیٹھ کر لڑی ہوں۔"

"یہ تو بڑا لمبا کام ہے بی بی...... جھاڑو پونچھے سے فارغ ہو کر آرام سے کروں گی دوپہر میں......"

اس نے فرش پہ پونچھا لگاتے ہوئے کہا۔ جہاں آرا ڈپٹ کے اسے دو چار سنانا چاہتی تھیں کہ صغیر احمد کو بڑے پُرجوش انداز میں اندر آتے دیکھ کے ارادہ ملتوی کر دیا۔

"جا لگا لے برآمدے کا پونچھا...... اور سن صغیر احمد کے کمرے کے جالے ضرور اتار لینا...... اس حلیمہ باؤلی کو تو ہوش ہی نہیں ہوتا۔"

"ماشاءاللہ...... آج بڑے دنوں بعد تمہارے چہرے پہ رونق دیکھ رہی ہوں۔"

"بات ہی ایسی ہے اماں...... آپ سنیں گی تو آپ بھی خوش ہوں گی۔"

"پھر تو جلدی سے سناؤ۔ کان ترس گئے ہیں خوشی کی خبر سننے کو اور ٹیپو کے جانے کے بعد تو جیسے گھر پہ کسی ماتم کا راج ہے۔ دل اتنا بھاری رہتا ہے کہ......"

اور ٹیپو کے ذکر پہ صغیر احمد کو پھر سے رنجیدہ ہوتے دیکھا تو فوراً بات بدل دی۔

"دیکھو میری عقل...... تم مجھے خوشی کی خبر سنانے آئے ہو اور میں پھر سے تمہیں اداس کر ہوں۔"

"اماں...... میں یاسر میاں کو ایئرپورٹ چھوڑ کے آ رہا ہوں۔"

"ہا...... ہا......" انہوں نے یاسیت سے ٹھنڈی سانس بھری۔ "کیسے باپ ہو صغیر میاں! خوشی کی خبر ہے...... ایسا ہیرا لڑکا ہاتھ سے پھسل گیا اور تم......"

"اماں...... جاتے جاتے اس نے زمین کے لیے ہاں کہہ دی ہے۔"

"کیا...... یا اللہ تیرا شکر ہے...... کوئی اچھی خبر سننے کو ملی، شاید اس کی وجہ سے سب ٹیپو کا بھلانے میں کامیاب ہو سکیں۔"

"خیریت سے واپس آ جائے تو بیٹی کے فرض سے بھی سبکدوشی ہو جائے۔"

"ان شاءاللہ......"

وہ اسی وقت شکرانے کے نفل ادا کرنے کی غرض سے اٹھ گئیں۔

☆======☆======☆

اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ اتنی خوش قسمت ہو سکتی ہے۔ جب جہاں آرا بیگم نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کے خوشی سے لبریز آواز میں دعائیں دیتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی تھی تو اس کے وجود کو پنکھ لگ گئے تھے۔

"آپ میری وہ دعا ہیں یاسر! جو بن مانگے پوری ہوئی ہے۔"

☆======☆======☆

اذان کی آواز پہ جنت بیگم "بسم اللہ" کہتی تکیے سے سر اٹھانے لگیں۔ نیم تاریک کمرے میں پیر نیچے اتار کے وہ ٹٹول ٹٹول کے چپل تلاش کرنے لگیں۔

"اٹھ جا خورشید! اذانیں ہو رہی ہیں۔ پھر نہ بہانہ بنانا کہ اٹھایا نہیں تھا۔"

اور وضو کے لیے واش روم جاتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"لو بھلا...... ایسا کون سا بھالا کھینچ مارا ہے میں نے جو کل رات سے منہ سجائے پھر رہی ہے۔"

اور باتھ روم کا دروازہ بند کرنے کے بعد بھی اندر سے ہلکی ہلکی بڑبڑاہٹ سنائی دیتی

رہی۔ تاوقتیکہ وضو کے پانی گرنے کی آواز آنی نہ شروع ہوئی۔ کچھ دیر بعد سفید دوپٹے کی بکل لپیٹے نکلیں تو خورشید ویسی کی ویسی پڑی تھیں۔

"نہیں اٹھی بدذات۔ بڑی چور ہے نماز پڑھنے کی اری اٹھ جا شکل پہ نور تو خاک آئے گا۔ شاید پھٹکار کم ہو جائے۔"

بات کرتے کرتے انہوں نے پردے ہٹائے۔ راہداری میں لگی ٹیوب لائٹ کی روشنی اندر تک آئی۔

"دیکھ...... اب میں بار بار نہیں جگانے والی۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔ شرافت سے اٹھ کے وضو کر لے۔"

اور انہیں کاندھے سے پکڑ کے جھنجوڑا۔ خورشید ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"خورشید!" جنت بیگم دھک سے رہ گئیں اور اس بار دونوں ہاتھوں سے تھام کے زور زور سے جھٹکے دیئے۔ خورشید کا بے جان جسم ایک جانب کو لڑھک گیا۔

"خورشید!"

صبح کی اولین ساعت کے سناٹے میں ان کی چیخ سارے گھر میں گونج گئی۔

☆======☆======☆

برآمدے میں سفید چادریں بچھی تھیں۔ اگربتیاں جل رہی تھیں اور دس بارہ عورتیں سوگوار بیٹھی سپارے پڑھ رہی تھیں۔ جن میں گل بھی شامل تھی۔

"جنت آپا کی بہو کو دیکھنا کیسے نچڑ کے رہ گئی ہے۔" ایک ہمسائی نے دوسری کو ٹہوکا دیا۔

"حالانکہ مرد کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ وہ باؤلا اس کے کس بھلے کا مگر آفرین ہے اس عورت پہ...... چوتھا مہینہ شروع ہونے کو ہے اس کی بیوگی کا...... مگر میں نے کبھی اس کی پلکیں خشک نہیں دیکھیں۔"

"گہری چپ لگی ہے اسے...... نہ جانے کب سے بال نہیں بنائے۔ کتنے دن سے منہ نہیں دھویا۔"

"تم بننے سنورنے کی بات کرتی ہو۔ مجھے تو شک ہے کہ عرصے سے اس نے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ نہ پوری نیند لی ہے۔ حلقے دیکھو ذرا...... کیسے صاف نظر آرہے ہیں۔ آدھی بھی نہیں رہی اب بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ۔"

اسے موضوع گفتگو بنتے دیکھ کے جہاں آرا اٹھ کے اس کے پاس آئیں اور پانی کا گلاس پکڑایا۔ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔

"پی لو...... ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔"

وہ بے چوں چرا گلاس لبوں سے لگا گئی۔ جہاں آرا اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

"جاؤ کچھ دیر لیٹ جاؤ اندر جا کے...... صبح سے بیٹھی ہو۔"

اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہ جانے کس کی نظر کھا گئی ہے ہمارے گھر کو...... کوئی خوشی راس ہی نہیں آتی۔ ابھی تو پپو کو نہیں بھولے تھے ہم کہ خورشید بھی۔ خیر جو مرضی پروردگار کی۔ ابھی کھل کے خوش ہو نہیں پائے کہ آنسو راستہ روک کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ابھی اسی شام تو صغیر احمد نے یاسر میاں کا پیغام سنایا تھا۔"

گل بری طرح چونکی اور سوالیہ انداز میں انہیں دیکھنے لگی۔

"اب یہ وقت ایسی باتوں کا ہے تو نہیں۔ سوچا تھا سب کا منہ میٹھا کرتے ہوئے یہ بات بتاؤں گی مگر اس سے پہلے ہی خورشید۔"

"کیا...... کیا ہوا ہے؟" وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

"اس کا رشتہ آیا ہے نرمین کے لیے اور ہم سب تو دل سے راضی ہیں۔ بس اب یاسر میاں باہر سے آجائیں تو......"

آگے کچھ سننے کی تاب اس میں نہیں تھی...... وہ جلتی بجھتی آنکھوں سے ذرا فاصلے پہ بیٹھی مالا کے سپارہ پڑھتی نرمین کو دیکھنے لگی۔

☆======☆======☆

جنت بیگم اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی آہیں بھر رہی تھیں۔

"بڑی حرافہ نکلی تُو خورشید...... دکھا دیا نا اپنا چلتر۔ چلی گئی مجھ سے پہلے۔ اب تو بڑی خوش ہو گی بدبخت...... بیرسٹر صاحب بھی تیرے پاس۔ ٹیپو تیرے پاس۔ خوب محفل جما کے بیٹھی ہو گی اور میرے اکیلے پن پہ ٹھٹھے لگا رہی ہو گی۔"

وہ ہلکی ہلکی سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

"جیتے جی بھی تُو نے مجھ سے ضد لگا کے رکھی۔ میرا سہاگ ہتھیایا۔ میرے بچوں میں شراکت کرنے آن گھسی۔ اب مر کے بھی مجھے کلسانے سے باز نہ آئی۔ آخری بازی بھی جیت لی تُو نے خورشید! خود کو ٹیپو کی ماں ثابت کر کے......"

روتے روتے وہ خود ہی چپ ہو گئیں۔

"میرا سب کچھ لے لیا تُو نے...... میرا شوہر...... میرا بیٹا...... اور...... اور میری

سہیلی...... میری ایک ہی تو سہیلی تھی۔ وہ بھی...... تیرے ساتھ ہی چلی گئی۔''

رات کے سائے میں بڑے سے افسردہ مکان میں صرف دو نفوس جاگ رہے تھے۔ ایک جنت بیگم جو اکیلے میں خورشید سے باتیں کر رہی تھیں اور دوسری گل جو بڑے کمرے میں چھپ کے یاسر کو فون کر رہی تھی۔

☆======☆======☆

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اب مجھے پکارنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تم سے کوئی رابطہ نہیں رکھنا چاہتا۔''

وہ بے حد رُکھائی سے کہہ رہا تھا۔

''اب کیا چاہیے تم کو مجھ سے؟''

''میں وہ اونچائیاں دیکھنا چاہتی ہوں یاسر! جن پہ چڑھ کے اب میں تمہیں نیچے...... بہت نیچے نظر آتی ہوں۔''

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں گل! میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ اب ہمارے راستے الگ ہیں۔ میں سمجھا تھا بات تمہاری عقل میں سما گئی ہو گی لیکن تم......''

''نہیں یاسر......! راستے الگ نہیں ہیں، تم نے راستہ بدلا ہے اور دکھ تو اس بات کا ہے کہ اس کے لیے تم نے بہت ہی گھٹیا راستہ اپنایا ہے۔ مجھ پہ ٹیپو کو مارنے کا الزام لگا کے تم صرف خود کو اس دوسرے راستے پہ جانے کا بہانا دے رہے تھے۔ مجھ پہ کیچڑ اچھال کے تم نے اپنی بے وفائی کا جواز ڈھونڈا ہے۔''

''بے وفائی......'' وہ طنزیہ ہنکارا بھر کے رہ گیا۔

''جس طرح تمہیں مجھے دینے کے لیے کوئی گالی نہیں سوجھ رہی تھی، اسی طرح مجھے بھی تمہاری اس حرکت کے لیے اس سے بہتر لفظ نہیں سوجھ رہا۔ یہ بے وفائی نہیں تو اور کیا ہے۔ تم میرے لیے آئے تھے اس گھر میں...... میرے لیے۔ اور میرے ہوتے ہوتے میرے ہی سامنے تم...... تم کسی اور کو...... غلط کہہ رہے ہو تم۔ میں تمہارے دل سے نہیں اتری۔ تم نے اپنا دل خالی کرنے کے لیے مجھے زبردستی گرایا ہے۔ نرمین کے لیے......''

''اسے بیچ میں مت لاؤ۔'' یاسر نے فوراً ٹوکا۔

''میں لا رہی ہوں اسے بیچ میں؟ تم لائے ہو اسے اپنے اور میرے درمیان۔''

''نرمین تمہارے اور میرے بیچ میں نہیں آئی۔ یہ تم ہو گل! تم خود...... جس نے قدم قدم پہ مجھے یہ سوچنے پہ مجبور کیا کہ تمہاری طرف جانے والا راستہ مجھے کس تباہی کی طرف لے کر

جائے گا۔ یہ تم ہو...... جس کی الٹی سیدھی حرکت اور سرپھرے پن نے مجھے نرمین جیسی سیدھی سادی لڑکی سے تمہارا مقابلہ کرنے پہ اکسایا۔''

''میں...... میں تمہیں تباہی کی طرف لے جاؤں گی؟''

''ہاں...... جو ساتھ قدم قدم پہ رسوائیاں اور ذلت دے، اس ساتھ کا کیا فائدہ؟ مجھے نرمین سے محبت نہیں ہے لیکن وہ ایک ایسی لڑکی ہے جسے کوئی بھی مرد اپنا ساتھی بنا کر فخر محسوس کرے گا۔''

گل خود کو بے حد بے بس محسوس کر رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، چلائے، بگڑے یا ...ے خدا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے دے پھر اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں وہ سب کروں گی یاسر! جو تم چاہتے ہو۔ میں ویسی ہی بن جاؤں گی۔ میں سر سے ...تک خود کو بدل دوں گی۔ یقین کرو یاسر! میں ایسا کر سکتی ہوں۔''

''فطرت کبھی نہیں بدل سکتی۔''

''بدل سکتی ہے۔ سب کچھ بدل سکتا ہے۔ فطرت، عادت، زندگی...... سب بدل سکتا ہے یاسر! صرف میری تم سے محبت نہیں بدل سکتی۔''

''محبت...... محبت...... محبت بس کرو، اس ایک لفظ کی تکرار۔ خدا کے لیے بس کرو۔'' وہ ...ری طرح چڑ کے بولا۔

''محبت اگر کوئی چیز ہے بھی تو اتنی ضروری نہیں ہے کہ انسان اس کے بدلے عمر بھر کا سکون گروی رکھ دے۔ مجھے نہیں چاہیے تمہاری یہ محبت، جو مجھے اپنے گلے کا پھندا محسوس ہوتی ہے۔ کبھی پیروں کی زنجیر، آزاد کر دو مجھے ایسی محبت سے۔''

''ایسا مت کہو۔ کاش کہ تم دیکھ سکتے یاسر! کہ میں نے تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رکھے ہیں۔ تم پاس ہوتے تو میں تمہارے پیروں کو ہاتھ لگا کے کہتی کہ ایسا مت کرو میرے ساتھ۔ میں نے زندگی میں سوائے تم سے محبت کرنے کے اور کیا ہی کیا ہے، کچھ بھی نہیں...... میں تو مر جاؤں گی یاسر!''

''کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا گل! ہاں کوئی کسی کی وجہ سے ضرور مر جاتا ہے۔ اگر تم نے ...محبت کا طوق دوبارہ زبردستی میرے گلے میں ڈالنے کی کوشش کی تو میں ضرور مر جاؤں گا۔''

اس کے لہجے میں اتنا پتھریلا پن تھا کہ گل کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئی۔ جب بولی تو لہجے میں حیرانی ہی حیرانی تھی۔

''اتنی نفرت! میں نے تو اس دل کی مٹی میں پیار ہی پیار بویا تھا یاسر! پھر اس میں نفرت

کے بول کیسے اُگے؟"

"شاید تمہارے پیار کے بیجوں کو یہ مٹی راس نہ آئی ہو، یا شاید میرے دل کی مٹی کو تمہاری محبت کا پانی۔"

"مت کرو یاسر! ایسا مت کرنا۔ تم میرے ساتھ ہی نہیں۔ اپنے ساتھ بھی ظلم کرو گے۔ جو محبت اور خوشی میں تمہیں دے سکتی ہوں، خدا کی قسم، کوئی اور نہیں دے سکتا۔"

"اس وقت میری ترجیح صرف ایک عزت بھری زندگی...... ایک بھرا پُرا کنبہ اور معاشرے میں اچھی ساکھ حاصل کرنا ہے، جو مجھے تم سے نہیں نرمین سے مل سکتا ہے۔ آج تم میرے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہو۔ پیروں میں گر کے محبت کی بھیک مانگنے پر تیار ہو۔ میں نے اگر یہ بھیک دے دی تو گلی میں زمانے کی ٹھوکر میں ہوں گا اور مجھے بھیک میں بھی وہ مقام اور عزت نہیں ملے گی۔ جو میں چاہتا ہوں۔"

وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

وہ مسلسل دل کی بھڑاس اگلتا رہا۔

"تم شروع سے لے کر اب تک میری عزت کے لیے ایک خطرہ بنی ہوئی ہو۔ جان چھوڑ دو اب میری۔ اور خدا کے لیے راتوں کو چھپ چھپ کے مجھے فون کرنا بند کرو۔ اسی بات کا لحاظ کر لو دنیا کی نظر میں تم اب تک عدت میں ہو۔"

"دنیا...... دنیا...... دنیا......"

بالآخر وہ پھٹ پڑی۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"بس کرو دنیا کے ڈراوے دینا۔ آگ لگا دوں گی میں اس دنیا کو اگر تم اسے اپنے اور میرے درمیان لائے تو۔"

اس کا منت بھرا انداز...... پیروں میں گرتا رویہ کہیں نہیں تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو۔ اتنی آسانی سے میں تمہیں کسی اور کا ہونے دوں گی؟ کیا کیا نہیں کیا میں نے تمہیں پانے کے لیے۔ اور وہ بیٹھے بٹھائے تمہیں پا لے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو گل تم سے محبت کی بھیک مانگ سکتی ہے وہ تم سے محبت کے نام پہ جنگ بھی کر سکتی ہے۔ جو تمہارے پیروں میں گر سکتی ہے، وہ تمہارے پَر کترنا بھی جانتی ہے۔"

"دھمکا رہی ہو مجھے۔"

"ہاں...... دھمکا رہی ہوں۔ بڑی پرواہ ہے نا تمہیں عزت کی...... دنیا کی۔ اسی دنیا کے سامنے دو کوڑی کا کر کے رکھ دوں گی۔ ابھی جا کے سب کو بتا دوں گی کہ تمہاری اصلیت کیا

تمہارا مجھ سے رشتہ کیا ہے اور یہ کہ کس لیے آئے تھے تم؟"

"تم میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ یہ سچ بتا سکو۔ کیونکہ اس سے پہلے تمہیں اپنا سچ بتانا ہو

"تو بتا دوں گی۔" وہ بے خوفی اور اطمینان سے بولی۔

"مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ ڈر کچھ کھونے کا ہوتا ہے یاسر اور میں نے زندگی میں ایک ہی ز طلب کی تھی۔ ایک ہی خواہش کی تھی اور تمہیں کھونے کے بعد اب اور کوئی ڈر نہیں رہا ہ کوئی میرے بارے میں کیا سوچتا ہے، میری جوتی کو بھی پرواہ نہیں۔ بتاؤں گی میں سب ہ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ ٹیپو سے شادی کرنے کی سازش میں بھی ریک تھے۔"

"ایک اور جھوٹ۔" وہ نفرت سے بولا۔

"ہاں...... ایک اور جھوٹ...... جہاں اتنا کچھ بدلا ہے تمہارے لیے۔ وہاں یہ بھی ی۔ اتنی بڑی بڑی بازیاں کھیلی ہیں میں نے تمہارے نام پہ۔ آج ایک بازی اور سہی۔ اس نہیں داؤ پہ لگا کے دیکھتی ہوں۔ جانتے ہو جب سب کو یہ بات پتا چلے گی تو کیسا ہوگا۔ جو تم مجھ پہ کرتے ہو، وہ تم پہ کریں گے تب...... کہ شاید رقابت کی وجہ سے تم نے ٹیپو کو......"

وہ بات ادھوری چھوڑ کے ہنسنے لگی۔

"تمہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گی کہ کوئی دوسرا تمہیں اپنانے کا حوصلہ بھی کر سکے۔ پٹ سے آنا پھر میرے پاس۔ مجھے تو خیر ہر حال میں قبول ہو۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ اس صورتِ حال میں بھی تم میرا کم اور اپنا نقصان زیادہ کرو گی۔ اس سے زیادہ کیا ہوگا میرے ساتھ؟ نرمین سے میری شادی نہیں ہو سکے گی۔ نہ ہو مجھے پرواہ ۔ میں کون سا اس کے عشق میں مر رہا ہوں لیکن تم سے شادی تو میں پھر بھی نہیں کروں گا۔ اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ نرمین نہ سہی کوئی اور سہی۔ ہر جگہ تم اپنی گندی چالیں نہیں سکو گی۔ میں تم سے، تمہاری پہنچ سے بہت دور چلا جاؤں گا اپنی ایک نئی دنیا بسانے۔ لائے میں تم رہو گی گل!"

"میں!"

"ہاں...... تم مجھ سے تو ہاتھ دھو چکی ہو۔ اب بھرم بھی کھوؤ گی۔ باقی کی عمر یا تو جیل میں گی یا سڑکوں پہ رُلتے ہوئے۔"

"بکواس مت کرو۔"

"سچ کہہ رہا ہوں۔ یہاں بیوہ بن کے ہی سہی سر چھپانے کا آسرا تو میسر ہے۔ شاید دوبارہ کوئی اُلو کا پٹھا مل جائے اور تمہاری نئی دنیا بس جائے۔"

گل سن کھڑی تھی۔

"اگر تم اپنا منہ بند رکھتی ہو تو ہم دونوں اپنی زندگیاں آرام سے جی سکتے ہیں۔"

اتنا کہہ کے وہ سانس روکے اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا مگر چند طویل لمحے گزرنے کے بعد گل نے فون کاٹ دیا۔

یاسر نے ایک سکون بھرا سانس لے کر ریسیور رکھ دیا۔

☆======☆======☆

آگ خرید کے لائی نی میں
آگ خرید کے لائی
دنیاداری...... قسمت ماری
شکلیں بدلے روز
دل کی ایک نہ چلنے دے اور
عقلیں بدلے روز
عشق کے کاروبار میں پڑ کے
اچھا نفع کمایا
گھڑی گھڑی پل کو
اپنے دل کا ماس کھلایا
تن من دھن سب بیچ دیا اور
بھاگ خرید کے لائی نی میں
بھاگ خرید کے لائی
کوئل لینے گھر سے نکلی
کاگ خرید کے لائی نی میں
کاگ خرید کے لائی......

بیسن کی بڑیاں بیلتے ہوئے اس کی نظریں نہ جانے کس غیر مرئی نکتے پہ مرکوز تھیں۔

چکنی لانبی انگلیوں والے سانولے ہاتھ ایک معمول کی طرح مہارت سے بڑیاں اتار رہے تھے۔ جہاں آرا بیگم نے نماز کے بعد سلام پھیرتے ہوئے اسے دیکھا تو یکبارگی چونک

تیں...... انہیں گل پہ حلیمہ کا گمان ہوا تھا۔

وہی بے خودی......

ان کا دل تاسف سے بھر گیا...... اس کی زرد رنگت...... ویران آنکھوں...... روکھے بالوں اور پپڑی جمے ہونٹوں کو دیکھ کے ان کا دل بھر آیا...... بے اختیار دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

"یا اللہ! اس بچی کے دل کو صبر دے...... اس وفا کی پتلی کو اس کی وفا کا صلہ دے...... جو ایسے شخص سے وفا نبھا رہی ہے جو نہ تو اس کے قابل تھا، نہ اس کا کچھ بھلا کر کے گیا۔"

"بس کرو گل! تھک جاؤ گی۔"

وہ اس کے پاس آئیں تو گل کا ارتکاز ٹوٹا۔

"کب تک اکیلے لگی رہو گی...... کہاں ہے حلیمہ؟"

گل نے جواب دینے کے لیے لب کھولے پر شاید جواب کو غیر ضروری جان کے سر جھکا دیا۔

وہ ایسی ہی ہو چکی تھی...... لفظوں کو بہت کنجوسی سے خرچ کرنے والی...... اور آنسوؤں کو پانی سے لٹانے والی......

اب بھی اس کی پلکوں پہ چند قطرے ٹکے تھے۔

"کب تک سوگ منائے گی؟ چار مہینے سے اوپر ہو گئے...... اب تو عدت کے دن بھی تمام ہونے کو ہیں...... اتار یہ کالی چادر...... جا...... میری بچی...... کوئی نکھرے رنگ کی اوڑھنی لے...... بھلے سفید ہی سہی...... اگر رنگین آنچل سے ایسا ہی دل اوب گیا ہے تو...... لیکن یہ سیاہ رنگ...... جان چھڑاؤ اس ماتمی رنگ سے...... تمہیں اس چادر میں دیکھ کے ہول اٹھتے ہیں۔"

گل کوئی جواب دیئے بنا ہاتھ مسل کر بیسن اتارتی وہاں سے اٹھ گئی۔

چپ تو وہ اسی دن سے تھی، جب سے اس نے یاسر کے حوالے سے آخری امید بھی ہار دی تھی...... جس دن یاسر نے صاف صاف جتلا دیا تھا کہ وہ کبھی نہ تو اس کی محبت حاصل کر سکے گی، نہ اسے...... لیکن جو پُراسراریت گزشتہ کچھ دنوں سے اسے گھیرے ہوئے تھی...... وہ چونکا رہی تھی۔

اس کی خالی کھنڈر سی آنکھیں اب بیٹھے بٹھائے الاؤ دہکانے لگتی تھیں...... جیسے آس پاس کا سب کچھ بھسم کر ڈالیں گی۔

اس کے خشک بے جان ہونٹ یکا یک پھڑپھڑا اٹھتے، جیسے بہت کچھ کہنے کو بے تاب

ہوں۔

اس کے چہرے پہ اَن گنت حکایتیں بنتی بگڑتی نظر آ رہی تھیں۔

نہ جانے کون سے طوفان چھپے تھے اس خاموشی کے پیچھے......

☆======☆======☆

''میری زندگی تو برباد کر چکے ہو...... اب کیا چاہتے ہو؟'' چھنو نے دانت کچکچا کے کہا۔

''ابھی کہاں برباد ہوئی ہے میری جان......''

وہ مکروہ انداز میں ہنسنے لگا۔

''برباد تو تب ہوگی، جب یہ سی ڈی ہر دکان، ہر فٹ پاتھ پہ بک رہی ہوگی۔''

''ساجد! خدا کے لیے ایسا مت کرنا...... دیکھ تجھے پرانے تعلق کا واسطہ۔''

''گھوڑا گھاس سے دوستی کرے گا تو کھائے گا کیا...... یا تو پھر اسے گھاس کے بجائے کچھ اور مل جائے...... پھر سوچا جا سکتا ہے۔''

''کیا چاہیے تمہیں؟ پیسے...... پتا ہے مجھے ذلیل انسان...... میں جانتی تھی تم مجھے بلیک میل کرو گے۔ حیرت تو یہ ہے کہ اتنی دیر سے کیوں اصل بات پہ آئے...... بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں؟''

''بکواس بند کر......'' وہ بگڑ گیا۔ ''کتنے پیسے چاہئیں؟ منہ پھاڑ کے ایسے کہہ رہی ہے جیسے کمشنر کی بیٹی ہو...... کل تک ایک برگر کھانے کے لیے ہر ایک کی جھولی میں گر رہی تھی آج پیسے پوچھ رہی ہے...... چپ کر......''

اس نے چھنو کو بری طرح جھاڑ کے رکھ دیا۔

''تو کیا چاہتے ہو تم؟''

''ہاں...... یہ سوال ہوا نا پوچھنے والا...... دیکھ جانِ من...... پیسہ تو مجھے چاہیے اور لا کے بھی تُو دے گی، مگر وہاں سے جہاں میں لانے تجھے بھیجوں گا۔''

''کیا مطلب؟''

''ابھی بھی مطلب پوچھ رہی ہے۔ اتنے مہینے تجھے کس بات کی ٹریننگ دی تھی؟ اور اب تو ٹرائل بھی لے لیا تھا...... میری محنت کو ڈبو مت۔ جاؤ شاباش...... پارلر شارلر کا چکر لگا کے آؤ...... تھوڑی مرمت، کوئی جھاڑ پونچھ کرا...... ابھی بڑے کام لینے ہیں تجھ سے......''

''مگر...... مگر......''

''کوئی اگر مگر نہیں...... دوسرا کوئی راستہ نہیں تمہارے پاس...... اس میں پیسہ بھی ملے گا

بچی بھی رہو گی، یہاں وہاں کی ٹھوکریں کھانے سے۔ دوسرا طریقہ میں نے استعمال کر لیا تو سی ڈی کے بدلے مجھے تو کچھ نہ کچھ مل جائے گا، مگر تم...... تم کہیں کی نہیں رہو گی۔''

چھنو سسک کے رو پڑی۔

☆======☆======☆

''صغیر میاں...... ذرا پتا تو کرنا تھا یاسر میاں کا...... کب آ رہے ہیں؟'' اس دن پھر جہاں آرا بیگم کو فکر ستائی۔

''فون آیا تھا...... دس دن میں واپسی ہے۔''

''یہ تو تم نے اچھی خبر سنائی...... کسی اچھی خبر کے لیے کان ترس کے رہ گئے تھے۔''

انہوں نے پان بنا کے خیالوں میں گم بیٹھی جنت بیگم کو تھمایا...... وہ چونکیں اور مشکور مسکراہٹ کے ساتھ پان لے لیا...... خورشید کے جانے کے بعد جیسے ان کے سارے چونچال، ساری شوخی...... ساری حرارت رخصت ہو گئی تھی...... جہاں آرا پرانی سب ہی تلخیاں بھلائے اب نامحسوس طریقے سے ان کا خیال رکھتیں۔

''میں چاہتا ہوں کہ نرمین کے فرض سے جتنی جلدی سبکدوش ہو جاؤں اتنا ہی اچھا ہے۔''

''مگر ابھی تو......''

''میں جانتا ہوں کہ گھر میں دو...... دو موتیں ہوئی ہیں...... شاید اتنی جلدی نرمین کی شادی کا فیصلہ آپ کو اچھا نہ لگے۔ مگر فرض کی ادائیگی میں جھجک کیسی؟ ہم زیادہ دھوم دھام سے کرنے کے بجائے سادگی سے کر لیتے ہیں۔''

صغیر احمد کی رائے پہ جہاں آرا نے ٹٹولتی نظروں سے جنت بیگم کا چہرہ ٹٹولا...... شاید کوئی دلیل...... کوئی خوشگوار...... یا ناگوار تاثر جھلک جائے...... مگر وہاں وہی غیر دلچسپی کا عالم تھا۔

''ایک ہی بیٹی ہے...... اور سالوں بعد ایسا موقع آ رہا ہے گھر میں...... دوبارہ نہ جانے کب آئے اور تم سر سے بوجھ اتارنے کی بات کر رہے ہو؟ بچی کے بارے میں تو سوچو...... اس کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔''

''صغیر میاں......! نمو کے بارے میں آپ کا جو دل چاہے...... فیصلہ کیجیے...... مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

جنت بیگم نے بالآخر لب کھولے۔ ''جانے والے چلے گئے...... جو ہیں ان کی خوشیوں اور ارمانوں کو کیوں نظر انداز کیا جائے۔''

جنت بیگم کی آمادگی دیکھ کے جہاں آرا بھی پُر جوش ہو گئیں۔

''ایسا ہے کہ پانچ ماہ تو ہو گئے...... چند ماہ اور رک جاتے ہیں...... پھر سادگی کے بجائے دھوم دھام سے بیٹی کی رخصتی کریں گے۔''

''اصل بات تو دل کی خوشی ہے اماں جان...... کیا سادگی اور کیا دھوم دھام...... میں ایک ماہ بھی مزید نہیں رک سکتا۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔کل تک تو نمو تمہارے لیے ننھی بچی ہی تھی۔'' جہاں آرا ذرا ٹھٹکیں۔

''میرے سمجھنے نا سمجھنے سے کیا ہوتا ہے...... میرا دل تو چاہے گا میری بیٹی ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہے، لیکن جو دنیا کا دستور ہے وہ تو نبھانا پڑے گا اور جتنی جلدی یہ فرض ادا ہو جائے اتنا ہی بہتر ہے۔''

''سچ کہتے ہو......'' انہوں نے آہ بھری۔

''بیٹی چیز ہی ایسی ہے...... اپنے گھر میں بس رہے تو سکون دیتی ہے...... میں بیٹی کی ماں تو نہیں ہوں، مگر گل کو اس طرح اجڑا دیکھ کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔اس نے ابھی دیکھا ہی کیا تھا دنیا میں۔ابھی تک مہندی کی خوشبو پھوٹتی ہے اس سے۔''

پھر وہ اچانک چونکیں...... جیسے کچھ خیال آیا ہو۔

''اے میاں...... میں تو کہوں اس کے بارے میں بھی کچھ سوچنا چاہیے...... یاسر میاں آئیں تو یہ بات بھی ان کے سامنے رکھنا۔''

''کیسی بات؟''

''گل اس کی عزیزہ ہے...... اس کے مشورے سے ہی دکھیا کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو گا...... ویسے تو بے چاری کا ہونا نہ ہونا ایک برابر...... میاں کے جانے کے بعد ایک چپ سی لگی ہے اسے، لیکن ہے تو عمر کے بڑے ہی خطرناک سال میں...... میں تو کہتی ہوں اگر یہاں وہاں دیکھ کے......''

''گل کے بارے میں کسی کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔'' صغیر احمد کچھ بے چین سے انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیسے نہیں ہے...... میکہ تو اس کا ہے نہیں...... اب ہماری ہی ذمے داری ہے وہ کیسے گزارے گی یہ پہاڑ جیسی زندگی...... وہ بھی اکیلے۔''

''وہ اکیلی نہیں ہے...... میں نے...... میں نے اس سے نکاح کرنے کا فیصلہ کر لیا

ان کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

جنت بیگم اور جہاں آرا دونوں ہکا بکا سی انہیں دیکھے گئیں۔

☆======☆======☆

رکشے سے اترتے ہوئے اس نے باہر جھانکا...... کوئی تھرڈ کلاس سا ہوٹل تھا...... پلستر اکھڑی دیواروں اور بے رنگ و روغن دروازوں، کھڑکیوں والا...... نچلی منزل پہ درجن بھر ڈبہ نما دکانیں تھیں، پان، سگریٹ وغیرہ کی...... ایک بیچ مارکہ سستا سا ڈھابہ بھی تھا، کباب سکے جا رہے تھے، تندور میں نان لگ رہے تھے، بینچوں پہ قلی، ڈرائیور اور اسی قبیل کے بھرے گاہک بڑے بڑے نوالے بے صبری سے منہ میں ٹھونستے، اتنے ہی حریصانہ انداز میں اس کا سر سے پیر تک جائزہ لے رہے تھے...... واہیات شاعری والے پنجابی گانوں کا شور اٹھا۔

''یہ کہاں لے آئے ہو مجھے؟'' چھنو نے ناگواری سے کہا۔

''تو اور کیا تو پی سی یا شیرٹن کی سواری ہے۔''

ساجد نے بری طرح اسے گھرکا...... اب اس کا انداز اس کے ساتھ ایسا ہی مالک و محکوم کا ہوتا تھا۔

''پھوپھی کے دسویں پہ آئی ہے کیا؟ تھوڑی سی لیپا پوتی تو کر لینی تھی شکل پہ...... یا اس کے پیسے الگ سے خرچ کرنے ہوں گے مجھے۔چل...... پارٹی انتظار کر رہی ہے۔''

تنگ سی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ساجد نے ایک بار پھر زمانے بھر کی کوفت چہرے پہ لاتے ہوئے اسے دیکھا۔اوپر سے ایک چھبیس ستائیس سالہ بھرے بھرے بلکہ چھلکے چھلکے جسم والی عورت چھمک چھلو بنی سیڑھیاں اتر رہی تھی...... نارنجی لباس...... نارنجی لپ اسٹک...... گہرا نارنجی آئی شیڈ...... بڑے گلے والی فٹنگ کی قمیص...... برائے نام دوپٹہ...... ہر سیڑھی اترنے پہ اس کے جسم پہ سجا نہ جانے کون کون سا زیور چھنا چھن بج اٹھتا تھا...... پاس سے گزرنے پہ اس کی تیز پرفیوم اور مہنگے سگریٹوں کی ملی جلی خوشبو نے چھنو کا سانس بند کر دیا...... ساجد کی نظریں مسلسل اس چھمک چھلو پہ ٹکی تھیں۔

''جتنا تو خود پہ لگائے گی اتنا ہی دگنا کر کے لوگ تیرے پہ لگائیں گے۔آئندہ خیال رکھنا...... ادھر دیکھ...... کیا ٹائٹ پیکنگ ہے۔''

ایک دروازے کے آگے رک کر اس نے دستک دی۔

پاجامے اور میلی بنیان والا ایک چالیس پینتالیس سالہ شخص باہر نکلا...... سر کے آدھے سے زیادہ بال اُڑے ہوئے، دانتوں کا پان کھا کھا کے حشر کیا ہوا تھا۔

''ڈلیوری ہے......'' ساجد نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے محتاط الفاظ میں کہا۔

اس شخص نے ناقدانہ نظروں سے چھنو کو دیکھتے ہوئے اس کے منہ پہ سگریٹ کا دھواں چھوڑا۔ وہ مایوس نظر آرہا تھا۔

''کیا ہے یار ساجد...... مہینے میں ایک بار تو کھینچ کھانچ کے گنجائش نکالتا ہوں۔ کم از کم وہ مال تو لا کہ پیسہ جانے کا افسوس نہ ہو۔''

''اسلم صاحب! جتنا گڑ ڈالو گے اتنا میٹھا ہوگا۔ اچھے پیکیج کے لیے دام بھی اچھے چکانے ہوتے ہیں۔ اب جو مال آپ کے بجٹ میں فٹ بیٹھے گا وہی لاؤں گا نا......''

اس نے نیم رضامندی سے سر ہلا کے ایک طرف ہوتے ہوئے چھنو کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ بے ساختہ بدک کے پیچھے ہٹی...... تو ساجد نے اسے کہنی سے پکڑ کے باقاعدہ اندر دھکیلا اور دروازہ بند ہو گیا۔

☆======☆======☆

صبح سے گھر میں سکوت کا سا عالم تھا۔

نہ کوئی کسی سے کچھ پوچھ رہا تھا...... نہ ایک دوسرے کا سامنا کر رہا تھا۔

جہاں آرا بیگم فجر کے بعد جو تسبیح لے کر بیٹھیں تو دانے گر گر کے تھک گئے...... وہ ہل ہل کے نہ تھکیں...... اب ظہر ہونے کو تھی۔

''اماں......'' آخر صغیر احمد نے پہل کی اور ان کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ خفگی جتلاتے ہوئے رخ بدل کے رہ گئیں۔

''آپ ناراض ہیں اماں؟''

''نہیں...... بہت خوش ہوں۔'' وہ پھٹ پڑیں۔

''اس بڑھاپے میں تم نے جو میرے سفید چونڈے میں کالک تھوپی ہے، اس پہ شادیانے بجانے کو جی چاہ رہا ہے میرا۔''

''دوسری شادی کوئی جرم تو نہیں۔''

صغیر احمد کے ہونٹوں پہ وضاحت تھی...... مگر انداز ایسا ہی تھا کہ جیسا کوئی جرم کرنے کے بعد مارے ندامت کے اب نظریں نہ اٹھا پا رہے ہوں۔

''مانا...... یہ جائز کام ہے، مگر جائز کاموں کو جائز طریقے سے جائز وقت پہ کیا جائے تب ہی بھلے لگتے ہیں۔''

''میں نے کون سا آپ کو اطلاع کیے بغیر یا آپ کی اجازت لیے بنا چوری چھپے یہ قدم اٹھایا ہے...... صرف اپنا...... ارادہ تو ظاہر کیا ہے۔''

''ارادہ نہیں...... تم نے اپنا فیصلہ سنایا ہے۔''

''اس میں غلط کیا ہے اماں! ایک بے سہارا عورت کو......''

''رہنے دو...... بس کرو...... اب یہ گھسے پٹے بہانے سنانے کی ضرورت نہیں...... پھری پھرتی ہیں بے سہارا عورتیں...... کتنی بار نیکی کماؤ گے؟ اور ہم سب بھی اس کا بھلا سوچ رہے تھے۔ کوئی بے دام کی ملازمہ جان کے عمر بھر اس سے اپنے گھر کی چاکری نہیں کرانا تھی ہمیں۔ اتنا خوفِ خدا تو تمہاری ماں میں بھی ہے۔ آج کل میں کسی بھلے بندے سے نکاح کروا کے رخصت کر ڈالتے، مگر یہ ٹنٹا تمہیں پالنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''آخر اس میں حرج کیا ہے؟''

''حرج؟ نہ صرف تمہارے سالے کی بیوی تھی وہ...... بلکہ جب سے آئی تھی، ایک چھت کے نیچے تمہارے ساتھ رہتی آئی تھی اور ٹیپو کی موت جن حالات میں ہوئی ہے، اس کے بعد تمہاری اور اس کی شادی لوگوں کو دس باتیں بنانے کا موقع دے سکتی ہے۔''

''دس باتیں بنائے دنیا...... یا ہزار...... مجھے پرواہ نہیں۔'' وہ جھنجلا کے بولے۔

اندر ہی اندر جز بز ہو رہے تھے کیونکہ گمان یہی تھا...... اور بھلے ہر جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑے، مگر ماں ضرور طرف داری کریں گی...... حلیمہ کے معاملے میں بیٹے کی سب سے بڑی ہمدرد جو ٹھہریں...... کئی سالوں سے اس ناانصافی اور زیادتی پہ پشیمانی کا اظہار کرتی نظر آرہی تھیں۔

''وہ تو میں جانتی ہوں......''

جہاں آرا بیگم نے شرم دلاتی نظروں سے بیٹے کی کنپٹیوں کے سفید بالوں کو دیکھا۔

''تمہیں کیوں پرواہ ہونے لگی دنیا کی باتوں کی...... بڑھاپے کا عشق ایسے ہی ستیاناس کرتا ہے عقل کا۔ تم پرواہ کرنے والے ہوتے تو ماں کی بات مان جاتے...... یہ بھی نہ سوچا کہ ایسے وقت میں جب بیٹی بیاہنے کا وقت ہے تمہارا اپنا گھر بسانا جگ ہنسائی کی وجہ بن سکتا ہے۔''

''کبھی دنیا کے ڈراوے...... کبھی جگ ہنسائی کا خوف...... کبھی مرتے باپ کی خواہش

کا مان......کبھی بیٹی کی شادی کا لحاظ......''

بالآخر صغیر احمد کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

''ساری عمر میں نے دل مارنے اور سمجھوتے کرنے کے علاوہ اور کیا ہی کیا ہے۔ آخر میں اپنی زندگی کب جیوں گا...... پہلے ماں، باپ کی فرمائش پوری کی اور حلیمہ جیسا عذاب گلے میں ڈالا۔ اب جب زندگی نے مجھے ایک موقع دیا ہی ہے تو اولاد کی خاطر اسے گنواؤں...... اکیس سال اماں......اکیس سال میں نے اس جہنم میں سلگتے ہوئے گزارے ہیں......وہ بھی اس عورت کے ساتھ جس کے ساتھ اکیس منٹ گزار لینے سے انسان کو زندگی سے نفرت ہو جائے۔''

کہتے کہتے ان کی نظر دروازے سے ایستادہ حلیمہ پہ پڑی تو وہ چپ ہو گئے۔

حلیمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں...... ہاتھ میں پکڑی ٹرے لرز رہی تھی اور مسکرانے کی ناکام کوشش کرتی، وہ ہمیشہ سے زیادہ گاؤدی لگ رہی تھی۔

''اور......اور پھر اماں! میں نے زبان دی ہے اسے......وعدہ کیا ہے گل سے...... میں اپنے عہد سے ہٹ نہیں سکتا۔''

وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئے اور جہاں آرا رونے لگیں۔

''لو...... میں بے خبر رہ گئی...... یہاں وعدہ بھی ہوتے رہے...... میں اس کی کالی چادر کے سوگ کے دھوکے میں ہی رہ گئی۔''

☆======☆======☆

''اکیس سال میں نے جہنم میں سلگتے گزارے ہیں۔ وہ بھی اس عورت کے ساتھ۔ جس کے ساتھ اکیس منٹ گزار لینے کے بعد انسان کو زندگی سے نفرت ہو جائے۔''

حلیمہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی...... اور اس کے کانوں میں رہ رہ کے صغیر احمد کے الفاظ بازگشت بن کے گونج رہے تھے...... دروازہ کھلنے کی آواز پہ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا...... صغیر احمد تھے جو اندر داخل ہونے پر اس پہ ایک نگاہ ڈالے بغیر الماری کی جانب بڑھ گئے...... وہ انہیں دیکھے گئی...... الماری میں سے کچھ ڈھونڈتے صغیر احمد کو اپنے وجود کو مسلسل چھیدتی اس کی نظروں سے گھبراہٹ اور بے چینی سی محسوس ہوئی۔ اپنا رات کو پہننے والا سوٹ نکال کر انہوں نے الماری بند کی...... اور پلٹتے ہوئے ایک دزدیدہ سی نگاہ اس پہ ڈالی، وہ یونہی لب نیم وا کیے مندی آنکھوں کے سامنے تکے جا رہی تھی۔

وہ باتھ روم جاتے جاتے رکے۔

''تم کوئی سوال نہیں کرو گی مجھ سے......؟ کوئی ناراضی......؟ کوئی شکوہ......؟ باقی سب کی طرح تم مجھے کوئی الزام نہیں دو گی؟''

وہ جواب دیئے بغیر سر جھکا کے اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کا رواں مسلتی رہی، جیسے یہ سوال کسی اور سے ہوئے ہوں۔ صغیر احمد ایک سرد آہ بھر کے رہ گئے۔

''تمہارا کوئی سوال نہ کرنا ہی ہر اس سوال کا جواب ہے جو گھر کے باقی لوگ کر رہے ہیں۔ تمہاری یہ بے نیازی...... ہمارے رشتے سے غیر دلچسپی...... یہی وجہ ہے جو میں کسی کو سمجھا نہیں پا رہا۔''

اچانک حلیمہ نے چونک کر سر اٹھایا اور دیوار گیر گھڑی کی سوئیوں کی حرکت دیکھ کے گھبرا اٹھی۔

''آ......آپ جائیے...... جائیے آپ......زیادہ دیر بات نہ کریں مجھ سے......''

''کیا؟'' اس کی دماغی حالت پہ شک ہوا۔

''ہاں......آپ ہی تو کہتے ہیں صرف اکیس منٹ میرے ساتھ گزارنے کے بعد کسی کو بھی مجھ سے نفرت ہو سکتی ہے۔''

صغیر احمد نے افسوس سے سر ہلایا اور دوبارہ واش روم کی جانب قدم بڑھائے، مگر حلیمہ کی آواز نے ایک بار پھر دامن پکڑ لیا۔

''لیکن......آپ......کو یہ بات پتا تھی تو......تو آپ کیوں رہتے تھے اتنی اتنی دیر تک میرے ساتھ؟ ساری رات میں کتنے ڈھیر سارے اکیس منٹ ہوتے ہیں......آپ کو مجھ سے نفرت تو ہونا ہی تھی۔''

اس کی آواز شاید آنسوؤں سے بھیگ جانے کی خنکی سے ٹھٹھری ہوئی تھی۔

صغیر احمد بے ساختہ نظر گھما کے اسے دیکھنے پہ مجبور ہوئے۔

''مجھے پہلے بتا دیتے آپ تو......تو میں خود ہی آپ کے پاس کم کم رہتی...... چلو......کوئی بات نہیں......دور دور رہتے ہم، لیکن آپ کو مجھ سے نفرت تو نہ ہوتی۔''

☆======☆======☆

ساجد نے دور سے اسے آتے دیکھا تو ایک ٹیکسی روکی اور پچھلی سیٹ پہ بیٹھ کے سگریٹ سلگانے لگا...... چھنو کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا...... دھپ دھپ کرتے قدموں سے اس کے اندر کے جوار بھاٹے کا اندازہ ہو رہا تھا۔

''بڑی دیر لگا دی...... میں تو سمجھا...... دل لگ گیا......''

اسے دروازہ کھولتے دیکھ کر وہ کمینے پن سے مسکرایا۔

''دل لگاتی ہے میری جوتی......''

بیٹھتے ہی وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگی......ٹیکسی والے کے لیے شاید یہ صورتِ حال خاص نئی یا حیران کن نہیں تھی......وہ اطمینان سے چل پڑا تھا۔

وہ روتے ہوئے اسے گالیاں دیئے جا رہی تھی۔

''بری بات......اپنی روزی روٹی کو گالی نہیں دیتے۔''

''اپنی شکل نہیں دیکھتا اور مجھے ایسے باتیں سنا رہا تھا جیسے......پتا نہیں کتنے مہینوں سے نہایا نہیں تھا......بدبو کا مارا......میل سے بھرا......'' وہ چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔

''چل غم نہ کر......اگلی بار کوئی نہایا دھویا......پوٹا ٹپ......''

ساجد کو اس کے غم اور وجہ غم دونوں پہ ہنسی آ رہی تھی۔

''نہ اگلی بار......نہ پچھلی بار......ساجد تم مجھے بخش نہیں سکتے۔'' وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

''مجھ سے نہیں ہوگا یہ سب......گھن آتی ہے مجھے۔''

''اس سے تو گھن نہیں آتی؟''

ساجد نے ہزار ہزار کے نوٹ اس کی جانب بڑھائے۔

''نہیں چاہیے مجھے یہ بھی......بس تم مجھے معاف کر دو......رحم کرو مجھ پہ......''

''کر لوں گا......رحم بھی کر لوں گا......اتنی جلدی کیا ہے۔ سال ڈیڑھ سال بعد سہی......چل چپ کر......''

☆======☆======☆

صغیر احمد کے سامنے کوئی کب تک ڈٹ کے کھڑا رہتا اور کھڑا رہنے کو باقی تھا کون......

جنت بیگم، حلیمہ کی ماں ہونے کے ناطے صرف گلہ کر سکتی تھیں......خفا ہو سکتی تھیں......مگر دباؤ نہ ڈال سکتی تھیں......

نرمین کے اندر بھی بہت سے گلے مچل رہے تھے......مگر فطری جھجک کی وجہ سے وہ باپ کے مقابل نہ آ سکتی تھی۔ صرف کمرہ بند کر کے اور ان کا سامنا نہ کر کے اپنی ناراضی کا اظہار کر رہی تھی۔

حلیمہ کی تو فطرت میں ہی پسپائی تھی۔

اکیلی جہاں آرا کب تک بیٹے کو روکتیں......چار آنسو بہاتے......چند جذباتی کلمات

ہوئے اجازت دے دی......ویسے بھی ڈر تھا کہ ابھی تو بھرم ہے......دنیا دکھاوے کو اجازت طلب کی جا رہی ہے......کل کلاں کو کہیں اور لے جا کر بسا دیا تو بیٹے سے بھی ہاتھ نے پڑیں گے......اس پورے کنبے کے واحد کفیل تھے صغیر احمد۔

جمعہ کی صبح گیارہ بجے کے قریب چند قریبی رشتے داروں اور محلے داروں کی موجودگی ما سادگی سے نکاح ہوا۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے ہی مہمانوں کو کھانے سے فارغ کر کے رخصت کر دیا گیا......صغیر احمد کے جمعہ کی نماز کے لیے مسجد روانہ ہونے کے بعد پورے گھر میں ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔ زردے، قورمے کی خوشبو حواسوں پہ ناگوار گزر رہی تھی......حلیمہ رزق کی بے حرمتی کے ڈر سے صحن میں گرے چاول کے دانے چن کر اکٹھے کرنے لگی......جہاں آرا لوگوں کے سامنے بھرم رکھنے کو نیا چکن کا جوڑا پہنے زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے بیٹھی تھیں......آخری مہمان کے نکلنے پہ وہ بھی کمرے میں سدھاریں......نرمین اور جنت بیگم نے تو خیر باہر نکلنے کی زحمت ہی نہیں کی تھی۔

گل کمرے میں تنہا بیٹھی رہ گئی۔

☆======☆======☆

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

صغیر احمد نماز پڑھ کے لوٹے تو کمرے کے وسط میں کھڑی حلیمہ کو چوٹی کے بل کھولتے دیکھ کے جز بز ہو گئے۔

''یہ......یہ کھول رہی تھی......''

وہ بھول پن کے پردے میں چھپی آزردگی کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ ''آؤ......اندر آؤ ما''

صغیر احمد نے دروازے کی جانب رخ کر کے کہا۔

ان ہی کے لائے میرون رنگ کے کامدار جوڑے میں ملبوس، روپہلے کام سے بھرے دوپٹے کا آنچل سر پہ ڈالے گل نے چھوٹے چھوٹے قدم اندر بڑھائے۔

''گل......'' حلیمہ پہلی نظر میں اسے پہچان نہ پائی۔ دلہن کا روپ تو اس پہ تب بھی نہ آیا تھا جب ٹیپو سے بیاہی گئی تھی اور اب پچھلے چار پانچ مہینے سے جس طرح وہ کالی چادر کے حلیے میں اپنا پژمردہ وجود ڈھانپے رکھتی تھی اس کے بعد یہ سج دھج...... یہ بناؤ سنگھار اوپرا اوپرا سا ہی لگتا تھا......آنکھوں میں کاجل کے کنارے......پپوٹوں پہ گلابیاں......رخسار دہکے ہوئے......لبوں پہ میرون چمک......گلوبند......کانچ کی چوڑیاں، سونے کے کنگن......ماتھے

کی بندی...... ناک کی بالی......

وہ منہ کھولے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی...... پھر ہلکی سی جھنکار پہ اس کے پیروں کی جانب دیکھ کے پوچھنے لگی۔

''پازیب بھی پہنی ہے؟ گناہ ہوتا ہے...... اماں بتاتی ہیں...... آواز والی پازیب نہیں پہنتے۔''

''آؤ...... تمہارا اپنا کمرہ ہے۔''

صغیر احمد نے اس کی بے سروپا باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے گل سے کہا، جو حلیمہ کی موجودگی کی وجہ سے جھجک رہی تھی۔

''نہیں...... یہ تو ہمارا کمرہ ہے۔'' حلیمہ نے جھٹ تصحیح کی۔

''گل اب یہیں رہے گی۔'' صغیر احمد نے نظریں چرا کے کہا۔

''ہمارے ساتھ؟'' وہ اس سوال پہ بے بسی سے سانس بھر کے رہ گئے۔

''ہم تینوں رہیں گے یہاں؟'' حلیمہ بات کو گھما کے دوسرا سوال کر رہی تھی۔

''میں اپنے کمرے میں ہی ٹھیک ہوں صغیر صاحب! آپ آپا کو پریشان نہ کریں۔'' گل نے بے حد آہستہ آواز میں کہا۔

''اسے کوئی کیا پریشان کرے گا۔ یہ تو خود چلتی پھرتی پریشانی ہے۔'' وہ بڑبڑا کے رہ گئے پھر حلیمہ سے مخاطب ہوئے۔

''میں اور گل یہاں رہیں گے...... صرف ہم دونوں۔''

''اور...... میں...... میں؟'' وہ گھبرا اٹھی۔

''گل کے کمرے میں...... تھوڑی دیر تک اپنا سامان وہاں لے جانا...... اور گل! تم بھی اپنی چیزیں...... خیر وہاں تمہارا کیا ہے؟''

''مم...... میں...... میں اکیلی...... نہیں...... میں اکیلی کیسے...... نہیں میں نہیں جاؤں گی وہاں۔''

وہ جلدی سے ان کے بازو سے لپٹ گئی...... صغیر احمد نے سٹپٹا کے گل کو دیکھا...... وہ بے تاثر چہرہ لیے کھڑی تھی۔

''حلیمہ...... بچی مت بنو۔''

''آپ کے ساتھ رہوں گی میں۔'' وہ واقعی کسی ضدی بچے کی طرح مچل رہی تھی۔

''حلیمہ!'' اپنا بازو چھڑاتے ہوئے وہ زور سے دھاڑے۔ حلیمہ سہم کے پرے ہٹی اور

آنسو بھری آنکھوں سے ساتھ ساتھ کھڑے گل اور صغیر احمد کو دیکھنے لگی۔

☆======☆======☆

گہرے سبز رنگ کی بیڈ شیٹ پہ رکھا گل کا سانولا ہاتھ گندمی لگ رہا تھا...... میرون نیل پالش اور میرون کانچ کی چوڑیوں سے سجا...... مہندی کے گل بوٹے بھی بہار دکھا رہے تھے، جو کسی ہمسائی نے نکاح کے وقت لگائی تھی...... اب جا کے کہیں سوکھی تو گل نے ہاتھ دھوئے تھے۔

صغیر احمد کا ہاتھ دھیرے سے گل کے ہاتھ کی جانب بڑھا جو سپاٹ چہرہ لیے سامنے کی دیوار پہ لگی پینٹنگ کو دیکھے جا رہی تھی۔

ان کی انگلیاں اس کی انگلیوں سے مس ہوئیں۔ وہ تب بھی نہ چونکی...... وہ انگلیاں اس کی چوڑیوں سے کھیلنے لگیں...... وہ ٹس سے مس بیٹھی رہی۔

صغیر احمد کہنی کے سہارے نیم دراز ہوئے اور اس کا ہاتھ تھام کے لبوں سے لگایا تو وہ کرنٹ کھا کے اچھلی...... جس کو اس کی ادا جان کے وہ مسکرا دیئے۔

''تم میرے لیے قدرت کا ایک تحفہ ہو گل! ایک نعمت بیش بہا۔''

''اور تم...... ایک مسلسل آزمائش...... ایک خود ساختہ سزا......'' وہ دل ہی دل میں جواب دے رہی تھی۔

''مجھے نہیں پتا تھا۔ حلیمہ کی بے اعتنائی مجھے تم تک لے آئے گی۔''

''جانتی تو میں بھی نہ تھی کہ یاسر کی محبت...... اس کی بے وفائی مجھے یہاں تک لے آئے گی۔''

''میں چاہتا ہوں۔ تم میری بے کشش زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر دو۔''

انہوں نے ایک اور قدم بڑھانا چاہا...... وہ بدک کے پرے ہٹی اور بیڈ سے اتر کے کھڑی ہو گئی۔

صغیر احمد بھی اٹھے...... اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''حلیمہ کی باتوں سے پریشان ہو؟''

وہ چپ رہی...... اور نامحسوس طریقے سے اپنا چہرہ ان کے ہاتھوں کے پیالے سے نکال لیا۔

''اماں کا رویہ بھی تمہارے دل کو کھٹک رہا ہو گا؟''

اس بار انہوں نے دونوں ہاتھ اس کے شانے پہ دھر دیئے...... اسے اپنا وجود کسی بھاری بوجھ تلے دب کے زمین کے اندر دھنستا محسوس ہوا۔

"کچھ وقت گزرے گا...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر...... میں ہوں نا تمہارے ساتھ......"

انہوں نے اسے اپنے قریب کرنا چاہا۔

"ہاں...... کیوں ہو تم میرے ساتھ؟ وہ کیوں نہیں ہے؟" وہ پھر سے فاصلے بڑھانے لگی۔ جیسے اس کی شرم و گریز جان کے صغیر احمد مسکرا اٹھے۔ ایک انگلی سے اس کا چہرہ تھوڑا سا اونچا کر کے اس کے کان کے پاس سرگوشی میں کہنے لگے۔

"مجھے اپنی خوش قسمتی پہ یقین نہیں آ رہا کہ تم میری زندگی میں شامل ہو...... پتا نہیں وہ کون سی مبارک گھڑی تھی جب میں نے تم سے تمہیں مانگا اور تم نے میری درخواست قبول کر لی۔"

گل نے گھبرا کر آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

"وہ مبارک نہیں...... بڑی منحوس گھڑی تھی، جب تم میرے پاس آئے تو میری ٹھکرائی ہوئی محبت...... کچلی ہوئی انا اور چوٹ کھائی زخمی روح کو کسی سہارے کی تلاش تھی۔ میری بربادی...... تمہاری خوش قسمتی بن گئی......"

اس نے صغیر احمد کے لمس کی اذیت برداشت کرنے کے لیے مٹھیاں زور سے بھینچ رکھی تھیں...... اور دانت ایک دوسرے پہ جما کے لب دبا رکھے تھے...... مبادا کوئی سسکی نہ نکل جائے۔

☆=====☆=====☆

کمرے کی تاریکی میں اس کی گھٹی گھٹی سسکیاں عجیب سی وحشت پیدا کر رہی تھیں...... اسے ایک کے بعد ایک اپنی وہ سب غلطیاں نظر آنے لگیں جن کی وجہ سے آج اسے یہ دن دیکھنا پڑ رہا تھا۔

اسے نثار بھائی یاد آئے۔

اس کی چچا زاد جمیلہ باجی کے شوہر......

وہ تیرہ سال کی تھی جب پکے رنگ اور پکی عمر والی جمیلہ باجی کی شادی کسی معجزے کی طرح اتنے ہی پکے رنگ اور اتنی ہی پکی عمر والے نثار بھائی سے ہو گئی...... جن کا قد بہر حال اونچا اور آنکھیں بڑی بڑی مسکراتی ہوئی تھیں...... صحیح عمر میں شادی نہ ہو سکنے کی وجہ سے ان

میں عجیب سا چڑچڑا پن آ گیا تھا، جس سے نثار بھائی اب تک محفوظ تھے...... ہر وقت چٹکلے چھوڑنے والے...... گدگدیاں کرنے والے نثار بھائی اسے اچھے لگتے تھے...... ابا کو ہمیشہ سے بھتیجے بھتیجیوں کے بڑے چاؤ چڑھا کرتے تھے اور جمیلہ باجی تو تھیں بھی بن باپ کی۔

چھنو کے باپ نے بڑے مان سے انہیں کہا تھا کہ شادی کے بعد وہ جب چاہیں تایا کے گھر کو باپ کا گھر یا میکہ سمجھ کے رہنے آ سکتی ہیں۔ اماں نے اس پہ جتنے ناک بھوں چڑھائے ہوں، چھنو کے مزے تھے۔ ہفتے بعد نثار بھائی کا سکوٹر گلی میں رکتا تو وہ کدکڑے لگاتی چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ باہر نکلتی...... وہ بھی سب کو چھوڑ اسے تو ضرور ساتھ چپکاتے...... بطورِ خاص گود میں بٹھا کے لوڈو کھیلی جاتی...... کھانے کے بعد سب کے لیے آئس کریم لینے جاتے تو اسے سکوٹر پہ بٹھا کے باہر سے ہی کھلا لاتے...... ذرا ہوش آیا تو پتا چلا...... اس پہ یہ خاص عنایت کس لیے؟ وہ ذرا اپنے میں سمٹ گئی۔

کچی عمر...... نادانی...... سہم...... خوف...... اوپر سے ماں بھی میلوں فاصلے پہ معلوم ہوتی...... اسے بتاتی تو کیا...... بڑے صرف بھائی...... بہن دو، تین سال چھوٹی...... اسے دل ہی دل میں بٹھا کر خود ہی پرے پرے رہنے لگی...... سکوٹر کی آواز سن کر چیخیں مارتی باہر بھاگتی ہوئی چھنو...... اب اس آواز پہ پچھلی کوٹھری میں دبک کر بیٹھ جاتی۔

گلی میں آتے جاتے بہت سے لڑکے آنکھیں مارتے...... کوئی رقعہ پکڑا جاتا...... تانگے میں بیٹھی ہوتی تو کوئی سائیکل یا بائیک والا پاس سے گزرتا ہوا کمال پھرتی اور ہوشیاری سے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے آگے نکل جاتا۔ بانو بازار یا اچھرہ کی پُر ہجوم گلیوں میں کتنے ہاتھ اس کے وجود سے مس ہوتے...... وہ گن بھی نہ پاتی۔

پہلے پہل اس لمس سے وہ اچھل جایا کرتی تھی...... سہم کر تیز ہوتی دھڑکنیں قابو کرنے لگتی...... بھرے بازار میں کچھ چمک دمک کے باوجود اس کا جی اوب جاتا...... کچھ خریدنے کو طبیعت مائل نہ ہوتی، پھر یہ سب معمول کا حصہ لگنے لگا...... اب اس پہ خاص اثر نہ ہوتا تھا، جیسے اس نے خود کو مفت کا مال تسلیم کر لیا تھا...... اور وہ کوئی واحد تو نہ تھی۔ اس کے سکول، گلی اور خاندان کی ہر لڑکی کا یہی مسئلہ تھا۔ پندرہ سولہ سال تک کی ہوتے ہوتے ہر لڑکی اس صورتِ حال سے سمجھوتہ کر لیتی تھی...... بس یہ نرمین جیسی کوئی کوئی ہوتی ہیں...... نانیوں دادیوں کی بکل میں دبک کے بیٹھنے والی...... جن کے ساتھ ایسا کوئی تجربہ نہ ہوتا تھا اور وہ نرمین کو بڑے رشک اور حسد سے تکا کرتی تھی...... یہی حسد اسے نرمین کے قریب لایا تھا...... اور دونوں میں عمر اور مزاج کے فرق کے باوجود دوستی ہو گئی تھی۔

بجیلہ باجی کے ہاں شادی کے تیسرے سال بچے کی ولادت ہوئی تو دو آپشن تھے...... یا تو وہ زچگی کے لیے یہاں یعنی چھنو کے باپ کے ہاں آتیں...... کیونکہ اس عرصے میں چچی کی وفات بھی ہو چکی تھی...... بجیلہ باجی کے دونوں بھائیوں کے نہ مالی حالات اچھے تھے نہ اخلاقی...... وہ بہن کی یہ ذمے داری لینے پہ تیار نہ تھے، حالانکہ عموماً پہلی زچگی میکے میں ہونے کا ہی رواج ہوا کرتا ہے...... دوسرا آپشن نثار بھائی نے پیش کیا تھا کہ چھنوان کے ہاں آجائے تاکہ بجیلہ باجی کے بستر پہ ہونے سے گھر کے جو کام رکے ہوں...... وہ چل پڑیں۔

چھنو بدک اٹھی، مگر اماں کو یہ کام کم خرچ اور جھنجھٹ والا لگا...... انہوں نے فوراً اس کے چار جوڑے شاپر میں ڈال کر اسے نثار بھائی کے سکوٹر پر دھکا دے دیا...... وہ سارے رستے چپ چاپ آنسو بہاتی رہی...... اندازہ تھا کہ وہ شخص جو دس لوگوں کی موجودگی میں لائٹ جانے اور موم بتی جل اٹھنے تک کی مہلت کے دوران کیا جسارت کر جاتا تھا...... وہ اپنے گھر میں کتنا کھل سکتا ہے، لیکن جب سکوٹر گھر کے راستے پہ جانے کے بجائے شادمان کی طرف مڑا تو وہ حیران رہ گئی۔

''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''یہاں کا اتوار بازار دیکھا ہے؟''

''نہیں۔''

''چلو...... دکھلاؤں......''

''لیکن بجیلہ باجی......''

''اسی نے منگوایا تھا کچھ سامان...... سبزی، مرغی...... دالیں وغیرہ...... ویسے یہاں اور بھی بہت کچھ ملتا ہے...... کپڑے، جوتے، پرس، جیولری...... لے لو جو کچھ لینا ہے...... اب تو تم نے تین مہینے یہاں رہنا ہے اور کپڑے بس صرف یہ تین چار...... جو دل چاہے خرید لو......''

اور گھر آنے تک نثار بھائی کا سارا ڈر اس کے دل سے نکل چکا تھا...... تین ریڈی میڈ سوٹ، ایک سینڈل، ایک پرس، دو لپ اسٹکس اور نیل پالش...... کئی ہار بُندے اور انگوٹھیاں الگ۔

اب وہ جان گئی تھی کہ ان مفت خوروں سے کیسے اور کتنا فائدہ اٹھانا ہے...... ڈر کو لطف میں کیسے بدلنا ہے۔

نثار بھائی پہ ہاتھ صاف کیے تو باقیوں پہ بھی گُر آزمانے لگی۔ حالانکہ اپنی طرف سے بڑی وفاداری کا ثبوت دیتے ہوئے صرف ان ہی سے وابستہ رہنا چاہتی تھی، مگر شاید وہی

...گئے تھے۔ یا کوئی اور پھنس گئی تھی۔

پھر دل الیاس پہ آیا...... الیاس نے کسی اور سے منگنی کر لی تو نظریں مجید پہ جا ...ہریں...... مجید ابوظہبی چلا گیا تو طاہر...... ابھی اس سے جان پہچان ابتدائی مراحل میں تھیں ...ساجد آن ٹکرایا...... چھنو کو لگنے لگا...... اب ملا ہے صحیح جوڑ......

اس کی اور ساجد کی فطرت ایک تھی...... مزاج ایک...... اوپر سے وہ دل کا کھلا...... شاہ... چھنو کو لگنے لگا۔ اب اس کی زندگی ٹھہر جائے گی...... اس کی تلاش ختم ہو جائے گی۔ ...کسی پرچون فروش یا ویلڈنگ والے کی بیوی بن کے نہیں جینا پڑے گا، جو اسے سات ...وں میں رکھ کے پالے گا...... دس دس روپے کے لیے ترسائے گا اور ذرا سا تنگ ہونے پہ ...ونوں سے مارے گا...... ساجد کو تو اس کا کھلا ڈلا انداز اور بے باک فطرت ہی پسند تھی...... ...ب گزرے گی...... لیکن ہوا کیا......؟

اس کے پَر کترے گئے......

وہ بکاؤ مال بن گئی......

گناہ کی یہ زندگی اس کے لیے نئی نہ تھی۔

لیکن پہلے دل کے بہلاوے کو وہ اس پہ عشق و محبت کے خوش نما لیبل لگا لیا کرتی...... ...ہ لیے چھوٹی چھوٹی خوشیاں تلاش کرنے کا روزن سمجھا کرتی تھی اسے...... اور اب ...ب اسے لگتا وہ سر سے پیر تک لتھڑی گئی ہے گوبر سے......

سسکیاں روکتے ہوئے وہ اٹھی...... اور تولیہ اٹھا کے غسل خانے میں گھس گئی...... صبح ...ے تین بار نہا چکی تھی...... بدن سے بدبو ہی نہیں جا رہی تھی۔ اور رات کے اس پہر تو پانی بھی ...ہے برف پگھل پگھل کے آ رہا تھا...... وہ ٹھٹھرتی کپکپاتی صابن مل مل کے نہانے لگی۔

نہ جانے جسم کو پانی زیادہ بھگو رہا تھا یا آنسو...... ایسے ہی اس کے گھر کی دیوار سے ملے ...غیر احمد کے بڑے سے گھر کے ایک کمرے میں بھی کوئی آنسوؤں سے کچھ مٹانے میں ...مصروف تھی...... گل...

اس نے اپنے پہلو میں بے خبر سوتے صغیر احمد کو دیکھا...... جس کے چہرے پہ اطمینان ...کچھ پا لینے کا سرور تھا...... پھر اس نے اپنے مفتوح وجود کی جانب دیکھا...... اور بے ساختہ ...ٹھنے والی چیخوں کو دبانے کے لیے منہ پہ زور سے ہتھیلی جمائی۔ اندر اٹھتے بَین روکنے کی ...بہت اس کا بدن ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا۔

''تم سچ کہتے تھے یاسر! میں نے زندگی میں ہر فیصلہ غلط کیا ہے...... مگر صحیح ہو یا غلط

میں نے ہر فیصلہ صرف تمہاری وجہ سے کیا ہے۔"

وہ منہ پہ ہاتھ رکھے واش روم کی جانب بھاگی تھی اور شاور کھول کے نیچے کھڑی ہو گئی تھی...... اس کے ہاتھ بھی چھنو کے ہاتھوں کی طرح اپنے وجود سے کوئی نادیدہ میل مل مل کے اتارنے میں مصروف تھے۔

☆======☆======☆

"ارے اتنے تیز بخار میں باہر کیوں نکلیں تم......؟"

جہاں آرا نے سامنے سے آتی جنت بیگم سے سوال کیا، جو ہاتھ میں گھڑا اٹھائے سست قدم اٹھا رہی تھیں۔

"گھڑا گندہ ہو رہا ہے۔ نہ جانے کب سے نہیں دھلا...... میں نے سوچا صاف کر کے تازہ پانی بھر لوں۔"

"تو رجو سے کہہ دیتیں...... رجو...... او رجو......"

"رہنے دو بھابھی......" جنت بیگم نے روکا۔ "اب ہماری وہ حیثیت کہاں جو نوکروں سے خدمتیں کروائیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟"

"اب تک تو بیٹی کے گھر میں ڈھٹائی سے جیتی آ رہی تھی کہ بھلا ہو داماد کا...... جو ساس نہیں...... ماں سمجھ کے عزت دیتا ہے۔ مگر اب جب وہ رشتہ ہی نہ رہا تو...... میرا ابھی پانی نہیں مرا جو بیٹھی مزے سے......" وہ رونے لگیں۔

"باؤلی ہوئی ہو؟ رشتہ کیوں نہیں رہا، خدانخواستہ۔"

"کیسا داماد اور کیسا میرا اس پہ یا اس کے گھر پہ حق...... میری بچی پہ سوت لا بٹھائی اس نے اور میں...... میں بے غیرت بن کے اس کا کھاؤں۔"

وہ مسلسل ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھیں...... جہاں آرا بیگم نے ہمدردی سے ان کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے تخت پہ بٹھایا۔

"تمہارا گلہ بجا ہے، لیکن اس سے تمہارا اس گھر پہ حق تو ختم نہیں ہو جاتا...... تمہارے مرحوم شوہر کا......"

"رہنے دو بھابھی......" جنت بیگم نے ان کا ہاتھ جھٹکا۔

"اپنی ہمدردیاں اپنے پاس رکھو۔ تمہیں کاہے کو میرا درد سمجھ میں آنے لگا...... حلیمہ پہلے ہی خار کی طرح کھٹکتی تھی تمہیں...... اور وہ حرافہ...... وہ بھی تمہیں پہلے دن ہی بھا گئی تھی......

چاہا تھا، میں نے کہ مت گھسنے دیجیے ایسی راہ چلتی کو...... مگر تب تو تم اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں...... حالانکہ وہ تب میری بہو تھی اور اب تمہاری بہو ہے تو اب تمہیں کیوں نہ اسے دیکھ دیکھ کے چین ملتا ہوگا...... ہائے خورشید...... تُو ہوتی...... تُو ہوتی تو میرا درد سمجھتی...... میرا دکھ بانٹتی......"

"خورشید نہیں رہی تو کیا ہوا؟ میں تو ہوں جنت......" اتنا کچھ سننے کے باوجود جہاں آرا کے لہجے کی نرمی کم نہ ہوئی۔

"جب سے خورشید گئی ہے تم اپنے خول میں ہی سمٹ کے رہ گئی ہو، نہ کسی سے بات کرتی ہو نہ کمرے سے نکلتی ہو، مجھے اچھا لگا، آج کم از کم تم نے مجھ سے بات تو کی...... چاہے گلہ ہی کیا...... اور یہ غلط فہمی دل سے نکال دو کہ میں تمہارا درد نہیں سمجھ سکتی...... صغیر میاں کی اس حرکت پہ میرا بھی وہی حال ہے جو تمہارا ہے...... میں حلیمہ سے خوش نہیں تھی...... یہ تمہاری غلط فہمی ہے...... میں صرف اس سے مطمئن نہیں تھی...... مجھے لگتا تھا کہ اپنی لاپروائیوں اور حماقتوں کی وجہ سے وہ ضرور اس گھر کا یا اس گھر کے رہنے والوں کا کوئی بڑا نقصان کرائے گی، لیکن وہ غریب تو اپنا نقصان کرا بیٹھی۔"

"سچ کہتے ہیں سیانے!"

جنت بیگم کو ان کی ہمدردی سے ذرا تسلی ملی...... آنسو صاف کرتے ہوئے آہ بھر کے بولیں۔

"کہ بیٹیاں ماؤں کے نین نقش لیں نہ لیں ان کے ہاتھوں کی لکیریں ضرور اپنی ہتھیلیوں پر چرا لاتی ہیں۔ جب میرے نصیبوں میں سوتن کا جلاپا بھگتنا لکھا تھا تو میری حلیمہ کہاں بچی رہتی۔"

وہ جہاں آرا بیگم کے گلے لگ گئیں۔

☆======☆======☆

"میرا ٹیپو...... میرا منا بھیا...... میرا سوہنا! دیکھ جانا مت کمرے سے...... مجھے ڈر لگتا ہے۔"

جہاں آرا، جنت بیگم کے آنسو پونچھ کے حلیمہ کے پاس آئیں تو وہ کمرے میں دائیں جانب والی دیوار کے ساتھ لگی، اکڑوں بیٹھی تھر تھر کانپتی، یہی ایک بات کہے جا رہی تھی...... وہ گھبرا کے پاس آئیں۔

"حلیمہ...... حلیمہ......!"

"نہ جا ٹیپو! ڈر لگتا ہے۔"

انہوں نے اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کے دیکھا، جو بھٹی کی طرح تپ رہا تھا...... فوراً گھبرا کے سب کو پکارنے لگیں......

کل رات حلیمہ نے پہلی بار کسی کے بغیر اکیلے کمرے میں گزاری تھی...... اور وہ بھی اپنے نہیں...... ٹیپو کے کمرے میں...... اس نے ساری لائٹیں جلا کے رکھیں...... سردی کے باوجود پچھلے آنگن کی کھڑکیاں اور برآمدے کی جانب کا دروازہ بھی کھلا چھوڑا، مگر خوف کم نہ ہوا...... وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی......

"آپا......" اچانک ٹیپو کی آواز پہ اس نے آنکھیں کھولیں اور اسے ڈھونڈنے کے لیے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

"ٹیپو...... یہ تُو ہے؟"

"ڈر لگ رہا ہے آپا؟"

"ہاں......" وہ رونے لگی۔

"مجھے بھی بہت ڈر لگتا تھا آپا! مگر اب نہیں لگتا...... تم کیوں ڈر رہی ہو آپا! یہ میرا کمرہ

ہے...... تمہارے ٹیپو کا کمرہ...... تمہیں تو خوش ہونا چاہیے آپا...... ہم پھر سے اکٹھے رہیں گے۔"

"ہاں...... پھر سے...... ہم پہلے اکٹھے رہتے تھے نا...... ایک کمرے میں...... بچپن سے میں اپنے منے بھیا کو گود میں لٹا کے سلاتی تھی...... پھر میری شادی ہو گئی اور میں یہ کمرہ چھوڑ کے تمہارے بھیا کے کمرے میں چلی گئی...... نمو کے ابا کے پاس اور تمہارے کمرے میں تمہاری دلہن آ گئی...... لیکن اب تمہاری دلہن نمو کے ابا کی دلہن ہے...... ان کے ساتھ پھر سے ایک کمرے میں......" وہ تالیاں بجانے لگی۔

"مزے...... آپا! مزے......" وہ بھی تالیاں بجانے لگا۔

"تو پھر ڈرتی کیوں ہو؟ سو جاؤ...... میں ہوں نا پاس......" اور وہ سو گئی...... لیکن کچھ دیر بعد آنکھ کھلی تو لائٹ غائب...... ٹیپو غائب...... اور وہی ڈر پھر سے موجود......

جنت بیگم نے اس کے سرہانے بیٹھ کے کچھ پڑھ کے پھونکا۔ نرمین پانی میں بھیگی پٹیاں اس کے ماتھے پہ رکھتی جاتی تھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟"

صغیر احمد کی آواز پہ نرمین اور جنت بیگم دونوں نے بڑی شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔

"نہ جانا ٹیپو! مجھے بڑا ڈر لگنے لگا...... اندھیرے میں بڑے بڑے ناخنوں والے ہاتھ نظر آتے ہیں۔"

حلیمہ کی بڑبڑاہٹ نے صغیر احمد کی توجہ کھینچی...... وہ خجل سے ہو کر پھر نرمین سے مخاطب ہوئے۔

"اماں بتا رہی تھیں۔ حلیمہ کو تیز بخار ہے۔"

نرمین نے کوئی تبصرہ کیے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔

"اسے اٹھاؤ...... ڈاکٹر کو دکھا لاتے ہیں۔"

"دوا دی ہے میں نے......" اب کے نرمین کو لب کھولنا ہی پڑے، مگر وہ دانستہ ان کی جانب دیکھنے سے گریزاں تھی...... اور یہی گریز صغیر احمد کو کھل رہا تھا۔

"پھر بھی...... اچھا...... زیادہ طبیعت خراب ہو تو فون کر دینا...... میں گاڑی بھیج دوں گا۔"

وہ کچھ دیر کھڑے اسے دیکھتے رہے کہ شاید وہ کچھ بولے...... نظر اٹھا کے دیکھ ہی

لے...... کوئی ناراضی بھرا فقرہ...... کوئی ملامت بھری نظر...... مگر وہ مسلسل...... بے اعتنائی جتا رہی تھی...... جنت بیگم البتہ رخ موڑے بیٹھی بڑبڑائے جا رہی تھیں...... وہ ایک گہرا سانس لے کر جانے کے لیے پلٹے کہ حلیمہ کی آواز پھر سے سنائی دی۔

"ٹیپو! تُو تو کہتا تھا اپنی دلہن لانے کے بعد نمو کے لیے دولہا لائیں گے ہم...... مگر نمو کے دولہا سے پہلے نمو کے ابا کی دلہن آ گئی...... ٹیپو تُو لے جا اسے...... اس دلہن کو لے جا...... جہاں سے لایا تھا...... واپس لے جا۔"

"مجھے تو لگتا ہے اس کی طبیعت نہیں خراب ہوئی، بلکہ دماغ خراب ہوا ہے۔"

صغیر احمد اس کی بڑبڑاہٹ پہ کچھ سٹپٹا کے کچھ کھسیا کر کہتے باہر نکلے اور دیر سے ضبط کرتی نرمین، جنت بیگم کی گود میں سر رکھ کے رو پڑی۔

☆======☆======☆

جہاں آراں بیگم کچنار توڑ رہی تھیں......

"حلیمہ ذرا قیمہ دھو کے چھلنی میں رکھیو...... اور کٹوری بھر دہی میں مسالے پھینٹ...... اس موسم کی پہلی کچنار اتری ہے پیڑ سے...... ساتھ میں کوئی سبزی یا......"

کہتے کہتے انہوں نے آہٹ پہ سامنے نظر کی اور لمحے بھر کے لیے ساکت سی ہو گئیں۔

"بڑی اماں...... یہ میں ہی ہوں...... یاسر...... یقین نہیں آ رہا کیا؟"

ہاتھ میں بیگ تھامے...... پہلے سے کہیں اجلی رنگت اور قابلِ رشک صحت لیے وہ یاسر ہی تھا۔

"جیتے رہو......" وہ اس کے اپنے سامنے جھکے سر پہ ہاتھ پھیرنے لگیں جو فرطِ جذبات سے کپکپا رہا تھا۔

"کب آئے؟ خبر تو کر دی ہوتی......"

"ایئرپورٹ سے سیدھا یہیں آ رہا ہوں...... سوچا سرپرائز دوں گا۔" وہ ان کے پاس ہی تخت پہ بیٹھ گیا۔

"صغیر بھائی کو ہفتہ دس دن پہلے بتایا تو تھا کہ ان ہی دنوں میں آنے کا پروگرام ہے، مگر تب سیٹ کنفرم نہیں ہوئی تھی، اس لیے تاریخ نہیں بتائی تھی...... پھر انہوں نے پوچھا ہی نہیں...... شاید مصروف زیادہ رہنے لگے ہیں...... فون پہ بھی کم ملتے ہیں خیریت تو ہے؟"

"ہاں...... خیریت ہے۔" وہ پھیکے پن سے مسکرائیں۔ "واقعی مصروف تو رہنے لگے ہیں اب۔"

"گھر بہت خالی خالی لگ رہا ہے...... سب لوگ کہیں گئے ہوئے ہیں کیا؟"

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ کسی تبدیلی کا احساس بہت واضح تھا...... مگر کیا؟ یہ جاننا تھا۔

"نمو تو اس وقت کالج میں ہوتی ہے۔"

وہ ان کے جواب پہ جھینپ گیا۔

"میں باقی سب کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ بہت دن ہو گئے کسی بھی اپنے سے ملے ہوئے، صغیر بھائی سٹور پہ ہیں کیا؟"

"ہاں...... اور تم سناؤ طبیعت تو ٹھیک رہتی ہے۔"

وہ کھٹک گیا۔ ان کا ٹالنے والا انداز صاف ظاہر تھا۔ اندر ہی اندر الجھتے ہوئے وہ انہیں دھیرے دھیرے بتانے لگا۔

"جی شکر ہے اللہ کا...... بلکہ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے پہلے سے دگنی صحت لے کر......"

بات کرتے کرتے وہ رک گیا کیونکہ گل سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ وہ بری طرح چونک گیا۔

یہ وہ گل نہیں لگ رہی تھی جسے وہ یہاں چھوڑ کے گیا تھا۔

یہ اس گل سے یکسر مختلف تھی۔ بے پناہ پُر اعتماد اور پُر استحقاق قدموں کے ساتھ چلتی نازمین پہ بنے سبز اور سرخ پھولوں کے بارڈر والی ساڑھی میں ملبوس، ہلکے ہلکے میک اَپ ئیں جیولری سے آراستہ...... وہ آتے ہی یاسر کے وجود کو نظر انداز کرتے ہوئے جہاں آرا سے مخاطب ہوئی۔

"اماں...... صغیر صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے گاڑی بھیج دی ہے آپا اور چھوٹی اماں بینک جانے کے لیے تاکہ انہیں تکلیف نہ ہو۔"

"تمہیں ان کی تکلیفوں سے کیا بی بی!"

وہ کچھ سخت کہتے کہتے رکیں۔ شاید یاسر کا لحاظ آ گیا جو حیرت سے دم سادھے، پلک جھپکے بنا دیکھ رہا تھا۔ بس

"یاسر سے نہیں ملیں تم؟"

انہوں نے تپائی پہ رکھے اخبار کو درست طریقے سے تہہ لگاتے ہوئے گل کو ٹوکا۔ وہ اب ساتھ اماں کی دوائیں ترتیب سے رکھنے لگی۔ انہیں غصہ سا آ گیا بھلے لگتا ہو گا یاسر گل کا بھرا، اب تو ان کا ہونے والا داماد ہے۔ اور گھر آئے داماد کو یہ تیور؟

''السلام علیکم ...... کیسے ہیں آپ؟''

گل نے بغیر یاسر کی جانب دیکھے تب جواب دیا جب جہاں آرا بیگم کو باقاعدہ ڈانٹ کر احساس دلانا پڑا۔

''میرا خیال ہے بڑی اماں! مجھے چلنا چاہیے۔'' یاسر کسی عجیب سی گھبراہٹ میں مبتلا ہو کر اٹھا تھا۔

''ابھی تو صغیر بھائی! آپا کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہوں گے شام کو آؤں گا ان سے ملنے۔''

''شام میں انہیں میرے ساتھ بازار جانا ہے۔''

وہ اب بھی بغیر اسے دیکھے سپاٹ لہجے میں اطلاع دے رہی تھی۔ وہ بے حد حیران پریشان ہوتا کبھی اسے کبھی جہاں آرا کو دیکھنے لگا۔

''بیٹھو تم یاسر میاں!'' انہوں نے خفت سے دوچار ہوتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''گل! تمہارا اور یاسر میاں کا جو بھی تعلق ہو۔ اب تمہیں اس بے تکلفی کو بھولنا ہوگا۔ تمہارا اور اس کا رشتہ اب بہت نزاکت اختیار کر چکا ہے۔ وہ اس گھر کا ہونے والا داماد ہے۔ اور تمہارا بھی......''

پہلی بار گل نے نظر اٹھا کے یاسر کو دیکھا۔ وہ صرف اس خبر کا ردِعمل جانچنا چاہ رہی تھی۔ حسبِ توقع وہاں بے شمار سوال تھے۔

''یاسر میاں! کہتے زبان ساتھ نہیں دیتی مگر اب تو تم اس خاندان کا حصہ ہو۔ تم سے کیا چھپانا۔ صغیر میاں نے چار دن قبل تمہاری پھوپھی زاد سے نکاح پڑھا لیا ہے۔''

☆======☆======☆

گل اپنے گیلے بالوں میں کنگھا پھیر رہی تھی اور صغیر احمد آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو محبت سے دیکھ رہے تھے جب دروازے پہ ہلکی سی دستک پہ چونک کر بیڈ پر سیدھے ہو بیٹھے۔ نرمین چائے لے کر اندر آ رہی تھی۔

''گل کے لیے بھی لے آتیں۔''

صغیر احمد نے چائے کا واحد کپ دیکھ کے دبے لفظوں میں کہا۔ نرمین بہت کچھ لبوں تک لاتے لاتے رہ گئی۔

''نمو!'' صغیر احمد نے آواز دے کر اسے روکا۔

''صبح تم دونوں میرے ساتھ چلنا۔ بینک سے پیسے نکلوا دوں گا۔ اور بازار بھی ڈراپ کر دوں گا۔ جی بھر کے شاپنگ کر لینا۔''

''دونوں؟'' نرمین نے استفسار کیا۔

''ہاں...... تم اور تمہاری امی!''

انہوں نے محبت پاش نظروں سے لپ اسٹک لگاتی گل کو دیکھتے ہوئے کہا۔ باپ کی نظروں کا تعاقب کر کے نرمین کو غصہ سا آ گیا۔

''میری امی بیمار ہیں...... بازار نہیں جا سکتیں۔''

نرمین کے جواب نے لمحہ بھر کے لیے صغیر احمد کو ساکت کر دیا۔ پھر کچھ سنبھل کر انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''میں گل کی بات کر رہا ہوں۔ وہی تمہاری ماں ہیں۔''

نرمین کے دل میں تو بہت سے جواب کلبلا رہے تھے مگر لبوں کو اس درجہ گستاخی و بے ادبی کی عادت نہ تھی، اس لیے انہیں کچلتے ہوئے سر جھکا کے فقط اتنا کہا۔

''امی ٹھیک ہو جائیں گی تو ہو آؤں گی۔''

وہ یہ کہہ کر پلٹنے کو تھی کہ صغیر احمد نے پھر روکا۔

''اتنا وقت نہیں ہے بیٹا...... یاسر آ چکا ہے اور میں چاہتا ہوں، جلد از جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔''

چوڑیاں پہنتے گل کے ہاتھ رکے...... آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے نظر آتے نرمین کے لب پہ اس نے ایک سلگتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

''ویسے بھی حلیمہ کو ان معاملات کی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ تم گل کو ساتھ لے جانا۔ وہ اس سلسلے میں تمہاری زیادہ اچھی طرح مدد کرے گی۔''

''تو پھر میرے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے۔ سب کچھ یہی کر لیں۔''

اتنا کہہ کر وہ پل بھر کے لیے بھی کمرے میں نہ رکی۔

صغیر احمد نے خجالت بھرے انداز میں گل کی جانب دیکھا۔ اب وہ بُندے پہن رہی ...... انداز ایسا تھا جیسے کچھ نہ سنا ہو۔

''تم برا نہ مانا...... نمو کچھ ناراض ہے مجھ سے...... بچی ہے...... تم دل پہ مت لینا...... کے ساتھ ساتھ سمجھ جائے گی۔''

اس کے پاس آتے ہوئے انہوں نے دونوں ہاتھ گل کے کاندھوں پہ رکھے۔

"ویسے بھی اب کچھ ہی دن کی مہمان ہے وہ اس گھر میں۔"

گل کو اپنے کاندھوں پہ منوں وزن محسوس ہوا۔

وہ ذرا سا پرے سرک کر لپ اسٹک لگانے لگی۔ صغیر احمد نے لپ اسٹک اس کے ہاتھ سے واپس لے کر ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے محبت سے کہا۔

"اور کتنا سنورو گی...... تمہیں ان رنگوں کی کیا ضرورت ہے؟"

ان کی انگلی نے گل کے خوب صورت کٹاؤ والے لبوں کو دھیرے سے چھوا...... وہ گھبرا اٹھی۔

"آپ بازار جانے کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں، میری خواہش ہے، یاسر سے بات کر کے اگلے مہینے کی کوئی تاریخ مقرر کر لوں۔ شادی کی ساری تیاریاں تمہیں کرنا ہیں گل! میں چاہتا ہوں آج جو لوگ میرے تم سے شادی کرنے کے فیصلے کو غلط قرار دے رہے ہیں، وہ اپنی بات سے خود انحراف کر جائیں۔ کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ تمہیں نمو کو بیٹی کی طرح رخصت کرنا ہے۔"

☆======☆======☆

اس کی حیرت کی کوئی انتہا تھی نہ تشویش کی کوئی حد......

گل کا اس طرح صغیر احمد سے شادی کر لینا سمجھ سے بالاتر تھا، یہ یقین بھی نہ آ رہا تھا کہ گل نے صغیر احمد جیسے بردبار اور زیرک شخص کو شیشے میں کیسے اتارا ہوگا۔

دوسری جانب یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ اس کے اور صغیر احمد کے اس نئے رشتے کا اثر زمین کے اور اس کے اس نئے رشتے پہ نہ پڑے۔ اب جب کہ شادی میں کچھ دن ہی رہ گئے تھے، یہ انکشاف یاسر کے حواس مختل کیے دے رہا تھا۔

کال بیل کی آواز پہ وہ چونکا...... سست قدموں کے ساتھ چل کے دروازہ کھولا تو سامنے گل پہ نظر پڑتے ہی اس کی تمام حسیات چوکس ہو گئیں۔

"تم؟"

اس کی نظر کے سامنے صرف گل کا وجود ایک بھرپور خطرے کی علامت میں موجود تھا...... اس کے عقب میں کھڑے صغیر احمد پہ پہلی نظر میں وہ دھیان ہی نہ دے پایا۔ جب دھیان گیا تو اپنی بے تابی پہ خود خجل ہو گیا۔

"صغیر بھائی! آئیے ناں۔" اس نے کچھ سنبھل کے دونوں کو ایک طرف ہٹ کر آنے کا

"اب یہ بھائی وائی کہنا چھوڑو بیٹا...... رشتے بدل چکے ہیں اور اس کے تقاضے بھی نئے ہیں۔"

یاسر نے پہلو بدل کے گل کی جانب دیکھا جو صوفے پہ صغیر احمد کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی اور صغیر احمد کی اس بات پہ اس کے لبوں پہ ایک بڑی اکسا دینے والی مسکراہٹ آئی تھی۔

"ہم بازار جا رہے تھے، سوچا، پہلے تمہاری طرف چکر لگا لیں۔ ملاقات بھی ہو جائے گی اور تم سے ایک کام بھی تھا گل کو...... وہ بھی ہو جائے گا۔"

"مجھ سے کام؟" وہ گھبرا اٹھا، اب نہ جانے یہ اپنے شوہر کے سامنے کون سا کام لینے والی ہے مجھ سے۔

گل معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے اس کے پاس آئی اور بڑے استحقاق سے کہنے لگی۔

"اٹھو بھی۔" یاسر کبھی اس کا...... کبھی صغیر احمد کا منہ تکنے لگا۔

"گھبرا کیوں رہے ہو، بھئی، ناپ لینا ہے اس نے تمہارا۔"

وہ نہ چاہتے ہوئے بھی کھڑا ہو گیا۔ صغیر احمد اب سامنے رکھا میگزین اٹھا کے اس کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ گل ہاتھ میں پکڑی پیمائشی ٹیپ کھولتے ہوئے اس کی جانب بڑھی اور یاسر کی گردن کے گرد لپیٹ دیا...... یاسر نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا...... اس کی نگاہوں میں ایک چیلنج تھا...... جیسے وہ اسے للکار رہی ہو کہ ہمت ہے تو اس شکنجے سے نکل کے دکھاؤ...... یاسر نے گھبرا کے نظریں چرا لیں۔

گل اب ٹیپ اس کی کمر کے گرد لپیٹتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"آپ شادی پہ سوٹ پہننا پسند کریں گے یا شیروانی؟"

☆======☆======☆

"میری بچی، کہے دے رہی ہوں...... مت ستائیو میرے کو، لے...... یہ یخنی پی...... بخار نے جان نکال کے رکھ دی ہے۔ میری بچی کی، کچھ کھائے گی، پیئے گی تو جان آئے گی۔"

جنت بیگم یخنی کا پیالہ ہاتھ میں لیے حلیمہ کی منت کر رہی تھیں اور وہ تھی کہ بار بار پیالہ پرے کر رہی تھی۔

"ارے بی بی......! جان کھانے پینے سے نہیں بنتی۔"

حلیمہ کے پیر دباتی رجو نے اپنا فلسفہ جھاڑا۔ "کھایا پیا سب ایک طرف ہو جاتا ہے

حلیمہ نے تڑپ کے رجو کو دیکھا جیسے اپنے دل کا حال اس کی زبان سے سن کر مارے رقت کے پگھلی جا رہی ہو۔

"اب جو ہونا تھا ہو گیا...... یوں بھوکی پیاسی...... رہ کے کیا جان گنوائے گی۔ اسے کیا پرواہ تیرے فاقوں یا بیماری کی اور کچھ نہیں تو ماں یا بیٹی کے دل کو ہی اپنا خیال رکھ لیجیو۔"

جنت بیگم نے اس کے بکھرے بال سنوارے۔

"اماں...... وہ اس کے ساتھ بازار گئے ہیں۔" حلیمہ نے بہ دقت اٹھتے ہوئے کہا۔

"بازاری جو ہوئی...... وہیں جائے گی۔"

جنت بیگم نے جل کے کہا۔

"وہ کبھی میرے ساتھ اتنے خوش خوش بازار نہیں گئے...... اب تو ہنسنے بھی لگے ہیں اور اماں...... وہ بھی میرے ساتھ نہیں۔ اسی کے ساتھ۔"

"بٹیا بی بی...... وہ نئی جو ہوئی...... آدھی عمر کی جورو ویسے ہی سر چڑھی ہوتی ہے۔ اسے سر سے اتارنے کے لیے یہ بیماریاں، بخار اور رونا دھونا کام نہیں آتا۔ کچھ اور کرنا پڑتا ہے۔"

"کچھ اور رجو...... کیا؟"

"ان جادوگرنیوں کا توڑ صرف کالا جادو ہے۔ دو تعویذ ڈالو تو ان کے حُسن اور جوانی پہ پھٹکار برسنے لگ جائے اور......"

"چپ رہ نامراد...... نگوڑی جانے کون کون سے سادھوؤں اور ڈھونگی پیروں کی دلال بنی پھرتی ہے۔ خبردار جو میرے سامنے کالا جادو کرنے والوں کا نام لیا تو...... چوٹی پکڑ کے دو جھٹکے دوں گی کہ بلبلاتی پھرے گی۔ اُدھر اذانیں ہو رہی ہیں، اِدھر تُو کفر بک رہی ہے۔"

رجو برا سا منہ بنا کے ٹانگیں دابنے لگی۔ ادھر جنت بیگم مصلہ اٹھا کے کمرے سے نکلیں، ادھر حلیمہ نے رجو کے ہاتھ روکے۔

"رجو...... کیسے تعویذ؟"

"شوہر بس میں کرانے کے تعویذ...... بڑے اثر والے تعویذ ہوتے ہیں۔ دیکھنا کیسے صغیر میاں اس کلموہی پر لعنت بھیج کر تمہارے گن گانے لگیں گے۔"

"واقعی؟"

"اور کیا اب ایسے دو دنوں میں پتا صاف ہو گا اس رانڈ کا۔" راجو نے چٹکی بجائی۔

"پھر وہ...... نمو کے ابا...... میرے ساتھ بازار جایا کریں گے...... میرے ساتھ ہنسا کریں گے...... اور میں...... میں پھر سے ان کے کمرے میں رہا کروں گی؟"

☆======☆======☆

گل یاسر کے کف کا سائز لے رہی تھی جب صغیر احمد نے کسی کا نمبر ملانے میں چوتھی مرتبہ ناکام ہونے پہ پوچھا۔

"یہاں سگنلز ٹھیک نہیں آتے کیا؟"

"آپ لینڈ لائن سے کال کر لیں۔"

یاسر مسلسل بے چینی محسوس کر رہا تھا اور اس وقت یہ بے چینی عروج کو پہنچ گئی جب اس کی پیش کش پہ غور نہ کرتے ہوئے صغیر احمد ایک مرتبہ پھر کوئی نمبر موبائل پہ ملاتے ٹیرس کی جانب نکل گئے یہ کہتے ہوئے۔

"شاید باہر ٹھیک آ رہے ہوں۔"

ان کے جاتے ہی یاسر کا دبا ہوا غصہ باہر نکلا۔ وہ اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے غرا کے بولا۔

"بند کرو یہ ڈرامہ۔"

"اس بار کوئی ڈرامہ نہیں ہے...... سچ مچ شادی کی ہے میں نے صغیر احمد سے۔"

"اب کہاں گئی وہ تمہاری افلاطونی محبت...... تم تو میرے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں بقول تمہارے۔"

اس نے طنز کیا۔

"نہیں جی سکتی تمہارے بغیر...... سچ ہی تو کہا تھا میں نے۔ کیا میں تمہیں جیتی نظر آتی ہوں؟"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سوال کر رہی تھی۔

"رہا اس شادی کا سوال تو یاسر...... میرے سارے رستے تمہاری طرف ہی آتے تھے۔ سیدھے بھی اور ٹیڑھے بھی۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکا۔ "اب کون سی نئی چال چل رہی ہو تم۔ لیکن جو بھی کرنا۔ دھیان میں رکھنا، تم مجھے کبھی بھی نہیں پا سکتیں۔ کبھی نہیں۔ میری زندگی میں دور دور تک تمہاری کوئی گنجائش نہیں...... سمجھیں؟"

"میں سمجھ گئی...... اب تم بھی یہ سمجھ لو کہ میں نے یہ شادی کیوں کی ہے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ میں تمہاری اس بات کا جواب دینا چاہتی تھی، جو تم نے بڑے دعوے سے کہی تھی کہ کوئی بھی شخص مجھ جیسی عورت کو اپنی بیوی نہیں بنانا چاہے گا۔ کوئی بھی شریف آدمی مجھے اپنی زندگی

میں شامل کر کے ساری عمر کی نیک نامی اور عزت داؤ پہ نہیں لگانا چاہے گا۔ صغیر احمد بھی ایک شریف اور عزت دار شخص ہے۔ نہ ہوتا تو تم کبھی اس کی بیٹی سے شادی کے لیے اتنے بے چین نہ ہوتے۔ لو دیکھ لو، کر لی ایک معزز شخص نے پورے ہوش و حواس میں مجھ سے شادی، ہو گئی میں خاندانی۔“

”تم پاگل ہو چکی ہو گل۔“ وہ جھنجلا اٹھا۔ ”بالکل پاگل......صرف اس ایک بات کو، اس بے بنیاد سی بات کو ثابت کرنے کے لیے تم نے شادی جیسے مقدس رشتے کو کھیل بنالیا؟ اور کتنے لوگوں کو سیڑھی بناؤ گی تم؟“

گل کے لبوں پہ ایک زہریلی سی مسکراہٹ آئی۔

”تم جتنا میری پہنچ سے دور ہوتے جاؤ گے۔ مجھے اتنی ہی سیڑھیاں اور چڑھنا ہوں گی۔“

اس سے پہلے کہ یاسر کچھ اور بولتا، صغیر احمد کو آتا دیکھ کے سنبھل گیا۔ وہ موبائل جیب میں رکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

”ہو گیا کام؟“

”جی......ہو گیا۔“ گل نے یاسر پہ ایک بھرپور نظر ڈالی۔

”چلیں......“

گل نے اقرار میں سر ہلایا اور صغیر احمد کے پیچھے قدم بڑھانے لگی، جو یاسر سے مصافحہ کے بعد باہر نکل رہے تھے۔ یاسر اپنی جگہ سے قدم تک نہ ہلا سکا۔ گل بے حد سستی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا رہی تھی۔ صغیر احمد باہر نکل گئے تو گل نے دروازے پہ رک کر گردن گھمائی۔

”اور ایک وجہ تو میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ دوسری وجہ تمہیں وقت بتائے گا۔“

اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

رجو صحن میں کھڑی تھی۔ آج کم میلی چادر میں لپٹی کم مکروہ لگ رہی تھی......کاجل کے ڈورے گالوں تک بہہ رہے تھے۔

حلیمہ اندر سے چادر اوڑھتی نکلی......ہاتھ میں پرس تھا۔

”چل رجو......جلدی سے ہو آتے ہیں۔“

”جلدی سے کیسے بی بی بٹیا......دو ویگنیں بدل کے جانا پڑتا ہے۔ دو گھنٹے تو آنے

جانے کے لگا لو۔ پھر وہاں پتا نہیں کتنی دیر بعد باری آئے۔ کوئی کم رش تو نہیں ہوتا۔“

”پھر......دیر ہو گئی تو اماں کو کیا کہوں گی؟“

”ٹیکسی کر لینا بی بی بٹیا......آپ کو کیا مسئلہ پیسوں کا۔ مسئلہ تو ہم جیسوں کو ہوتا ہے۔ آنے جانے کا کرایہ بچانے کے چکر میں سگی رشتے داریاں چھٹ جاتی ہیں۔ کسی کی خوشی غمی میں شریک ہونے کی بھی اوقات نہیں۔“

”تم پہلے بتاتیں......میں نمو کے ابا سے کہہ کر گاڑی منگوا لیتی۔“

دونوں پچھواڑے کے دروازے سے نکل کر گلی میں آ گئیں۔

”ہا......بی بی رہیں نا آپ بھولی کی بھولی......ان کو تھوڑی بتا کے جانا ہے۔ ان کو تو ہوا بھی نہیں لگنے دینی۔“

”ہاں، یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“

”بی بی بٹیا......وہ میں نے پیسوں کا کہا تھا، رکھے ہیں ناں؟“

”ہاں......دکھاؤں؟“ وہ رک کر وہیں پرس کھول کر تسلی کرانا چاہتی تھی کہ رجو نے روک دیا۔

”نہیں نہیں......ایسے رستے میں نہیں......چلیں چلیں......وہ رہی ٹیکسی۔“

☆======☆======☆

چھنو، گل کے ساتھ اس کے کمرے میں تھی......درمیان میں ڈرائی فروٹ کی بھری پلیٹ رکھی تھی......چائے کے کپ تھے اور ہمیشہ کی ندیدی چھنو ان سے بے نیاز رنجیدہ سی منہ لٹکائے بیٹھی تھی۔

”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک وقت میں دو دو رشتے آئے ہیں تمہارے......کہاں ایک کی امید بھی نہیں تھی۔ پھر اب پریشان کس لیے ہو؟“

”بھوک لگی ہو......سامنے بھری پلیٹ ہو مگر......مگر ہاتھ باندھے ہوں تو کوئی کیسے کھائے؟“

اس کے افسردہ لہجے پہ گل چونکی۔

”بتاتی کیوں نہیں ہو، ہوا کیا ہے؟ بہت دنوں سے تمہیں یوں بکھرا بکھرا دیکھ رہی تھی۔ بہت بدل گئی ہو تم......بہت زیادہ ادھر میری اپنی زندگی میں اوپر تلے کچھ اتنی تبدیلیاں آئیں کہ تمہاری تبدیلی کی وجہ تک نہ پوچھ سکی۔ حالانکہ دوست کہا تھا میں نے تمہیں۔ دوست سمجھ کے ہی بتا دو۔“

ذرا سی ہمدردی پا کے چھنو کے آبلے پھوٹ بہے......وہ بلک بلک کر رو دی۔

"کیا بتاؤں......کیا بتاؤں تمہیں کہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ......وہ ساجد۔"

"دھوکا دیا اس نے؟"

چھنو نے گل کے سوال پر ہاں میں سر ہلا دیا۔

"شادی نہیں کر رہا؟"

اس بار چھنو نہ اقرار میں سر ہلا سکی......نہ انکار میں......البتہ اس کے لبوں پہ بڑی زخمی سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"دفع کرو......نہیں کرتا تو نہ کرے......میں نے تم سے کبھی کہا نہیں کیونکہ بلاوجہ کی نصیحتیں کرنا میری عادت نہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ شکل سے ہی دھوکے باز اور فراڈیا لگتا ہے۔ اچھی بات ہے کہ تمہاری اس سے جان چھوٹ گئی۔"

"جان ہی تو نہیں چھوٹ رہی اور اگر وہ تمہیں فراڈیا لگ رہا تھا تو بتا ہی دیتیں......نصیحت نہ سہی۔ خبردار تو کر دیتیں۔"

"کر دیتی تو تم سنبھل جاتیں؟ عشق کا بخار کسی کے بتائے ٹوٹکوں سے نہیں اترتا۔ خیر جو ہوا......بھول جاؤ اسے......دل کا روگ بھی اسے بناؤ......جو دل کا روگ بنتے ہوئے بچے بھی......میں تو کہتی ہوں، ان دو رشتوں میں سے کسی ایک کے لیے ہاں کر دو، بھلے میں رہو گی۔"

"نہیں کر سکتی۔" وہ پھر سے بلکنے لگی۔ "نہیں کر سکتی۔ میں کسی اور سے شادی۔"

اب کے گل ٹھنک گئی۔ "کسی چکر میں تو نہیں پھنس گئیں۔"

اس کے رازداری سے پوچھنے پہ چھنو اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

☆=====☆=====☆

یہ شاہ بی بی کا ڈیرا تھا۔ کچی مٹی کی زمین کا بڑا سا کمرہ، جس کے ماحول میں عجیب سی خنکی اور عجیب سی تاریکی کا تال میل تھا۔ زمین پہ کھردری چٹائی بچھی تھی جس پہ حلیمہ اور رجو سمیت آٹھ دس عورتیں بیٹھی تھیں۔

دیواروں پہ گارے کا لیپ تھا......چاک سے اور کوئلے کی راکھ سے عجیب بدہیت تصویریں بنی ہوئی تھیں......چاروں جانب گیس کے لیمپ لگے تھے......گیس شاید ہلکی ہلکی لیک بھی ہو رہی تھی، فضا میں گیس کی بدبو رچی بسی تھی......دائیں جانب کی دیوار میں موجود

کمرے کے واحد روشن دان میں گھونسلے بنے تھے۔

ذرا اونچے ایک تخت پہ......جو سامنے کی دیوار کے ساتھ بچھا تھا......اجرک کی چھاپے والی چادر بچھی تھی......جس پہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کے شاہ بی بی بیٹھی تھی......کالے بڑے سے ڈھیلے ڈھالے چغے میں ملبوس، کھلے ہوئے بال آدھے کالے......آدھے سفید......روکھے اور بے رونق......اس کی شکل کو اور بھی اجاڑ بنا کے دکھاتے ہوئے۔

آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ......ہونٹ بھی خشک، کٹے پھٹے اور سفید......گلے میں بڑے بڑے رنگین منکوں والی مالا پیٹ تک جھول رہی تھی۔ تخت کے دائیں بائیں اگربتیاں جل رہی تھیں۔

ایک عورت تخت کے پاس نیچے بیٹھی، شاہ بی بی کی پنڈلیاں دباتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"شاہ بی بی......آپ ہی کا آسرا ہے۔ کچھ ایسا کرو کہ لاڈو رانی اجڑ کے رہ جائے۔ بڑی مٹک مٹک کر چلتی ہے۔ ذرا اس کی اکڑ تو توڑ دو شاہ بی بی۔"

"بی بی بٹیا......آپ والا کیس......سوتن کا۔"

رجو نے ہونق بیٹھی حلیمہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"اس کی اکڑ تو اس صورت ٹوٹتی نظر آ رہی ہے کہ جس پہ اسے زیادہ مان ہے، وہ سہارا ہی نہ رہے اس کے پاس۔"

"تو دیر کس بات کی ہے شاہ بی بی! ایک ساہ میں چھین لو اس کا مان۔"

"بے وقوف عورت! اس صورت میں تم زیادہ نقصان میں رہو گی۔ وہ تو دوسری کیا تیسری شادی کر لے گی۔ تم جوان بیٹا کہاں سے لاؤ گی......وہ ہی تو ہے اس کا مان، اس کی اکڑ۔"

"اوئے ہوئے......یہ تو ساس بہو والا کیس ہے۔" رجو نے دوبارہ سرگوشی کی۔

"نہ جی نہ......میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" وہ عورت دہل گئی۔ "ذرا ہتھ ہولا رکھ کے بی بی۔ اس بدبخت کے بے شک گوڈے گٹے توڑ کے رکھ دو جی......لیکن میرے پتر کو کج نہیں ہونا چاہیے۔"

"اوکھے اوکھے کام ہی بتانا شاہ بی بی کو......بڑی کالی طاقتیں ہیں تیری بہو کے پیچھے......ایسے ہی دو سالوں میں تیرا دم نکال کے نہیں رکھ دیا۔ بڑا جگرا چاہیے ان سے مقابلہ کرنے کا۔"

"آپ کے لیے کیا مشکل شاہ بی بی......کچھ ایسا تگڑا تعویذ بنا کے دو کہ میرا پتر اس کے

منہ پہ تھوکے بھی نہ...... گلیوں کا ککھ بن کے پھرے ڈائن۔"

شاہ بی بی آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلی گئی۔

حلیمہ نے مارے خوف کے رجو کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"کالی گھاٹ میں تین سہاگنوں کی ہڈیوں کی راکھ کی دھونی جمانی ہوگی...... اُلو کی آنکھ میں سونے کی کیل سے تعویذ چبھو کے شتر مرغ کے انڈے میں رکھ کے مٹی میں دبانا ہوگا۔ انتظام کروان سب کا۔"

"تین سہاگنوں کو میں کہاں جلاتی پھروں گی۔ شاہ بی بی اور اُلو...... سونے کی کیل...... مواشتر مرغ کا انڈہ...... میں کہاں سے لاؤں گی یہ سب کچھ۔"

"چلو...... اب یہ چاکری بھی شاہ بی بی کرے۔" وہ گرجی...... حلیمہ اور دبک گئی۔

"چل کیا یاد کرے گی۔" شاہ بی بی نے مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"جا...... ہری بنو کو لکھوا دے سب کچھ...... وہ خرید لائے گی، مگر سارا حساب آج کے آج صاف کرنا۔"

عورت اٹھی اور اس کے جانے کے بعد شاہ بی بی پھر سے آنکھیں بند کر کے کوئی ورد کرنے لگی۔ رجو اٹھی اور حلیمہ کو بھی اٹھنے کا ٹھوکا دیا۔ مگر وہ سہمی ہوئی اس کی چادر کھینچ کر اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرنے لگی۔

"رجو...... مہمان راضی نہیں تو ضد نہ کر...... زبردستی نہ کر۔" وہ بند آنکھوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ یہ دیکھ کے حلیمہ کا دل اور خوف زدہ ہو گیا۔

"رجو...... اسے تو بند آنکھوں سے بھی نظر آتا ہے۔"

"چلو ناں بی بی بٹیا۔" رجو نے بازو سے پکڑ کے حلیمہ کو اٹھایا اور گھسیٹتے ہوئے لا کے تخت کے سامنے لا بٹھایا۔

اسی وقت شاہ بی بی نے آنکھیں کھولیں اور حلیمہ کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

☆======☆======☆

گل ہمدردی اور افسوس کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی، جو ساری بپتا سنانے کے بعد اب ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

پھر وہ آگے بڑھی۔ اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"اب رونے کا کیا فائدہ؟ انگاروں میں ہاتھ دینے کا یہی انجام تھا۔"

"میری غلطی کیا تھی؟ کیا قصور تھا میرا؟"

"اب بھی یہی کہتی ہو کہ تمہارا قصور نہیں ہے۔" گل کو اس کی ڈھٹائی پہ تعجب ہوا۔

"ہاں نہیں ہے...... کیا کیا تھا میں نے، اس گھٹن کی ماری زندگی میں تازہ ہوا کے لیے کھڑکی ہی کھولی تھی ناں...... یہ اتنا بڑا قصور نہیں ہے۔ میں کیا اس دنیا میں اکیلی ہوں جس نے یہ غلطی کی...... کیا اس سے پہلے کبھی کسی عورت نے اس دنیا میں کسی مرد کا اعتبار نہیں کیا؟"

گل کا ہاتھ آہستگی سے چھنو کے کاندھے سے پھسل کر نیچے آ گرا...... وہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھی کہ چھنو نے دوسرا سوال بھی کر دیا۔

"پھر میرے اعتبار کو ہی گالی کیوں پڑی؟"

"ملتی ہے...... گالی ہی ملتی ہے۔ ہر اس عورت کو جس نے مرد پہ اعتبار کیا اور پتا ہے کبھی کبھی تو دینے والے کو وہ گالی ہی نہیں لگتی اور...... اور وہی سب سے سنگین، سب سے گندی گالی ہوتی ہے۔"

"میری تو زندگی کو ہی ساجد نے گالی بنا کے رکھ دیا ہے۔ پتہ نہیں کبھی اس گٹر سے باہر نکل بھی سکوں گی میں یا نہیں...... اب تو دل چاہتا ہے کوئی بھی ہو...... بڈھا، لنگڑا، چیچک کا مارا، فالج زدہ...... بس کوئی ہو اور لے جائے مجھے یہاں سے میں تو ان دونوں میں سے کسی بھی ایک کے لیے آنکھیں بند کر کے ہاں کر دوں مگر میں جانتی ہوں، ساجد مجھے ایسا کرنے نہیں دے گا۔ مجھے اس گٹر سے نہیں نکلنے دے گا۔ جب تک میرے خون تک میں سے بساند نہ آنے لگ جائے۔"

"ایک بات پوچھوں چھنو؟" گل نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔ "ساجد سے پہلے بھی...... میرا مطلب ہے، وہ تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد تو نہیں تھا...... یہ رنگینی، یہ آزادی...... یہی تو چاہتی تھیں تم...... اسی کو تازہ ہوا لینا کہتی تھیں...... روز ایک نیا چاہنے والا...... نئے نئے انداز میں سراہنے والا۔ پھر اب اتنی کراہیت کیوں؟"

یہ چبھتا ہوا سوال سن کر چھنو کچھ دیر اسے غور سے دیکھتی رہی...... پھر ایک گہرا سانس لے کر بولی۔

"میں نے تمہارے سوال کا برا نہیں مانا گل...... جو تم کہنا چاہ رہی ہو، میں سمجھ گئی ہوں...... ہاں، میں اتنی پاک دامن نہیں تھی۔ شاید اسی لیے میرے ساتھ ہونے والے ظلم پہ نہ زمین پھٹی نہ آسمان ٹوٹا۔ نہ ہی تمہارا دل ہمدردی سے پگھلا...... مگر گل! اس سے پہلے میں نے جو کیا...... دل سے کیا، اپنی مرضی اور اپنی چاہ سے کیا۔ بھلے صحیح تھا یا غلط...... اور اب، اب

میں اپنی مرضی سے نہیں، کسی کے کہنے پہ بک رہی ہوں۔ بن مول بک جانے میں اور بکے لے کر بک جانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ درد بکنے والا جان سکتا ہے۔ صرف بکنے والا۔"

یہ کہہ کر تھکے ہوئے قدموں سے دروازے کی جانب بڑھی۔ مگر پھر رک کر اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اتنے ہی گہرے لہجے میں کہنے لگی۔

"میں بری تب بھی تھی...... مگر زمانے کی نظروں میں۔ اپنی نظروں سے اب گری ہوں کیونکہ اب میں اپنے دل کی خوشی کے لیے نہیں بلکہ کسی اور کی خوشی پوری کرنے کا ایندھن بنی ہوں۔ جب دل رسی تڑا کے بھاگنا چاہتا ہو اور...... اور بدن کسی اور کی مٹھی میں ہو، وہی لمحہ ہوتا ہے جو کسی عورت کو عورت سے طوائف بناتا ہے اور گل! میں اکیلی نہیں...... ہر وہ عورت طوائف ہے جو دل میں کسی کو بساتی ہے اور گھر کسی اور کا بساتی ہے۔ چاہے وہ کسی کا شوہر ہی کیوں نہ ہو۔"

گل سن ہو کر رہ گئی۔

"میں نے تمہارے سوال کا برا نہیں مانا تھا۔ تم بھی میری بات کا برا نہ ماننا۔"

جاتے جاتے وہ کہہ گئی۔

☆======☆======☆

رات کے سناٹے میں وہ آئینے کے سامنے بیٹھی ایک ایک کر کے اپنے سارے زیور اتار رہی تھی اور اس سناٹے میں گونج رہی تھی یاسر کی آواز۔

"کسی کی بیوی بن جانا اتنا بڑا کمال نہیں ہے گل! جس پہ تم اتراؤ۔ بات تو جب ہے کہ بیوی بن کے رہو بھی۔"

اس کا ہاتھ تھم گیا...... اس نے سر جھٹک کے ان دل جلی باتوں کے اثر سے خود کو نکالنا چاہا اور بُندے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھنے کے بعد چوڑیاں اتارنے لگی۔

"مور کے پر لگا لینے سے گدھ کی فطرت نہیں بدل جاتی۔ رہتا تو وہ وہی ہے...... مردار نوچنے والا...... بات تو جب ہے گل! کہ تم اپنی ذات...... اپنی فطرت بدل کے دکھاؤ تب مانوں گا میں تمہیں۔"

گل نے غصے سے چوڑیاں کلائی سے کھینچ کر پٹخیں۔

"چپ کیوں نہیں ہو جاتے تم...... کیوں کچوکے لگاتے رہتے ہو مجھے۔"

اسی وقت صغیر احمد کمرے میں داخل ہوئے۔ گل کو مسکرا کے دیکھا جو آئینے کی جانب عجیب الجھے انداز میں دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے...... مزاج کچھ برہم لگ رہا ہے۔" گل سے کوئی جواب نہ دیا گیا۔

صغیر احمد نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیا تو وہ کرنٹ کھا کر اچھلی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو۔

"کیا سوچ رہی تھیں؟"

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا۔

"میرے دیر سے آنے کی وجہ سے خفا ہو رہی ہو؟"

صغیر احمد نے بازو اس کی کمر کے گرد لپیٹ کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کان میں ...ی کی۔

گل کا پورا بدن پسینے میں بھیگ گیا...... دل کو عجیب سی بے چینی نے آ گھیرا۔

"جب دل رسی تڑا کے بھاگنا چاہتا ہو اور...... اور بدن کسی اور کی مٹھی میں قید ہو۔ وہی ہوتا ہے جو کسی عورت کو عورت سے طوائف بناتا ہے۔"

چھنو کی بات سرسراتی ہوئی کانوں میں گونجی اور اس نے گھبرا کے ان کا بازو اپنی کمر سے ...ا۔

"گل......" صغیر احمد حیران تھے۔

"آ...... آپ، آپ خدا کے لیے آپا کے پاس چلے جائیے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نہیں چاہتی کہ کوئی ہماری شادی سے ناخوش رہے۔ مجھے اتنے ڈھیر سارے الزام لے کر نہیں جینا۔" کچھ سنبھل کر اس نے بات بنائی۔ "وہ بھی آپ کی بیوی ہیں۔ مجھ سے شادی کرنے کے بعد ان کا آپ پر سے حق ختم نہیں ہو گیا۔ آپ کو ان سے اس طرح لاتعلق نہیں رہنا چاہیے۔"

"مگر گل...... ! حلیمہ تو...... وہ ایک مجبوری کا بندھن تھا اور......"

"تھا نہیں...... اب بھی ہے...... جہاں اتنے سال اسے نبھایا اور نبھا لیں...... مجبوری ...لی کی ورنہ بُری تو میں ہی بنوں گی۔"

صغیر احمد بے حد متاثر نظر آنے لگے۔

"بری؟ میرے دل سے پوچھو، تم کتنی اچھی ہو۔ آج تو تم نے ثابت کر دیا کہ تم صرف ...ں بلکہ کتنی عظیم ہو۔"

گل کی آنکھوں کے آگے دھند چھا گئی۔ اس دھند کے پار وہ صغیر احمد کو کمرے سے نکلتا

دیکھ رہی تھی۔

''مجھے اتنی اونچی جگہ پر مت بٹھائیں صغیراحمد......زیادہ اونچائی سے گرنے سے تکلیف بھی زیادہ ہوتی ہے۔ چوٹ بھی گہری لگتی ہے۔''

☆======☆======☆

وہ تن دہی سے اپنے کام میں مصروف تھی۔ ورنہ ہاتھوں سے صحن کی کیاری کی مٹی کھودتے کھودتے اب ہانپنے لگی تھی۔ اچانک کتوں کے بھونکنے کی آواز نے سناٹے کو چیرا تو وہ بوکھلا کے اٹھی......اور اپنے کمرے کی جانب بھاگی...... جہاں صغیراحمد حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتے اسے تلاش کررہے تھے۔

''آ......آپ۔''

''تم کہاں سے آرہی ہو؟''

وہ مزید بوکھلا گئی اور مڑ کے باہر کی جانب دیکھنے لگی۔

''باہر کیا کررہی تھیں اس وقت؟''

حلیمہ نے دونوں ہاتھوں کو چھپانے کے لیے پشت کی جانب کیا...... صغیراحمد چونکے اور اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے سامنے کیا۔

''مٹی...... مٹی میں کیا کررہی تھیں تم؟''

''وہ......مٹی......کیا......کیاری۔''

''یہ کوئی وقت ہے کیاری صاف کرنے کا؟ کون سا پودا لگا رہی تھیں، جس کے لیے صبح تک کا انتظار نہیں ہوسکتا تھا۔''

حلیمہ جلدی جلدی پہلے ہاں، میں پھر ناں میں سر ہلانے کے بعد مسکرانے لگی۔

صغیراحمد کا کوفت سے برا حال ہوگیا۔

''چلو جاؤ...... ہاتھ دھو کے آؤ۔''

وہ بیڈ کے کنارے ٹک کر جوتے اتارنے لگے۔

''آ......آ......آپ ادھر۔''

صغیراحمد بے دلی سے مسکرائے۔ ''ہاں۔''

حلیمہ کے چہرے پہ خوشی کے رنگ پھیل گئے۔

☆======☆======☆

گل نے بڑے دنوں بعد جہاں آرا کے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ ایک پرانی طرز کا بڑا سا جیولری بکس کھولے بیٹھی زیور نکال نکال کر دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں......آؤ بیٹھو۔''

وہ کچھ حیران ہوتی پلنگ کے ایک کونے پہ ٹک گئی۔ وہ قیمتی زیورات کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہی تھیں، جیسے کوئی فیصلہ نہ کرپا رہی ہوں۔

''کوئی کام تھا اماں جان؟''

''ہاں...... کام تو تھا۔'' ان کا انداز ایسا تھا جیسے نہ چاہتے ہوئے کام سونپنا پڑ رہا ہو۔

''کہیے......''

''یہ میرا اور حلیمہ کا زیور ہے، پرانے فیشن کا ہے مگر ہے کھرا اور ٹھوس۔ میں نے سوچا نمو کے لیے نیا زیور خریدنے کے بجائے اسی کو تڑوا کے آج کے زمانے کے حساب سے بنوالیا جائے۔ ایک ایک پازیب اتنی بھاری ہے کہ نمو کی آٹھ چوڑیاں نکل آئیں۔''

اتنا کہہ کر وہ رکیں اور گل کو بغور دیکھنے کے بعد کہا۔

''میرا بازار جانا تو اب چھوٹ چکا ہے۔ ہول اٹھتے ہیں اللہ ماری موٹروں کے ریلے دیکھ کے۔ نمو ابھی بچی ہے۔ اتنی بڑی ذمے داری اسے دے نہیں سکتی۔ حلیمہ بچی نہیں ہے، جوان بچی کی ماں ہے مگر یہ ذمے داری اسے بھی نہیں دے سکتی۔ تم...... اب جو بھی ہے جیسا بھی ہے، ہو تو اس گھر کی بہو...... اگر صغیراحمد کو اپنایا ہے تو اس کی ذمے داریاں بھی اپناؤ...... تب ہی اس کے ساتھ ساتھ تمہیں گھر کے باقی لوگوں کے دل میں بھی جگہ مل سکے گی۔''

''جی...... میں مگر۔''

اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جہاں آرا نے اس کے ہاتھوں میں جیولری باکس تھما دیا۔

''میاں بیوی کا رشتہ ہوتا ہی ایک دوسرے کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے صغیراحمد کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا تھا مگر اب کھلے دل سے سوچتی ہوں کہ شاید اسی میں میرے بیٹے کی اور اس گھر کی بہتری ہو۔ شاید تم اس کی ساری محرومیاں، سارے فرائض بانٹ لو...... اس لیے یہ پہلا بوجھ میں نے تمہاری جھولی میں ڈالا ہے۔''

گل کشمکش کے عالم میں گود میں پڑے بیش قیمت زیورات کو دیکھتی رہی۔

☆======☆======☆

اس بار شاہ بی بی کے سامنے حلیمہ ڈری ہوئی یا سہمی ہوئی نہیں لگ رہی تھی...... بڑے

"ادھر میں نے تعویذ دبائے، وہیں نمو کے ابا میرے پاس آ گئے۔"

رجو نے عقیدت کے مارے شاہ بی بی کے ہاتھ چوم لیے اور حلیمہ کو بھی آنکھ کے اشارے سے ایسا کرنے کو کہا۔ وہ ہونقوں کی طرح رجو کو دیکھنے لگی۔

"آپ کی کرامات کے صدقے جاؤں۔"

اسے سمجھانے کی کوشش کو بےکار جان کے رجو اب شاہ بی بی کے واری جا رہی تھی۔

"دشمن پہلی بار میں ہار مان جائے تو یہ اس کی چال ہوتی ہے۔ اس پہ زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا دشمن تمہارا مقدر ہے حلیمہ! اور مقدر سے زیادہ عیار، مکار اور پل پل میں رنگ بدل لینے والا اور کوئی نہیں۔"

"مقدر..... مگر وہ کیوں دشمنی کر رہا ہے؟"

"ساڑھ ستی کا بڑا تنگ گھیرا ہے تیرے گرد۔ اسے توڑنا ہوگا۔"

"سا..... ساڑھ..... ستی؟" وہ خوفزدہ ہو گئی۔

"بڑا سخت چلہ کاٹنا ہوگا شاہ بی بی کو..... تجھے ساڑھ ستی کے عذاب سے نکالنے کے لیے اور اس کے لیے تجھے۔"

اتنا کہہ کر وہ رکی اور نظریں حلیمہ کے زرد پڑے چہرے پہ جما دیں۔

☆======☆======☆

"بی بی بٹیا..... بار بار گننے سے پیسے زیادہ نہیں ہو جاتے۔" رجو نے حلیمہ کو کوئی آٹھویں بار الماری کی دراز سے نکالے کب کے جمع کیے پیسے گنتے دیکھا تو اکتا کے کہا۔

"پھر کیسے زیادہ ہوتے ہیں؟" وہ پریشانی سے دریافت کرنے لگی۔

"صاحب سے مانگو..... کوئی بہانا کر کے۔"

"وہ دے دیں گے؟"

"کیوں نہیں دیں گے۔ اس چھمک چھلو کو صبح مٹھی بھر کے نوٹ پکڑائے تھے بازار جانے کے لیے۔ آپ بھی مانگو۔"

حلیمہ کچھ سوچتے ہوئے سر ہلانے لگی۔

☆======☆======☆

جہاں آرا نے بڑا سا کامدانی کا دوپٹہ نرمین کے سر پہ پھیلا کے دکھایا۔

"ماشاءاللہ..... کیا روپ آیا ہے میری نمو پہ۔"

وہ شرما کے سر جھکا کے رہ گئی۔

"پسند تو لاجواب ہے گل کی۔"

نرمین کی مسکراہٹ یہ سن کر پھیکی پڑ گئی۔

"بڑے دل سے خریداری کی ہے اس نے تمہارے لیے۔"

وہ اس کے تاثرات سے بے خبر گل کی تعریف کیے جا رہی تھیں، تب چونکیں جب بے دلی سے دوپٹہ سر سے کھینچتے دیکھا۔ فوراً ٹوکنے لگیں۔

"اوں ہوں..... سہاگ کا دوپٹہ ہے۔ ایسے مت نوچو۔"

"آپ نے انہیں کیوں کہا میری شاپنگ کے لیے۔"

"تو اور کسے کہتی..... اور اس نے تمہیں بھی تو ساتھ جانے کے لیے کہا تھا۔ چلی جاتیں اپنی پسند سے خرید لیتیں۔"

"مجھے نہیں جانا کسی کے ساتھ۔"

"بچپنا چھوڑو اب نمو..... زندگی میں بہت سی باتیں ان چاہی ہونے کے باوجود قبول رنی پڑتی ہیں۔ میں نے بھی گل کو اس صورت میں قبول کرنے کا نہیں سوچا تھا..... لیکن اب د لگانے سے کیا حاصل۔ دوسری عورت کے لیے مرد بڑا جذباتی ہوتا ہے۔ اسے ضد میں نہیں اچاہیے۔ ورنہ وہ پھر کسی اور کا نہیں رہتا۔ اسی کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ تم بھی گل سے اکڑی ڑی رہ کے گل کا کچھ نہیں بگاڑو گی۔ اپنے ہی باپ کے دل میں میل لاؤ گی۔"

"اماں جان..... یہ زیورات۔" گل اندر داخل ہوئی۔

"نمو کو دکھاؤ..... بلکہ پہنا کے دیکھو، ناپ میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔"

گل ڈبہ کھول کے ایک سیٹ نکالنے لگی اور آہستہ سے نرمین کی جانب بڑھی جو سر کائے بیٹھی تھی۔ گل نے اس کے گلے میں زیور سجایا تو جہاں آرا نے ساتھ ہی دوپٹہ پھر سے کے سر پہ ڈال دیا۔

"بنا کسی سنگھار کے ہی ایسی جچ رہی ہے میری بنو..... دلہن بن کے کیا غضب ڈھائے گا۔"

اس بار گل کی نظروں میں حسد نہیں، حسرت تھی۔

☆======☆======☆

"ایک لاکھ.....؟ مگر وہ کس لیے؟"

غیر احمد کے سوال پہ حلیمہ گڑبڑا گئی..... یہ سوال کرنے کی ہمت ہی مجتمع کرنے میں ے دو دن لگ گئے..... وجہ کیا بتائے گی؟ نہ اس کی تیاری کی نہ سوچا۔

"وہ...... وہ کچھ لینا ہے۔"

"ایسی کون سی چیز لینی ہے جو اکٹھے ایک لاکھ کی ضرورت پڑ گئی۔ پہلے تو تمہاری شاپنگ حد سے حد سات آٹھ ہزار میں آرام سے ہو جاتی تھی۔"

حلیمہ کو کوئی جواب نہ سوجھا، وہ انگلیاں مسلنے لگی۔

"کوئی زیور پسند آ گیا ہے؟"

حلیمہ نے جھٹ سے ہاں میں سر ہلایا۔

"دیکھو حلیمہ! زیور کی تمہارے پاس کمی نہیں ہے میں نے کبھی اور لینے سے منع نہیں کیا لیکن نمو کی شادی سر پر ہے۔ بہت سی تیاری کرنا ہے، بہت کچھ خریدنا ہے۔ ایک ہی تو بیٹی ہے ہماری۔ ایسے میں تمہیں خود سوچنا چاہیے کہ تمہاری خریداری زیادہ ضروری ہے یا زرمین کی۔ گل کو دیکھو، اس کے پاس زیور کے نام پہ وہ اکلوتا گلوبند اور جھمکے ہیں جو میں نے نکاح پہ دیئے تھے اور گنتی کے چند جوڑے کپڑے لیکن اس نے ایک بار بھی شادی کی تیاری کے لیے کوئی فرمائش نہیں کی۔"

حلیمہ نئے سرے سے کلس گئی گل کی مثال دینے پہ......

"اور وہ جو...... اس دن ڈھیر سارے روپے دیئے تھے اسے؟"

"کسے...... گل کو...... وہ نمو کی خریداری کے لیے ہی گئی تھی۔ اپنے لیے تو ایک چیز بھی نہیں لے کر آئی۔ تمہیں پتا بھی ہے کہ ان دنوں میں تمہاری کیا ذمے داری ہونی چاہیے۔ تمہارے حصے کے سارے فرائض وہ ادا کر رہی ہے۔ تم تو پتا نہیں ملازمہ کے ساتھ کہاں کہاں کی خاک چھانتی پھر رہی ہو۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے جیسے ٹیپو کی روح تم میں سما گئی ہو۔"

حلیمہ گھبرا کے گردن گھما گھما کے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ جیسے ٹیپو کی روح کو تلاش کر رہی ہو۔

"وہی گھر سے بے زاری۔ اپنے آپ میں مگن رہنا نہ دنیا کی خبر نہ رشتوں کی پروا۔"

حلیمہ ڈانٹ کھا کے منہ بسور کے رونے لگی۔ زیورات کے ڈبے اٹھا کے اندر آتی گل نے ٹھٹک کر یہ منظر دیکھا پھر سر جھٹک کے الماری کی جانب بڑھ گئی اور زیورات سنبھالنے لگی۔

حلیمہ روتا دھونا بھول کے بڑے غور سے اسے دیکھنے لگی۔ ادھ کھلے دہانے کے کناروں پہ جھاگ جمع ہو رہا تھا۔

☆=====☆=====☆

رات کے سوا دو بج رہے تھے جب حلیمہ دبے پاؤں کمرے سے نکلی۔ اس نے چور دل

کی طرح کوریڈور میں جھانکا...... کسی کو نہ پا کے ذرا مطمئن ہوتی آگے بڑھی۔ صغیر احمد کے کمرے کے سامنے رک کر، جو کبھی اس کا بھی کمرہ تھا، وہ رکی، ڈرتے ڈرتے کواڑ کو دھکیلا...... جانتی تھی کہ لکڑی کا پرانا دروازہ سالوں سے چرچراہٹ دے رہا ہے مگر اسے یہ جان کے ڈھیروں حیرت ہوئی کہ دروازہ بغیر کسی آواز کے آرام سے کھلتا چلا گیا۔ اسے یاد آیا ابھی اس دن تو صغیر احمد ستائشی لہجے میں جہاں آرا سے کہہ رہے تھے۔

"گل کے آنے سے سب کچھ بدل گیا ہے...... حتیٰ کہ اس گھر کے در و دیوار بھی...... وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جن کی جانب کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا، ان سب کا حل اس کے پاس ہے۔"

یہ بات یاد آتے ہی گل کو شاہ بی بی کی اس بات پہ پکا یقین ہو گیا کہ گل جادوگرنی ہے...... ورنہ بھلا دروازے اس کے ایک اشارے پہ چپ کیوں سادھ لیتے۔

اندر نائٹ بلب کی روشنی میں گل اور صغیر احمد سوئے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ صغیر احمد کے پرسکون چہرے پہ نظر ڈالتے ہی حلیمہ اور گھبرا اٹھی۔ ایک قدم پیچھے ہٹی واپس جانے کے لیے پلٹی بھی مگر پھر رک گئی۔ اسی وقت صغیر احمد نے کروٹ لی اور ان کا بازو گل کی کمر کے گرد حائل ہو گیا۔

حلیمہ کے دل پہ برچھیاں چل گئیں اور فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔ وہ سیدھا الماری کی جانب گئی، دو ڈبے نکالے اور دوپٹے میں چھپا کے واپس جانے لگی۔ الماری کھلی چھوڑ دی تھی...... دروازے کے قریب جاتی وہ اندر سے بے حد مسرور تھی۔

"ایسے ہی اماں جان کہتی ہیں کہ میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتی۔ دیکھ لو، کسی کو پتا بھی نہیں چلا کہ میں نے کیا کیا۔ یہ بھی سوئے رہ گئے۔"

اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا اور صغیر احمد کے بازو کو گل کے گرد لپٹا دیکھ کے ایک بار پھر عجیب سے محسوسات میں گھر گئی۔ اب وہ نظر انداز کر کے نہیں گزر سکتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی بیڈ تک آئی اور دھیرے دھیرے سے صغیر احمد کا ہاتھ گل پر سے ہٹانے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی غیر معمولی ٹھنڈک سے صغیر احمد چونک کے جاگ گئے۔ اس کے ہاتھ میں اپنی کلائی دیکھ کے حیرت سے اٹھ کے بیٹھ گئے۔

"تم اس وقت...... یہاں؟"

ان کی آواز پہ گل کی آنکھ بھی کھل گئی۔ وہ بھی حلیمہ کو اپنے سر پہ کھڑا دیکھ کے حیران نظر آ رہی تھی۔

"تم رات کے اس وقت میرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟"

حلیمہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جواب دینے کی ہمت کہاں سے لاتی۔

"تمہیں عقل کب آئے گی حلیمہ؟ یہ کوئی طریقہ ہے آدھی رات کو کسی کے کمرے میں یوں۔"

اچانک ان کی نظر حلیمہ کے دوپٹے پہ گئی۔ جس میں کچھ لپٹا ہوا تھا جسے وہ چھپانے کی بڑی واضح مگر ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ اس کی جانب بڑھے۔

حلیمہ زیورات کے ڈبے سینے سے لگائے الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی...... صغیر احمد نے اس کے ہاتھ پکڑنے چاہے...... گھبرا کے بھاگنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں سے ڈبے نیچے گر کر کھل گئے...... صغیر احمد اور گل حیرت سے دم بخود تھے۔

☆======☆======☆

جہاں آرا اپنے تخت پہ سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ ساتھ جنت بیگم تھیں جس کا سر افسوس کے ساتھ ساتھ شرمندگی سے جھکا ہوا تھا زمین ایک دیوار سے چپکی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی جبکہ حلیمہ، جہاں آرا اور جنت بیگم کے تخت کے پاس نیچے زمین پہ بیٹھی اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ صغیر احمد غصے سے گرج رہے تھے۔

"دیکھی آپ نے اس عورت کی حرکت...... صرف گل کو پھنسانے کے لیے اس نے اپنے ہی گھر میں اپنی ہی بیٹی کے زیور چرائے تاکہ الزام گل پہ آئے۔"

روتی ہوئی حلیمہ حیرت سے انہیں دیکھتے ہوئے زور زور سے انکار میں سر ہلانے لگی۔

"صغیر میاں...... اس کا اتنا دماغ کہاں...... یہ کہاں سے سیکھے گی ایسے مکر...... کوئی اور وجہ رہی ہو گی جو اس نگوڑی نے۔"

جنت بیگم نے بیٹی کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی بھی کوشش کی اور اسے گھور کے بھی دیکھا۔ جواب ٹسوئے بہا رہی تھی۔

"تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔ میں نے رنگے ہاتھوں اسے پکڑا ہے اس کا خیال ہو گا ساری ذمہ داری گل کی ہے۔ اگر زیور غائب ہو گا تو اسی کا نام آئے گا...... اس طرح سے یہ اسے سب کی نظروں سے گرانا چاہتی تھی۔"

"نہیں...... میں تو، میں تو بس۔"

حلیمہ نے یہ کہتے ہوئے مدد طلب نظروں سے پہلے ماں کو پھر ساس کو دیکھا۔

"جنت ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بیٹا تم تو جانتے ہو، اس کی عقل بس پوری پوری ہے۔ اتنی گہرائی میں یہ کہاں سوچتی ہے۔"

پھر حلیمہ کو ڈانٹنے لگیں۔

"بتاتی کیوں نہیں حلیمہ! کیوں کی تُو نے یہ واہیات حرکت؟"

"وہ مجھے پیسے چاہیے تھے ناں تو میں۔"

"تو پیسوں کے لیے تم نے بیٹی کے زیور چرائے؟"

"چرائے تو نہیں، وہ تو نمو کے ابا نے واپس لے لیے ادھر الماری میں رکھ دیے دوبارہ۔"

جہاں آرا کوفت سے ماتھے پہ ہاتھ مار کے رہ گئیں۔

"اری بدنصیب! تجھ پہ کیا آفت آئی تھی جو اتنے پیسے چاہیے تھے۔"

"نہیں مجھے نہیں...... وہ تو شاہ بی بی کو چاہیے تھے۔"

"شاہ بی بی؟" صغیر احمد چونکے۔

زمین زار و قطار روئے چلی جا رہی تھی...... جہاں آرا نے بمشکل چند گھونٹ پانی کے اسے پلائے۔

"پتا نہیں امی کو کیا ہو گیا ہے؟ کیوں کرتی ہیں وہ ایسے؟"

"ہونا کیا ہے...... کب سے یہی کچھ کرتے دیکھ رہے ہیں اسے۔ رجو فسادن کے کہنے میں آ کے نہ جانے کس ڈھونگی پیرنی کے لیے لٹانے چلی تھی میرے بیٹے کی کمائی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ سوتن کا پتہ صاف کرنے کے چکر میں اپنی ہی بیٹی کا۔"

پھر زمین کو دوبارہ روتا دیکھ کے چپ ہو گئیں۔ اس کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے سمجھانے لگیں۔

"اسی لیے تمہیں سمجھاتی ہوں کہ نئی ماں سے ضد لگانا چھوڑ دو۔ یقیناً اس میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہو گی۔ میں کب تک جیوں گی۔ آج ہوں، کل نہیں تم بھی خیر سے اپنے گھر کی ہونے والی ہو۔ صغیر میاں کو سنبھالنے، اس گھر کو چلانے کے لیے کسی کا ہونا تو ضروری ہے، ہے ناں؟"

وہ کئی دنوں سے زمین کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن آج پہلی بار وہ متفق نظر آ رہی تھی۔

☆======☆======☆

گل گود میں ایک دوپٹہ پھیلائے اس پہ کرن ٹانک رہی تھی، چھنو ساتھ بیٹھی تھی۔

''تُو نے پوچھا نہیں؟''

''کیا؟'' گل نے سر اٹھایا۔

''میری اس دن والی بات کے بارے میں کہ مجھے کیسے پتا چلا تمہارے اور یاسر کے۔''

گل نے ہاتھ روک دیا۔ اس کے چہرے پہ اداسی کے رنگ نظر آ رہے تھے...... وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دوپٹے کو دیکھ رہی تھی۔

''میں بہت پہلے سے جانتی تھی...... ایک بار چھت پہ، دوسری بار پارک میں بھی تم لوگوں کو اکٹھے دیکھا تھا لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تم نے اسے اتنی آسانی سے کسی اور کا کیسے ہونے دیا؟''

''میں تو اب تک یہ بھی نہیں سمجھ پائی کہ میں نے اتنی آسانی سے خود کو کسی اور کا کیسے ہونے دیا؟''

''جیسی شکل تمہیں اللہ نے دی ہے، کاش اتنی عقل بھی دی ہوتی۔ دونوں بار تم نے کیا سوچ کے شادی کی۔ ایک ٹیپو جیسا گھامڑ...... دوسرا اصغیر چچا جیسا ادھیڑ عمر، یاسر تمہارے ہاتھ سے نکلا کیسے؟''

چھنو کے سوال پہ وہ بے بسی سے ہنس پڑی۔

''ریت بھی بھلا کبھی مٹھیوں میں قید ہوتی ہے؟''

''اور اب تم بیٹھی اس کی دلہن کے لیے سہاگ کے دوپٹے سجا رہی ہو۔ بڑا جگرا ہے تمہارا۔''

سلائی کرتی گل کی انگلی میں اچانک سوئی چبھ گئی...... وہ جلدی سے سوئی اور دوپٹہ چھوڑ کے اپنی انگلی تھام کے بیٹھ گئی۔ جس سے خون کا قطرہ ابھر رہا تھا۔

''یہ دوپٹہ اوڑھنے والی کو تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ اس پہ تمہارے کتنے آنسو اور کتنے خون کے قطرے گرے ہوں گے۔''

چھنو کے ہمدردی سے کہنے پہ گل نے افسردگی سے مسکراتے ہوئے اپنے آنسو صاف کیے اور اپنے ہی دوپٹے سے اپنی انگلی پہ لگا خون کا قطرہ پونچھا۔

''اسی لیے میں انہیں اس دوپٹے پہ گرنے نہیں دیتی...... کیونکہ وہ میرے آنسوؤں کی مہک بھی پہچانتا ہے اور خون کی بھی۔''

''اور محبت؟'' چھنو نے چبھتا ہوا سوال کیا۔ ''محبت کو پہچانتا ہے؟''

گل آنسو بھری پلکوں کو تیزی سے جھپکنے لگی۔

''تو پہچان کرا دُ اپنی محبت کی...... ہار مان کے کیوں بیٹھ گئی ہو؟''

گل نے دوبارہ سے دوپٹہ گود میں پھیلایا اور کرن ٹانکنے لگی۔

''تم نہیں سمجھو گی چھنو...... نہیں سمجھو گی...... میں نے ہار مانی یا نہ مانی...... کیا فرق پڑتا ہے جب ہار گئے تو ہار گئے۔ پوری تو میں کہیں بھی نہیں ہوتی...... جہاں پیار کھینچتا ہے وہاں اعتبار نہیں ہے اور جہاں سے اعتبار مل رہا ہے وہاں پیار نہیں۔ ادھورا تو رہنا ہی ہے...... ہر حال میں۔''

''میری سمجھ میں تمہاری باتیں نہیں آتیں میں تو کہتی ہوں، جب تک سانس ہے تب تک مقابلہ کرنا چاہیے اور وہ بھی اس طرح کہ آر یا پار ساجد سے نمٹنے کا میں نے بڑا اچھا حل نکالا ہے۔ تم دیکھنا، کیسے چار دنوں میں جان چھڑاتی ہوں اس آدم خور سے۔''

''میری مانو تو اپنے گھر والوں کو اعتماد میں لے کر۔''

''بھاڑ میں جائیں گھر والے اور ان کا اعتماد...... وہ تو مجھے راتوں رات مار کے دفنا دیں گے۔ میں نے ساجد سے بات کی ہے۔ وہ کہتا ہے اگر اپنی جگہ کسی اور لڑکی کا انتظام کر دوں ...... تم سے میری کوئی بہن ہوتی تو میں اپنے گلے کا پھندا اس کے گلے میں ڈالنے سے بھی نہ ہچکچاتی۔ اور تُو ہے کہ اپنے گلے کا ہار کسی کے گلے میں ڈال رہی ہے۔''

گل کوئی جواب دیے بغیر چپ چاپ دوپٹے میں کرن ٹانکتی رہی۔

☆======☆======☆

صغیر احمد اندر داخل ہوئے تو وہی دوپٹہ آدھا گود میں، آدھا بیڈ پہ پھیلائے محبت سے اس پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ مسکرائے اور اس کے قریب بڑھنے لگے...... وہ ان کی آمد سے بے خبر تھی۔ چونکی جب انہوں نے اس کی گود میں پڑا دوپٹہ اٹھایا...... وہ سر اٹھا کے دیکھنے لگی...... صغیر احمد نے دوپٹہ اس کے سر پہ پھیلا دیا۔

وہ سحر کے سے عالم میں بیٹھی دوپٹے کے ہالے میں بڑی الگ نظر آ رہی تھی۔

''بہت اچھا لگ رہا ہے تم پہ......''

گل دوپٹہ اتارنے لگی مگر صغیر احمد نے ہاتھ بڑھا کے روک دیا۔

''رہنے دو...... میں جانتا ہوں، ہر لڑکی کی طرح تمہارے دل میں بھی کئی ارمان ہوں گے مگر نہ پہلے...... نہ اب تمہیں دلہن بننے کا موقع ملا...... یہ خیال مجھے پہلے آنا چاہیے تھا۔ اب بھی کوئی دیر نہیں ہوئی۔ میں تمہاری ہر خواہش پوری کروں گا گل۔''

گل کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

وہ مبہوت سی ہو کر صغیر احمد کو تکے جا رہی تھی۔

"تمہاری ہر محرومی مٹاؤں گا...... تمہارے دل کی ہر کسک......"

وہ اچانک صغیر احمد کے ہاتھ تھام کے ان پہ چہرہ رکھ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"گل......" وہ متحیر تھے۔

☆======☆======☆

وہ جب گھر کے اندر داخل ہوا تو گل صحن میں موجود تھی...... تار سے دھلے ہوئے کپڑے اتار رہی تھی...... یاسر پہ ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ رخ بدل کے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

بڑی اجنبی...... بڑی سرسری سی نظر تھی۔

یاسر اچنبھے میں پڑ گیا...... اور جاتے جاتے مڑ کے دوبارہ اسے دیکھا جو کسی روبوٹ کی مانند اپنے کام میں مصروف تھی۔ کوئی پون گھنٹہ بعد جہاں آرا بیگم کے کمرے سے نکلا تو وہ برآمدے میں کپڑے استری کر رہی تھی۔

اس کے نزدیک آتے یاسر کے قدم آہستہ ہوئے...... وہ اس کی جانب دیکھے بغیر اپنے کام میں مگن رہی۔

"تمہاری خاموشی مجھے الجھا رہی ہے گل۔"

گل نے اس کے مخاطب کرنے پہ بھی نظر نہ اٹھائی۔

"یہ خاموشی طوفان آنے سے پہلے والی خاموشی تو نہیں؟"

"نہیں...... تم اسے موت کے بعد والا سکوت سمجھ لو۔" بغیر سر اٹھائے، انہماک سے استری کرتے اس نے جواب دیا۔

"موت...... کس کی موت...... تمہاری اس محبت کی موت؟" یاسر طنز سے بولا اور اس کا طنز گل کو تڑپ کے سر اٹھانے پہ مجبور کر گیا۔

"بددعا تو مت دو میری محبت کو...... میری عمر سے لمبی زندگی ہے اس محبت کی۔"

"پھر سے وہی رٹ، مجھے شاید غلط فہمی ہوئی تھی کہ تم سدھر گئی ہو، بدل گئی ہو۔"

"نہ میں بدلی ہوں نہ میرا دل۔"

وہ یاسیت سے مسکرائی۔ "بس خوابوں نے رستہ بدل لیا ہے۔"

وہ صغیر احمد کی قمیص ہینگر پہ لٹکاتے ہوئے بولی۔

"میں مان ہی نہیں سکتا۔" چند لمحے اسے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد یاسر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم جتنا بھی پرسکون نظر آنے کی کوشش کرو...... مجھے اپنی زندگی کا سکون اتنا ہی خطرے میں نظر آتا ہے۔ تم جتنا بھی نارمل نظر آنے کی کوشش کرو گی...... مجھے معاملہ اتنا ہی ٹیڑھا نظر آئے گا۔"

گل اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے بڑے دھیان سے ہینگر پہ لٹکے صغیر احمد کے سوٹ پہ ہاتھ پھیر پھیر کے کوئی شکن ڈھونڈ رہی تھی۔

یاسر چڑ گیا۔ "بند کرو یہ ڈرامہ...... اور صاف صاف بتاؤ۔ تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟"

گل نے حیرت، دکھ اور بے یقینی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ اسے دیکھا۔

"تم نے ٹیپو کے ساتھ جو کیا سو کیا...... اب اس شریف انسان کو تو بخش دو...... کیا قصور ہے اس کا۔ چھوڑ دو اس گھر کا پیچھا۔"

چند سیکنڈ تک دکھ کی شدت سے گل کچھ کہہ نہیں پائی...... پھر طیش سے کپکپاتی مگر مدھم آواز میں بولی۔

"تمہارے نزدیک میری ہر بات جھوٹی ہے؟ ایک ڈرامہ ہے...... میں کچھ بھی کر لوں، کچھ بھی بن جاؤں۔ تم میرا اعتبار کبھی نہیں کرو گے؟"

"ہاں کبھی نہیں کروں گا...... جن کی فطرت میں ڈسنا ہو، ان پہ اعتبار کرنا بھی نہیں چاہیے۔"

اور تیزی کے ساتھ وہاں سے نکلا مگر اگلے ہی قدم پہ ٹھٹک گیا۔ حلیمہ اپنی ہراساں آنکھوں کے ساتھ اسے ہی تک رہی تھی...... چند سیکنڈ کی گھبراہٹ پہ اس نے جلد ہی قابو پایا اور قدم آگے بڑھا دیئے۔ حلیمہ نے اب حیرت سے گل کو دیکھا جو دوبارہ کپڑے استری کرنے میں مگن تھی۔

☆======☆======☆

"جن کی فطرت میں ڈسنا ہو، ان پہ اعتبار کرنا بھی نہیں چاہیے۔"

یاسر کی آواز نے رات کے سکوت کو چیرتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔

وہ ننگے پیر آنگن کی اینٹوں پہ ٹہل رہی تھی۔

ہوا سے بکھرے بال اس نے ہاتھوں سے سمیٹتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"میری پور پور میں ڈنک مارنے کے بعد، میری ہر رگ میں زہر اتارنے کے بعد تم مجھ پہ ہی ڈسنے کا الزام لگا رہے ہو۔"

جنت بیگم اور جہاں آرا کچھ سلے اور کچھ اَن سلے کپڑوں کا ڈھیر سامنے رکھے بحث کر رہی تھیں۔گل وہیں بیٹھی زرمین کے دوپٹے پہ کڑھائی کر رہی تھی۔

"اے بھابی! بس رہنے دو، تمہیں کیا خبر نگوڑے آج کل کے فیشن کی۔ نمو کو خود پسند کرنے دو......مگر خبردار نمو! جو تُو نے پھیکے رنگوں کے جھابڑ جھولے سلوائے تو۔"

جنت بیگم نے ذرا فاصلے پہ بیٹھی رسالہ پڑھتی زرمین کو مخاطب کیا۔ وہ مسکرا کے رہ گئی۔

"شادی بیاہ پہ پہننے والے کپڑوں کے بارے میں اس کی کیا پسند ہوگی بھلا......ساری عمر وہ موئے سوتی جوڑے میں پہنے ہیں۔ اسے تو زری اور پوت کا فرق بھی معلوم نہ ہوگا۔ بس کہہ دیا......مایوں سے لے کر چوتھی کے جوڑے تک سب میری پسند کا ہوگا۔"

"واہ......تم چاہے کیسا بھی غلاف اوڑھا دو۔"

جنت بیگم نے منہ بنایا۔

"غلاف کیوں، ایک سے ایک بڑھیا جوڑا خریدوں گی۔ گل جو ہے مشورہ دینے کے لیے، اس کی پسند لاجواب ہے۔"

جہاں آرا کی بات پہ جنت بیگم نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے سر جھٹکا۔

"میں تو کہتی ہوں، یاسر میاں سے بھی پوچھ لیتے ہیں۔ ان کو کیا پسند ہے کون سا رنگ بھاتا ہے۔ اسی رنگ کے جوڑے زیادہ رکھیں گے۔"

گل بے ساختگی سے کچھ کہنے لگی۔ پھر لب دبا لیے۔

"اے گل...... بیٹی! ذرا گھمانا تو ایک فون یاسر میاں کو۔ لگے ہاتھوں یہ بھی پوچھ ڈالیں۔ بھئی......ان کے کپڑے تو ان کی مرضی کے مطابق بننا چاہیے۔"

گل ہاتھ سے کڑھائی کا فریم اور دوپٹہ رکھ کے سُست قدموں سے اٹھی...... یاسر کے طعنے سننے کا بھی حوصلہ نہیں ہو رہا تھا......اور ساس کا حکم بھی ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

"میں کہے دے رہی ہوں بھابی...... اسے اتنا مت سر چڑھائیو۔ نمو کی ماں حلیمہ ہے......میری حلیمہ اور اسے ہی دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا ہے تم لوگوں نے۔ ہر جگہ یہی چھنال آگے ہوتی ہے۔"

☆=====☆=====☆

یاسر کوفت اور بے بسی سے ریسیور کان سے لگائے کہہ رہا تھا۔

"تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟"

"چھوڑتی ہوں، بہت بار راستہ بدلتی ہوں لیکن ہر موڑ پہ تم پہلے سے کھڑے ہوتے ہو۔"

"پھر وہی باتیں...... میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ اپنی زندگی میں مگن رہو تم......اور اپنے راستے پہ چلنے دو......مگر تم۔"

"مجھے یہ فون کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس لیے میں نے کیا ہے۔"

"ورنہ تم نہ کرتیں...... ہے ناں؟" وہ طنز سے ہنسا۔

"شاید۔" وہ کچھ سوچ کے بولی۔

"شاید تب بھی کرتی......شاید نہ کرتی......محبت بڑا بے اختیار جذبہ ہے......کس وقت کیا کرا دے......کچھ پتا نہیں چلتا۔"

"مجھ سے محبت کرتے رہنے کی اب کوئی وجہ نہیں رہ گئی تمہارے پاس۔"

"تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی...... کیوں؟ ہے کوئی وجہ تمہارے پاس۔ تمہیں مجھ سے زیادہ اور بے تحاشا نفرت ہوگئی ہے اور تمہارے پاس اس کی کوئی بھی وجہ نہیں ہے۔ پھر اپنی محبت کے لیے کسی وجہ کا سہارا کیوں لوں؟"

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا......اور ایک مصنوعی مسکراہٹ کا لبادہ اپنے تھکے ہوئے چہرے پہ اوڑھ کے سب کے درمیان آگئی۔

زرمین تجسس بھرے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

"کون سا رنگ پسند ہے یاسر میاں کو؟"

جہاں آرا بیگم کے سوال پہ گل نے ایک پھسلتی ہوئی نظر زرمین کے دھلے دھلے معصوم چہرے پہ ڈال کے کہا۔

"بے داغ۔"

زرمین کے چہرے پہ تعجب نظر آنے لگا۔

"لو......یہ کون سا رنگ ہوا بھلا۔"

جنت بیگم کے اعتراض پہ وہ سنبھلی۔ "میرا مطلب ہے سفید......سفید رنگ۔"

"اے ہٹاؤ پرے...... یہ سفید رنگ بھی نگوڑا کوئی رنگ ہے۔ بھابی! تم بھی کس سے پوچھ بیٹھیں۔ یہ لونڈوں لپاڑوں کو کیا خبر سہاگ کے رنگوں کی۔"

☆=====☆=====☆

ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں زرمین دلہن بنی بیٹھی تھی۔ حلیمہ نے نزدیک آ کے اس کا گھونگھٹ ذرا سا ہٹا کے دیکھا اور مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ مسکراہٹ زرمین کے ہونٹوں پہ بھی ٹھہر گئی۔ پھر اچانک اس مسکراہٹ کی جگہ وحشت نے لے لی کیونکہ حلیمہ اس کے ماتھے سے ٹیکا اور جھومر نوچ رہی تھی، پھر وہ اس کا گلوبند بھی کھینچنے لگی۔ زرمین نے سہم کے ماں کو دیکھا۔ روکنے کی ہلکی سی کوشش بھی کی۔ مگر حلیمہ اپنی اسی مخصوص درویشانہ مسکراہٹ کے ساتھ سارے زیور اتارتی گئی اور زرمین سے پیٹھ موڑ کے پتھر کے اوپر ایک ایک کر کے سارے زیور سجانے لگی۔ زرمین ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"امی...... میری چوڑیاں...... میرا جھمکا...... امی!"

"اوں ہوں...... روتے نہیں۔"

گل نہ جانے کہاں سے آئی۔ اس کے آنسو صاف کیے، اسے کاندھوں سے پکڑ کے اٹھایا اور سہارا دے کر اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ حلیمہ جو پتھر کے اوپر زیور سجانے میں مگن تھی۔ ان کو اکٹھا جاتے دیکھ کر اٹھی اور چلانے لگی۔

"زرمین...... نمو......"

مگر وہ دونوں پیچھے مڑ کے اسے دیکھے بغیر آگے بڑھتی رہیں۔ حلیمہ پاگلوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگنے لگی۔

"نمو...... رک...... یہ لے لے...... میں نہیں لیتی...... نمو!"

مگر اسے پیچھے بھاگتے دیکھ کے گل نے نمو کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں بھی سرپٹ بھاگنے لگیں۔ اسی بھاگ دوڑ میں زرمین کا بھاری کام دار دوپٹہ نیچے گرا اور اس کے پیر سے الجھ گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ منہ کے بل نیچے گری تھی۔

"نمو......!" حلیمہ حلق پھاڑ کے چلائی۔

دور تک ریت اور دھول کا غبار نظر آ رہا تھا۔

حلیمہ دیوانوں کی طرح بازو ہلا ہلا کے دھول کے پار دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

دھول چھٹی تو...... نہ گل نظر آ رہی تھی نہ زرمین...... مٹی میں لپا زرمین کا سرخ زرتار دوپٹہ گول مول ہوا زمین پر پڑا تھا۔

"نمو......!"

حلیمہ پوری شدت سے چلائی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سارا بدن پسینے میں تر بتر تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا۔

☆======☆======☆

"کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟" صغیر احمد کھڑے کھڑے اسے دیکھنے آئے تو جنت بی سے پوچھنے لگے جو بے سدھ سوتی حلیمہ کے سرہانے بیٹھی کچھ پڑھ پڑھ کے پھونک رہی تھیں۔

"پہلے سے کچھ بہتر ہے مگر گم صم سی رہتی ہے۔ سوتے میں بھی بار بار ڈر جاتی ہے۔"

"ایسا دورہ اسے پہلے بھی پڑا ہے کبھی۔"

"اے ہٹ...... کیسا دورہ؟" وہ برا مان گئیں۔ "برا خواب دیکھ لیا ہے اور کیا......؟ دیکھا اس منحوس چہرے کو...... اتنا سا تو کلیجہ ہے میری بچی کا۔ وہ بھی سوتن کے ڈر سے سکڑ کے رہ گیا ہے۔"

گل کے ذکر نے صغیر احمد کو چیں بہ جبیں کر دیا۔

"شام کا ٹائم ہو۔ آپ لے جایئے گا۔ گاڑی آج سارا دن گھر پہ ہی ہے۔ فی الحال تو اور گل کو بازار......"

مگر حلیمہ جواب نیند میں کسمسا رہی تھی۔ یہ سنتے ہی اٹھ کے بیٹھ گئی اور ہسٹریائی انداز میں چلانے لگی۔

"وہ...... وہ لے جائے گی میری نمو کو...... اسے چھپا کے، اس کے سارے گہنے لے گی، اور چنری گندی کر دے گی۔ وہ بڑی چور ہے نمو کے ابا اسے میری نمو کو نہ لے جانے دیں......"

اس نے صغیر احمد کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

"یہ پاگل پن کا دورہ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اس کی دیوانگی پہ پردے ڈالنے سے آپ اس کا کوئی بھلا نہیں کر رہیں۔"

صغیر احمد نے گھبرا کے اپنا ہاتھ کھینچا اور ناگواری سے بولے۔

"میری نمو...... میری نمو کو گم کر دے گی وہ۔"

"میرا خیال ہے میں ڈاکٹر صدیق کے بجائے اس کے لیے کسی ماہر نفسیات سے ٹائم لوں۔"

"صغیر میاں! میری بچی پاگل نہیں ہے۔"

"یہی کہہ کہہ کر آپ ٹیپو کو آغوش میں چھپاتی رہیں۔ نہ اس کا علاج ہونے دیا نہ...... نتیجہ دیکھ لیا؟ حلیمہ پہ اب بھی میرا اتنا ہی حق ہے۔ شوہر ہوں میں اس کا۔ دوسری

شادی کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس سے لاتعلق ہو گیا ہوں۔ اور اس کو ایسی حالت میں چھوڑ کے خود نئی زندگی میں مگن ہو جاؤں۔ عمر کے تیس اکتیس سال گزارے میں نے اس کے ساتھ۔ میری بیٹی کی ماں ہے وہ۔ میں اس کا علاج کروا کے رہوں گا۔ جیسے مناسب سمجھوں گا، ویسے کراؤں گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"ہک...... ہا...... صغیر میاں! کاش تم جان سکو اس دکھیاری کا علاج کیا ہے۔"

"اماں...... اماں! وہ نمو کو چھپانے گئے ہیں نا؟"

حلیمہ نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔

"ہاں...... میری بچی! وہ چھپالے گا اپنی بیٹی کو...... کاہے فکر کرتی ہے۔"

جنت بیگم نے اس کے پسینے سے چپکے بال چہرے سے ہٹاتے ہوئے تسلی دی۔

"کہاں چھپائیں گے بھلا؟ اپنے کمرے میں؟ نہیں نہیں وہاں تو وہ ہو گی...... لے جائے گی میری نمو کو۔"

"کیسے لے جائے گی؟ ہاتھ جھڑ جاویں گے اس حرافہ کے۔ میں تو اس کی پلک پلک نوچ کے پھینک دوں گی۔ بس میری بچی...... چپ...... نمو تمہاری بٹیا ہے۔ گھڑی دو گھڑی اس کے ساتھ بازار سے ہو آئے گی تو اس کی تو نہ ہو جائے گی۔"

حلیمہ، جنت بیگم کے ساتھ چپک گئی۔

اس کی آنکھوں میں اب تک ہراس بھرا تھا۔

☆======☆======☆

"مایوں کا جوڑا پورا زرد رنگ کا بنواؤں یا سبز رنگ کے ساتھ؟" نرمین نے گل سے پوچھا۔ جو لاتعلق سی نظریں سامنے پھیلے رنگ برنگے چمکتے دمکتے کپڑوں پہ جمائے کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

"ہوں...... دیکھ لو...... جو پسند ہو۔"

"آپ بھی تو بتائیں...... مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"پیلا ہی لے لو...... میں دوپٹے پہ کرن کے ساتھ ساتھ سبز رنگ کی بنارسی پٹی بھی ٹانک دوں گی۔ اور وہ جو دوپٹے اور قمیص پہ شیشے لگنے ہیں ان کے گرد ایک ایک سبز ٹانکا۔"

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔"

وہاں سے نکل کے وہ جوتوں کی دکان میں گھس گئیں۔

"ایک گولڈن اور ایک سلور سینڈل تو لینی ہی ہے، باقی ایک سرخ، ایک نیلی، کیونکہ نیلے

ں کے تین جوڑے بنائے ہیں میں نے اور ایک اسکن کلر کی لے لیتی ہوں۔ اچھا ہو اگر ن کلر میں کوئی ایسی چپل یا سینڈل مل جائے جس پہ مختلف رنگ کے نگ لگے ہوں۔ بہت ے جوڑوں کے ساتھ چل جائے گی۔"

"تم بے شک ہر رنگ کی لے لو...... کھل کے شاپنگ کرو...... تمہارے ابا نے خاصی رقم ہے۔"

"بات پیسوں کی نہیں......" وہ مسکرائی۔

"مجھے نیلی، ہری، گلابی چپلیں پیروں میں اچھی نہیں لگتیں۔ میں نے ہمیشہ کالی سفید یا ن کلر کی پہنی ہے۔ یہ سرخ بھی صرف شادی والے دن کے لہنگے سے میچ کی ہے۔ ہائے ا دیکھیں تو بالکل ویسی سینڈل ہے جیسی میں کہہ رہی تھی۔ بس اس کا رنگ سفید ہے۔ ئی...... اس میں اسکن یا بلیک کلر ہو گا؟"

وہ سیلز مین کی طرف متوجہ ہوئی اور گل نے شیشے سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی ں کی شاپنگ ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا اس کے لیے...... وہ جو خود کو تکلیف اور اذیت دے ے کر یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ وہ اب اذیت پسند ہو چکی ہے اور ان سب باتوں کا اس پہ کوئی اثر ں ہونے والا۔ نئے سرے سے تکلیف اور درد کے مزے لوٹ رہی تھی۔

"یہ بلیک اور سلور سینڈل اچھی لگ رہی ہے؟"

نرمین نے ایک بار پھر اسے متوجہ کیا اور اسے ہونا پڑا۔ اس کے سفید سفید پیر اس نازک کالی سینڈل میں بڑے سج رہے تھے مگر یہ ہائی ہیل......

"لیکن یاسر کو تو ہائی ہیل کی ٹک ٹک پسند نہیں ہے۔" بے ساختہ وہ کہہ اٹھی اور پھر خود ہی ں ہو گئی۔

"میری بلا سے...... وہ جو چاہے لیتی، مجھے کیا فرق پڑتا۔ میں کیوں یہ چاہتی ہوں کہ وہ کے سامنے ناپسندیدہ نہ ٹھہرے۔"

"یہ واپس رکھ دیں۔"

وہ سینڈل نرمین کو از حد پسند آئی تھی۔ یہ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا مگر اسے اتار واپس رکھواتے ہوئے وہ پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔

وہاں سے نکل کر گل نے گاڑی کی جانب بڑھنا چاہا۔

"پیاس لگی ہے، جوس پئیں؟" نرمین کے کہنے پہ وہ رکی۔

"چلو...... وہ سامنے ہے ریسٹورنٹ۔"

دونوں نے رخ موڑ لیا۔

"ارے گل......نمو......"

اچانک ہی سامنے سے چھنو ٹکرا گئی۔

نرمین کے چہرے کا زاویہ اسے دیکھ کے بگڑ گیا۔ وہ اس کے پُر تپاک سلام کا جواب منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے دیتے ہوئے نظریں پھیر کے جولری شاپ کے اندر جھانکنے لگی۔

"تم کہاں پھر رہی ہو؟"

"ایک دوپٹہ میچ کرنا تھا۔ اسی کے لیے ماری ماری پھر رہی ہوں۔ تم لوگ تو شاید لمبی شاپنگوں پہ نکلے ہو۔"

اس نے دونوں کے ہاتھوں سے لٹکے پھولے پھولے تھیلوں کو دیکھ کے کہا۔ پھر اپنی دانست میں سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"اب یہ نمو صحیح ہے تمہارے ساتھ؟"

گل اسے تنبیہاً گھور کے رہ گئی۔

"ہاں ظاہر ہے...... مطلب جو ہوا...... شادی کے دن قریب ہیں ماں اور نانیاں تو جوڑے ٹانکنے سے رہیں۔" اس کی یہ سرگوشی بھی حقیقتاً سرگوشی نہ تھی۔

"چلیں......" نرمین نے ناگوار انداز میں اسے گھورتے ہوئے گل کو ٹہوکا دیا۔

"گھر جا رہی ہو؟ گاڑی پہ آئی ہو تو مجھے بھی اتارتی جانا۔"

"ابھی تو جوس پینے جا رہے ہیں۔"

گل کے جواب پہ اس نے منہ لٹکا لیا۔

"اوہو...... پھر سے ویگن کی خواری...... رکشے جتنے پیسے بھی تو نہیں بچے۔"

"چلو آؤ۔ تم بھی ساتھ آ جاؤ۔ دس پندرہ منٹ کی تو بات ہے۔ پھر اکٹھے نکلتے ہیں گھر کے لیے۔"

گل نے مروتاً کہہ ہی ڈالا۔ نرمین احتجاجاً تیز تیز چلتی دو چار قدم آگے نکل گئی۔

☆======☆======☆

"تمہارے رشتے کی بھی تو بات چل رہی ہے؟"

جوس کے سپ لیتے ہوئے گل نے پوچھا تو موبائل پہ کوئی میسج ٹائپ کرتی چھنو نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ہاں دبئی کا رشتہ ہے۔ لڑکا الیکٹریشن ہے۔ ماں باپ مر گئے ہیں۔" پھر ذرا رک کر

...نی پتی لاتعلق سی بیٹھی نرمین کو دیکھ کر مزے لینے کے انداز میں بولی۔

"نرمین کے ساس سسر کی طرح...... جن کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، ان کے ساتھ شادی ...رنے کی بات ہی اور ہے، ہے ناں نمو!"

نمو نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہاں...... بس یہ فرق ہے کہ میں شادی کے بعد اپنے میاں کے ساتھ ملک سے باہر ...لی جاؤں گی۔ نمو کا میاں اس کے ساتھ اپنے سسرال آ کے رہنے لگے گا۔"

اس کے کھی کھی کر کے ہنسنے پہ گل نے اسے بری طرح گھورا۔ وہ نرمین کے چہرے کے ...بڑتے زاویے بخوبی دیکھ رہی تھی۔

"اور ہاں...... ایک دوسرا فرق بھی ہے۔ میں تو ایک گھریلو مشرقی لڑکی کی طرح ایک ...یے لڑکے سے شادی کرنے والی ہوں جس کی میں نے صرف تصویر دیکھی ہے جبکہ نمو......" وہ ...ھر سے کھلکھلائی۔

نرمین نے گلاس آدھا وہیں چھوڑ دیا۔

"بہت دیر ہو رہی ہے۔"

وہ بے چینی سے کرسی پہ پہلو بدلنے لگی۔

"ویسے گل...... نرمین کو دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ یہ شادی سے پہلے عشق بھی لڑا سکتی ہے ...ور لو میرج بھی کر سکتی ہے۔"

"بس کرو چھنو! حد ہوتی ہے بکواس کرنے کی۔"

پتا نہیں کیوں گل سے یہ سب سنا نہیں گیا، وہ پیسے نکال کر میز پہ رکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ...ہی اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

"لو...... ایسا میں نے کیا کہا؟"

"تم کتنی گھریلو ہو اور کتنی مشرقی یہ بھی سب جانتے ہیں اور نرمین کس حد تک عشق لڑا سکتی ہے یہ بھی سب جانتے ہیں۔ اپنی کڑواہٹ کو اپنے اندر رکھا کرو...... یہاں وہاں چھنکاریں ...ارنے سے کچھ نہیں ہو گا۔"

اس نے نرمین کا بازو پکڑا اور نکلنے کے لیے مڑی...... جہاں چھنو اپنی اس قابلِ اعتبار ...وست کے غیر متوقع رویے پہ پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ وہیں نرمین کو بے حد تقویت اور تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔

"لیکن یہ کوئی نہیں جانتا سوائے میرے کہ تم نرمین کی کتنی ماں بن سکتی ہو اور اس کے

میاں کی کتنی ساس...... ہے ناں؟"

چھنو کی دھمکی آمیز بات پہ گل نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ واقعی نمو کی حمایت اور ہمدردی میں چھنو کو کھری کھری سناتے ہوئے وہ یہ فراموش ہی کر گئی تھی کہ اس کے ایک اہم راز میں چھنو بھی شریک ہے۔

ان کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی چھنو نے اپنے موبائل فون کو ٹیبل سے اٹھایا۔ کسی کا پیغام اس کا منتظر تھا۔ وہ میسیج پڑھتے ہی زہریلے انداز میں مسکرا دی۔

☆======☆======☆

نرمین کو ایک بار پھر کسی سٹور کے آگے سے گزرتے ہوئے کچھ یاد آ گیا وہ اندر گھس گئی۔

کوفت میں مبتلا گل نے پہلے روکنا چاہا پھر سوچا۔

"دیر تو ہو گئی ہے۔ جتنا تھکنا تھا تھک بھی لیا۔ اچھا ہے اسے جو جو لینا ہے، آج ہی لے لے ورنہ کل پھر آنا پڑے گا۔"

وہ سُست قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے گئی۔

اندر نرمین کاؤنٹر پہ بہت سے پرفیومز اور آفٹر شیوز نکالے الجھن میں مبتلا نظر آ رہی تھی۔

پھر اس نے جھجکتے ہوئے گل سے پوچھا۔

"وہ...... ان کا...... انہیں کون سا پرفیوم پسند ہے؟"

"پتا نہیں...... پوچھوں گی۔"

"وہ پرفیوم دکھائیے۔"

سیلز مین کے نکال کر دینے پہ اس نے ڈھکن اتار کے اسے اپنے چہرے کے نزدیک کیا۔ آنکھیں بند کرتے ہوئے ایک گہرا سانس لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتارا۔ اسے یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، آس، پاس ہر جگہ یاسر کی مہک بھر گئی ہو۔

"پیک کر دوں!"

"جی...... دو دے دیجیے گا۔"

"ٹیپو سے شادی کرنے پہ تم نے مجھے شک اور بے اعتباری کا تحفہ دیا...... صغیر احمد سے شادی کرنے پہ نفرت کا تحفہ دیا۔ مجھے بھی تو تمہاری شادی پہ کوئی تحفہ دینا چاہیے۔ ایک تمہارے لیے اور...... اور ایک اپنے لیے۔ تاکہ میں جب چاہوں، تمہاری خوشبو اپنے پاس محسوس کر سکوں، اپنے اندر اتار سکوں۔"

وہ سوچوں میں گم وہاں سے نکلی اور گاڑی تک پہنچی۔ جہاں صغیر احمد کی دکان کا ملازم لڑکا ئی الوقت ڈرائیور کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا، گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اسے آتا دیکھ تیزی سے آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ سے سامان لینے لگا۔

"یہ آگے رکھ لو...... پیچھے جگہ ہی کہاں......"

اور یہ کہتے ہوئے اسے اچانک احساس ہوا کہ پچھلی سیٹ بالکل خالی تھی۔ نہ نرمین تھی نہ ں کا خریدا سامان۔

"نرمین کہاں ہے؟"

"جی...... پتا نہیں...... آپ کے ساتھ ہی تھیں۔"

"مگر...... وہ تو......"

وہ ہراساں ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

دل بیٹھتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

"کیا مطلب ہے اس بات کا......؟"

چند سیکنڈ کی بے یقینی سی خاموشی کے بعد صغیر احمد نے دھاڑ کے پوچھا۔

گل سہم کے دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس نے صغیر احمد کو پہلی بار اتنی بلند آواز میں بولتے سنا ا۔

"کہاں گئی میری نمو......؟" جہاں آرا بیگم رونے لگیں۔

"وہ تمہارے ساتھ تھی۔ پھر گئی کہاں......؟ کہاں ہے میری بیٹی......؟"

صغیر احمد کے استفسار پہ گل نے ڈرتے ڈرتے وضاحت دی۔

"میں نے آس پاس سب جگہ دیکھ لیا، وہ پتا نہیں۔"

"ارے مگر وہ تھی تو تمہارے ساتھ؟" جہاں آرا چلائیں۔

"ہم اکٹھے ہی تھے پھر ایک دکان پہ...... وہ...... وہاں...... پارکنگ سے بالکل قریب ی۔ دکان کے دروازے سے گاڑی نظر بھی آ رہی تھی۔ نمو کہنے لگی کہ وہ جا کے گاڑی میں بیٹھتی ہے، میں بعد میں آ جاؤں، بڑی اماں قسم سے اس کے جانے کے صرف پانچ چھ منٹ بعد میں ہاں سے نکلی مگر نمو گاڑی تک نہیں آئی تھی۔"

"ہائے میری نمو کو ڈھونڈ کے لاؤ۔ یہ وقت ہار کے بیٹھنے کا نہیں ہے صغیر احمد۔"

جہاں آرا بیگم نے شکست خوردہ انداز میں سر جھکائے بیٹھے صغیر احمد کا کاندھا جھنجوڑا۔

"جاؤ اسے ڈھونڈ کے لاؤ......تین دن بعد اسے مایوں بیٹھنا ہے۔"

"میں یاسر میاں سے بات کرتا ہوں۔"

بالآخر وہ اٹھے مگر جہاں آرا نے ٹوک دیا۔

"ہوش میں رہو صغیر میاں! لڑکی کا معاملہ ہے۔ ارے یاسر میاں کو تو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے اس بات کی۔"

صغیر احمد کشمکش کے عالم میں کھڑے رہ گئے۔

"کیا پتا راستہ بھول گئی ہو۔ شاید کوئی سہیلی نظر آ گئی ہو یا پھر وہ......یا......"

"نہیں اماں جان! وہ بچی نہیں ہے جو راستہ بھول جائے۔ نہ ہی ایسی غیر ذمہ دار کہ سہیلی کی طرف چل پڑے اور وہ بھی بغیر بتائے۔ کچھ بھی ہو مجھے یاسر میاں کو اعتماد میں لینا ہوگا۔ پچھلے دو گھنٹے سے میری بیٹی کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ میں ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے تو نہیں بیٹھ سکتا۔"

وہ اٹھ کے چلے گئے اور جہاں آرا بیگم نے ٹٹولتی نظروں سے گل کو دیکھتے ہوئے شک سے پوچھا۔

"کوئی بات تو نہیں ہوئی تمہاری نرمین سے؟"

گل آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے انکار میں سر ہلانے لگی۔

☆======☆======☆

اس کے منہ پر ٹیپ لگی تھی۔ ہاتھ پیچھے کی جانب بندھے تھے اور ٹانگیں بے ترتیب انداز میں صوفے سے نیچے جھول رہی تھیں۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔

ساجد آگے بڑھا اور اس کے چہرے پہ آئے بال ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے ایک خباثت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"بچپن میں گھر کا چھان بورا پھیری والے کو دے کر بدلے میں گلا سڑا پھل خرید لیا کرتے تھے۔ مگر یہ تو کمال ہو گیا یار......! پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ ردی مال کے بدلے خزانہ ہاتھ لگا ہے۔"

"ردی کا کیا کرو گے؟" اس کے ساتھی نے پوچھا۔

"وہی جو ردی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔"

"اگر یہ ہوش میں آ گئی......تو......؟"

"دوبارہ بے ہوش کر دینا۔ فی الحال کوئی شور شرابا نہیں ہونا چاہیے۔ ذرا یہ رات گزر جائے پھر اسے کسی کے ٹھکانے پہنچاتا ہوں۔"

پھر وہ گہری نظریں اس کے بے ہوش وجود پہ جمائے سیل فون پہ کوئی نمبر ملانے لگا۔

"تب تک مارکیٹ میں اس کے ریٹ تو لگواؤں۔"

☆======☆======☆

کمرے کے سکوت میں رہ رہ کے سسکیاں گونج رہی تھیں۔

کبھی جنت بیگم کی......

کبھی حلیمہ کی......

کبھی جہاں آرا بیگم کی......

"دوپہر سے شام ہو گئی ہے اور اب شام سے رات ہو رہی ہے مگر نمو کی خبر ہے نہ صغیر میاں کی۔"

"مل گئی ہوتی نمو تو اب تک صغیر میاں لے کے نہ آ گئے ہوتے۔ ہائے میری بچی! کس بد نظر کی نظر کھا گئی۔ کس غیر قدم کی نحوست پڑ گئی اس گھر پر۔"

جنت بیگم واویلا مچاتے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے برآمدے کی جانب دیکھ رہی تھیں جہاں کچن کی جانب جاتی گل نظر آ رہی تھی۔

"آتے ہی دو دو جنازے نکلوا دیئے کلموہی نے۔ مرنے والوں کو پھر بھی رو پیٹ کے جی ہلکا کر لیا۔ اب ہاتھ سے جاتی عزت پہ کیا واویلا کریں۔ یہاں تو منہ سے آہ نکالتے ہی ڈر لگتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہو۔"

"اماں......میں نے کہا تھا نا......نمو کو مت جانے دو۔ کوئی میری بات نہیں مانتا، کوئی میری نہیں سنتا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ وہ میری نمو کو لے جائے گی۔ مجھ سے دور لے جائے گی۔ گم کر دے گی۔ مگر کسی نے میری بات نہ مانی۔ صرف ٹیپو میری بات مانتا تھا۔"

روتے روتے وہ جس جوش سے بول رہی تھی۔ وہ جوش ٹیپو کا ذکر کرتے ہی دھیما پڑ گیا۔ جیسے اصل بات وہ بھول گئی۔

"ہاں ٹیپو......صرف ٹیپو لاتا تھا میرے لیے میٹھی گولیاں اور نمو کے لیے ہری کانچ کی چوڑیاں۔ میں ٹیپو سے کہتی ہوں۔"

وہ فوراً اٹھی اور اونچی آواز میں پکارنے لگی۔

"ٹیپو......ٹیپو!"

"دیکھو اسے......" جہاں آرا نے کوفت سے جنت بیگم کو متوجہ کیا۔

"جوان لڑکی پہ افتاد ٹوٹ پڑی ہے اسے اپنی باؤلیاں جھاڑنے کی پڑی ہے۔ میں کہتی

ہوں یہ سب ان تعویذوں کے بداثرات ہیں۔ کالے اور سفلی علم کرانے والے کے ساتھ ہمیشہ برا ہوتا ہے اور اس کی نادانی اور کفر ہمارے آگے آرہا ہے۔''

تب ہی صغیر احمد اندر داخل ہوئے۔ تینوں نے بڑی امید کے ساتھ انہیں دیکھا مگر ان کے چہرے پہ رقم مایوسی اور وجود سے جھلکتی تھکن دیکھ کے چپ ہو رہیں۔

صغیر احمد بیٹھ گئے اور سر جھکا کے اپنے خالی ہاتھوں کو تکنے لگے۔ پھر ان کے آنسو ان کے ہاتھوں پہ گرنے لگے۔ ان کو روتا دیکھ کے جنت بیگم اور جہاں آرا بھی ہمت ہار گئیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ حلیمہ ٹکر ٹکر ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

چند منٹ تک دل کا غبار نکال لینے کے بعد صغیر احمد نے آنسو صاف کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''اب مجھے وہی کرنا ہوگا جو میں کرنا نہیں چاہتا لیکن کیا کروں خاندان کی عزت میری بیٹی سے زیادہ اہم نہیں ہے۔ میں نے رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''مگر......'' جہاں آرا بیگم گھبرا گئیں۔

''اور آپ مجھے یاسر سے بات کرنے سے بھی نہیں روکیں گی۔ اب یہ بات چھپائے رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر...... اگر یہ رات یونہی گزر گئی تو اس کی سیاہی ہماری ساری زندگی کو تاریک کر دے گی۔''

☆======☆======☆

یاسر بے یقینی کے عالم میں ریسیور کان سے لگائے کھڑا تھا۔

دوسری جانب سے فون بند ہو چکا تھا۔ صغیر احمد اسے نرمین کے لاپتہ ہونے کی خبر دینے کے مشکل مرحلے سے گزر چکے تھے۔ مگر اس کا وجود اب آندھیوں کی زد میں تھا۔ وہ کچی نیند سے جاگا تھا یہ فون سننے کے لیے اور اب نیند تو کیا ساری حسیات ہی ہچکولے لے رہی تھیں۔

''نرمین...... مگر......''

بے یقینی سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے ریسیور رکھا اور پھر آہستہ آہستہ اس کے حواس کام کرنے لگے۔ اب اس کے چہرے پر حیرت اور بے یقینی کی بجائے دکھ اور غصہ تھا۔

''گل! تم...... تم...... اس حد تک بھی جا سکتی ہو۔'' وہ تیزی سے گھر سے نکلا۔

☆======☆======☆

رات کے پونے تین بجے وہ جہاں آرا بیگم کے سامنے بیٹھا تھا جو دوپٹہ منہ پہ رکھے سسکیاں روک رہی تھیں۔

''ایک ایک منٹ جیسے آری کی طرح کٹ رہا ہے۔ اتنی عمر ہوگئی ہے۔ بڑے سے بڑا صدمہ سہا ہے مگر یہ...... یہ غم تو برداشت سے باہر ہے۔''

''صغیر بھائی جان!''

''پھر رہا ہوگا سڑکوں پہ مارا مارا...... بڑی مشکلوں سے اسے تھانے جانے سے منع کیا ہے۔ اللہ کی ذات سے بڑی امیدیں ہیں۔ ہم نے آج تک کسی کی عزت نہیں اچھالی۔ پھر ہماری عزت کیسے...... اسی لیے میں نے ہاتھ جوڑ کے منت کی صغیر احمد کی کہ تھانے کچہری کے چکر میں نہ پڑے۔ اللہ کرے نرمین خیریت سے گھر لوٹ آئے۔ بات ختم...... لیکن اگر بات پھیل گئی تو بدنامی زندگی بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔''

''میں اس جگہ جانا چاہ رہا ہوں جہاں سے نرمین......''

''اس وقت......؟ اتنی رات کو......؟''

''شاید کوئی سراغ ہاتھ لگ جائے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''وہاں تو......'' بات کرتے کرتے جہاں آرا کی نظر کمرے میں داخل ہوتی گل پر پڑی۔

''ہاں...... گل جانتی ہے۔''

یاسر نے پلٹ کر گل کو گہری نظروں سے دیکھا اور اتنے ہی گہرے لہجے میں کہا۔

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کیا کیا جانتی ہے؟''

☆======☆======☆

''وہ سوال جس کا جواب تم نے وقت پہ چھوڑا تھا۔ مجھے اس کا جواب مل گیا ہے۔''

اسے بازو سے پکڑ کے گاڑی تک لانے...... فرنٹ سیٹ پہ دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کرنے اور بے حد فاسٹ ڈرائیونگ کرتے ہوئے چار منٹ کے اندر اندر مین روڈ تک آتے ہوئے وہ مسلسل چپ تھا اور گل اس کے پھٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔

یہ وہ پہلی بات تھی جو اس نے کی تھی۔

''یہی کہا تھا ناں تم نے کہ تم نے صغیر احمد سے شادی کیوں کی۔ اس کا جواب یہی ہے گل کہ تم نے یہ شادی اپنے گندے ارادوں پہ عمل کرنے کے لیے کی تھی۔''

گل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر یاسر نے موقع نہ دیا۔

''تم میرے دل سے اتری تھیں...... مگر مجھے یہ نہیں پتا تھا کہ تم انسانیت کی سطح سے بھی نیچے اتر چکی ہو۔''

''میں نے کیا کیا ہے اب؟''

''تم نے وہ کیا ہے گل! کہ مجھے یہ سوچتے ہوئے بھی خود سے گھن آرہی ہے کہ کبھی میں نے اپنے دل میں تمہیں جگہ دی تھی۔ تمہارے جیسی عورت کو۔''

''مگر......''

''بس......'' اس نے بریک لگاتے ہوئے دھاڑ کے کہا۔

گاڑی ایک ویران سڑک پہ کھڑی تھی۔

''زرمین کہاں ہے؟''

یاسر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

گل کانپ کے رہ گئی۔ کرب اس کی آنکھوں سے جھلکنے لگا۔

''ابھی، اسی وقت مجھے وہاں لے کر چلو۔''

''تم ہر بار مجھے ایک نیا چرکہ کیوں لگاتے ہو یاسر! کبھی ٹیپو کو مارنے کا الزام...... کبھی محبت کے نام پہ کھیل کھیلنے کا الزام اور......اور......اور اب زرمین...... میں ایسا کیوں کروں گی یاسر......!''

''یہ تم جانتی ہو گل کہ تم ایسا کیوں کرو گی۔ وجہ ہے تمہارے پاس، مگر جواز کوئی نہیں ہے۔ کوئی جواز نہیں ہے تمہارے پاس اپنے اس گھٹیا پن کی وضاحت کے لیے۔'' وہ اسے نفرت سے گھور رہا تھا۔

''تمہاری ڈھٹائی کے مظاہرے بہت دیکھ چکا ہوں میں۔ تمہارے ٹسوے بہانے سے میں تمہاری بات کا یقین نہیں کروں گا۔ زرمین جہاں بھی ہے، ابھی اسے واپس لاؤ۔ ابھی......''

''میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ اپنی مرضی سے گئی ہے یا......''

گل نے رک کر چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیسے ہوں گے اس نے کسی سے وعدے، شادی تم سے کرنا پڑ رہی تھی لے گیا ہوگا وہ انتقاماً۔ ایسی لڑکیوں کا یہی انجام ہوتا ہے جو پیار تو کر لیتی ہیں مگر اپنی جھوٹی شرافت کا پردہ چاک کر کے اس محبت کو قبول نہیں کرتیں اور بزدلوں کی طرح سر جھکا کے ماں باپ کی مرضی سے شادی کر لیتی ہیں۔''

یاسر غصے سے اندر ہی اندر ابل کے رہ گیا۔ وہ گاڑی سے اتر چکی تھی اور پیدل چل رہی تھی۔ یاسر لپک کے اس کے نزدیک آیا اور بازو سے پکڑ کے اسے اپنی جانب کھینچا۔

''کیا بکواس کی ہے تم نے؟ اور کچھ نہیں بن سکا تو اس پہ بہتان باندھ رہی ہو؟''

''جس کی وجہ سے تم نے مجھ پہ الزام لگائے۔ اس کی جانب ایک بھی بہتان ...نے پہ اتنا تڑپ کیوں رہے ہو؟''

''تم نے یہ حرکت اسے بدنام کرنے کے لیے نہیں بلکہ میری عزت کو داغ دار کرنے ...لیے کی ہے، مگر میں زرمین پہ مکمل بھروسہ کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں وہ جہاں بھی ہے تمہاری ...بات کی وجہ سے ہے۔''

گل نے اپنا بازو ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

''بہت جانتے ہو اس کے بارے میں...... بہت سے الہام اترتے ہیں تمہارے دل پہ ...ل کے بارے میں......تو جاؤ...... جا کے ڈھونڈو اسے۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔''

اور دوبارہ تیز تیز قدموں سے آگے چلنے لگی۔

☆======☆======☆

''میں نہیں کر سکا اماں! میں اپنی عزت کی نیلامی کے اشتہار نہیں لگوا سکا۔''

صغیر احمد، جہاں آرا بیگم کی گود میں سر رکھے رو رہے تھے۔

''مجھ سے نہیں ہو سکا یہ کام۔''

''میں تو پہلے ہی چاہتی تھی کہ بات تھانے کچہری تک نہ پہنچے۔''

''مگر اب میں کہاں سے لاؤں اپنی بیٹی کو۔''

تب ہی یاسر مایوس سا اندر داخل ہوا۔

''ایک رات...... پوری ایک رات اماں!'' وہ مسلسل رو رہے تھے یاسر نے آگے بڑھ ...ان کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔

''نہیں آئی نمو......؟''

حلیمہ باہر سے بھاگتی آئی...... اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور وہ باری باری یاسر اور صغیر ...کے چہرے دیکھتی ہوئی پھولی سانسوں کے ساتھ پوچھ رہی تھی۔

''کوئی میری سنتا کیوں نہیں، کیوں نہیں لائے نمو کو؟ وہ ساری رات سوئی نہیں ہوگی۔ ...گھر سے باہر نیند نہیں آتی۔ وہ ڈرتی بھی بہت ہے...... اسے ڈر لگ رہا ہوگا نمو کے ابا! اسے ...لا کر آئیے۔''

اس کی حالت دیکھ کر یاسر سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ اٹھا اور فوراً کمرے سے نکل ...ا۔

☆======☆======☆

رات کا آخری پہر سست روی سے بیت رہا تھا۔ کسی بھی وقت پو پھٹنے کی تیاری کر لیتی۔

گل صحن میں بیٹھی ساکت نظریں خلا میں جمائے بیٹھی تھی۔ کسی چیونٹی کے کاٹنے پہ وہ ہلکا سا چونکی۔ اپنا بازو مسلتے ہوئے اس نے ذرا دھیان میں آنا چاہا۔ کب سے اس کی نگاہیں چھنو کی چھت پہ جمی تھیں۔

اور تب ہی ایک خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا۔

''چھنو......!''

''تم دیکھنا میں کیسے دو دنوں میں پیچھا چھڑاتی ہوں اس آدم خور سے۔''

اس کی بات یاد آنے پہ گل فوراً کھڑی ہو گئی۔

''اگر اپنی جگہ میں کوئی اور لڑکی اسے لا دوں تو شاید......''

اور یہ بات یاد آتے ہی گل نتیجے پہ پہنچ گئی۔

''قسم سے اگر میری کوئی بہن ہوتی تو میں اپنے گلے کا پھندا اس کے گلے میں ڈالنے سے بھی نہ چوکتی۔''

اور گل نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے باہر کی جانب قدم بڑھائے مگر اگلے ہی لمحے اس کے سامنے یاسر کھڑا تھا۔

بکھرا بکھرا...... ہارا ہوا سا......

وہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ یاسر نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''یاسر......!''

''گل......! خدا کے لیے ایسا مت کرو...... میرا غصہ ان معصوم لوگوں پہ مت نکالو۔ ان کا کیا قصور ہے؟ کیا صرف یہ کہ انہوں نے تم پہ اعتبار کیا؟ تمہاری اصلیت جاننے کی زحمت کیے بغیر تمہیں اس گھر میں...... اپنے دلوں میں جگہ دی۔ تمہارے حوالے سے مجھ پہ بھی اعتبار کیا۔ مجھے بھی وہی جگہ اور محبت دی۔ پتا نہیں تمہارے پاس اس محبت اور اعتبار کے بدلے میں انہیں دینے کے لیے کیا ہے مگر میں انہیں اس اعتبار کے بدلے میں اتنی بڑی چوٹ نہیں دے سکتا۔''

''ہاں...... یہ سوغات تو تم نے ہمیشہ میرے لیے بچا کر رکھی ہے۔'' گل اس کی حالت دیکھ کر سلگ رہی ہے۔

کبھی بڑی شدت سے یہ دعا کی تھی کہ کاش وہ بھی یاسر کو اسی طرح محبت میں ہاتھ جوڑے عاجز آتے دیکھے۔ جیسی کہ وہ خود ہے۔ آج یہ دعا پوری ہوئی۔ محبت اسے جھکا رہی تھی مگر اس کی نہیں، زرمین کی محبت جو اس جیسے شخص کو گل کے سامنے ہاتھ تک جوڑنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے گلہ ہے، مجھ پر غصہ ہے، تم مجھے برباد کر دو گل...... میری طرف سے اجازت ہے مگر انہیں بخش دو...... زرمین کو واپس لے آؤ۔''

''لیکن زرمین میرے پاس......''

ابھی وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ یاسر اس کے قدموں میں گر گیا۔ اپنے پیروں پہ اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کر کے وہ کرنٹ کھا کے پرے ہٹی۔

''دیکھو...... میں نے ہار مان لی۔ گر چکا ہوں میں تمہارے قدموں میں۔ تم یہی چاہتی تھی نا۔ تم جو چاہتی ہو۔ وہی ہو گا۔ میں سب بھول جاؤں گا یہ گھر...... یہ لوگ...... اس گھر کے راستے، اپنی محروم اور منتشر زندگی کے سارے خواب، زرمین کو بھی بھول جاؤں گا۔ سب بھول جاؤں گا۔ بس تم زرمین کو واپس لے آؤ۔ میں نہیں چاہتا میری وجہ سے ان پہ کوئی تکلیف آئے۔''

گل سکتے کے عالم میں اسے گھٹنوں کے بل گرے گڑگڑاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

''میں اس کے بدلے اپنا آپ تمہاری غلامی میں دینے کو تیار ہوں عمر بھر کی غلامی۔''

''زرمین کے بدلے؟'' گل نے بے یقینی سے دہرایا۔

وہ اقرار میں سر ہلانے لگا۔

گل کے اندر بہت کچھ دھڑ دھڑ کر کے گرنے لگا۔

☆======☆======☆

چھنو کی آنکھ تکیے کے نیچے رکھے سیل فون کی کرخت آواز پر کھلی۔ جھنجلا کر اس نے سکرین پہ نام پڑھا۔

''اب کیا کاٹ رہا ہے اس ساجد کے بچے کو......؟''

''کیا تکلیف ہے تمہیں صبح صبح؟''

وہ فون کان سے لگاتے ہی چیخی۔

''تکلیف تو تمہیں کرنی ہوگی۔ آنا ہوگا یہاں۔''

''مگر کیوں؟ ہماری بات ہو گئی ہے نا۔ اب کیوں آؤں میں؟ وہ جو بھیجی ہے تجھے کم پڑ

رہی ہے کیا؟“

”ظاہر ہے تیرے بدلے تو دو بھی کم ہیں۔“

”مجھے تیری زبان پہ بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“ وہ تلملا کے رہ گئی۔

”وہ تو ہے...... اچھا اب زیادہ وقت مت ضائع کرو بک بک کرتی جا رہی ہو۔ نکلو گھر سے۔“

”میں نہیں آنے والی۔“

”دیکھ چھنو! یہ مت بھولنا کہ تمہاری وہ سی ڈی اب تک میرے پاس ہے۔“

چھنو ٹھنڈی پڑ گئی۔

”لیکن اتنی صبح سویرے۔ میں کیسے......؟“

”جو مال تم نے بھجوایا ہے اسے گودام تک لے جانے کے لیے تمہاری ضرورت ہے۔ اب ایک بے ہوش لڑکی کو چار لڑکے سیڑھیوں سے لے جاتے کیسے لگیں گے بھلا۔ تمہارے لیے ایک نرس کا یونیفارم زبردست سا استری کروا کے رکھا ہے۔ آ جاؤ شاباش تمہارا ایکٹنگ کا شوق بھی پورا ہو جائے گا۔“

”بس......؟“

”ہاں، بس اور کیا مجھے تم سے پراٹھے پکوانے ہیں؟“

چھنو نے ایک گہری سانس لی جیسے سستے میں چھوٹ جانے پہ شکر کر رہی ہو۔

”دن تو نکلنے دو...... اس وقت پونے چھ بجے ہیں نکلنے کا کون سا بہانہ بناؤں۔“

اور ریسیور رکھ کے کچھ سوچنے لگی۔

☆======☆======☆

”میں نے آج تک تجھ سے کچھ نہیں مانگا میرے اللہ! سوچتی تھی جو میرا ہے، اسے مانگنے کی کیا ضرورت، کاش میں نے جھولی پھیلا کے اسے تجھ سے مانگا ہوتا۔ اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ اسے پانے کی دعا کی ہوتی۔ کیونکہ کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ دعائیں پوری ہو جاتی ہیں۔ ہاں میں غلط تھی۔ میں نے غلطی کی، لیکن میرے اللہ تُو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ مجھے پتا ہے کہ میں کب غلط تھی اور کب نہیں۔ کہاں میں جھوٹی ہوں اور کہاں سچی۔ یا اللہ! مجھے اتنی ہمت دے کہ میں وہ سب پا سکوں جو میں نے کھو دیا ہے۔ یا اللہ! مجھے ہمت دے۔ میری مدد فرما آمین......“

نماز کے بعد اس نے دل سے دعا مانگی اور جائے نماز تہہ کرتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

☆======☆======☆

”جونک ہے یہ...... سارے کا سارا خون چوس کے رہے گا میرا۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل رہی تھی جب دروازے کے عین درمیان گل کو ایستادہ دیکھ کے ٹھٹک کر رہ گئی۔

”گل تم؟ اس وقت......؟“

”ہاں...... تمہارے خیال میں تو اس وقت مجھے اپنے گھر میں ہونا چاہیے۔ گھر کے لوگوں کے آنسو پونچھتے ہوئے۔“

وہ اندر آتے ہوئے پُرسکون انداز میں بول رہی تھی۔

”نہیں...... میں تو ایسے ہی......“ وہ گڑبڑا کے رہ گئی۔

”پوچھو گی نہیں، کیسے آنسو؟ ہاں مگر تم کیوں پوچھو گی...... پوچھتے تو وہ ہیں جو جانتے نہ ہوں۔“

”دیکھو گل۔ بعد میں ملتے ہیں ابھی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے ابھی جانے دو۔“ وہ گھبرا کے کہہ رہی تھی۔

”میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔“ گل نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

”بلکہ میں تو آئی ہی اس لیے تھی۔ نرمین کے پاس جا رہی ہو تم؟“

”نر...... نرمین......“ وہ پھر سے گڑبڑا گئی۔

”میں کیوں جاؤں گی نمو کے پاس؟ اس کی تو اب دوستی بھی نہیں مجھ سے۔“

”ہاں...... اس نے دوستی ختم کی تھی تم سے...... تم نے تو دشمنی کی انتہا کر دی۔“ گل نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے اس کے بازو کو دبوچا۔

”کہاں ہے نمو؟ کہاں رکھا ہے تم نے اسے؟“

چھنو جان گئی کہ اب آئیں بائیں شائیں کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سوڈھٹائی سے بولی۔

”تمہیں اس سے کیا؟ تمہیں تو شکر کرنا چاہیے تمہارے راستے کا کانٹا جو دور ہوا۔ وہ چاہے جہنم میں جائے۔ بجائے میرا احسان ماننے کے تم الٹا آنکھیں دکھا رہی ہو مجھے۔“

”کیسا احسان؟“

”اب نہ نمو ہو گی نہ یاسر اس سے شادی کرے گا۔ تمہارا راستہ تو صاف ہو گیا ہے۔“

''میرا راستہ...... میرا راستہ صاف نہیں ہوا۔ اس پہ اور کانٹے بکھر گئے ہیں۔'' اس کے درشت لہجے میں دکھ بھر گیا۔

''چھنو! مجھے ابھی لے کر جاؤ نمو کے پاس۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے کیا۔ میں نے کیا اسے اپنی پھوپھی کے گھر رکھا ہے جو لے جاؤں تمہیں۔ تم نہیں جانتی ساجد کو...... وہ تو......''

''اور تم مجھے نہیں جانتیں۔ مجھے اپنے راستے کے کانٹے خود چننے کی عادت ہے۔ لے جاؤ ورنہ ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں چاہوں تو ابھی جا کے سب کو بتا دوں کہ نرمین کی گمشدگی میں تمہارا ہاتھ ہے۔ تمہارا بھلا چاہتی ہوں کیونکہ کبھی تمہیں دوست کہا تھا اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ساجد کے آگے چارہ ڈالا ہے۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ چپ چاپ میری بات مان لو۔ تمہارا نام بھی نہیں آئے گا نرمین بھی واپس آجائے گی۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے گل! مجھ سے پوچھو کہ اس جال سے نکلنا کتنا مشکل ہے۔ میں تو کہتی ہوں لعنت بھیجو نمو پہ۔ جاؤ جا کے سکون کا سانس لو اور مجھے بھی لینے دو۔ میرے پاس اس سے اچھا موقع نہیں ہے اس دلدل سے نکلنے کا۔ اگلے مہینے میری شادی ہو جائے گی اور میں یہ ملک ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گی۔ کبھی پلٹ کے بھی نہیں دیکھوں گی لیکن اگر تم نے کوئی گڑبڑ کی تو ساجد میری شادی کبھی نہیں ہونے دے گا۔''

''یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ اس طرح تم ساجد کے شکنجے سے نکل آؤ گی۔ بلکہ اس کے پاس تمہیں بلیک میل کرنے کا ایک اور طریقہ ہاتھ لگ گیا ہے۔ تم جانتی بھی ہو کہ ایک لڑکی کو اغوا کرنے کے جرم میں تم بھی ان کے ساتھ برابر کی شریک ہو۔''

اس کی توقع کے عین مطابق چھنو ہراساں ہو گئی۔

''پھر اب...... اب...... کیا ہو سکتا ہے۔ میں کیسے...... میں نہیں...... اب کیا کر سکتی ہوں میں؟ پھنسا دیا اس نے مجھے۔''

گل نے اس کے سامنے اپنی مٹھی کھولی۔

اس میں ایک پڑیا دبی تھی۔

''یہ کیا ہے؟''

''یہ وہی دوا ہے جو میں تم سے منگواتی تھی، ٹیپو کے لیے اور ساجد سے ہی لاتی تھیں تم۔''

''مگر......'' چھنو ابھی بھی متذبذب تھی۔

''چلو میرے ساتھ......''

گل نے اسے دوبارہ کسی قسم کے پس و پیش کا موقع دیئے بغیر اس کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

ساجد نشے میں دھت چھنو سے کہہ رہا تھا۔

''بڑی یاد آئے گی تو...... قسم سے بڑی یاد آئے گی شادی کے بعد۔ ویسے ساجد کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے ہیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ گزارا نہ ہو سکے۔ یا کوئی برا وقت آجائے تو آجانا ساجد کے پاس، کوئی نہ کوئی کسٹمر دلا دیا کروں گا...... بھئی پرانے تعلق کا لحاظ تو کرنا پڑتا ہے۔''

نشے سے کم اور دوا کے اثرات کی وجہ سے زیادہ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''لا...... فون لا...... اکبر کو بلا لوں اور تو ذرا برقعہ وغیرہ پہن لے اور اسے بھی پہنا دے۔ اس وقت بلڈنگ میں کوئی ہوتا تو نہیں مگر احتیاط اچھی چیز ہے۔ کسی کو شک نہیں ہوگا اگر......''

بات کرتے کرتے وہ چھنو کے پاس رکھے فون کو اٹھانے کے لیے جھکا اور وہیں لڑھک کے بے ہوش ہو گیا۔ اب تک صبر سے اس کی لن ترانیاں سنتی چھنو نے کراہیت سے اسے دھکا دیا۔ اور اٹھ کے دروازے کا لاک کھولا۔ گل جو کب سے انتظار میں تھی، فوراً اندر داخل ہوئی۔ دونوں تیزی کے ساتھ اس کمرے میں داخل ہوئیں جہاں نرمین کو باندھ کے رکھا گیا تھا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کے حیران رہ گئی۔ گل نے جیسے ہی اس کے منہ سے ٹیپ اتاری وہ چلائی۔

''وہ لوگ مجھے......'' گل نے جلدی سے اس کے منہ پہ سختی سے ہاتھ جما دیا۔

''ششش...... چپ...... اٹھو......''

اور اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے باہر کی جانب لے جانے لگی۔

''چلو نا...... کھڑی کیوں ہو؟''

اس نے چھنو سے کہا جو ساجد کے بے ہوش وجود پہ نظریں جمائے کھڑی تھی۔

''تم جاؤ...... میری ایک چیز ہے یہاں...... میں وہ لے کر آتی ہوں۔''

''مگر......''

''جاؤ تم...... مجھے دوبارہ یہاں کبھی نہ آنا پڑے اس کے لیے میرا تھوڑی دیر اور یہاں رکنا ضروری ہے۔''

☆======☆======☆

''کہاں جا رہے ہو صغیر احمد؟''

"کسی معجزے کے انتظار میں دن نکل آیا اماں! اب ہم چاہیں بھی تو یہ بات چھپا نہیں سکتے۔ جب دنیا کے سوالوں کے جواب دینے ہی ہیں تو پھر پولیس سے مدد لینے میں کیسی جھجک؟"

اس بار جہاں آرا منع نہ کرسکیں۔ چپ چاپ اسے جاتا دیکھتی رہیں۔

صغیر احمد نے جیسے ہی دروازہ کھولا، چونک گئے۔ سامنے ہی نرمین کو کاندھوں سے تھامے گل کھڑی تھی۔

حیرت کے غلبے سے نکل کر صغیر احمد خوشی سے کپکپاتے لہجے میں پکارنے لگے۔

"میری نمو آ گئی اماں جان!"

اندر سے حلیمہ، جنت بیگم اور جہاں آرا بھاگتی ہوئی باہر نکلیں اور اس سے لپٹ لپٹ کے رونے لگیں۔

"گل......! تم نرمین کو......"

ذرا سنبھلنے پہ صغیر احمد کو یہ سوال کرنے کا خیال آیا۔

"دیکھا...... میں نے کہا تھا نا...... یہی وہ چڑیل ہے۔" حلیمہ وحشیانہ انداز میں چلائی۔

"یہ نمو کو لے گئی تھی۔ میری بیٹی کو لے گئی تھی۔"

اور نرمین کو اس طرح بازوؤں کے حلقے میں لے کر چھپانے لگی جیسے اسے گل کی نظروں سے بھی محفوظ رکھنا چاہتی ہو۔

"آ جا میری بچی!" جہاں آرا نے نرمین کا ماتھا چوما۔

"دیکھ تو کیا حالت ہو رہی ہے۔ ڈھائی گھڑی کی آئے اس مردار پہ، جس نے یہ ظلم کیا۔"

"یہ صرف خوف زدہ ہے اور کچھ نہیں۔" گل نے وضاحت دی۔

"آپ کی نرمین بالکل محفوظ ہے۔"

جہاں آرا نے تصدیق طلب انداز میں نرمین کو دیکھا۔ وہ نڈھال انداز میں بھی اقرار میں سر ہلا کے انہیں تسلی دینے لگی۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے میری بچی خیر خیریت سے لوٹی۔" وہ دونوں ہاتھ بلند کیے شکر ادا کرنے لگیں۔

اب صغیر احمد نے حلیمہ کو تنبیہہ کی۔

"اور خبردار جو اب تم نے کوئی بکواس کی گل کے بارے میں۔ احسان مانو اس کا۔ جو نہ

جانے کیسے اور کس طرح ہماری بیٹی کو واپس لائی ہے۔"

تب ہی یاسر اندر داخل ہوا اور گل کے ساتھ ساتھ نرمین کو بھی سب کے درمیان پا کر ٹھٹک کر رک گیا۔

"اللہ نے بڑا کرم کیا ہے یاسر میاں! نرمین آ گئی ہے۔ گل لائی ہے اسے۔"

یاسر نے بغور گل کو دیکھا جو زمین پہ نظریں گاڑے کھڑی تھی۔

"یعنی عمر بھر کی غلامی کا وقت آ گیا؟"

اس نے اپنے پورے وجود کو زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کیا۔

"گل! نمو کہاں سے ملی تمہیں؟"

صغیر احمد کے سوال پہ یاسر نے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔ وہ اس کے ایک اور ماہرانہ ہوٹ کی داد نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ تو خود کو تیار کر رہا تھا اس کی غلامی میں دینے کے لیے۔

"وہیں سے جہاں میں نے اسے رکھا تھا؟"

صغیر احمد نے بے حد الجھ کر اور یاسر نے بے یقینی سے اسے دیکھا جو اس تمام عرصے میں لی بار نگاہیں اٹھائے ہوئے تھی اور بے حد بے خوفی سے صغیر احمد کے چہرے پہ نظریں اڑے کہہ رہی تھی۔

"میں لائی ہوں نرمین کو...... کیونکہ میں ہی لے کر گئی تھی اسے۔"

☆======☆======☆

چھنو نے ساجد کے فلیٹ کی ایک ایک چیز چھان ماری......

ساری الماریاں......

سارے دراز......

ہر چیز الٹ پلٹ کر کے رکھ دی۔ مگر وہ سی ڈی کیا، کوئی ایک سی ڈی بھی وہاں نہیں تھی۔

اس نے بے حد نفرت سے صوفے پہ ڈھیر ساجد کو گھورتے ہوئے کہا۔

"پتا نہیں، ماں کی قبر میں رکھ آیا ہے کم بخت، مل ہی نہیں رہیں۔"

پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اس کی جیبیں ٹٹولنے لگی۔ سگریٹ کی ڈبیا، لائٹر، موبائل، ٹ، سب کچھ تھا مگر وہ چیز نہ تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ بھنا کر اس نے ساجد کے سینے پہ ے مکے مارے۔ تیسرے گھونسے پہ ساجد نے ایک ہچکی سی لی اور آنکھیں کھولیں۔ چھنو سہم ساکت ہو گئی اور اس سے پہلے کہ اس کے حواس کام کرتے...... وہ بھاگ کر اس سے دور

ہوئی، مگراس کی کلائی ساجد کی گرفت میں آچکی تھی۔

''بڑے پُرزے نکال رہی ہے۔ میرے ہی دھندے میں مجھے کراس کر کے میری جگہ سنبھالنے کا ارادہ ہے کیا......؟''

وہ غرایا تو چھنو نے اپنی کلائی چھڑانے کی بھرپور کوشش کے دوران اس کے چہرے پہ تھوک دیا۔

ساجد کا ہاتھ صوفے کے کشن کے نیچے رینگا اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور چھنو کے سینے میں اکٹھی تین گولیاں۔

☆======☆======☆

گل، صغیر احمد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے ان کے مقابل کھڑی تھی اور وہ مسلسل بے یقینی سے اسے گھورے جا رہے تھے۔ پھر ان کے حلق سے سرسراہٹ نما آواز نکلی۔

''مگر......مگر......تم نے......مگر کیوں گل......؟''

اور یکا یک یہ سرسراہٹ غراہٹ میں تبدیل ہوگئی اور وہ پھٹ پڑے۔

اس سوال کے جواب میں گل نے مڑ کے یاسر کو دیکھا۔ یاسر کے پورے وجود پہ خوف کا لرزہ طاری ہوگیا۔

بھرم کھو دینے کا خوف......

جھوٹ کھل جانے کا خوف......

نظروں سے گر جانے کا خوف......

اس خوف کو سمیٹے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گل کی جانب بڑھا۔ تاکہ اس کو ملنے والی ذلت اور سزا میں سے اپنا حصہ سمیٹ سکے۔

''یاسر کے لیے......محبت کرتی ہوں میں اس سے اور......اور......وہ نرمین سے۔''

گل کے جواب نے یاسر کو اس سے کچھ فاصلے پہ ٹھہر جانے پہ مجبور کر دیا۔ صغیر احمد نے شاکی نظروں سے یاسر کو دیکھا تو وہ نظر چرا بیٹھا۔

''مگر میں کبھی اسے بتا نہیں سکی کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔''

یاسر ایک بار پھر نظر اٹھا کے حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''مجھے لگتا تھا ٹیپو کے جانے کے بعد یہ مجھے سہارا دے گا لیکن اس نے میرے بجائے نرمین سے......اور......میں......میں یہ برداشت نہیں کر سکی۔''

صغیر احمد کے زوردار تھپڑ نے اس کے رواں جھوٹ کے آگے بند باندھا۔ وہ لڑکھڑا کے

پیچھے جا گری۔ یاسر بے ساختہ دو قدم آگے بڑھا۔ مگر رک گیا۔ وہ بہت الجھ کے رہ گیا تھا۔ گل کے اس ایک نئے جھوٹ میں شامل ہو کر یا کم از کم اپنی زبان ہی بند رکھ کے خود کو محفوظ کر لے۔ یا دل کا بوجھ ہٹانے کے لیے سچ سامنے لے آئے اور گل کو ملنے والی ہر سزا میں حصہ دار بن جائے۔ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا اس کے۔

شش و پنج کا شکار وہ بت بنا گل کو دیکھ رہا تھا جو اپنے سنسناتے ہوئے گال پہ ہاتھ رکھ کے زمین سے اٹھ رہی تھی۔

آخر یاسر نے فیصلہ کر لیا۔

''صغیر بھائی! میں آپ سے اس غلطی کے لیے......''

''ہاں......غلطی تو تم سے ہوئی یاسر!'' گل نے اسے بات مکمل کرنے کا موقع نہ دیا۔

''مجھ پہ اعتبار کرنے کی غلطی......تمہیں کیا پتا تھا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں اور تمہیں پانا چاہتی ہوں۔''

یاسر جز بز ہو کے رہ گیا۔

''اعتبار تو میں نے بھی تم پہ کیا تھا گل!'' صغیر احمد نے ٹوٹے لہجے میں کہا۔ ''میں بھی نہیں جانتا تھا کہ تم میری پیٹھ میں یوں چھرا گھونپو گی۔ میں نے تمہیں عزت دی۔ تمہارے سر پہ چادر دی اور تم نے میری ہی عزت کو نیلام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کس قدر نیچ عورت ہو تم۔''

''اور تم نے نمو کے ابا کو رُلایا بھی ہے۔''

حلیمہ آگے بڑھی اور بت بنی گل کو کاندھوں سے پکڑ کے جھنجھوڑ ڈالا۔

''پتا ہے بیس سال انہوں نے میرے ساتھ عذاب کی طرح گزارے ہیں۔''

پھر مڑ کے صغیر احمد سے تائید چاہی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں نمو کے ابا! آپ نے یہی کہا تھا ناں اماں سے۔''

''لیکن اس عذاب میں بھی وہ روئے کبھی نہیں۔ میں نے انہیں رونے نہیں دیا اور تم نے......تم نے ان کو رُلا دیا۔''

وہ پھپھک کے رو دی۔ صغیر احمد آگے بڑھے اور نرمی سے اس کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھ کے اسے گل کے سامنے سے پرے ہٹایا اور خود اس کے مقابل کھڑے ہو کر سخت الفاظ میں کہا۔

''اس گھر میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

گل نے زخمی نظروں سے یاسر کے جھکے سر کو دیکھا اور چپ چاپ باہر جانے کے لیے پلٹی۔

''آئی خالی ہاتھ تھیں۔ مگر میں تمہیں خالی ہاتھ نہیں نکالوں گا۔ جتنی جلدی ہو سکے، اپنا ضروری سامان سمیٹ لو۔ جو لے جانا چاہتی ہو، لے جاؤ۔''

''جو بھی لے جانا چاہوں؟''

گل کے ہونٹوں پہ بڑی پُراسراری مسکراہٹ آئی۔

وہ شکستہ قدموں کے ساتھ اندر کی جانب بڑھی۔

وہاں کھڑے تمام نفوس کے وجود پہ سکوت طاری تھا۔ یاسر کو گھبراہٹ نے آن دبوچا اور وہ باہر نکلنے لگا۔

''رکو یاسر میاں!''

صغیر احمد کی آواز پہ وہ رکا۔

☆======☆======☆

وہ جہاں آرا کے کمرے میں صغیر احمد کے سامنے والی کرسی پہ مجرمانہ انداز میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔

جہاں آرا کے ساتھ جڑی بیٹھی جنت بیگم بھڑاس نکال رہی تھیں۔

''دیکھا...... میں نہ کہتی تھی، چھنال کیسی دیدہ ہوائی نکلی۔''

''غلطی انسانوں سے ہی ہوا کرتی ہے۔ ہم سے بھی ہو گئی۔'' جہاں آرا نے کچے سے لہجے میں کہا۔

''دوسروں کے مشورے پہ کان بھی انسان ہی دھرا کرتے ہیں۔'' جنت بیگم نے جھٹ جتلا دیا۔

''تم میری بات کبھی نہ رکھیو بھابھی! میرے منہ سے نکلی بات اور بھکاری کی جھوٹن ایک برابر لگے ہے تمہیں۔''

کافی دیر تک یاسر کے تاثرات جانچنے کے بعد صغیر احمد اس سے مخاطب ہوئے۔

''جو ہوا، وہ خلافِ توقع بھی تھا اور سنگین بھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ سوائے اس کے گل تمہاری عزیزہ ہے۔''

''اور کیا۔'' جہاں آرا نے تائید کی۔ ''ضروری نہیں ذات میں ایک رذیل نکل آئے تو نسل ہی خراب ہو۔ اس کے اعمال اس کے ساتھ، تمہارے تمہارے ساتھ۔''

یاسر بے چینی سے پہلو پہ پہلو بدل رہا تھا۔

''میں اس کی غلطی کی سزا تمہیں نہیں دینا چاہتا۔ نہ اپنی بیٹی کو...... میں جانتا ہوں، اسے تم سے بہتر ساتھی نہیں مل سکتا۔''

یاسر نے صغیر احمد کی مسکراہٹ دیکھی تو اس کا حوصلہ بندھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا آپ گل کو معاف......''

صغیر احمد کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

''نہیں قطعی نہیں۔ معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے قصور انگلیوں پہ نہیں گنے جا سکتے۔ اگر بات صرف اس کے اور میرے رشتے کو پامال کرنے کی ہوتی تو شاید...... مگر اس نے میری بیٹی کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک شوہر تو شاید بیوی کی بے وفائی اور بددیانتی کو معاف کر دے مگر ایک باپ اس کا یہ جرم کبھی نہیں معاف کر سکتا۔''

یاسر نے بے بسی سے دوبارہ سر جھکا لیا۔

☆======☆======☆

''میں سمجھتا ہوں اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں۔''

''تمہاری کوئی غلطی نہیں۔ کوئی غلطی نہیں۔''

یاسر اکیلا صحن میں کھڑا تھا اور رہ رہ کے اس کے کانوں میں صغیر احمد کے الفاظ گونج رہے تھے جس میں انہوں نے اسے صاف بری قرار دے دیا تھا۔ مگر بے گناہی ثابت کروانے کے باوجود وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے کے بجائے زنجیروں میں جکڑا محسوس کر رہا تھا۔

''میری غلطی...... ساری غلطی میری ہی تو ہے۔ میرا دل بدلا...... میں نے راستہ بدلا...... اور گل...... گل نے ساری بازی بدل ڈالی۔ مگر یہ اس نے۔ اس نے یہ آخری پانسہ اپنے خلاف کیوں پھینکا۔ وہ تو ہر داؤ جیتنے کے لیے کھیلا کرتی ہے۔ پھر یہ''

وہ اس سوال کا بوجھ لیے اندر کی جانب پلٹا۔

☆======☆======☆

گل ایک بیگ میں اپنا ضروری سامان رکھ رہی تھی۔

چند عام استعمال کے جوڑے وغیرہ......

الماری سے وہ سرخ کام دار دوپٹہ نکالتے ہی اس کی نگاہوں میں حسرت بھر گئی۔ یہ وہی دوپٹہ تھا جو اس نے نرمین کے لیے بنایا تھا اور صغیر احمد نے اسے اوڑھا دیا تھا اور جسے اوڑھتے ہی اس کے اندر باہر کی دنیا بدل گئی تھی۔

گل نے اس دوپٹے کو چہرے کے ساتھ لگایا۔ اس کی بند پلکوں کے کناروں پر دیئے ٹمٹمانے لگے۔ کچھ سوچ کر اس نے یہ دوپٹہ بھی بیگ میں رکھ لیا۔ اپنی پرانی سیاہ چادر نکالی اور پھیلا کے اوڑھتے ہوئے بیگ اٹھا کے جیسے ہی کمرے سے نکلنے لگی۔ یاسر کو دروازے کے بیچوں بیچ پایا۔

''جا رہی ہو؟''

''نہیں...... نکالی جا رہی ہوں۔''

''لیکن...... کیوں...... کیوں تم نے ایسا کیا؟ سب کچھ ویسے ہی تو ہونے جا رہا تھا جیسا تم چاہتی تھیں۔ میں نے اپنی ہار مان لی تھی۔ تم نرمین کو واپس لے آئی تھیں۔ وعدے کے مطابق میں نے اپنا آپ تمہیں سونپنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ اور یہ جاننے کے بعد کہ پہلے ہم دونوں کا رشتہ تھا اور یہ کہ نہ صرف صغیر احمد پہلے سے بلکہ ٹیپو سے تمہارا رشتہ ایک فریب تھا۔ ایک مصلحت تھا۔ یہ سب جاننے کے بعد تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی یہاں سے جانے کا حکم مل جاتا۔ یہی چاہتی تھیں نا تم...... پھر کیوں نہیں ہونے دیا تم نے ایسا......؟''

''میں ایسا نہیں چاہتی تھی یاسر! اب تو میرا یقین کر لو۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے تم سے محبت تھی۔ ہے اور رہے گی اور جب تک میرے دل کو ایک فیصد بھی یقین تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میں نے ہر وہ حربہ آزمایا جس سے میں اس ایک فیصد محبت کو پا سکوں اور جس دن میں نے اس ایک فیصد محبت کی امید کو کھویا، اسی دن میں تمہاری طلب سے دست بردار ہو گئی تھی۔ وہ دل...... جس میں میرے لیے رتی بھر محبت بھی نہ ہو۔ اس دل کا کیا کرتی میں۔ ہاں میں اپنے دل کو تم سے محبت کرنے سے۔ تمہاری چاہ کرنے سے نہیں روک سکتی تھی اور مانتی ہوں کہ صغیر احمد سے شادی کا فیصلہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ اس بہانے تمہارے آس پاس رہوں گی۔ تمہیں کبھی کبھار دیکھ بھی سکوں گی لیکن قسم تمہاری یاسر...... میں نے صغیر احمد کے نکاح میں آنے کے بعد ان سے بددیانتی کا ایک لمحہ بھی نہیں آنے دیا اپنی زندگی میں۔''

''اور میں...... میں یہ سمجھتا رہا کہ......''

یاسر کے تاسف اور شرمندگی بھرے انداز پہ وہ دکھ سے مسکرائی۔

''یہی تو رونا ہے یاسر......! تم کبھی مجھے سمجھے ہی نہیں۔ مجھے تمہاری محبت چاہیے تھی۔ تاوان نہیں اور تم...... تم خود کو نرمین کے تاوان کے طور پر پیش کر رہے تھے۔ اپنا آپ گروی رکھ رہے تھے اس کے لیے۔ یہ چیز ثابت کرتی ہے کہ جس محبت کے لیے میں سالوں سے خود کو رول رہی تھی، وہ محبت نرمین کے دامن میں بن مانگے جا گری ہے۔ پھر یاسر تمہارے کھوکھلے

وجود کا میں نے کیا کرنا تھا۔ نرمین کی محبت کی ایک یادگار کو میں کہاں سجاتی؟''

وہ بیگ اٹھا کے نکلنے لگی۔

''میں ایک بار پھر صغیر بھائی سے بات کرتا ہوں گل! رک جاؤ، وہ برے آدمی نہیں ہیں۔ ضرور میری......''

''ہاں...... وہ برے آدمی نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں، وہ بہت اچھے ہیں۔ اتنے اچھے کہ مجھے ڈر لگنے لگا تھا ان کے ساتھ کچھ دن اور رہتے رہتے کہیں میں بھی اچھی نہ ہو جاؤں۔''

وہ جیسے اپنے اوپر ہنسی...... دروازے کے پاس جا کے پھر سے رک کر بولی۔

''صغیر احمد سے شادی کرنے کی وہ دوسری وجہ...... جس کا جواب میں نے آنے والے وقت پہ چھوڑا تھا۔ اس کا اندازہ تم نے بہت غلط لگایا یاسر! وہ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں...... میں تم پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ میں ایک اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہوں۔''

یاسر چونکا۔ اسے اپنی کہی بات یاد آئی۔

''تمہارے جیسی عورت سے شادی کرنے کا مطلب عمر بھر کی رسوائی اور پچھتاوے کو گلے لگانا ہے۔ تم کسی شریف مرد کی زندگی کا حصہ بننے کے قابل ہی نہیں ہو۔''

وہ افسوس سے لب بھینچ کر رہ گیا۔

''مجھے موقع نہ مل سکا ورنہ میں تم پر یہ ثابت ضرور کرتی۔ مگر میں نے پورے دل سے کوشش ضرور کی تھی ایک شریف انسان کی اچھی بیوی بننے کی۔ اس انسان کی جس سے میں نے کبھی محبت نہیں کی۔ سوچو، میں اس کے لیے کتنی اچھی بیوی ثابت ہوتی جس سے میں نے محبت کی۔''

وہ دروازے کے پار نکل گئی۔

''رکو گل!'' یاسر بے تابی سے اس کے پیچھے لپکا۔

''اب میں اس موڑ پہ پہنچ گئی ہوں یاسر! جہاں سے پیچھے مڑ کے دیکھنے والا پتھر ہو جاتا ہے۔''

وہ بغیر مڑے، بغیر اسے دیکھے یہ کہہ کر نکل گئی۔ صحن میں سب لوگ جمع تھے۔ شاید اسے نکلتا دیکھ کر اطمینان محسوس کرنے کے لیے۔

وہ صغیر احمد کے پاس آ کے رکی۔ حلیمہ ان کا بازو مضبوطی سے تھامے کھڑی گل کو گھور رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی۔ جنت بیگم نے اسے دیکھ کر نخوت سے منہ پھیر لیا۔ جہاں آرا بیگم نے ایک گلہ آمیز نظر اس پہ ڈالی اور اندر کی جانب مڑ گئیں۔

اندر...... جہاں سے یاسر تھکے ہارے قدموں کے ساتھ سر جھکائے نکل رہا تھا۔

گل ایک بار پھر صغیر احمد کے سامنے رکی۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر وہ حلیمہ کا ہاتھ تھامے وہاں سے ہٹ گئے۔ گل نے حسرت بھری نظران بندھے ہاتھوں پہ اور ایک ساتھ اٹھتے قدموں پہ ڈالی۔ یاسر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

گل نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

''تمہاری شادی پہ دینے کے لیے میرے پاس اس سے اچھا تحفہ کوئی اور نہیں تھا۔ اب تمہاری آنکھیں عمر بھر مجھے دیکھنے کی اذیت سے محفوظ رہیں گی۔ میں نے تمہیں نرمین لا کے دی، جسے تم چاہتے تھے اور میں نے تم سے گل کو دور کھینچ لیا جس سے تم نفرت کرتے تھے۔ بدلے میں تم مجھے کوئی تحفہ دو...... نہ دو...... بس ایک زادِ راہ دے دو...... دو گے؟''

رندھے گلے کے ساتھ یاسر سے کچھ نہ کہا گیا۔ وہ سر ہلا کے رہ گیا۔

''صرف میرے ایک سوال کا جواب ''ہاں'' میں دے دو۔ کیا میری زندگی میں کوئی ایک پل ایسا ہے، جس میں تم نے مجھے پوری شدت سے چاہا ہو......؟''

یاسر کے ہونٹ فوری طور پہ کچھ کہنے کے لیے کھلے، گل کے چہرے پہ امید کا سایہ سا جھلکا۔

مگر اگلے ہی لمحے یاسر کے لب دوبارہ ایک دوسرے میں پیوست ہو چکے تھے۔

گل نے اپنی مایوس نظریں اس کے چہرے سے ہٹائیں اور دہلیز پار گئی۔

☆======☆======☆

اس کی پتھریلی نظریں پلیٹ فارم کے اسی جانب لگی تھیں جہاں سے ٹرین نے آنا تھا۔ پیروں میں دھرے بیگ سے یکسر غافل، ہوا سے پھڑپھڑاتی چادر سے بے نیاز اس کی نظریں مسلسل اس رستے پہ لگی تھیں۔ جیسے اسے سوائے ٹرین کے انتظار کے اور کوئی کام نہ ہو۔ مگر اسے اس ٹرین کا کتنا انتظار تھا۔ یہ تو تب پتا چلا جب ٹرین اس کے سامنے آ کے رکی۔ وسل بھی بجی۔ لوگ اس کے پاس سے بھاگ بھاگ کر سوار بھی ہونے لگے۔ وسل دوبارہ بھی بجی۔ یہاں تک ٹرین اگلے اسٹیشن تک جانے کے لیے چل بھی پڑی۔ مگر اسے ذرا خبر نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح اس رستے پہ پلکیں جھپکے بغیر تکے جا رہی تھی۔ ایک اخبار والا اس سے ٹکرایا تو وہ بری طرح چونکی۔

سامنے سے دھیرے دھیرے سرکتی آگے بڑھتی ٹرین کو دیکھ کے بوکھلا کے پوچھنے لگی۔

''یہ...... یہ کون سی ٹرین ہے؟''

☆======☆======☆

پورا گھر قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔

صغیر احمد شاید دوسرے حالات میں کبھی یہ شادی اتنی دھوم دھام سے نہ کرتے مگر شوری طور پہ وہ خود کو اور گھر کے باقی سب لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ گل کے نہ ونے سے نہ تو ان کی ذات کو کوئی فرق پڑتا ہے نہ ہی اس گھر کی خوشیوں کو۔ نرمین کو جو جھٹکا اتھا اس سے سنبھلنے کے لیے بھی یہ ضروری تھا کہ اس کو بہلانے کے لیے ہی سہی۔ یہ اہتمام کیا اتا۔

یاسر نے بھی وقت کی اس کروٹ کو قبول کر لیا۔

''شاید حالات میرے حق میں جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے میں نے بہت سا مشکل ت بھی کاٹا۔ مگر اس کی بدولت ہی آج مجھے کوئی خوشی مل رہی ہے تو اسے پورے حق سے ول کرتے ہوئے ندامت کیسی؟''

وہ ہلکا پھلکا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے دل سے اس شادی کے ہنگاموں میں شریک ا۔

اس نے اپنا مختصر سا اپارٹمنٹ نفاست سے سجایا تھا۔ جس رستے سے نرمین نے گزر کے کے کمرے تک آنا تھا، وہ سارا رستہ پھولوں سے سجایا تھا۔ پھولوں سے ہی سجے بیڈ پہ نرمین نی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یاسر کا ہاتھ ہینڈل پہ ٹھہرا...... دروازہ کھولتے کھولتے وہ ذرا سا رکا۔ اس کے ہاتھ کی فت ہینڈل پہ کچھ اور مضبوط ہو گئی۔

☆======☆======☆

وہ سرپٹ بھاگی۔ اس کی سیاہ چادر کا ایک کونا اس کے پیر کے انگوٹھے سے الجھا تو وہ ہ کے بل گرتے گرتے بھی بچی۔ ایک جھٹکے سے چادر کھینچتے ہوئے انگوٹھے کا ناخن بھی ایک ب سے اکھڑ گیا۔ خون رسنے لگا۔ مگر وہ بیگ گھسیٹتے ہوئے ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ا۔ ٹرین جو اس کے مکمل ہوش و حواس میں آنے تک اسپیڈ پکڑ چکی تھی۔

''یہ عورت پاگل ہے کیا؟''

پلیٹ فارم پہ آتے جاتے لوگ رک کر حیرت سے یہ تماشا دیکھتے رہے ایک دوسرے پوچھ رہے تھے۔

''اے...... بات سنو...... لڑکی! مر جاؤ گی۔''

کسی نے اونچی آواز میں مشورہ دیتے ہوئے اسے باز رکھنا چاہا۔

اور اگلے ہی لمحے ٹرین کے دروازے کے راڈ پہ گل کے ہاتھ کی گرفت تھی۔ اندر بیٹھے لوگ ہاتھ ہلا ہلا کے اور چلا چلا کے اسے اس سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''چھوڑ دو...... پاگل ہو کیا...... رفتار تیز ہے، نہیں چڑھ پاؤ گی۔''

''مر جاؤ گی نیچے آ کے۔ کٹ جاؤ گی۔''

عورتیں چیخیں مار رہی تھیں۔ بچے سہم کر اس بے خوف عورت کو دیکھ رہے تھے۔ بڑی بوڑھیاں کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔

''کیسی بے وقوف ہے یہ۔ ایک ٹرین چلی گئی دوسری آ جائے گی۔ جان جائے، دوبارہ نہیں ملتی۔''

اب وہ کیسے کسی کو بتاتی۔ اس کا آج ہی اس شہر سے بہت دور جانا ضروری ہے۔ آج ہی کی رات وہ کسی اور کا ہونے جا رہا تھا اور ایسا تب ہی ممکن ہو پاتا۔ اگر وہ اس شہر سے بہت دور چلی جائے ورنہ ابھی دل پہ اتنا اختیار نہیں ہو پایا تھا کہ وہ اسے من مانی کرنے یا پھر سے بد دیانتی کرنے سے روک پاتی۔ ایک ہی حل تھا۔ وہ اتنی دور چلی جاتی۔ اتنی دور کہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر پاتی اس نے کسی اور کا ہونے سے روک نہ پاتی۔

ٹرین رفتار پکڑ رہی تھی۔ اس کے پیر زمین سے اکھڑ رہے تھے۔ قریب تھا کہ اس کا وجود کسی زوردار جھٹکے سے یا تو پرے جا کے پلیٹ فارم پہ جا گرتا۔ یا ٹرین کے نیچے آ کے دو ٹکڑوں میں بٹ جاتا۔ آخر کار اس کے پیروں نے پائدان کو چھو لیا۔ سنگلاخ ہوتی انگلیوں پہ ذرا اور دباؤ ڈال کے اس نے اپنے ہانپتے وجود کو کچھ اوپر اٹھایا اور ٹرین پہ سوار ہو گئی۔

☆======☆======☆

اس نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوا۔

زمین کے گٹھڑی بنے وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے سامنے آ کے بیٹھا۔ اس کے گھونگھٹ کو انگلیوں کی پوروں سے ذرا سا اونچا کیا۔ زمین کے حیا سے جھکے سر اور بوجھل پلکوں کو دیکھ کے اس کا دل مسرور ہوا تھا۔ یہی رنگ تو وہ چاہتا تھا اپنی شریک حیات میں...... اس نے جیب سے ایک ڈبیہ نکالی۔

''یہ تمہاری رُونمائی کا تحفہ......''

اس نے زمین کے چہرے کے پاس جھک کر کہا۔

''تمہاری شادی پہ دینے کے لیے میرے پاس اس سے اچھا تحفہ کوئی اور نہیں تھا۔''

گل کی آواز اس کے کمرے کے سکوت میں گونجی۔

وہ بت بنا بیٹھا رہ گیا۔

☆======☆======☆

پھولی سانسوں کے ساتھ وہ وہیں ٹرین کے داخلی دروازے کے پاس زمین پہ بیٹھ گئی۔ ناگہم بھاگ میں اس کے بیگ کی زپ کب کھلی۔ یا شاید خراب ہوئی۔ اسے پتا ہی نہ چل سکا کئی چیزیں نکل کر باہر جھانک رہی تھیں۔

اس نے اپنا بکھرے بالوں والا سر پیچھے ٹیک دیا اور آنکھیں موند کے اپنی سانس ہموار کرنے لگی۔

اس کی سیاہ چادر تیز ہوا سے پھڑ پھڑا رہی تھی اور اس کا ایک پلو ٹرین کے باہر تک جاتا رہا تھا۔

☆======☆======☆

گہری سانس لے کر یاسر نے خود کو ریلیکس کیا۔ اس گونج کے اثر سے نکلتے ہوئے جھری سی لی۔ اور ڈبیا سے انگوٹھی نکال کے مسکراتے ہوئے زمین کو پہنانے لگا۔ زمین نے اپنی پلکیں اٹھا کے دیکھا۔

اس بار اس مسکراہٹ میں وہ تازگی نہیں تھی جو کمرے میں داخل ہوتے سمے تھی۔ وہ الجھ رہ گئی۔ اس الجھن میں جس میں گل جاتے جاتے اسے ڈال گئی تھی۔

یاسر نے زمین کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالوں میں لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''بدلے میں تم مجھے کوئی تحفہ دو...... نہ دو...... بس ایک زادِ راہ دے دو۔ دو گے؟ صرف میرے ایک سوال کا جواب ''ہاں'' میں دے دو۔''

گل کی آواز کی بازگشت کے سحر میں وہ پھر سے جکڑا گیا۔

''ہاں...... دوں گا۔''

اس کے لبوں سے سرگوشی نکلی اور زمین نے اپنی حیا سے بند پلکیں کھول کے بڑے اچنبھے سے اسے دیکھا۔ اس نے ایسا کیا مانگا تھا جو وہ دے رہا تھا۔

''صرف اتنا بتا دو۔ کیا میری پوری زندگی میں ایک پل بھی ایسا ہے جس میں تم نے مجھے اتنی شدت سے چاہا ہو؟''

''ہاں...... پوری شدت سے چاہا ہے۔ ایک پل نہیں کئی پل...... شاید تمام عمر۔''

زمین حیرت سے اسے تکے جا رہی تھی۔ جو اپنے ہی کہے الفاظ پہ حیران پریشان نظر آ رہا تھا۔

پھر یاسر کے ہاتھ اس کے چہرے سے پھسل کے کسی بے جان چیز کی طرح نیچے آن گرے۔

☆======☆======☆

پانچ سال بعد......

یاسر کسی اپارٹمنٹ کے لاک میں چابی گھما رہا تھا اور زمین ایسے لاتعلقی سے اس کے برابر کھڑی تھی۔ جیسے دو اجنبی اتفاق سے کسی ایک مقام پہ اکٹھے کھڑے ہوں۔

لاک کھولنے کے بعد یاسر اندر داخل ہوا۔ وہ بھی زمین سے اتنا ہی لاتعلق اور بے گانہ نظر آ رہا تھا جتنی وہ...... زمین بوجھل قدموں کے ساتھ اندر داخل ہوئی اور اسے پردے ہٹاتے دیکھنے لگی۔

''ایک اور نیا ٹھکانہ......''

اس کے تلخ لہجے پہ یاسر کے سگریٹ سلگاتے ہاتھ ایک لمحے کے لیے تھمے۔ کٹیلی سی نظر اس پہ ڈالنے کے بعد وہ پھر سے سگریٹ کو شعلہ دکھانے لگا۔

''یا پھر ایک اور فرار؟''

یاسر ایک بار پھر چونکا...... مگر اس بار اس کو دیکھنے سے احتراز کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

''یاسر...... میں تنگ آ چکی ہوں اس خانہ بدوشی کی زندگی سے...... پانچ سال ہو گئے ہیں مجھے آپ کی رفتار کا ساتھ دیتے ہوئے۔'' وہ پھٹ پڑی۔

''آپ کہیں رک کیوں نہیں جاتے؟ کسی مقام پہ ٹھہر کیوں نہیں جاتے؟''

وہ ان سوالوں کو قطعی غیر ضروری گردانتا اطمینان سے دھواں اگلتا رہا۔ زچ ہو کر وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''کچھ تو کہیں...... کوئی وجہ تو بتائیں اس خانہ بدوشی کی......؟''

دھوئیں کی اوٹ سے اس کا ناراض ناراض چہرہ تکتے ہوئے یاسر نے سکون سے جواب دیا۔

''میں نے کبھی تمہیں پسند نہیں کیا۔ تم چاہو تو آرام سے اپنے ابا کے گھر رہ سکتی ہو۔''

''مطلب کیا ہے آپ کا اس بات سے......؟''

وہ چلا اٹھی...... پانچ سالوں نے اس کی ظاہری شخصیت میں جو تبدیلیاں کی تھیں۔ سو کی تھیں۔ اس میں چلانے اور احتجاج کرنے کی خو بھی آ گئی تھی۔

''مطلب یہ کہ بقول تمہارے میں خانہ بدوش ہوں اور خانہ بدوش پیروں میں بیڑیاں نہیں ڈالتے۔''

''آپ مجھے پاؤں کی بیڑی سمجھتے ہیں؟''

وہ دکھ سے بولی۔ یاسر نے اس کے کاندھوں پہ ہاتھ سے ہلکا سا دباؤ ڈال کے اسے اپنے نزدیک کیا۔

''میرے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ بھی نہیں......''

اور پھر خود سے دور کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

''کیوں کرتے ہیں یاسر! آپ میرے ساتھ ایسا......؟ میں نے آپ کو خوش اور مطمئن کرنے کے لیے کیا نہیں کیا؟ آپ کی خواہش پہ ابا کا گھر چھوڑا۔ میکے کا ساتھ چھوڑا۔ آپ نے اپنا بزنس ابا سے الگ کیا۔ میں نے آپ کا ساتھ دیا۔ آپ نے مجھے کسی سوال کے نہ کرنے کا پابند کیا۔ میں نے یہ پابندی بھی نبھائی۔ مگر کب تک یاسر......؟ کب تک......؟ ان سوالوں نے میرے اندر گھٹن پیدا کر دی ہے۔ اس حبس سے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔ مجھے جواب چاہئیں۔''

☆======☆======☆

وہ نیند میں بھی سخت بے چین اور مضطرب نظر آ رہا تھا۔ جاگتے میں تو وہ اپنے مضبوط اعصاب کی بدولت اس اضطراب پہ قابو پا لینے میں کامیاب ہو جاتا تھا جو اسے پچھلے پانچ سالوں سے گھیرے ہوئے تھا لیکن نیند کے سامنے وہ بے بس ہو جاتا تھا۔ اس کے واہمے خوابوں کی صورت اسے ہولا کے رکھ دیا کرتے تھے۔

گل اس کے سامنے کھڑی تھی۔ تار تار لباس میں، کانٹوں پہ ننگے پیر، پورے وجود پہ رستے ناسور لیے، بالوں میں خاک ڈالے۔

وہ اس منظر سے نظر چرانے کے لیے بار بار سر جھٹک رہا تھا۔ ہاتھ ہلا ہلا کے آنکھوں کے آگے دیوار کھڑی کرنا چاہ رہا تھا لیکن بے سود...... آخر وہ چلانے لگا۔ تڑپنے لگا۔

زمین کی آنکھ یاسر کی زوردار چیخ سے کھلی۔

ہڑبڑاہٹ کے عالم میں لیمپ آن کرتے ہوئے وہ اس پہ جھکی اور زور سے جھنجوڑتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یاسر...... یاسر......! کیا ہوا؟"

وہ سینہ مسلتا ہوا اٹھا اور ہراساں نظروں سے گردن گھما گھما کے دیکھنے لگا۔ وہ اذیت ناک منظر غائب تھا۔ ایک سکون بھرا سانس لے کر اس نے ممنون نظروں سے زرمین کو دیکھا جس نے ایک بار پھر اسے اس اذیت سے نجات دلائی تھی۔

"یہ لیں...... پانی پئیں۔" وہ گلاس اسے تھما کے پھر سے پوچھنے لگی۔ "کوئی خواب دیکھا تھا کیا؟"

پانی کا گھونٹ یاسر کے حلق میں اٹک گیا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے دبی دبی آواز میں غرایا۔

"میں کیوں دیکھوں گا خواب؟ میں نے کئی سالوں سے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ سمجھیں تم......؟"

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟" وہ اس کے شدید ردِعمل پہ حیران ہوئی۔ "خواب تو آ ہی جاتے ہیں...... نہ چاہتے ہوئے بھی۔ اچھے بھی اور برے بھی اور آپ بھی شاید کسی خواب سے ہی......"

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

زرمین پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ دیوار کے ساتھ فرش پہ گری کرچیاں...... تو کبھی اس کا زرد سے سرخ پڑتا چہرہ دیکھنے لگی۔

"جب میں نے کہا ہے کہ میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تو کیوں بحث کر رہی ہو تم؟ کیوں......؟"

وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔ زرمین کو اس پہ یکبارگی ترس سا آ گیا۔

"اوکے...... نہیں دیکھا ہوگا...... ریلیکس...... سو جائیں آپ......"

وہ ذرا فاصلے پہ لیٹ گئی اور لیمپ آف کرنے کے بعد بھی دیر تک چپکے چپکے اسے دیکھتی رہی۔ جو چھت کی جانب نظر جمائے سیدھا لیٹا بڑبڑا رہا تھا۔

"میں نے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں...... چھوڑ دیئے ہیں خواب دیکھنے۔ بالکل چھوڑ دیئے ہیں۔"

☆======☆======☆

بڑی بے دلی کے ساتھ وہ معمول کے کاموں میں لگی تھی۔

ان پانچ سالوں میں شفٹنگ...... پیکنگ...... اور پھر نئے سرے سے گھر کی سیٹنگ یہ

اس کے لیے معمول ہی تو بن چکا تھا۔ اب تو وہ اس معمول سے اکتانے لگی تھی۔

کتنا ہی سامان وہ ایسے ہی بندھے رہنے دیتی۔ جانتی تھی کہ چند ماہ بعد یاسر سب چھوڑ چھاڑ کسی نئے شہر کی جانب روانہ ہو چکا ہوگا۔ نہ جانے کتنا رزق لکھ رکھا تھا رب باری تعالیٰ نے اس کے نصیبوں میں کہ کہیں بھی کاروبار نہ جمانے کے باوجود انہیں کبھی تنگی کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن ایک عورت ہونے کے ناطے زرمین کے اندر فطری طور پہ کسی آنگن میں ایسی بیل لگانے کی آرزو موجود تھی جسے وہ دن بدن...... سال بہ سال...... بڑھتے پھولتے دیکھے۔ مگر یہ خواب...... خواب ہی رہنا تھا۔

ایک گھر ہستن ہونے کے ناتے...... ایک عام انسان ہونے کی حیثیت سے اسے کل کی فکر بھی تھی۔ پانچ سالوں میں یاسر نے اسی خانہ بدوشی کی وجہ سے جو کمایا تھا۔ اتنا ہی خرچ کیا تھا۔ یہ بھی شاید اللہ کا کرم تھا کہ وہ کما بہر حال رہا تھا۔ ورنہ نئے شہروں میں جمتے جمتے ہی لوگوں کو سال لگ جاتے۔ زرمین کو فکر تھی کہ آئندہ اگر حالات ایسے نہ رہے تو کیا ہوگا؟ مگر وہ کوشش کے باوجود یاسر کو اس عادت سے روک نہ سکتی تھی۔

چند ضروری چیزوں کو ان کی جگہ پہ رکھنے کے بعد وہ ذرا سانس لینے کو بیٹھی ہی تھی کہ کال بیل کی آواز پہ اٹھنا پڑا۔

"جی...... فرمایئے۔"

وہ اپنے سامنے کھڑی بتیس، چونتیس سال کی دبلی پتلی، مناسب نقوش والی خوش لباس عورت کو دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

"میں سمیرا ہوں...... آپ کی نیبر......" (پڑوسی)

"اوہ...... آیئے...... پلیز......"

"اکیلی رہتی ہیں آپ......"

سمیرا خالی خالی لاؤنج کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ایک صوفے سیٹ اور ٹی وی کے علاوہ کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ نہ کوئی تصویر، نہ دیگر آرائشی سامان، تیسرا دن تھا ان لوگوں کو شفٹ ہوئے۔ اتنے عرصے میں سیٹنگ ہو ہی جاتی ہے۔

"جی نہیں...... میرے ہسبینڈ بھی رہتے ہیں اور آپ......؟"

"ہاں...... میرے ہزبینڈ بھی رہتے ہیں میرے ساتھ...... مگر میں اکیلی ہوں۔" وہ عجیب سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"جی......؟"

نرمین کے حیرت بھرے استفسار پہ وہ قہقہہ لگا کے ہنسی۔

"میرا مطلب ہے، لوگوں کی نظروں میں اکیلی ہوں۔ وہ میرے ساتھ ہیں۔ یہ تو بس میرے دل کو پتا ہے۔"

"اوہ......" نرمین نے افسوس ظاہر کیا۔ "یہ کب......؟ میرا مطلب ہے......وہ......"

"دو سال ہوئے ہیں۔" سمیرا نے مختصر الفاظ میں بتا کر بات بدلی۔

"تم لوگ پرسوں ہی شفٹ ہوئے ہو نا......؟ ہسبینڈ کی ٹرانسفر ہوئی ہے۔"

"نہیں......وہ بزنس کرتے ہیں۔ بس شوق ہے ایک جگہ سے دوسری جگہ سیٹل ہونے کا۔"

"یعنی......کہیں بھی سیٹل نہ ہونے کا شوق ہے؟"

وہ مسکرا کے پوچھ رہی تھی۔

"شاید......" نرمین اتنا کہہ کے رہ گئی۔

"کتنا مزہ آتا ہوگا......لوگ تو ترستے ہیں اس ایکسائٹ منٹ اور ایڈونچر کو......ایک جیسی زندگی سے۔ ایک ہی جگہ سے تو اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہر بار نئی جگہ...... نئے لوگ......اچھا لگتا ہوگا؟"

"ہاں......نئی جگہ...... نئے لوگ......مگر دل تو وہی ہوتا ہے...... پرانا......اور وہی اس کے پرانے تقاضے......کاش ہر بار یہ دل بھی......"

☆======☆======☆

یاسر بڑی الجھن کے عالم میں ڈرائیونگ کر رہا تھا

وہ جاگ چکا تھا۔ مگر ابھی تک اس خواب کے تکلیف دہ تاثر سے ابھر نہیں پایا تھا۔

اچانک اس کی نظر فٹ پاتھ پہ پیدل چلتی ایک عورت پر گئی۔

سیاہ چادر میں لپٹی عورت......

جس کی سیاہ سوتی چادر کا ایک پلو لٹک کے پیروں میں رُل رہا تھا۔

وہ خود سے بے گانہ چال......سُست قدم......

یاسر کے پیر خود ہی بریک پہ جا پڑے۔ چند سیکنڈ بے یقینی سے سامنے تکتے رہنے کے بعد جب اسے لگا کہ وہ اس وقت واقعی جاگ رہا ہے، کسی خواب کے طلسم میں نہیں ہے تو اس نے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی اور سُست روی سے فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چلاتا اس عورت کے پاس آیا۔ اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پہ کپکپا سے گئے

...اور دیکھنے کے بعد وہ ساری امید...... وہ ساری آس......جس نے لمحوں میں اپنا آپ اس کے سارے وجود پہ پھیلا دیا تھا، اس آس نے فوراً ہی اپنے پَر سمیٹ لیے۔

یاسر نے گاڑی کی اسپیڈ تیز کر دی اور چند سیکنڈ کے اندر اندر وہاں سے نکل گیا۔

☆======☆======☆

جس تھکن اور بے زاری کے ہمراہ وہ گھر میں داخل ہوا تھا، وہ بے زاری اور تھکن نرمین کے حلیے کو دیکھ کے سوا ہو گئی۔

دو دن سے پہنے ملگجے......سلوٹوں سے پُر بدرنگ کپڑے......بکھرے الجھے اور روکھے بال...... بے رونق چہرہ......

"سارا دن میں اتنی بھی کیا مصروفیت ہوتی ہے تمہیں جو اپنے لیے دو منٹ بھی نہیں نکال سکتیں۔ حلیہ دیکھا ہے اپنا؟"

"آپ نے دیکھا تھا میرا وہ حلیہ......؟ جب میں زندگی میں پہلی بار اور آخری بار آپ کے لیے سجی تھی۔ اپنی شادی پہ...... آپ بھی تو ایک ہی نظر ڈالنے کے بعد چلے گئے تھے۔ شادی کی پہلی رات سڑکوں پہ نہ جانے کس کا ماتم کرتے گزاری تھی آپ نے۔ پھر اب کس لیے حلیہ سنواروں میں اپنا......؟"

"میرے لیے نہیں......نہ سہی......اپنے لیے......لوگوں کے لیے......" نائٹ سوٹ نکال کر یاسر نے زور سے الماری بند کی۔

"کون لوگ؟ میرے پاس ہے ہی کون؟ اجنبی چہروں کا ایک ہجوم ہے اور جب یہ اجنبی کچھ شناسا سا ہونے لگتے ہیں تو آپ اپنی تلاش ختم کر کے کسی اور نئے شہر میں لا مارتے ہیں مجھے۔ کچھ اور اجنبی چہروں کے درمیان......"

"کسی کی تلاش نہیں ہے مجھے۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "بات کو گھماؤ مت۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ اس طرح اجڑی ہوئی بن کے رہنے سے تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ کتنے دن سے ...نہیں بدلا تم نے......"

"لباس سے کیا ہوتا ہے......؟ اگر برف کی سل کو سرخ کپڑے میں لپیٹ دیا جائے تو وہ دہکنے نہیں لگتی۔"

اس کے دکھ بھرے لہجے پہ یاسر کے اندر تاسف سا گھل گیا۔ وہ ہمدردی سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگا جس کی گلابیاں کبھی اس کا دل موہ لیتی تھیں......آج وہاں زردیاں بکھری تھیں۔

وہ اس کے گال پہ جھولتی لٹ کو ہاتھ سے سنوارتے ہوئے محبت اور نرمی سے کہنے لگا۔

''دیکھو زمین! میں تم سے......''

مگر زمین نے اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ زور سے جھٹک دیئے اور پوری طاقت سے چلائی۔

''مت ہاتھ لگائیں مجھے۔''

وہ ششدر رہ گیا۔

''مجھے ہاتھ لگاتے ہوئے آپ کے چہرے پہ جو تاثرات ہوتے ہیں۔ کاش میں وہ دکھا پاتی آپ کو...... آپ مجھے چھوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے خود پہ جبر کر رہے ہیں۔''

یاسر نے تحمل سے اسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کے اپنے قریب کرنا چاہا مگر وہ پاگلوں کی طرح چلا چلا کے اس کے ہاتھ جھٹکنے لگی۔

''چھوڑیں مجھے۔ مت چھوئیں۔''

وہ بھی غصے میں آ گیا۔ ''زمین! آخر تم چاہتی کیا ہو؟''

''پتا نہیں......'' وہ سسکنے لگی۔ ''مگر...... مگر میں یہ نہیں چاہتی تھی کہ آپ کی زندگی میں میری جگہ کسی کی خالی کی ہوئی جگہ ہو اور وہ میرے ہونے سے بھی بھر نہ رہی ہو۔ وہ جگہ خالی کی خالی ہے یاسر......!''

یاسر زخمی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تھکے تھکے انداز میں بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

''کتنی بار کہا ہے زمین! یہ ذکر مت چھیڑا کرو۔''

''مجھے بھی شوق نہیں ہے اپنے ہی زخموں پہ نمک چھڑکنے کا...... مگر...... میں اس گتھی کو سلجھانا چاہتی ہوں۔ اس نے جاتے جاتے کہا تھا کہ وہ آپ کو پانا چاہتی تھی اور آپ مجھ سے محبت کرتے تھے لیکن مجھے...... مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ پانا تو مجھے چاہتے تھے مگر محبت اس سے کرتے تھے۔''

یاسر کو ایسا لگا، کسی نے اس کے سامنے ایسا آئینہ رکھ دیا ہے جس سے اس کا اندر واضح ہو کر سامنے آ گیا ہو۔ سیخ پا ہوتے ہوئے اس نے غصے سے ڈریسنگ ٹیبل پہ ہاتھ مار کے کتنی ہی چیزیں گرا ڈالیں۔ شاید اندر کا وہ روپ جو انسان چھپانا چاہتا ہو، کسی کے ظاہر کرنے پہ ایسا ہی طیش آتا ہے۔

''نہیں کرتا تھا میں اس سے محبت۔'' وہ حلق پھاڑ کے چلایا۔ ''تم مجھے اسے بھولنے کیوں نہیں دیتیں۔''

سخت بے بسی سے کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔

''آپ اس سے محبت نہیں کرتے اور وہ آپ کو بھولتی بھی نہیں۔''

ایک طنزیہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ آ گئی۔

☆======☆======☆

وہ آج پھر اس دوراہے سے گزر رہا تھا۔

وہی فٹ پاتھ...... وہی سیاہ چادر میں لپٹی عورت...... یاسر بے اختیار اس کے نزدیک بریک لگا بیٹھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ گل نہیں ہے۔

''صاحب ہا...... ہاتھ کی کڑھائی کی چادریں ہیں......لو گے؟''

عورت نے اسے اپنی جانب دیکھتے پا کے ہاتھ میں پکڑے...... تھیلے کی جانب اشارہ کیا۔

اس کی ناک میں چاندی کی بالی تھی۔ بالکل گل کی طرح۔

اس کے ابرو قدرتی طور پر تراشیدہ تھے۔ بالکل گل کی طرح۔ اس کی رنگت میں ہلکی سی سنولاہٹ تھی بالکل......

''بیٹھو......'' یاسر نے کھولے کھولے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے حکم دیا اور عورت عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتی کار میں بیٹھ گئی۔

☆======☆======☆

سمیرا سبزی خریدنے کے بعد گھر واپس آ رہی تھی۔ جب اس نے یاسر کو تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک ایسی عورت بھی تھی جو کسی بھی طرح اس کی جاننے والی یا رشتہ دار ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔

وہ حیرت سے اسے یاسر کے ساتھ فلیٹ کا لاک کھول کے اندر جاتے دیکھتی رہی۔ لاک کھولنے کا مطلب یہی تھا کہ اندر زمین موجود نہیں تھی۔

عورت تھیلا کارپٹ پہ رکھ کے وہیں بیٹھنے لگی تھی کہ یاسر نے اشارے سے روک دیا۔

''وہاں بیٹھو......'' یاسر کے لہجے میں احترام اور التجا تھی۔ وہ جھجکتے ہوئے صوفے کے کونے پہ ٹک گئی۔

''آرام سے بیٹھو......''

''یہ...... یہ سب ہاتھ کی کڑھائی ہے۔''

وہ جلدی جلدی تھیلے سے دوپٹے، چادریں نکال نکال کے دکھانے لگی۔ یاسر خالی خالی

نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''صاحب......'' عورت کی آواز پہ چونکا۔

''صاحب......وہ بی بی لوگ......''

وہ یاسر سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی مگر اس کی نگاہیں ٹیبل پہ رکھی بھری ہوئی فروٹ باسکٹ پہ بھٹک رہی تھیں۔

''لو......کھاؤ......'' یاسر پھرتی سے اٹھا اور باسکٹ اس کے سامنے رکھی۔ عورت کچھ بے یقینی اور تذبذب کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

''کھا لو پہلے......'' وہ بڑی عقیدت سے پھل کاٹ کاٹ کر اس کے آگے رکھنے لگا اور پھر اس خیال سے اٹھ آیا کہ شاید اس کی موجودگی کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح سے کھا نہ رہی ہو۔ کچھ دیر بعد آیا تو ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ عورت فروٹ کھانے کے بعد دوپٹے سے منہ پونچھ رہی تھی۔ یاسر نے اس کے سامنے ٹرے رکھی تو وہ حیرت سے دیکھ کے رہ گئی۔

''کھاؤ......لیموں کا اچار بھی ہے۔ تمہیں پسند ہے نا......؟''

عورت اسے ایسے دیکھنے لگی جیسے یاسر پاگل ہو......پھر کچھ سنبھل کے بولی۔

''صاحب! یہ گھر لے جاؤں! ابھی تو پیٹ پھل سے بھر گیا......''

وہ اثبات میں سر ہلا کے رہ گیا۔ وہ جلدی جلدی روٹیوں پہ سالن ڈال کے انہیں رول کرتے ہوئے چادر میں باندھنے لگی۔ لیموں کا اچار وہیں پڑا رہ گیا۔

''یہ بھی رکھ لو۔'' یاسر نے اندر سے لایا ایک اور شاپر اسے تھمایا۔ وہ ہاتھ سے چھو کر دیکھنے لگی۔ وہ بالکل نئے سلے ہوئے زنانہ جوڑے تھے۔ اس کا چہرہ چمکنے لگا۔

''بڑی مہربانی صاحب......''

ان کو اپنے کڑھائی والے کپڑوں کے تھیلے میں ٹھونسنے کے بعد وہ جھکی نظروں اور پست لہجے کے ساتھ بولی۔

''اور یہ......یہ صاحب......یہ نہیں لو گے؟''

وہ تھیلے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ یاسر کے نفی میں سر ہلانے پہ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ بجھے بجھے انداز میں وہ اپنی سیاہ چادر اتارنے لگی۔

''اندر جانا ہے صاحب! یا......''

یاسر سناٹے میں آ کے رہ گیا۔ چند سیکنڈ بے یقینی سے اسے گھورتے رہنے کے بعد بولا۔

''کیا......کیا کہا تم نے؟''

''صاحب! کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ ہاتھ کی کمائی کر کے کھائیں۔ مگر ان کے خریدار کم ہی ملتے ہیں۔''

اس نے تھیلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے دکھ سے کہا۔ ''ہاں......دوسرے گاہک ہر موڑ پہ مل جاتے ہیں۔ بیچنا تو پڑتا ہے صاحب! ایک مال نہ بکے تو دوسرا تو بیچنا پڑتا ہے۔''

یاسر سکتے سے نکلا اور اس کے چہرے پہ ایک زور کا تھپڑ جما دیا۔

☆======☆======☆

نرمین شاپنگ کر کے گھر لوٹی تو شاپنگ بیگز ایک جانب رکھتے ہوئے اس کی نگاہ ٹیبل پر گئی۔ جہاں ٹرے میں خالی برتن......اچار کی بھری پیالی اور فروٹ کے چھلکے پڑے تھے۔

نرمین کے چہرے پہ نہ حیرت تھی نہ اچنبھا......اس نے ایک گہرا سانس لے کر سر جھٹکا اور برتن اور چھلکے اکٹھے کرنے لگی۔ جیسے یہ سب اس کے لیے معمول کی بات ہو۔

''بہت دیر لگا دی تم نے؟''

ادھ کھلے دروازے پہ ہلکی سی دستک دے کر اندر آتی سمیرا نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں......بس......گروسری میں اتنا ٹائم تو لگتا ہے۔''

''ایک بات پوچھوں نرمین......'' وہ بیٹھتے ہوئے تمہید باندھنے لگی۔ ''تمہیں اپنے شوہر پہ کس حد تک اعتماد ہے؟''

''کس معاملے میں؟''

''تمہارے معاملے میں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ کبھی کسی دوسری عورت میں......''

''اپنے معاملے میں مجھے شاید اتنا اعتماد نہ ہو ان پہ......'' نرمین نے بات کاٹی۔ ''مگر اس معاملے میں ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ کبھی کسی دوسری عورت پہ نظر ڈال ہی نہیں سکتے۔''

''یہ کیا بات ہوئی، ایک طرف تو تم اپنے معاملے میں اعتماد کرنے پہ تیار نہیں ہو، دوسری جانب ایسا کہہ رہی ہو۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ یاسر کے دل، دماغ اور سوچ پہ......کسی بھی چیز پہ کسی دوسری عورت کا سایہ بھی نہیں پڑ سکتا۔ وہاں بڑا کڑا پہرہ ہے۔ بڑی جابر حکومت ہے کسی کی۔''

نرمین کے ہونٹوں پہ خود اذیت سی مسکراہٹ تھی۔

''صرف تمہیں محتاط کرنے کے لیے بتا رہی ہوں کہ تمہاری غیر موجودگی میں تمہارا میاں اک گھر میں کسی عورت کو لایا تھا جو اپنے حلیے اور چال ڈھال سے بہر حال تمہاری ملنے جلنے والی

یا عزیزہ تو ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔"

"پتا ہے مجھے...... نئی بات نہیں ہے یہ میرے لیے۔"

زمین کے اطمینان بھرے لہجے نے سمیرا کو دنگ کر دیا۔ وہ کچھ بول تک نہ سکی۔

"میری غیر موجودگی میں ہی نہیں۔ میری موجودگی میں بھی لے آتے ہیں۔"

"اور تم یہ سب برداشت کر لیتی ہو......؟ کون ہے وہ عورت......؟"

"میں نہیں جانتی...... نہ کبھی جاننے کی کوشش کی...... ویسے بھی ہر بار وہی تو نہیں ہوتی...... ہر بار ہر شہر میں...... کوئی نہ کوئی مل جاتی ہے یاسر کو...... ایسی ہی۔"

"امپاسبل...... اور تم ایسے نارمل نظر آ رہی ہو جیسے یہ کوئی بہت معمولی بات ہو۔"

"واقعی...... صحیح کہا تم نے...... یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ اچھا بتاؤ۔ وہ عورت سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔"

"ہاں......"

"بدحال سی...... بیچاری سی......؟"

"ہاں۔"

"پھر واقعی کوئی تشویش کی بات نہیں۔ پریشان مت ہو۔ دراصل یاسر کو سوشل ورک کا شوق ہے۔ خدمت خلق کا......"

وہ مسکرائی جس سے سمیرا چڑ سی گئی۔

"اچھی خدمت ہے۔ جو صرف کالی چادر والی سڑک چھاپ عورتوں سے کی جاتی ہے۔"

☆======☆======☆

"کیوں کر رہی ہوں میں ایسا؟ کیوں خود کو اتنا ارزاں کر رہی ہوں۔"

وہ آئینے کے سامنے کھڑی لمبے کھلے بالوں میں برش کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اس نے کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی شفون کی ساڑھی پہنی تھی۔ جن پہ موتیا رنگ کے پھولوں کا بارڈر تھا۔ ہلکا سا میک اَپ سفید نگوں کا ہلکا پھلکا سیٹ...... بدن سے اٹھتی مسحور کن خوشبو......

"جانتی ہوں کہ آج وہ خوش ہوں گے۔ آج اپنے دل کا وہ بوجھ ہلکا کر آئے ہوں گے جو سالوں سے انہیں کچل رہا ہے اور میں...... میں کسی بھوکی ندیدی بلی کی طرح اس تاک میں لگی رہتی ہوں بس...... کہ کب ایسا لمحہ آئے اور کب میں کسی کے صدقے میں ملی اس محبت کو......"

ہارن کی آواز پہ وہ چونکی۔ برش رکھ کے جلدی سے ٹشو کھینچ کر ہونٹوں پہ لگا گلابی رنگ

...ر کے اتارا یاسر کے اندر آنے تک وہ چوڑیاں اور بُندے بھی اتار چکی تھی۔

"تم تیار نہیں ہوئیں اب تک؟ بتایا تو تھا...... ڈنر پہ جانا ہے۔"

زمین کوئی جواب دیئے بغیر اسے دیکھتی رہی۔ وہ بہت خوش، بہت مطمئن نظر آ رہا تھا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بجائے ہلکی گنگناہٹ کے ساتھ ٹائی اتارنے کے بعد موزا اتار رہا تھا۔ واش روم جانے کے لیے پلٹا تو وہ راستے میں ایستادہ تھی۔

"کیا ہوا؟"

"یہ تو مجھے آپ سے پوچھنا چاہیے۔ کیا ہوا ہے آج......؟"

یاسر کے چہرے کا رنگ بدلا اور پھر وہ سنبھل کے مسکرایا۔

"کچھ نہیں...... کچھ بھی تو نہیں۔"

"ہاں...... اس کچھ بھی نہ ہونے کا تو رونا ہے سارا۔"

وہ گہرا سانس لے کر بیڈ کے کونے پہ ٹک گئی۔ یاسر کچھ شرمندہ شرمندہ سا اس کے پاس آیا۔ زمین پہ اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کے گود میں رکھے ہاتھوں پہ اپنے ہاتھ رکھ کے محبت اور ندامت میں ڈوبے لہجے میں بولا۔

"میں برا ہوں ناں نمو! بہت برا......"

زمین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جن کو جھپکنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ انکار میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں...... میں ہوں برا......" وہ اس کی گود میں سر رکھ رہا تھا۔

"میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ نہ تھا۔ میں مانتا ہوں، تمہارے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ تم...... تم بہت اچھی ہو۔ اتنی ہی اچھی...... جتنی میں چاہتا تھا۔ مگر میں یہ بھول گیا کہ ایک مکمل عورت کی خواہش جیسی مجھے ہے ویسے ہی وہ مکمل اور بے عیب عورت بھی کسی مکمل اور بے عیب مرد کی خواہش رکھتی ہوگی تم مجھ جیسا شخص ڈیزرو نہیں کرتی تھیں نمو!"

"ایسا مت کہیں یاسر......!" وہ اپنی گود میں رکھے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"آپ کو تو شاید عادت ہو گئی ہے خود کو ہر وقت کٹہرے میں کھڑا رکھنے کی۔ ایک الزام سے خود کو بری کرتے ہیں اور دوسرا خود ہی لگا لیتے ہیں۔ کچھ دیر تک اپنے دل کو خالی رہنے دیں اس پچھتاوے سے۔"

"پتا ہے زمین......!"

وہ سر اٹھا کے کچھ کہنے والا تھا کہ نرمین نے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"نمو کہیں نا...... کتنے عرصے بعد سنا ہے یہ نام......"

یاسر نے اس کا ہاتھ اپنے لبوں سے ہٹا کے ہاتھوں میں دبایا۔

"نمو! میں نے سوچا تھا کہ اگر میری بیوی میں کوئی بھی کھوٹ ہوا تو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ مار ڈالوں گا۔ مگر اب میں خود دعا کرتا ہوں کہ تمہارے قدم لڑکھڑا جائیں یا کم از کم تم مجھ سے اتنی محبت کرنا ہی چھوڑ دو...... میرے ساتھ وہ سب کرو جو میں پانچ سالوں سے تمہارے ساتھ کر رہا ہوں۔ تاکہ پلڑا برابر ہو جائے۔"

اس کی حالت دیکھ کے نرمین کی سسکیاں نکل گئیں۔

☆======☆======☆

بڑے عرصے بعد ان کے درمیان ایسی رات آئی تھی۔ جس میں وہ دونوں اجنبی نہیں تھے۔

بڑے عرصے بعد ایسی صبح طلوع ہوئی تھی جس میں دونوں ایک دوسرے سے بیگانہ نہیں تھے۔

نرمین نے گنگناتے ہوئے اس کے کپڑے نکالے۔ بڑے مسرور انداز میں...... بہت دل لگا کے اس کا پسندیدہ ناشتہ تیار کیا۔ ہلکی پھلکی باتوں کے دوران ناشتہ کرنے کے بعد اسے مسکراتے ہوئے گھر سے روانہ کیا اور میکے کا نمبر گھمایا۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام...... جیتی رہو...... خوش رہو...... یاسر میاں کیسے ہیں؟"

دوسری جانب سے جہاں آرا بیگم تھیں۔

"بالکل ٹھیک ہیں...... آفس گئے ہیں۔ آپ سنایئے۔ کیسی طبیعت ہے؟ گھٹنوں میں درد تو نہیں ہوتا؟ ابا کا سٹور کیسا جا رہا ہے، امی...... وہ......"

"ذرا دم لو لڑکی...... سارے سوال کیا ایک سانس میں کرو گی؟ اتنا ہی دل اتاولا ہو رہا ہے تو آ کے مل جاؤ اماں باوا سے...... نانی، دادی کی آنکھوں میں بھی ٹھنڈک اُتر آئے گی۔"

"آؤں گی دادی جان! ابھی نئے نئے تو اس شہر میں شفٹ ہوئے ہیں۔ ابھی تو یاسر ہاؤس سیٹ کرنے میں لگے ہیں۔"

"ہٹاؤ بھی...... یہ کون سی نئی بات ہے۔ پانچ سالوں میں پچاس تو شہر بدلے ہوں گے یاسر میاں نے۔ نہ جانے کیوں نہیں موافق آتی انہیں کسی بھی شہر کی آب و ہوا...... ارے، میں کہوں...... کسی سیانے حکیم سے مشورہ کریں۔"

انہوں نے وہی کہا جو زرمین نے عذر پیش کر رکھا تھا۔

''آب و ہوا تو موافق آ جائے...... مگر بعض اوقات زندہ رہنے کے لیے صرف پانی اور ہوا ہی ضروری نہیں ہوتی ہے۔''

''جانے کیا بڑبڑائے جا رہی ہے۔ اب تمہارے مزے میں ہیں اور کیوں نہ ہوں گے۔ حلیمہ کی جو کایا پلٹ ہوگئی ہے اور بھئی جب وہ مزے میں ہیں تو میں اور جنت بھی مزے میں ہیں۔ اس عمر میں سارا سکھ تو اولاد کے سکھ میں ہوتا ہے۔ بس ایک آرزو ہے کہ تمہاری گود ہری بھری دیکھ لیں۔ پھر بھلے بلاوا آ جائے۔'' وہ رکیں پھر رازداری سے پوچھنے لگیں۔

''پھر بھی دھیان رکھنا کیا پتا خون جوش میں آ جائے اور یاسر میاں بھلے ہمدردی میں ہی سہی۔ اسے طوق بنا کے ڈال دیں ہمارے گھرانے پہ...... اللہ اللہ کر کے تو صغیر میاں کی زندگی میں کوئی رنگ آیا ہے۔ کتنا کہا تھا میں نے کہ......''

''چھوڑیئے بھی دادی جان! آپ بھی کیا ذکر لے بیٹھی ہیں۔'' وہ گھبرا گئی۔

''دھڑکا تو لگا رہتا ہے ناں۔ نامراد دو دو مردوں پہ دیدے گاڑے بیٹھی تھی۔ ایک میرا بیٹا، ایک میرا داماد...... مجھے تو ہول اٹھیں گے ہی۔ صغیر میاں سے اس کا رشتہ چار بول پڑھ کے بندھا۔ تین لفظوں سے ٹوٹ گیا مگر یاسر میاں سے اس کا خون کا رشتہ ہے۔ کبھی بھی پلٹ کر...... خیر...... اللہ نہ کرے۔ میں نے یونہی تمہیں پریشان کر دیا۔ بس محتاط رہو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور ہاں یاسر میاں سے بات کر کے آنے کا پروگرام بناؤ۔ سب اداس ہو رہے ہیں۔''

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ مگر زرمین کا دھیان اسی ایک بات میں اٹکا تھا۔

''خون کا رشتہ؟ یہ تو شاید روح کا رشتہ ہے۔ جو ٹوٹ کے بھی نہیں ٹوٹ رہا۔ وہ کہتی تھی یاسر اس سے محبت نہیں کرتے۔ یاسر بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ اس سے محبت کبھی کرتے ہی نہیں تھے۔ پھر...... پھر یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے جو مجھے محسوس ہوتا ہے...... کون سا تعلق ہے یہ......؟''

ریسیور ہاتھ میں لیے گم صم وہ سوچ رہی تھی۔

☆======☆======☆

جیسے ہی وہ عورت کار میں بیٹھی۔ یاسر نے کار اسٹارٹ کر دی۔ مگر آج وہ عورت کچھ بے چین سی لگ رہی تھی۔ حالانکہ آج اسے بے چین نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پہلے دن جب وہ یاسر کے ساتھ بیٹھ رہی تھی۔ تب وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ شخص اسے کہاں لے جانے والا ہے۔ اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے لیکن اب تو وہ جان گئی تھی کہ یہ سر پھرا اس کے لیے قطعی بے ضرر

ہے۔ پھر اس بے چینی اور بے آرامی کی وجہ......؟

''صاحب...... آج بھی کچھ نہیں خریدو گے؟''

یاسر نے اسے گھور کے دیکھا...... وہ گڑبڑا گئی۔

''میرا مطلب ہے، دوپٹے...... وغیرہ۔''

وہ جواب دیئے بغیر گاڑی چلاتا رہا۔

''صاحب! اگر صرف روٹی کھلانی ہے تو یہیں بازار سے لے کر کھلا دو۔ مدد کرنی ہے تو راستے میں کر دو...... اپنے گھر کیوں لے کر جاتے ہو۔ میرا بھی ٹیم خراب کرتے ہو اور اپنا بھی نام خراب......''

یاسر کے دوبارہ گھورنے پہ وہ سہم کے چپ ہوئی۔ اس تھپڑ کی حدت اب تک یاد تھی۔

''گھر نہیں لے جا رہا۔ اپنے ایک دوست کی فیکٹری میں لے کر جا رہا ہوں۔ وہاں تمہاری ملازمت کی بات کی ہے میں نے۔ کل سے تمہیں وہاں جانا ہوگا۔''

عورت کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔

☆======☆======☆

اس نے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔

اور ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھیں اور دل اور دماغ دعا مانگنے کی جسارت بھی کر لیں۔

آج دنوں بعد وہ یہ ہمت کر رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں اللہ...... میرا گناہ بہت بڑا ہے۔ میں نے وہ دل...... وہ اعتبار توڑا ہے جس کا واحد سہارا میں تھا۔ میں نے اور میری محبت نے اسے کچھ نہیں دیا اور میری نفرت...... میری نفرت نے بھی اسے کہیں کا نہیں رہنے دیا۔ میرا وہ شک اس کی پوری زندگی کھا گیا۔ وہ زندگی وہ بڑی نیک نیتی سے شروع کرنے والی تھی۔''

وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ کچھ دیر بھڑاس نکالنے کے بعد اس نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو صاف کیے اور دوبارہ دعا گو ہوا۔

''پتا نہیں میں معافی کے لائق ہوں یا نہیں مگر یا اللہ! اسے معاف کر دینا۔ اس کی آزمائشیں اور سختیاں دور کر دینا۔ سزائیں مجھے دینا، وہ جہاں ہے، اسے خیریت سے رکھنا۔ میں نے اب تک جتنی بھی عورتوں کو گناہ کی دلدل میں دھنسنے سے بچانے کی کوشش کی ہے، اس کے صدقے، اس کے صدقے میرے مولا...... اس کے صدقے اسے کسی ایسی دلدل میں

دھنسنے نہ دینا میرے مولا......!"

یاسر نے گاڑی فٹ پاتھ کے نزدیک روکی، وہ آج پھر وہیں تھی۔ اس کے رکنے پہ خاصے ناگوار سے تاثرات اس کے چہرے پر نظر آئے۔

"تم فیکٹری کیوں نہیں جا رہی، میں نے پتا کیا ہے اپنے دوست سے، تم دو دنوں میں ایک بار بھی نہیں گئیں۔"

"مجھے نہیں جانا وہاں۔"

اس عورت کے لہجے میں اجنبیت تھی۔

"کیا مطلب......؟ میں نے تمہاری خاطر اسے گنجائش نکالنے کو کہا تھا، ورنہ......"

"صاحب......! کیا میں نے کہا تھا کہ میرے لیے نوکری ڈھونڈو؟" وہ بات کاٹ کر درشتی سے بولی۔

یاسر کی سمجھ سے اس کا رویہ بالاتر تھا، وہ الجھ کر رہ گیا۔

"مگر......تم...... یہاں بھی تو...... یہاں تمہارے ہنر کی قدر ہے، نہ قیمت لگتی ہے، اس لیے میں نے تمہیں وہاں ملازمت دلوائی تھی۔"

"کون سا ہنر صاحب......!" وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

"یہ کپڑے...... میں نے نہیں بنائے، یہ پھول بوٹے، نہ مجھے بنانے آتے ہیں۔"

وہ تھیلے سے دوپٹے نکال کر دکھاتے ہوئے بول رہی تھی بڑے ہی کھردرے لہجے میں۔

"اور آتے بھی ہوتے...... دیدے پھوڑ کے بنا بھی لیتی تو کون خریدتا انہیں؟ یہ تو پولیس تھانے سے بچنے کے چکر ہیں...... بہانے ہیں سارے...... ورنہ سب کو پتہ ہے کہ ان فٹ پاتھوں پہ کیا بکتا ہے۔ جاؤ صاحب......! کسی اور کا دماغ چاٹو۔ دھندے کا ٹیم کھوٹا نہ کرو۔"

یاسر ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا اور وہ اتنے میں نزدیک ہی رکنے والی کسی اور گاڑی میں بیٹھ کے چلی بھی گئی۔

نرمین کو عرصے بعد سمیرا کی صورت ایک دوست میسر آئی تھی۔ اگرچہ عمر کا کچھ فرق تھا دونوں کے درمیان اور جگہ جگہ بدلتے رہنے کے باعث نرمین نے کبھی نئے ہمسایوں سے تعلقات بڑھانے یا دوستی پیدا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی لیکن سمیرا کی ذات میں کچھ ایسا تھا کہ وہ اس کے قریب آ گئی۔

"تمہارے ہسبینڈ کو کیا ہوا تھا؟"

ایک دن چائے پیتے پیتے اس نے ذرا جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"عشق......"

سمیرا نے چسکی لیتے ہوئے لطف کے عالم میں کہا۔

نرمین چونکی، مسکرا کے اسے دیکھا۔

"وہ تو ظاہر ہے تمہیں ان سے اتنی محبت ہے تو وہ بھی عشق ہی کرتے ہوں گے تم سے مگر میرا کہنے کا مطلب تھا کہ ان کی ڈیتھ کیسے ہوئی۔"

"اللہ نہ کرے، ان کی ڈیتھ نہیں ہوئی نرمین!"

وہ اتنے اطمینان سے بولی کہ کچھ دیر تک تو مارے حیرت کے نرمین کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ حیرت سے اس کا چہرہ کھوجنے لگی، جو کسی بھی قسم کے مذاق یا شرارت کی رمق سے پاک تھا۔ ایسے بھی اس قسم کا مذاق کوئی بھی نہیں کر سکتا۔

"شاید مجھے ہی مغالطہ ہوا ہو سننے میں۔"

ذہن میں اس کی پچھلی ساری باتیں دہرا لینے کے باوجود اس نے خود کو باور کرایا اور کچھ شرمندہ سے انداز میں کہنے لگی۔

"اوہ......آئی ایم سوری...... مجھے لگا......سوری سمیرا...... مجھے واقعی شرمندگی ہے کہ میری مس انڈراسٹینڈنگ کی وجہ سے......"

"کوئی بات نہیں، ہو جاتا ہے۔"

سمیرا نے مسکرا کے بسکٹ دانتوں سے کترا، پھر مزید بتانے لگی۔

"وہ مرا ضرور مگر اپنی سیکرٹری پہ۔"

نرمین پھر سے الجھ گئی۔

"ہماری محبت کی شادی تھی، لو میرج......مگر پھر چار سال بعد ہی محبت پہ عشق غالب آ گیا۔ بھلا عشق کے آگے محبت کیا دم مارتی۔ سو میں ہار گئی۔"

"تم نے اسے جانے کیسے دیا؟"

"روک نہیں سکتی تھی پھر جانے دینے کے علاوہ اور کیا کرتی۔ چلو اعلیٰ ظرفی کا سرٹیفکیٹ مل گیا، اس بہانے۔" وہ ہنسی، شاید اپنے اوپر۔

"اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا، نہ سہی مگر قدر تو کرتا ہے۔ احسان مانتا ہے کہ میں نے الٹے سیدھے حربے آزما کے اسے من مانی کرنے سے نہیں روکا۔ اسے اس کے دل کی کرنے دی۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ میرے پاس اس اعلیٰ ظرفی کا جھوٹا مظاہرہ کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جب ہار گئی، سو ہار گئی۔ ایک کھوکھلے مرد کو لے کر ساری عمر ٹین کے خالی ڈبے کی

طرح بجاتی رہتی کیا؟"

"لیکن تمہارے دو بچے ہیں سمیرا! تم نے ان کے لیے ہی اسے روکا ہوتا۔"

"ہاں...... بچے...... دو تاروں کے درمیان کرنٹ کا کام دیتے ہیں بچے...... میں ان کے ذریعے اسے اموشنل بلیک میل کرسکتی تھی مگر کیا فائدہ...... جب تاریں ہی ٹوٹ چکی ہوں تو کرنٹ کہاں دوڑتا۔"

وہ کپ اٹھا کے باقی کی چائے پینے لگی اور نرمین خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

☆======☆======☆

وہ آج پھر اس کے لیے تیار ہوئی تھی۔

کئی سُونے اجاڑ مہینے گزارنے کے بعد یہ مرادوں بھرے دن آئے تھے اس کی زندگی میں، جب یاسر نارمل زندگی کی طرف لوٹنے لگا تھا۔ بھیک اور خیرات میں ملی اس خوشی کو وہ کسی بخیل کی طرح سینت سینت کر رہتی۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی اسے امید تھی، اب یاسر پہ یہ موسم ہمیشہ رہے گا۔ وہ کبھی اس حالت کی جانب نہیں لوٹے گا جو حالت اسے نہ نرمین کا رہنے دیتی ہے نہ اپنا۔

وہ نیکلس پہن رہی تھی جب آئینے کے عکس میں اسے یاسر اندر آتا نظر آیا، وہ بہت نڈھال سا لگ رہا تھا۔ چہرہ اترا ہوا، بال گرد گرد۔

"آ گئے آپ...... میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" وہ یاسر کے مقابل کھڑی مسکرا کے پوچھ رہی تھی مگر یاسر کی پتھرائی نظریں اسے کچھ اور دکھلا رہی تھیں۔

گل دامن پھیلائے تر سے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"میں کب سے انتظار کر رہی ہوں اپنے اس آخری سوال کے جواب کا۔ بتاؤ نا یاسر! کیا زندگی میں کبھی ایک بار بھی تم نے مجھ سے سچے دل سے محبت کی ہے؟"

وہ جواب دینے ہی لگا تھا کہ نرمین کا نرم ٹھنڈا ہاتھ اس کے کاندھے پہ ٹکا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنے تصور سے باہر آیا۔ اب سامنے گل نہیں، ہلکے سبز لباس میں نفاست سے کیے میک اَپ کے ساتھ بنی سنوری...... خوشبوئیں لٹاتی وہ نرمین تھی۔ اسے ان خوشبوؤں سے وحشت ہونے لگی۔ وہ بدک کے دو قدم پرے ہٹا۔

"آج میں نے آپ کی پسند کا کھانا تیار کیا ہے۔ کہیے، ہوں نا میں ایک اچھی اور سگھڑ بیوی۔"

وہ مسکراتی، اِتراتی پوچھ رہی تھی اور یاسر کی نگاہیں پھر سے اسے ایک گم گشتہ لمحے کی

جھلک دکھلا رہی تھیں۔

"میں نے پورے دل سے کوشش کی تھی، ایک شریف انسان کی اچھی بیوی بننے کی۔ اس انسان کی جس سے میں نے کبھی محبت نہیں کی۔ سوچو، میں اس کے لیے کتنی اچھی اور وفادار بیوی ثابت ہوتی جس سے میں نے محبت کی۔"

یاسر کے چہرے پہ زردی کھنڈ گئی۔

نرمین کا ہاتھ اس کے کاندھے سے اٹھا اور اس کے گال پہ آہستگی اور نرمی سے ٹھہر گیا۔

"یاسر...... کیا ہوا ہے آپ کو...... آپ ٹھیک تو ہیں؟"

یاسر کو اپنا گال دہکتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسے جیسے کسی نے انگارے اس پہ رکھ دیئے ہوں۔

اس کی نظروں نے اسے پھر سے اس منظر میں الجھایا، جس میں صغیر احمد نے گل کے رخسار پہ زور کا طمانچہ مارا تھا اور وہ کھڑے پیروں زمین پہ آ رہی تھی۔

"کیا اس وقت اسے بھی ایسے ہی انگارے اپنے گال پہ دہکتے ہوئے محسوس ہوئے ہوں گے۔"

یاسر نے بے حد تکلیف سے سوچا اور وحشت کے عالم میں پہلے نرمین کا ہاتھ اپنے چہرے سے جھٹکا اور پھر بنا کچھ سوچے سمجھے سے اتنے زور کا تھپڑ دے مارا کہ وہ جو اس سے ایک قدم کے فاصلے پہ کھڑی اس آفت ناگہانی کے لیے بالکل بھی تیا نہیں تھی، الٹ کے پیچھے جا گری۔

☆======☆======☆

"نرمین...... دروازہ کھولو...... باہر نکلو نرمین۔"

وہ زور زور سے دروازہ پیٹ رہا تھا۔

مگر نرمین جو پچھلے دو گھنٹوں سے واش روم میں بند تھی، نہ جواب دینے پہ آمادہ تھی، نہ دروازہ کھولنے پہ۔

ہاں اس کی سسکیوں اور ہچکیوں کی آواز مسلسل یاسر کا دل چیرے جا رہی تھی۔ اسے خود سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ آج اس نے حد ہی تو کر دی تھی۔ نہیں، اس نے نہیں، اس کی دیوانگی، اس کی وحشت نے۔ زیادتی تو وہ پچھلے کئی سالوں سے اس معصوم، بے قصور لڑکی کے ساتھ کرتا ہی آ رہا تھا مگر ایسا بے رحمانہ سلوک...... نہیں، وہ اس کی مستحق نہیں تھی۔ اسے رہ رہ کے تاسف ہو رہا تھا۔

"نرمین...... میں تم سے معافی مانگ رہا ہوں۔ پلیز...... پلیز...... مجھے معاف کر دو،

میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھا۔"

"آپ اپنے آپ میں ہوتے کب ہیں؟" وہ زور سے چلائی۔

"آپ کبھی بھی اپنے آپ میں نہیں ہوتے، آپ گم ہو چکے ہیں یاسر! آپ کا اپنا آپ اس عورت میں گم ہو چکا ہے، جسے میں نے آپ سے الگ نہیں کیا تھا، وہ آپ کا اپنا فیصلہ تھا۔ یہ آپ تھے جس نے مجھے اس پہ ترجیح دی تھی پھر اب کیوں آگ گلیاں کھنگالتے پھرتے ہیں، کیوں اس کے ساتھ کی جانے والی ہر زیادتی کا بدلہ مجھ سے لیتے ہیں۔"

"زمین...... بھول جاؤ یہ سب...... باہر آؤ۔"

"بھول جاتی ہوں، ہر بار بھول جاتی ہوں۔ ہر بار اس دھوکے میں آجاتی ہوں مگر اب نہیں، اب نہیں یاسر......"

پھر اس کے بعد کتنی ہی دیر وہ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا، اس کے ہاتھ شل ہو گئے۔

کتنی ہی منت سماجت کرتا رہا کہ اس کا گلا خشک ہو گیا۔

مگر بے سود......

دوسری جانب ایک جامد خاموشی تھی۔

ایک جان لیوا سناٹا۔

☆======☆======☆

وہ واش روم میں بند تھی۔ گرمی میں...... حبس میں۔ وہ بھی بغیر پنکھے کے...... بغیر کھڑکیاں کھولے صوفے پہ نیم دراز ہو گیا۔

نیند سولی پہ بھی آجاتی ہے۔ شاید وہ وہاں ننگے فرش پہ اکڑوں بیٹھی دروازے سے سر ٹیکے چہرے پہ آنسوؤں کے نشانات لیے سو گئی ہو جیسے یہاں وہ گرم صوفے پہ پسینہ پسینہ وجود لیے سو رہا تھا۔

مگر نہیں...... وہ سو کب رہا تھا۔

وہ تو خواب میں بھی سزا کے عمل سے گزر رہا تھا۔

گل کو دیکھ رہا تھا جو فٹ پاتھ پہ کھڑی تھی۔ کاندھے سے ایک تھیلا لٹکا تھا کڑھائی والے دوپٹوں کا اور وہ کسی گاڑی والے سے مول تول کر رہی تھی۔ ان دوپٹوں کا نہیں، اپنا...... اور پھر بھاؤ طے ہونے پہ وہ مڑی۔ یاسر کو ایک تکلیف دہ مسکراہٹ سے نوازنے کے بعد اس مرد کے ساتھ بیٹھ کے چلی گئی۔

"گل......" وہ چلاتے ہوئے اٹھا۔

نہ صرف وہ بلکہ واش روم میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی اونگھتی ہوئی زمین بھی ہڑبڑا کے جاگی۔

"گل......" اس نام کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی اور زخم نئے سرے سے ادھڑ گیا۔

"اور کچھ دیر پہلے تم قسمیں کھا رہے تھے کہ اسے بھول چکے ہو، وہ ہمارے درمیان نہیں ہے۔" اس نے اذیت سے سر پٹختے ہوئے سوچا۔

☆======☆======☆

"تم مجھے کبھی کبھی ایک منہ زور ندی لگتی ہو گل......"

کبھی یاسر نے اس سے کہا تھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

"ایک ایسی منہ زور ندی...... جو چڑھ جائے تو اترنے کا نام نہ لے۔ مجھے کمزور ہونے سے ڈر لگتا ہے۔ ڈرتا ہوں تمہارے سامنے ذرا سا بھی کمزور پڑا، ایک بھی دراڑ میرے اندر بھی تم نے تو پوری کی پوری میرے اندر گھس جاؤ گی۔ میرے اندر ٹھاٹیں مار کے حکمرانی کرنے لگو گی۔ مجھے تمہاری حکمرانی سے خوف آتا ہے گل!"

"میں اور حکمرانی......؟ کیوں گناہ گار کرتے ہو۔" اس کی محبت میں بلا کی عاجزی در آئی۔

"میں تو داسی ہوں تمہاری...... باندی...... صرف تمہیں چاہنے کے لیے...... تمہیں پوجنے کے لیے بنی ہوں۔"

"اور جو کبھی میں کہیں چلا گیا تو...... تو کیا کرو گی؟"

"تمہارا انتظار۔" جواب بڑا برجستہ تھا۔

"انتظار تو تم نے کرنا تھا گل......"

وہ صوفے پہ نڈھال پڑا سوچ رہا تھا۔

"اسے میری آنکھوں میں کیوں سجا گئی ہو۔ اپنی ساری دیوانگیاں مجھے کیوں سونپ گئی ہو؟"

اور تب آنکھیں کسمسا کے کھلنے لگیں، جب روشنی نے اس پہ دستک دی اور پسینے اور حبس سے گھٹے بدن پہ ٹھنڈی ہوا نے ملائمت سے ہاتھ پھیرا۔

وہ آنکھیں کھول کے دیکھنے لگا، پنکھا آن تھا۔ زمین سارے پردے ہٹا رہی تھی۔ رت جگا اس کے بھی سارے وجود سے عیاں تھا۔

''زمین......''

وہ کچھ کہنے کے لیے اٹھا مگر زمین واپس جا چکی تھی۔ وہ بے دم سا ہو کے دوبارہ گر گیا۔

☆======☆======☆

وہ بہت بجھے بجھے انداز میں گھر کے کام کر رہی تھی۔ یاسر جا چکا تھا۔ تین گھنٹوں کے درمیان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ یاسر نے کوشش بھی کی تو زمین نے ایسی کوئی کوشش کامیاب نہ ہونے دی۔ وہ ایسے ہی گھر سے نکل گیا اور وہ نڈھال سے انداز میں پھیلاوا سمیٹنے لگی جو آج معمول سے زیادہ نظر آ رہا تھا جیسے ان دونوں کی زندگی کی بے ترتیبی گھر کی ایک ایک چیز سے عیاں ہو رہی ہو۔

ایسے میں سمیرا کی آمد۔

''آج بہت دیر سے جاگی ہو کیا؟''

دن کے بارہ بج چکے تھے اور وہ اب تک نائٹ سوٹ میں تھی۔ گھر کا بھی حال بے حال تھا۔ اس لیے اس نے یہ اندازہ لگایا۔

''ہاں، بہت دیر سے جاگی، بہت آرام دہ نیند تھی۔'' وہ اذیت پسندی سے مسکرائی۔

''نیند پوری ہو جانے پہ تو تمہیں فریش نظر آنا چاہیے، اتنی تھکی تھکی کیوں لگ رہی ہو۔''

وہ غور سے اسے دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی تو زمین بھی کشن رکھتے رکھتے دوبارہ زمین پہ پھیل کے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

''بعض نیندیں کبھی پوری نہیں ہوتیں، خوابوں کی طرح اور بعض خواب ایسے ہی تھکا ڈالتے ہیں۔ اپنے پیچھے بھگا بھگا کر۔ سمیرا...... تم کبھی خواب میں ننگے پیر دور تک بھاگی ہو۔ کئی کئی گھنٹے، کئی کئی دن بھاگی ہو۔ نہیں نا پھر تم کیسے جان سکتی ہو کہ جاگنے کے بعد تھکن کیوں ہوتی ہے۔''

''اگر تم ایک دوست سمجھ کر مجھ سے اپنے دل کی بات کرنا چاہو تو......''

''نہیں، مجھے کہنا کچھ نہیں۔ ہاں پوچھنا ہے، جب تمہیں پتہ چلا تھا کہ تمہارا شوہر کسی اور سے محبت کرتا ہے تو تمہیں کیسے...... میرا مطلب ہے کیسا لگا تھا تمہیں؟''

''ظاہر ہے برا لگا لیکن فوری طور پہ...... سب سے پہلا احساس جو جاگا وہ ذلت کا تھا، توہین کا تھا۔''

''پھر تم نے کیسے جانے دیا اسے دوسری عورت کے پاس؟''

''کیونکہ اس ذلت اور توہین کے احساس کو میں عمر بھر کے لیے خود پہ طاری نہیں کرنا

ہتی تھی اور کون جانے وہ دوسری تھی یا میں۔ اس وقت جس کی طلب زیادہ ہو وہی پہلی ترجیح تی ہے، پہلی...... اور اس وقت پہلی ترجیح...... پہلی عورت وہی تھی...... میں دوسری تھی۔''

''لیکن وہ شوہر تھا تمہارا...... تم سے زیادہ حق کیسے کسی اور کا ہو سکتا ہے اس پہ۔''

''ہاں، میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ یہی سمجھانے گئی تھی میں اس عورت کو۔ میرا خیال تھا ں سے لڑوں گی، اسے دھمکاؤں گی اور اس سے بھی بات نہ بنی تو اس کے پیروں میں گر کے ڑگڑاؤں گی۔ اپنا شوہر بھیک میں مانگوں گی۔ شاید اسے ترس آ جائے اور اگر نہ آئے تو...... تو ں جھولی اٹھا اٹھا کے اسے بددعائیں دوں گی۔ ترس کھا کے نہ سہی، شاید بددعاؤں سے ڈر ے وہ میرے شوہر کا پیچھا چھوڑ دے۔''

''پھر...... چھوڑا اس نے؟''

زمین نے تجسس سے پوچھا۔

''نہیں، میں نے چھوڑ دیا ان دونوں کو۔''

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

''وہ بہت خوبصورت تھی، میرے اندازوں سے بھی بڑھ کے۔ اس کی خوبصورتی سے رعوب ہو کے میں کچھ نہ کر سکی۔ نہ ڈرا سکی، نہ منت سماجت کر سکی، نہ بددعا دے سکی۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' زمین خاک نہ سمجھی۔

''اگر وہ ترس کھا کے یا ڈر کے میرا شوہر مجھے واپس کر بھی دیتی تو زمین! میں اس کے اس سے اس عورت کی خوبصورتی کیسے مٹاتی جس پہ وہ فدا تھا۔ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتا تھا، ن یہ تھا نا کہ اسے مجھ سے وہ محبت نہ رہی تھی۔ لیکن زمین! اگر میں اسے اپنے ساتھ رہنے پہ بور کرتی تو شاید نفرت بھی کرنے لگتا وہ مجھ سے۔ میں نے خود کو اس کی نفرت سے بچایا ہے۔ ب وہ مجھ سے دور سہی مگر مجھے اچھے لفظوں میں یاد تو کرتا ہو گا۔ میرا احسان مند تو ہو گا۔''

''بے وقوف ہو تم، اتنی آسانی سے اپنی چیز کسی دوسرے کو سونپ دی۔''

''وہ چیز نہیں تھا زمین! چیز نہیں تھا، یہی تو غلطی کرتے ہیں ہم، انسانوں کو چیز سمجھ لیتے ں۔ اس کا ایک دل تھا جو شدت سے کسی کو چاہتا تھا، اس کا ایک دماغ تھا جہاں کوئی چھایا ہوا ا۔ میں اس عورت کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، وہ اسے چھوڑ کے میرے پاس آتا تو میں اسے لے سے زیادہ بری لگتی۔ اس سے اس کا عشق اور شدت پکڑ لیتا۔ میں نے ٹھیک کیا زمین! مجھے ئی پچھتاوا نہیں ہے۔ ایک درد اپنا کے میں نے خود کو سدا ملنے والے دردوں سے نجات دلا لی ہے۔''

☆======☆======☆

"کیوں...... کیوں کرتا ہوں میں ایسا...... جسے دکھ نہیں دینا چاہتا، اسے بھی دکھ ہی دیتا ہوں جس سے سکھ پانا چاہتا ہوں، اس سے بھی دکھ پاتا ہوں۔ کیا قصور ہے نرمین کا۔ کیوں وہ میرے پچھتاوے کی آگ میں راکھ ہو رہی ہے۔ یہ میرا جہنم ہے، اس میں مجھے جلنا ہے، اس کو نہیں۔"

کسی ویران سڑک کے کنارے گاڑی روکے، وہ دھوپ کی تپش سے بے نیاز اسٹیئرنگ پہ ہاتھ دھرے سوچے جا رہا تھا۔

"نہیں، اتنی بددعاؤں کے حصار میں نہیں رہ سکتا میں۔ مجھے سر سے پیر تک جھلسانے کے لیے گل کی ایک آہ کافی ہے۔ میں اس میں نرمین کی آہوں کا حصہ کیوں ڈالوں۔ مجھے ایک اور بے گناہ کو آزمائش میں نہیں ڈالنا۔ نہیں...... میں اب نرمین کو اور دکھی نہیں کروں گا، کبھی نہیں۔"

فیصلے کے ساتھ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ چند قدم آگے جاتے ہی وہ بری طرح چونکا۔ فٹ پاتھ پہ کوئی تھی جس کی چال ڈھال حد درجہ گل سے ملتی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹی۔ یاسر کی کار کی اسپیڈ بے ارادہ آہستہ ہوئی۔

"نہیں...... اور نہیں...... اب اور نہیں...... مجھے اس وہم کو اپنے دل سے کھرچ کر مٹانا ہوگا۔"

وہ زن سے گاڑی اس عورت کے پاس سے گزار کے لے گیا، اس کا چہرہ دیکھے بغیر۔

دھول اڑی، سیاہ چادر والی نے چہرے کو دھول اور گرد سے بچانے کے لیے بازو موڑ کے چہرے کے آگے کر لیا۔

"مجھے کبھی پلٹ کے نہیں دیکھنا۔" وہ مڑ کے دیکھے بغیر کار آگے لے گیا۔

سیاہ چادر والی نے چادر کے کونے سے چہرے کا پسینہ صاف کیا، گل کے چہرے کی سنہری رنگت سنولا چکی تھی۔

☆======☆======☆

وہ گھر میں داخل ہوا تو ہاتھ میں نرمین کے پسندیدہ پھولوں کا بوکے تھا۔ اس کے من بھاتے فلیور کی آئس کریم کا پیک، وہ چونکا۔ صبح کے برعکس نرمین نارمل نظر آ رہی تھی۔ ہلکا ہلکا میک اپ، ترو تازہ چہرہ، نیا لباس۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پہ برتن لگا رہی تھی۔

"آ گئے آپ، میں کھانا لگانے ہی والی تھی۔"

وہ مطمئن ہو کر آگے بڑھا اور اسے بوکے اور آئس کریم کا پیک پکڑایا۔

"تمہارے لیے۔"

"تھینکس۔" نرمین نے مسکرا کے لیا اور سونگھتے ہوئے بولی۔

"یہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے اور آپ بھی۔"

"کیا......؟" وہ چونکا، کچھ ٹھٹکا۔

"مجھے اچھا لگا کہ آپ مجھے اتنی محبت سے اور اتنا gracefully رخصت کرو گے۔"

وہ منہ بند کلیوں پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے مدھری مسکان کے ساتھ کہہ رہی تھی، یاسر لجھنے لگا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"میں نے بھی ڈنر میں ساری آپ کی فیوریٹ ڈشز ہی بنائی ہیں۔ میں بھی یہی چاہتی ی کہ ہمارا لاسٹ ڈنر، یادگار ہو، خوشگوار ہو۔"

یاسر بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا، کچھ کہنے کے لیے منہ بھی کھولا مگر اس سے کہا نہ گیا۔

نرمین آئس کریم شاید فریج میں رکھنے چلی گئی تھی۔ وہ ڈائننگ چیئر گھسیٹ کر اس پہ گر سا لیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چکراتا سر تھام لیا پھر اس کی نظروں کے سامنے نرمین کے ہاتھ تحرک ہوئے۔ وہ ٹیبل پہ چاول کی ڈش رکھ رہی تھی، اس نے سر اٹھا کے دیکھا۔

"نرمین...... پلیز...... ٹھنڈے دماغ سے سوچو...... میری بات سنو......"

"باتیں نہیں...... کھانا شروع کرو، ورنہ سب ٹھنڈا ہو جائے گا۔" وہ ان سنی کر رہی تھی ں پہ وہ جھنجلا اٹھا۔

"مجھے نہیں کھانا، کھانا۔"

"کیوں...... آپ کم از کم میرے ہاتھ کا کھانا تو پسند کرتے ہی ہیں۔"

"صرف کھانا......؟" یاسر نے بے تابی سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"مجھے تو تمہاری بہت سی باتیں پسند تھیں اور ہیں، اسی لیے تو کی تھی تم سے شادی۔"

"میری بہت سی باتیں پسند تھیں، اس لیے مجھ سے شادی کی اور جس سے نہیں کی، ......وہ تو شاید پسند سے بہت آگے کی چیز تھی۔"

وہ اداس نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اداسی لفظ لفظ سے ٹپک رہی تھی۔

"نمو...... اس صفحے کو میں اپنی زندگی کی کتاب سے پھاڑ چکا ہوں، یقین کرو۔"

"تو پھر آپ کی زندگی کی کتاب میں رہا کیا ہوگا۔ نہیں یاسر...... مجھے کٹی پھٹی ادھوری کتاب نہیں چاہیے اور نہ آپ اپنا بٹوارہ کر کے زندہ رہ سکتے ہیں۔ دو الگ الگ ٹکڑے کسی کام کے نہیں۔ ادھورے نہ آپ میرے کسی کام کے، ادھورے نہ آپ اس کے کسی کام کے۔ کسی ایک کو تو پورے مل جائیں۔"

"میں صرف اور صرف تمہارا ہو کے رہوں گا۔"

"وہ دعوے نہ کریں جو پورے نہیں ہو سکتے۔"

وہ اپنے ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑا کے پرے ہٹی۔

"میں اب اس چوکیداری سے تنگ آ گئی ہوں۔ کب تک آپ کا رستہ دیکھوں کہ کب آپ میرے پاس لوٹیں گے۔ نہیں یاسر...... اب نہیں...... تھک گئی ہوں میں۔"

اور ٹیبل پہ رکھے خالی گلاسوں پہ نظر جما کے بیٹھ گئی۔

یاسر بھی خالی ٹھس سا بیٹھا تھا جیسے کہنے کو کچھ نہ رہا ہو۔

"پتا ہے یاسر......" اچانک وہ بولی اور دو گلاس اس کے سامنے سرکائے۔ ایک میں پانی، ایک میں جوس، دونوں الگ ڈیزائن کے۔

"پتہ ہے یاسر...... یہ آپ کا گلاس تھا۔"

اس نے جوس والے گلاس پہ انگلی ماری۔

"لیکن آپ کو چاہیے تھا سادہ پانی، اس لیے آپ نے یہ چھوڑ کے دوسرا والا لے لیا۔"

اب اس نے پانی والا گلاس یاسر کے سامنے کیا جو کچھ نہ سمجھتے ہوئے ٹکر ٹکر کبھی اسے، کبھی گلاسوں کو دیکھ رہا تھا۔

"لیکن کیا فائدہ، پانی آپ کی پیاس بجھاتا تھا لیکن آپ نے نہیں پیا کیونکہ گلاس آپ کو وہ پسند تھا، پہلے والا۔ یہ ہے آپ کا مسئلہ۔ ایک کا مشروب پسند ہے آپ کو اور دوسرے کا گلاس لیکن یاسر...... میں نہ کوئی چیز ہوں، نہ گل کوئی چیز ہے۔ انسان کو چیز سمجھنے کی غلطی نہ کریں جو میں ہوں، میں وہ رہوں گی۔ جو گل ہے وہ رہے گی۔ ہم یہ گلاس نہیں ہیں، آپ اپنے پسند کے گلاس میں اپنی پسند کا مشروب بھر لیں اسے خالی کر کے۔"

"بند کرو اپنی بکواس۔"

یاسر چلایا اور دونوں گلاس ہاتھ مار کے ٹیبل سے گرا دیئے۔

پھر دوبارہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کے بیٹھ گیا۔ نرمین چپ چاپ برش سے گلاسوں کی کرچیاں سمیٹنے لگی۔ وہ ٹکڑے اٹھا کے کچن کی جانب گئی تو وہ اٹھ کے پیچھے پیچھے چلا

گیا۔ وہ اپنی انگلی کو دیکھ رہی تھی جس میں کرچی چبھی تھی اور خون رس رہا تھا۔

"کیوں اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی تکلیف دیتی ہو۔"

وہ نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کے نل کے نیچے رکھ کے پانی سے دھونے لگا۔

"تم یک طرفہ فیصلہ نہیں کر سکتیں اور وہ بھی اس وقت، جب میں ساری کشتیاں جلا کے تمہاری طرف آیا ہوں۔ اب نہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ فیصلہ مجھے بہت پہلے کرنا چاہیے تھا۔ تب جب میں آپ سے شادی سے انکار کر سکتی تھی، کیونکہ میں نے تب ہی جان لیا تھا کہ صرف گل نہیں، آپ بھی اس سے محبت کرتے ہیں لیکن تب میری عقل پہ پردے پڑ گئے تھے۔ مجھے اپنے اوپر اعتماد تھا کہ میں بازی جیت لوں گی، کچھ زمانے کا ڈر تھا کہ شادی سے ایک دن پہلے انکار کرنے کی کیا وجہ بتاؤں گی لیکن اب تین سال بعد احساس ہوتا ہے کہ وہ وقت صحیح تھا اس فیصلے کے لیے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں آپ کو نہ جیت سکوں گی نہ حاصل کر سکوں گی۔"

"تم بھول جاؤ سب کچھ، اتنے سالوں تک تم کوشش کرتی رہی کہ میں سب بھول جاؤں۔ آج میں نہیں کہہ رہا ہوں کہ بھول جاؤ۔ میں مانتا ہوں میں نے غلطی کی، وہ میری غلطی تھی، میں تسلیم کرتا ہوں۔"

"یہ گلاس آپ نے توڑے ہیں، تسلیم کرتے ہیں؟"

وہ ڈسٹ بن میں پھینکی کرچیوں کی جانب دیکھ کے بولی۔

"ہاں۔" وہ کچھ نہ سمجھا۔

"لیکن آپ کے مان لینے سے، اعتراف کر لینے سے یہ کرچیاں دوبارہ جڑ تو نہیں جائیں گی۔"

وہ سن کھڑا رہ گیا۔ نرمین اپنا ہاتھ دوپٹے سے خشک کرتی کچن سے نکل گئی۔ وہ کرچیوں پہ نظر جمائے کھڑا سوچتا رہا۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے۔ وحشت کے عالم میں اس نے ایک بڑا سا ٹکڑا ڈسٹ بن سے اٹھایا اور اپنی کلائی پہ پھیر لیا۔

☆======☆======☆

نرمین ٹیرس پہ کھڑی نیچے سے گزرتی ٹریفک دیکھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ گھر کے ایک حصے میں اس وقت یاسر اپنے ہی بہتے خون میں لوٹ رہا ہے۔

"پتہ نہیں، میں نے ٹھیک کیا یا غلط، کس سے پوچھوں۔"

وہ بڑبڑا کے رہ گئی۔

اور جواب میں ایک دم حلیمہ کا ہنستا مسکراتا سادہ سا معصوم چہرہ اس کے سامنے آ گیا۔ وہ بڑا اترا کے اسے اپنے کنگن دکھا رہی تھی۔ نرمین مایوں کے پیلے جوڑے میں تھی۔

”یہ دیکھو...... تمہارے ابا نے بنوا کے دیئے ہیں، نئے۔“

”لیکن...... یہ تو......“ نرمین نے غور سے دیکھتے ہوئے ان کو چھوا۔

”ہاں، پتہ ہے۔ اس چڑیل کے لیے بنوائے تھے لیکن وہ تو دفعان ہوگئی، دیئے تو مجھے ہیں تمہارے ابا نے۔“

”رہنے دیتیں آپ، ابا نے بنوائے تو اسی کے لیے تھے۔ وہ چلی گئی تو آپ کو دے دیئے۔ آپ کو برا نہیں لگ رہا اس کی چیز اپنے نام کرتے ہوئے۔“

”نہیں پگلی! میرے ہی ہیں، یہ دیکھ نا...... جیسے تمہارے ابا ہمیشہ سے میرے تھے، بہت پہلے سے...... درمیان میں کچھ دنوں کے لیے وہ اس کے ہو گئے لیکن وہ تھے تو میرے، اس لیے پھر سے میرے پاس آ گئے...... تو کیا ہوا جو یہ کنگن اس کے نام سے بنے تھے، میرے ہیں اور میرے ہاتھوں میں رہیں گے۔“

”امی...... آپ تو بہت سمجھ داری کی باتیں کرنے لگی ہیں۔“ وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

”سچی......“ حلیمہ شرما گئی۔ ”وہ بھی یہی کہتے ہیں، تمہارے ابا۔“

پھر اذان کی آواز پہ جلدی سے اٹھی۔

”اللہ...... مغرب ہوگئی اور میں نے ابھی تک روشنی نہیں کی گھر میں۔ اماں نے دیکھ لیا تو ڈانٹیں گی کہ رات کے وقت گھر میں اندھیرا صرف موت والے گھر میں ہوتا۔“

نرمین ایک جھٹکے سے یادوں سے نکلی، پیچھے مڑ کے دیکھا، اس کے گھر میں بھی اندھیرے کا راج تھا۔

”رات کے وقت گھر میں اندھیرا صرف موت والے گھر میں ہوتا ہے۔“

وہ ہول کے رہ گئی اور تیزی سے اندر لپکی۔

لاؤنج کی لائٹیں آن کرتے، کوریڈور کے بلب روشن کرتے ہوئے وہ جیسے ہی کچن میں داخل ہوئی۔ یاسر کو اوندھے منہ نیچے گرا دیکھ کے دہل گئی، اس کے ارد گرد گاڑھا سرخ خون بہہ رہا تھا۔

”یاسر......“ وہ پوری شدت سے چلائی۔

☆======☆======☆

”یاسر...... یاسر...... پلیز اٹھیں۔“

وہ ایمبولینس میں بے ہوش یاسر کا سر گود میں رکھے روتے ہوئے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں اب کبھی گھر میں اندھیرا نہیں رکھوں گی، میں کبھی روشنی کرنا نہیں بھولوں گی۔ میں یاسر...... اٹھیں...... خدا کے لیے...... آپ جو کہیں گے میں وہ کروں گی...... یاسر...... مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ مجھ سے الگ ہونے کا خیال آپ کی جان لے لے گا...... میں غلط تھی یاسر...... مجھے معاف کر دیں، اب کبھی ایسا نہیں ہوگا۔ میں کبھی آپ پہ شک نہیں کروں گی، کبھی کوئی ہمارے درمیان نہیں آئے گا۔“

روتے روتے نڈھال سی ہو کر اس نے اپنی گود میں رکھے یاسر کے سر پہ ٹھوڑی ٹکا دی اور سرگوشی میں کہنے لگی۔

”واپس آ جائیں یاسر...... واپس آ جائیں...... میرے لیے...... میرے لیے واپس آ جائیں۔ ہم اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر دیں گے، وعدہ......“

☆======☆======☆

”دیکھیے خاتون! یہ پولیس کیس ہے، میں پیشنٹ کا آپریشن اس کے بیان سے پہلے نہیں کر سکتا۔“

”ان کی حالت بگڑ رہی ہے، خون مسلسل بہہ رہا ہے۔ پلیز ڈاکٹر...... وقت ضائع مت کریں۔“

وہ گڑگڑا رہی تھی۔

”میں مجبور ہوں،“ ڈاکٹر نے اپنی پیشہ وارانہ سفاکی کے ساتھ کہا۔ ”ہاسپٹل کے رولز کے مطابق خودکشی کے کیس میں پہلے پولیس کو......“

”یاسر نے خودکشی نہیں کی۔“ نرمین نے جلدی سے بات کاٹی۔

”یہ ایک حادثہ ہے، یقین کریں ڈاکٹر......“

”نرمین......“ سمیرا تیز تیز چلتی اس کے پاس پہنچی، وہ بھی بہت ہراساں لگ رہی تھی۔

نرمین سسکتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

”مجھے ابھی ابھی پتہ چلا...... کیا ہوا تھا؟“

انہیں باتوں میں مصروف دیکھ کے ڈاکٹر آگے نکل گیا۔

”ڈونٹ وری، میں نے ڈاکٹر سہیل سے بات کر لی ہے۔“

کچھ دیر بعد سمیرا دوبارہ اس کے پاس آئی اور تسلی دی۔

"ان سے ہمارے فیملی ٹرمز ہیں۔ یاسر کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا رہا ہے اور پولیس بھی آنے والی ہے۔ اب تم خود کو سنبھالو تاکہ پولیس کو سکون سے، آرام سے وہ بیان دے سکو جو میں نے تمہیں سمجھایا ہے۔"

زمین نے غائب دماغی کے عالم میں سر ہلا دیا۔

"میں تمہارے لیے کافی لاتی ہوں۔"

سمیرا نے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کے کہا۔

"نہیں، مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"پلیز...... زمین...... ریلیکس...... کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ کافی لینے چلی گئی۔ زمین بے تابی سے آپریشن تھیٹر کی جانب چلی گئی اور اس کے دروازے کے اوپر جلتی سرخ بتی پہ نظر جما کے کھڑی ہو گئی۔

"اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ اس دروازے کے پار چلی جائے یا پار نہیں جا سکتی تو کم از کم آر پار دیکھ ہی لینے کی قدرت حاصل ہو جائے اسے۔

ایک نرس اس کے عقب سے گزر کے آپریشن تھیٹر کی جانب بڑھی تو زمین کے ساکت وجود میں ہلچل پیدا ہوئی، جیسے ہی نرس نے آپریشن تھیٹر کے دروازے کو دھکیلنے کے لیے اس پہ ہاتھ رکھا، زمین نے پکارا۔

"پلیز...... سسٹر...... میرے یاسر کو بچا لیں۔"

نرس کا ہاتھ وہیں جمے کا جما رہ گیا۔

"کسی بھی طرح...... مگر بچا لیں یاسر کو......"

نرس آہستگی سے پلٹی اور دونوں ہاتھ جوڑ کے گڑگڑاتی زمین کو حیرت سے دیکھا۔

زمین اب کسی بت کی مانند ساکت کھڑی اسے تک رہی تھی، اسے...... یعنی گل کو۔

☆======☆======☆

سمیرا کافی لے کر آئی تو زمین کی حالت دیکھ کے ڈر سی گئی۔ وہ کسی بے جان مجسمے کی مانند پیلا پھٹک چہرہ لیے بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ اسے سو سو واہمے ستانے لگے۔

"زمین......" سمیرا نے باقاعدہ اسے جھنجوڑ ڈالا مگر وہ کوئی بھی ردِعمل ظاہر کیے بنا آپریشن تھیٹر کے دروازے کو دیکھے جا رہی تھی۔

"زمین...... کیا ہوا...... یاسر ٹھیک تو ہے۔"

مگر زمین کے کانوں میں یاسر کے دعوے گونج رہے تھے۔

"میں سب کشتیاں جلا کے تمہارے پاس آیا ہوں زمین! تم بھی سب بھول جاؤ۔"

اور اپنا وعدہ......

"اب کوئی ہمارے درمیان نہیں آئے گا، ہم اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کریں گے، وعدہ......"

سمیرا بہت حیرت اور پریشانی کے عالم میں اس کے چہرے کی پیلاہٹ کو سفیدی میں بدلتے دیکھ رہی تھی۔

موت کی سی سفیدی۔

متوحش ہو کر اس نے ایک بار پھر زمین کو زور سے جھنجوڑ ڈالا۔

"زمین...... ہوش کرو۔"

اور زمین ہوش کہاں سے لاتی، وہ تو گل اپنی ایک جھلک دکھا کے اڑا چکی تھی۔

وہ تڑپ کے روتے ہوئے سمیرا کے گلے لگ گئی اور ماتم کرنے کے سے انداز میں دھاڑیں مارنے لگی۔

"بس بھی کرو زمین...... تم نے تو مجھے ڈرا کے رکھ دیا۔"

بہت مشکل سے سمیرا نے زمین کو بَین کرنے سے روکا۔ بصد اصرار اسے دو گھونٹ پانی پلا کے، اس کے چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارے اور اس کے ہاتھ سہلاتے ہوئے اس کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھی۔ زمین کے بَین بند ہو چکے تھے، آنسو رک چکے تھے مگر دبی دبی سسکیاں اب بھی سانسوں کو بے ترتیب کرتی ابھر رہی تھیں۔

"ہمت کرو زمین...... یاسر کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہیں، کچھ نہیں ہوا آپ کے ہسبنڈ کو۔"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

گل اس کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔

"کیا آپریشن کامیاب ہو گیا؟" یہ سوال سمیرا نے کیا تھا۔

"جی...... مگر خون بہہ جانے کی وجہ سے ہوش اب تک نہیں آیا۔ بہر حال خطرہ ٹل چکا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اجنبیت سے آگے بڑھ گئی۔

"کیا واقعی خطرہ ٹل چکا ہے؟"

اچانک نرمین کہہ اٹھی اور آگے بڑھتی گل اس سوال میں چھپے اندیشے کو بھانپ کے رکی۔ مڑ کے گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اتنا ہی گہرا جواب دیا۔

''خطرہ وہیں ہوتا ہے جہاں محبت ہو، اگر آپ کو محبت ہے تو خطرہ تو محسوس ہوگا ہی۔''

پھر مسکرا کے بات ٹالی۔

''مگر یہ خطرہ بے بنیاد ہے، ان کی صحت کی دعا کیجیے۔ بے کار اندیشے اور واہمے پالنے کے بجائے۔''

اور پھر سے آگے بڑھ گئی۔

☆======☆======☆

گل آئی سی یو میں بے ہوش یاسر کے پاس آئی، اس کا ایک ہاتھ بیڈ سے نیچے جھول رہا تھا۔ اس نے بہت نرمی اور احتیاط سے اس کا بازو اٹھایا اور اس کا ہاتھ اس کے سینے پہ رکھا۔ وہ اپنا ہاتھ ہٹانے ہی والی تھی کہ یاسر نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا، وہ چونک گئی پھر دل کی اتھل پتھل کو قابو میں رکھتے ہوئے اپنا ہاتھ یاسر کے ہاتھ کے نیچے سے نکالنے لگی۔

''نرمین...... نرمین...... مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔'' وہ بے ہوشی میں بڑبڑایا۔ گل نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا، جہاں بے پناہ درد نظر آ رہا تھا۔

گل ہولے سے مسکرائی۔

''چلو...... تم نے کسی کو تو اپنی زندگی کے لیے ضروری جانا۔''

اس کے ہاتھ آہستہ سے یاسر کے بالوں کی جانب بڑھے جو آنکھوں پہ پڑ رہے تھے مگر اسی وقت اس کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی، گل کا ہاتھ وہیں رک گیا۔

یاسر نے نیم بے ہوشی کی کیفیت میں گل کے پیکر کو اپنے سامنے دیکھا، اس کا ذہن تاریکی سے اجالے کی جانب بڑھنے لگا۔

☆======☆======☆

''کچھ نہیں ہوگا یاسر کو، تم بلاوجہ ہلکان ہو رہی ہو۔ اب تو اسے ہوش بھی آ گیا ہے، تم جا کے اسے دیکھ کیوں نہیں لیتیں...... تمہیں تسلی ہو جائے گی۔''

سمیرا کے کہنے پہ نرمین نے لاچاری سے اسے دیکھا۔

''کیسے جاؤں وہاں، وہاں...... وہ ہے۔''

''کون وہ...... کوئی بھی تو نہیں اندر...... صرف نرس ہے۔''

''وہی...... وہی تو ہے اس کے پاس...... میں کیسے جاؤں۔''

''پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو تم۔ اٹھو، جاؤ اندر۔''

سمیرا کو لگا یاسر کو صحیح سلامت دیکھنے کے بعد ہی نرمین کی حالت سنبھل سکتی ہے، اس لیے زبردستی اسے بازو سے پکڑ کے اندر بھیجا اور وہ گویا قدم گھسٹتے ہوئے اندر جا رہی تھی، جب گل کو تیزی سے باہر نکلتے اور پھر اسی تیزی سے آگے نکلتے دیکھا۔

وہ اندر آئی اور اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھا۔ یاسر کی آنکھوں تک آئے بال پرے کرتے ہوئے اس کے آنسو چھلک پڑے۔

وہ اب تک بے ہوش تھا۔

اس کے ہونٹوں میں ایک بار پھر جنبش ہوئی۔

''گل......''

نرمین کا وجود ہل کے رہ گیا، وہ بے یقینی سے اسے تکنے لگی۔ اب اس کی پلکیں کھلنے کی کشمکش میں کسمسا رہی تھیں۔ لب ہل رہے تھے مگر آواز نرمین تک نہیں پہنچ رہی تھی، نرمین نے اپنے کان اس کے لبوں کے پاس کیے۔

''کیا کہا آپ نے...... کس کا نام لیا آپ نے؟'' مگر اس کے لب دوبارہ بے حرکت ہو چکے تھے، وہ اس کے گال تھپتھپانے لگی۔

''یاسر...... یاسر......''

وہ دوبارہ بے ہوشی کی وادی میں جا چکا تھا۔

''یاسر...... کچھ کہیں نا...... کہیں کہ آپ نے مجھے پکارا تھا، میرا نام لیا تھا۔ پلیز یاسر...... مجھے یقین دلائیں کہ مجھ سے سننے میں غلطی ہوئی ہے، آپ نے اس کا نام نہیں لیا۔ کہہ دیں کہ نہیں لیا۔''

پھر بے بسی سے ہنس پڑی۔

''آپ ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ آپ کو صرف مجھ سے محبت ہے، میں نے یقین نہیں کیا۔ آپ قسمیں کھاتے رہے، میں نے یقین نہیں کیا۔ آپ کہتے رہے کہ آپ اسے بھلا چکے ہیں۔ وہ آپ کی زندگی سے جا چکی ہے لیکن میں نے یقین نہیں کیا، کبھی بھی نہیں کیا اور...... اور اب...... جب میں نے یقین کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا ہی تھا تو وہ لوٹ آئی۔''

☆======☆======☆

''تم لوٹ آئے۔''

گل اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی اندھیرے صحن میں دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"مجھے ہمیشہ یہ خوش فہمی رہی یاسر کہ تم مجھے کبھی بھول نہ سکو گے اور جہاں تم نے میرے اور بہت سے بھرم توڑے، وہاں آج یہ خوش فہمی بھی ختم کر ڈالی۔"

☆======☆======☆

"توڑنے دو آج مجھے آنسوؤں کے یہ سارے بند۔"

وہ سمیرا کو ساری بات بتانے کے بعد دل ہلکا کر رہی تھی۔

"وہ تین سال جو میں نے اس رشتے کو دیئے، وہ تین سال اپنی موت پہ اتنے آنسوؤں کا حق تو رکھتے ہیں۔"

"لیکن تمہارے اور یاسر کے درمیان تو سب ٹھیک ہو گیا تھا؟"

"کچھ ٹھیک نہیں ہو سکتا ہمارے درمیان، جب تک...... جب تک ہمارے درمیان وہ ہے......اور وہ ہے سمیرا...... ابھی تک ہے...... یاسر کتنا بھی انکار کرے لیکن آج بھی اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل کے جو نام ہونٹوں تک آتا ہے، وہ گل کا ہے۔"

☆======☆======☆

"کہتے ہیں جب انسان زندگی اور موت کی دہلیز پہ کھڑا ہو تو تب اس کے ہونٹوں پہ وہی نام ہوتا ہے جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔"

گل نے تاریکی میں کچھ تلاش کرتے ہوئے سوچا۔

"اور مجھے خوشی ہے کہ دیر سے ہی سہی، تمہیں اتنا تو پتہ چلا کہ تمہیں محبت کس سے ہے۔ مجھ سے نہ سہی...... اس سے ہی سہی...... مگر محبت کے درد کو تم نے محسوس تو کیا۔ اب کم از کم اتنا تو ہو گا یاسر...... کہ کبھی بھولے سے میرے بارے میں سوچو گے تو مجھے اتنا غلط نہ سمجھو گے کیونکہ محبت کرنے والا ہی کسی محبت کرنے والے کے جذبات کو، اس کی مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہے۔"

☆======☆======☆

اگلے دن وہ ڈیوٹی پہ آئی تو یاسر کو روم میں شفٹ کیا جا چکا تھا۔ یاسر بے ہوش تھا یا شاید سو رہا تھا۔ نرمین بیڈ کے ساتھ چیئر پہ اپنا سر بیڈ پہ ٹکائے سو رہی تھی۔ نہ جانے کتنے گھنٹوں سے وہ اس پوزیشن میں لیٹی ہو گی۔ یاسر کا ہاتھ اس نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔

گل میڈیسن باکس لے کر آگے بڑھی۔ سرنج میں دوا بھری اور آہستگی سے یاسر کا ہاتھ نرمین کے ہاتھوں سے نکالنے لگی مگر ایسا کرتے ہی نرمین کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے چونک کر پہلے سامنے کھڑی گل کو دیکھا پھر گل کے ہاتھ کو جن میں یاسر کا ہاتھ دبا تھا، اس نے پاگلوں کی طرح جھپٹ کے یاسر کا ہاتھ اس سے چھینا پھر دبی آواز میں غرائی۔

"مت کرو ایسا۔"

"لیکن یہ تو ضروری ہے۔" گل نارمل انداز میں بولی۔ "آپ کے ہسبنڈ کے لیے۔"

"اس کے لیے صرف میں ضروری ہوں، یہ انہوں نے خود کہا تھا مجھ سے۔" اور اس کی غراہٹ مدھم سرگوشیوں میں ڈھل گئی۔

"پتا ہے، یاسر نے اور کیا کہا تھا۔ انہوں نے کہا تھا صرف کھانا نہیں نمو، مجھے تمہاری بہت سی باتیں پسند ہیں اور...... اور یہ کہ وہ اپنی زندگی کی کتاب کے پچھلے تمام ورق پھاڑ چکے ہیں اور...... اور...... وہ...... وہ...... صرف اور صرف میرے ہو کے رہیں گے اور یہ بھی کہ انہوں نے غلطی کی۔"

پھر اس کی سرگوشی دوبارہ غراہٹ میں بدلی اور اس نے گل کے بے تاثر چہرے کو گھور کے کہا۔

"سنا تم نے...... کیا کہا انہوں نے...... وہ غلطی تھی، غلطی۔"

گل نے ہمدردی سے اس کا کاندھا تھپتھپایا۔

"میں صرف یہ انجکشن لگانا چاہتی ہوں مسز یاسر......"

اس کے لہجے اور خاص طور پر آخری الفاظ نے نرمین کو سنبھالا دیا۔ وہ اب ٹھنڈی سی پڑ کے اسے دیکھنے لگی جو خالص پیشہ وارانہ انداز میں یاسر کو انجکشن لگا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسے مشورہ بھی دے رہی تھی۔

"میرا خیال ہے آپ کو ریسٹ کی ضرورت ہے۔ اگر اٹینڈنٹ ہی اتنا تھکا ہوا ہو گا تو پیشنٹ کا خیال کیا رکھے گا۔"

نرمین حیرت سے کبھی اسے کبھی یاسر کو دیکھ رہی تھی اور جب گل نے یاسر کے سینے پہ اسٹیتھوسکوپ رکھا تو بے چین ہو گئی۔ اس نے وحشت کے عالم میں اس کا ہاتھ یاسر کے سینے سے ہٹایا۔

"اس کے دل کی دھڑکن سننے کا حق صرف مجھے ہے، صرف مجھے۔"

گل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر کچھ بھی کہنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے سر جھٹک کے یاسر کے تکیے کو درست کرنے کے لیے اس کے کاندھے تھام کے ذرا سے اوپر کیے۔

"نرمین زور سے چلائی۔

"کیا کر رہی ہو تم۔"

گل نے اسے سراسر نظر انداز کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا اور اب گیلے ٹاول سے اس کا چہرہ صاف کرنے لگی۔ نرمین نے اس کے ہاتھ سے ٹاول چھین کے اسے زور کا دھکا دیا۔

''پلیز مسز یاسر...... مجھے میری ڈیوٹی کرنے دیں۔''

''چلی جاؤ یہاں سے، میں ہوں نا، میں کرلوں گی سب کچھ۔ یاسر میری ذمہ داری ہے، تمہاری نہیں چلی جاؤ۔''

گل چند سیکنڈ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی پھر باہر نکل گئی۔

☆======☆======☆

"Leave" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

''آپ "Leave" پہ جانا چاہ رہی ہیں سسٹر گل؟ جب کہ آپ جانتی ہیں کہ آپ محض ایک ٹرینی ہیں اور مستقل بنیادوں پہ نہیں ہیں۔ سوری! آپ کو تین ماہ تک چھٹی نہیں مل سکتی۔''

''ڈاکٹر صدیقی! میری مجبوری ہے کہ......''

''میری بھی مجبوری ہے...... رولز کے مطابق میں آپ کو تین ماہ تک ایک بھی چھٹی دینے کا اہل نہیں ہوں۔''

''تو...... تو پھر آپ میری ڈیوٹی چینج کردیں۔''

''کیا کوئی مسئلہ ہے سسٹر؟''

''جی نہیں۔'' وہ ہاتھ مسلنے لگی۔

''تو ٹھیک ہے پھر آپ جا کر اپنا کام کریں۔''

ڈاکٹر کے سخت لہجے پہ وہ چپ چاپ اٹھ گئی۔

☆======☆======☆

''مجھے ڈر لگ رہا ہے یاسر کہ آپ ہوش میں نہ آجائیں۔''

اس کے سرہانے بیٹھی نرمین آہستگی سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے لیکن کیا کروں، آپ کو کھونے سے ڈرتی ہوں۔ میں نے خود حوصلہ کر کے آپ کو خود سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ تب تک میں نے آپ کو پایا ہی نہیں تھا لیکن اب...... اب جب پایا ہے تو اتنی جلدی سے کھودوں۔ نہیں یاسر...... میری زندگی میں آپ کی محبت صرف چند پل کے لیے نہیں ہوگی۔ میں ہمیشہ آپ کو......''

یاسر کی پلکوں کی جنبش پہ نرمین نے ڈرے ڈرے انداز میں اسے دیکھا، وہ اب سر کو دائیں بائیں خفیف سی حرکت دینے لگا۔

''اب...... اب آپ اسے دیکھ لو گے، اس کے ہو جاؤ گے۔ چھوڑ دو گے مجھے، چلے جاؤ گے اس کے پاس۔''

یاسر کی آنکھیں کھلیں تو وہ اس کے سرہانے کھڑی خوف زدہ انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔

☆======☆======☆

''اب آپ کیوں پریشان ہیں مسز یاسر! آپ کے ہسبنڈ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ ایک دو دن میں آپ انہیں گھر لے جاسکتی ہیں۔''

ڈاکٹر کے تسلی دینے پہ بھی نرمین کے چہرے کا وہ خوف نہ گیا۔ یاسر نے دھیرے سے اس کا ہاتھ سہلایا اور مسکرایا۔

''آپ لکی ہیں مسٹر یاسر! جو آپ کو اتنی کیئرنگ اور محبت کرنے والی وائف ملی ہیں۔''

خوش مزاج اور نوجوان ڈاکٹر نے کہا تو یاسر نے دوبارہ نرمین کو مسکرا کے دیکھا۔ اس بار نرمین نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیا۔

''میں سسٹر کو ان کا ڈائٹ چارٹ دے کر بھیجتا ہوں۔''

ڈاکٹر جاتے جاتے وہ کہہ گیا کہ نرمین کے چہرے کی مسکراہٹ نوچ کر خوف سجا گیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے دروازے کی جانب دیکھنے لگی، جیسے وہاں سے قیامت نے آنا ہو۔

''کیوں پریشان ہو اب، میں ٹھیک ہوں۔ سنا نہیں ڈاکٹر نے کیا کہا۔ تم اب مجھے گھر لے جاسکتی ہو۔''

''گھر...... آپ میرے ساتھ گھر جائیں گے؟''

''ہمارے گھر......؟''

''ہاں اب ہی تو وہ گھر کہلائے گا، پہلے تو وہ صرف ایک ٹھکانہ تھا۔''

''یعنی آپ کو کچھ پتہ نہیں، کچھ یاد نہیں۔''

اسے تسلی ہوئی کہ نیم بے ہوشی کے عالم میں گل سے ہوا آمنا سامنا اس کے حافظے پر نہیں ہے۔

''سب یاد ہے مجھے۔'' وہ شرمندگی سے گویا ہوا۔

''سب کچھ...... کس طرح میں نے یہ فضول اور بزدلانہ حرکت کر کے تمہیں پریشان کیا تھا۔ کیا کیا نمو...... تم مجھ سے الگ ہو رہی تھیں۔ میں کس طرح برداشت کرتا، میں نہیں رہ سکتا

تمہارے بغیر۔“

زمین آنسو بھری آنکھوں سے مسکرائی۔

”لیکن میں ایسا نہ کرتا تو مجھے پتہ کیسے چلتا کہ تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو۔“

”ایک اور بھی طریقہ تھا جاننے کا۔“

”وہ کیا؟“

”مجھ سے پوچھ لیتے۔“

اور ہاسپٹل کا روم دونوں کی کھلکھلاہٹ سے گونج اٹھا۔

”ایسا لگ رہا ہے سالوں کی قید کے بعد آزاد ہوا ہوں۔“

وہ یاسر کو وہیل چیئر پہ لیے ڈاکٹر کی ہدایت پہ ہاسپٹل کے لان میں لائی تھی۔تازہ کھلانے۔

”حالانکہ صرف تین دن ہی تو گزارے ہیں اس کمرے میں۔“

”تین دن...... یہ صرف تین دن نہیں تھے یاسر! یہ تین آریاں تھیں، جو مجھے بل بل کاٹتی رہیں۔“

”بھول جاؤ سب کچھ......اب تو گزر گیا جو وقت گزرنا تھا۔“

وہ اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے آج ہی اس سے محبت ہوئی ہو۔

دل نوعمری کی پہلی پہلی محبت کے خمار سے خوابیدہ ہو رہا تھا۔

وہ چلتے چلتے رک گئی تھی اور کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔

”لگتا یہی ہے مگر پلٹ کے دیکھو تو کبھی کبھی وقت وہیں کا وہیں کھڑا ہوتا ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔“ وہ دلکشی سے مسکرایا۔

اور ایسی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ زمین نے سالوں بعد دیکھی تھی۔

”تو ٹھیک ہے، ہم کبھی پلٹ کے دیکھیں گے ہی نہیں۔“

زمین مسکرا کے اس کی وہیل چیئر پھر سے آگے بڑھانے لگی۔

”تم تو بچوں کی طرح میرا خیال رکھ رہی ہو، مجھے تو لگتا ہے جیسے تم میرا خیال نہیں رکھ رہی، میری حفاظت کر رہی ہو کہ میں کہیں بھاگ نہ جاؤں۔“

”کیا مطلب؟“

وہ یکا یک گھبرا اٹھی۔

”کتنا کہا ہے میں نے کہ میں چل سکتا ہوں مگر تمہاری ضد...... مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ میں وہیل چیئر پہ ہوں اور تم......“

”لیکن مجھے تو اچھا لگ رہا ہے آپ کو اپنے اشاروں پہ چلاتے ہوئے۔“

وہ خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

”بس تم ہنستی رہو، میں ساری زندگی تمہارے اشاروں پہ چلوں گا بلکہ ناچوں گا۔“

”وعدہ......؟“

وہ سامنے آئی اور اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلایا۔

اسی وقت زمین کے عقب میں ہاسپٹل کی سٹاف وین آ کے رکی۔ دروازہ کھلا اور یونیفارم میں ملبوس گل نیچے اتری۔

”وعدہ۔“

یاسر نے اپنا ہاتھ اس کی ہتھیلی پہ رکھنے کو آگے بڑھایا اور ساکت ہو گیا۔

وہ گل تھی یا اس کا واہمہ۔

وہ فیصلہ نہ کر پا رہا تھا۔

زمین نے اس کی نظروں کے تعاقب میں مڑ کے دیکھا۔گل وین سے اترتے ہوئے ساکت ہو چکی تھی۔ یاسر اپنا ہاتھ زمین کی جانب بڑھاتے بڑھاتے منجمد ہو چکا تھا اور حیران......دو بے جان مجسموں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا، زمین کا۔

☆======☆======☆

بہت ہی گریزاں۔

بہت ہی نادم۔

نہ جانے کس بات پر ایک دوسرے سے نظر چراتے وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے۔

بے حد سست ہاتھوں سے زمین نے لاک کھولا اور اندر داخل ہوئی۔ دو قدم آگے بڑھانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ اندر داخل ہونے والی وہ اکیلی ہے۔ اس نے مڑ کے دیکھا، یاسر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا دہلیز پہ خالی خالی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

زمین کے لب اسے پکارنے کے لیے ذرا سے وا ہوئے لیکن نہ جانے کون سی بات تھی جو دونوں کو ایک دوسرے سے مخاطب ہونے سے تو کجا...... ایک دوسرے کی جانب دیکھنے سے بھی گریز کرنے پہ مجبور کر رہی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی باسکٹ ذرا زور سے زمین پہ رکھی۔ ہسپتال میں لے کر گئے برتن آواز کے ساتھ کھنکے اور یاسر چونک کر سامنے دیکھنے لگا......

ایسی اجنبی نظروں سے...... جیسے یہ کسی اور کا گھر ہو...... جس کے دروازے پہ وہ بھول کے آ گیا ہو۔

جیسے سامنے نرمین نہیں کوئی اجنبی کھڑا ہو جسے پہچاننے کی وہ کوشش کر رہا ہو۔

اس کی حالت دیکھ کے نرمین کو ترس سا آ گیا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کے اسے اندر تک لائی...... جیسے میلے میں کھوئے کسی بچے کو کوئی مہربان دلاسا دینے کے لیے تھام لے...... اسے صوفے پہ بٹھانے کے بعد نرمین نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا...... وہ دیوار پہ نظریں جمائے ہوئے تھا...... خالی کھنڈر...... ویران...... وحشت زدہ نظریں۔

نرمین کا دل دہل کے رہ گیا۔

وہ کپکپاتی انگلیوں سے اس کے بال ماتھے سے ہٹاتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کچھ کھائیں گے؟''

وہ چپ تھا...... جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

کچھ سیکنڈ تک اس کے جواب کا انتظار کرنے کے بعد وہ مایوس ہو کر کچن کی جانب مڑ گئی۔ فریج سے اس کے لیے جوس بنانے کی خاطر سیب نکالے اور پھر ضبط کھو دینے پہ رو پڑی۔

اس کی سسکیاں باہر بت کی طرح بنے بیٹھے یاسر تک پہنچیں اور اس میں روح پھونک گئیں۔ وہ کچن کی جانب دیکھنے لگا اور اس کی سسکیاں اور ہچکیاں سن کر اس کے اندر دکھ، پچھتاوے اور ندامت کے رنگ گہرے ہونے لگے۔ وہ کسی معمول کی طرح کچن کی جانب کھنچتا چلا گیا۔

وہ دونوں ہاتھ کاؤنٹر پہ رکھے ہچکیاں لے رہی تھی اور اس کے آنسو اس کے ہاتھوں پہ گر رہے تھے...... یاسر نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کے محبت سے اس کا رخ اپنی جانب کیا اور بساط بھر نارمل نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''بہت بھوک لگی ہے...... رونے دھونے کا پروگرام اور چلے گا...... یا کچھ کھانے کو بھی ملے گا؟''

نرمین نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا...... وہ مسکرا رہا تھا...... اگرچہ اس کی مسکراہٹ بہت بے جان اور بجھی بجھی سی تھی...... لیکن نرمین کے ڈوبتے دل کو سہارا سا ہوا اور وہ مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلا کے سیب کاٹنے لگی۔

''صرف جوس پہ گزارا کرنا ہو گا؟'' بات برائے بات کی غرض سے وہ بولا۔

''جو کہیں گے، وہ بنا دیتی ہوں۔''

وہ مستعد ہو گئی۔ آخر اتنے دنوں بعد وہ گھر لوٹا تھا۔ ہسپتال کے بدمزہ پھیکے...... بدرنگ اور پرہیزی کھانے کھا کھا کے تنگ آ چکا ہو گا۔

''کھچڑی...... دلیہ اور ساگودانہ کے علاوہ کچھ بھی بنا دو۔''

''نہیں...... اب ان کی ضرورت بھی نہیں۔ ڈاکٹر نے آپ کا ڈائٹ چارٹ دیا ہے صرف مرغن اور تلی ہوئی چیزوں سے پرہیز بتایا ہے باقی سب کھا سکتے ہیں۔ کچھ بھی ایسا جو زود ہضم ہو۔''

''اور اگر میرا جی مرغن اور تلی ہوئی چیزوں کو ہی چاہ رہا ہو۔'' وہ شرارت سے بولا تو نرمین آنسوؤں سے دھلی آنکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

''ضروری تو نہیں...... کہ آپ کو وہی ملے جو آپ کا دل چاہے۔'' سادہ سے انداز میں کہی اس بے ضرر سی بات میں جانے کیا تھا جو یاسر کا مسکراتا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا۔

نرمین بھی کہہ کے پچھتائی...... اور سہم کے اس کے چہرے پہ کوندتی زردی کو دیکھنے لگی۔

''ایسا کرو پلاؤ بنا دو...... سبزی پلاؤ...... ساتھ میں مرغی کا شوربا اور پودینے کا رائتہ۔''

اس بار بھی اس نے ہمت کر کے خود ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔

''ٹھیک ہے ناں...... اچھا خاصا شریف سا کھانا ہے بلکہ مسکین سا۔''

''ہوں۔'' نرمین نے گردن ہلائی اور فریزر سے گوشت کا پیکٹ نکالا...... مڑی تو وہ وہیں اسٹول پہ ٹکا تھا۔

''آپ اندر جا کے آرام کریں ناں۔''

''نہیں، میں اندر نہیں جاؤں گا۔'' وہ واضح طور پہ گھبرایا ہوا نظر آیا۔

''یہاں گرمی ہے اور ابھی ڈاکٹر نے آپ کو زیادہ سے زیادہ بیڈ ریسٹ بتایا ہے۔''

''نہیں...... بعد میں ہوتا رہے گا بیڈ ریسٹ...... جب تم فارغ ہو جاؤ گی...... میں اکیلا اندر نہیں جاؤں گا۔''

نرمین نے حیرت سے اسے دیکھا...... وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح خوف زدہ اور سہما ہوا لگ رہا تھا جو ماں کا آنچل مضبوطی سے تھام کے گڑگڑا رہا ہو۔ اس سے کمرے میں اکیلے نہ رہنے کی التجا کر رہا ہو۔

''اکیلے...... اچھا بور ہونے کے خیال سے کہہ رہے ہیں، ٹی وی آن کر لیں...... میں درمیان میں چکر لگاتی رہوں گی۔''

"میں نے کہا ناں...... میں ایک منٹ کے لیے بھی اکیلا نہیں رہوں گا۔"

"اوکے......اوکے۔" اس کے جارحانہ تیور دیکھ کے وہ گھبرا سی گئی۔ "میں تو گرمی اور آپ کے آرام کے خیال سے...... ٹھیک ہے بیٹھے رہیے۔"

وہ بظاہر کھانا بنانے میں مگن ہوگئی...... مگر گاہے بہ گاہے دزدیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو جوس کا گلاس تھامے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا...... زبردستی کچن کے مختلف سامان میں دلچسپی ڈھونڈ رہا تھا۔ کبھی نمک دانی کو اٹھا کے دیکھنے لگتا...... کبھی دراز میں چمچے اور کانٹے گننے لگتا۔

"لیجیے...... ہوگیا، اب چلیں اندر۔"

پسینہ پسینہ ہوتے اس نے یاسر کو مخاطب کیا۔ وہ دسترخوان کے ڈیزائن کا جائزہ لینے میں بری طرح مصروف تھا۔

"یاسر!" وہ ذرا قریب ہو کر قدرے اونچی آواز میں بولی تو وہ ہڑبڑا گیا اور کچھ خفگی سے اسے دیکھنے لگا جیسے اس کا مخل ہونا بری طرح کھلا ہو۔

"اندر چلیں...... میں شاور لے لوں۔" پھر اسے کسی بچے کی مانند وہ اس کا ہاتھ تھام کے اندر لے جانے لگی۔

شاور لے کر...... ہلکا پھلکا لان کا سوٹ پہن کے جب وہ گیلے بال جھٹکتی کمرے میں داخل ہوئی تو وہ ہنوز اسی انداز میں بیٹھا تھا جیسے وہ اسے بٹھا کے گئی تھی۔ چہرے پہ پھر سے زردی اور آنکھوں پہ وحشت کا راج تھا۔

وہ پھر سے انتہا درجے کا بیگانہ لگ رہا تھا...... اب نرمین کی سمجھ میں آیا، وہ تنہا ہونے سے ڈر کیوں رہا تھا، وہ کیوں نرمین کی پہرے داری چاہتا تھا۔

نرمین نے کچھ پوچھے بنا، کچھ کہے بنا اس کا ہاتھ تھاما اور ڈائننگ ٹیبل تک لے گئی۔

چند ایک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ پھر سے یاسر کو نارمل کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اب وہ چپ تھی اور وہ بول رہا تھا۔ لایعنی باتیں بلاوجہ کے قہقہے اِدھر اُدھر کے بے تکے قصے۔

وہ اس کی پلیٹ میں جو بھی ڈالتی تھی۔ جتنا بھی ڈالتی تھی۔ وہ بغیر ٹوکے کھاتا جارہا تھا۔ ورنہ وہ نہ شوربے والے سالن پسند کرتا تھا، نہ اتنے نرم پکے ہوئے چاول اسے بھاتے تھے مگر بغیر کسی اعتراض کے وہ نرمین کی دوسری بار بھری پلیٹ بھی مزے لے لے کر کھاتے ہوئے...... مسلسل بول رہا تھا اور نرمین کے دل سے غبار چھٹتا جارہا تھا۔

"میں کسٹرڈ لے کر آتی ہوں۔"

وہ اٹھی اور اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی یاسر کے چہرے کا منظر بھی بدل گیا۔

اس نے ہاتھ میں پکڑا بھرا ہوا چمچہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور منہ میں ڈالے نوالے کو بے چبانے لگا جیسے چباتے ہوئے بہت تکلیف ہورہی ہو...... یا حلق سے اتارنے میں کانٹے بھ رہے ہوں...... یہ اذیت اس کے چہرے کے ایک ایک نقش سے واضح تھی۔

نرمین ہاتھ میں پیالہ لے کر کچن سے نکلی تو یاسر کی حالت دیکھ کے ٹھٹک کے رک گئی...... ں کی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلی ہورہی تھیں۔ وہ بہت اذیت کے عالم میں منہ کے نوالے و نگلنے کی ناکام سی کوشش کر رہا تھا پھر اس نے گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ بھرا اور ساتھ ہی ارا پانی منہ سے باہر دور تک جا گرا...... اس کے منہ سے نکلے ادھ چبائے چاول کے دانے بل پر جگہ جگہ بکھرے تھے...... وہ پلیٹ پرے سرکاتا اٹھ کے تیزی سے کمرے کی جانب ھاگا...... اور اسی تیزی سے نرمین اس کے پیچھے لپکی مگر کمرے سے آتی آوازوں نے اس کے دم ٹیبل تک روک دیئے۔ وہ کسٹرڈ کا پیالہ ٹیبل پر رکھ کے تشویش سے ان آوازوں کو سننے گی۔ وہ الٹی کر رہا تھا۔

گل ایک کاغذ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔

اس کے آنسو ان حرفوں کو بھگو کے دھندلا نہ کر دیں...... اس لیے وہ بار بار ہاتھ روک کر آنکھوں سے ٹپکتے آنسو ہتھیلی سے صاف کر کے نیچے گرنے سے بچالیتی۔

کاغذ تہہ کر کے اس نے ایک لفافے میں ڈالا۔

"میں تم سے بچ کر کہاں جاؤں یاسر...... اور کب تک بچوں...... کب تک بھاگوں۔ ایک وقت تھا جب میں تمہارے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ وہ میری محبت تھی اور آج میں تم سے بھاگ رہی ہوں...... یہ بھی میری محبت ہے لیکن تم نہیں سمجھو گے۔ تم کبھی نہیں سمجھو گے...... نہ تم نے تب سمجھا تھا...... نہ اب سمجھو گے۔"

اب وہ لفافے کو آنسوؤں سے گیلا ہونے سے بچا نہ سکی۔ دوپٹے سے خشک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بری طرح چونکی۔ اندر کمرے میں کسی برتن کے زور سے گرنے کی آواز آئی تھی۔ وہ اٹھ کے ننگے پیر اندر بھاگی۔

☆======☆======☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب یاسر آنکھ موندے رکھنے کی ایکٹنگ کرتے کرتے تھک سا گیا۔ اس نے پلکوں کی جھری سے ساتھ لیٹی نرمین کو دیکھا...... وہ سو رہی تھی۔

وہ چپکے سے اٹھا اور ننگے پیر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے نکلنے کے اگلے ہی سیکنڈ نرمین کی آنکھیں بھی کھلیں۔ شاید وہ بھی سوتے رہنے کی اداکاری کرتے کرتے اوب گئی تھی......
یاسر کے پیچھے نکلی جو ٹیرس پہ کھڑا ہو کر سگریٹ سلگا رہا تھا...... وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ پیچھے کھڑی ہو کر اس کے چہرے کی ان تمام درزوں کو گننے لگی جو اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھیں اور جو اس وقت آدھے رخ پہ نظر آتے اس کے چہرے کے ایک حصے سے بھی مکمل واضح ہو رہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد یاسر کو اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ مڑا اور اسے دیکھ کے مسکرانے کی کوشش کی۔

دراڑیں اس مسکراہٹ سے بھرنے کے بجائے کچھ اور بھی تڑخ گئیں۔

''ارے تم...... میں آ رہا تھا بس ذرا ایک سگریٹ......''

''کس کو دھوکا دے رہے ہیں آپ!'' وہ حد درجہ سنجیدہ تھی۔ تنگ آ گئی تھی چند گھنٹوں کی اس لکن میٹی سے۔ ''مجھے...... یا اپنے آپ کو؟''

''نرمین۔'' وہ حیرت کے مارے اس سے زیادہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

وہ پاس آتے ہوئے ایک اپنائیت بھرے دکھ سے کہنے لگی۔ ''کیوں اپنے دل کی حالت مجھ سے چھپا رہے ہیں...... کیوں اپنے ساتھ یہ ظلم کر رہے ہیں...... ہنسنے کو دل نہیں چاہتا تو کیوں ہنستے ہیں آپ......''

پھر اس کی شرٹ کا کالر دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے احتجاجاً چلائی۔ ''میرے ساتھ رہنے کو جی نہیں چاہتا تو کیوں رہ رہے ہیں؟''

''محبت کرتا ہوں تم سے...... اس لیے۔'' وہ اس کے ہاتھوں سے نرمی کے ساتھ کالر چھڑا کے اتنی ہی نرمی سے بولا۔

''نہیں، ڈرتے ہیں آپ مجھ سے...... مجھے دکھ دینے سے ڈرتے ہیں۔''

''دکھ دینے سے ڈر بھی اس کو لگتا ہے نمو! جو محبت کرتا ہے۔''

''نہیں، جھوٹ مت بولیں یاسر! اب ایک بھی جھوٹ نہ بولیں...... اتنے سالوں سے آپ مجھے جھوٹ پہ جھوٹ بول کے بہلا رہے ہیں۔ ان کچے کھلونوں سے اب اور نہیں بہل سکتی میں...... ایک سچ تو بول دیں یاسر...... صرف ایک سچ۔''

''یہ سچ ہے نرمین! کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔''

''ہاں، وہ اپنے وقت کا سچ تھا۔ اس وقت آپ نے مجھ سے محبت کی تھی......

وقت...... وہ محبت اور آپ...... سب سچے تھے لیکن یاسر! یہ بھی ایک سچ ہے کہ وہ وقت گزر گیا، مر گیا۔''

''محبت کبھی نہیں مرتی نمو۔''

''مرتی ہے...... محبت مرتی ہے یاسر......! فنا صرف ایک چیز نہیں ہوتی۔ اور وہ ہے عشق...... کیا آپ کو مجھ سے عشق ہے؟''

یاسر کے پاس کوئی جواب نہ تھا...... وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا، اس کے ہاتھوں میں نرمین کے ہاتھ کسی بے جان چیز کی طرح چھوٹے...... اس نے اپنے خالی ہاتھوں کو دیکھا...... خالی ذہن کی بے بسی کو محسوس کیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کے تیزی سے پلٹا اور وہاں سے چلا گیا۔

''آپ صرف اس سے عشق کرتے ہیں یاسر۔'' وہ روتے روتے چلا رہی تھی۔

''مان کیوں نہیں لیتے یہ بات...... عشق کرتے ہیں آپ اس سے...... عشق۔''

☆======☆======☆

اگلی صبح پھر سے حیران کن تھی...... دونوں کے لیے...... دونوں نے شاید ایک دوسرے کو مسلسل حیران کر دینے کی قسم کھا رکھی تھی۔

ایک دوسرے کے سامنے ٹوٹتے تھے...... چٹختے تھے...... بکھرتے تھے...... پھر سمٹ کر دکھاتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہ بڑے پُرسکون انداز میں بغیر اس کے کہے دوا کھا رہا تھا۔ نرمین نے ایک استری کیا ہوا سوٹ اس کے سامنے کیا۔

''یہ ٹھیک رہے گا، آپ اچھے لگتے ہیں اس میں؟''

''کہاں جا رہے ہیں ہم؟''

''ہم نہیں...... صرف آپ......''

''مگر کہاں؟ ڈاکٹر کے پاس...... چیک اَپ کے لیے؟''

''نہیں، گل سے ملنے۔''

''کیا......؟'' اس کا سارا اطمینان...... سارا سکون بھک سے اُڑ گیا۔ ''میں اس سے ملنا نہیں چاہتا۔'' وہ گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ جو چاہتے ہیں...... ہمیشہ وہی نہیں کرتے۔'' وہ نرمی سے کہتے اس کے کاندھے پہ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کے اسے بٹھا رہی تھی۔ ''اور جو نہیں چاہتے ہمیشہ وہی کر ڈالتے

ہین...... کبھی تو اپنے دل کی مانیں یاسر۔''

''اس نے مجھے آج تک بے سکونی کے علاوہ دیا ہی کیا ہے؟''

''اور آپ نے بھی دل کو بے سکونی کے علاوہ دیا ہی کیا ہے...... آپ ہی پہل کر ڈالیں اسے پُرسکون کرنے کی...... جائیں...... اس سے ملیں، دے لیں سکون اپنے سالوں سے بے چین دل کو۔'' اس کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے بھرا گئی۔

یاسر بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں کے شیشے کے اس پار بہت سے بادل تھے۔ بوندوں سے بھرے، کسی بھی لمحے چھلک کر برس جانے کو تیار مگر وہ مسکرا رہی تھی۔

''جائیں یاسر۔''

''لیکن تم۔'' وہ ہچکچا گیا۔

''میں نے آپ سے کہا تھا ناں یاسر...... کہ ادھورے نہ آپ میرے کسی کام کے...... نہ گل کے...... آپ کا جسم میرے پاس ہے اور روح اس کے پاس...... جایئے خود کو مکمل کر لیں یاسر......! یقین کریں اپنے پاس آپ کا ادھورا وجود رکھ لینے سے جتنا دکھ مجھے ملے گا، اتنی ہی خوشی آپ کو اس کے ساتھ پورا دیکھ کے ملے گی۔''

یاسر نے اس کے ہاتھ تھامے...... کچھ کہنے کی کوشش کی مگر الفاظ کا کشکول خالی تھا۔ ہاں آنسوؤں کا لبالب بھرا تھا...... اس نے روتے ہوئے نرمین کے ہاتھ چوم لیے۔

☆======☆======☆

وہ وحشت کے عالم میں ڈرائیو کر رہا تھا...... شاید کوئی معجزہ ہی تھا جو اس سے کوئی ایکسیڈنٹ نہ ہوا گاڑی لاک کیے بغیر وہ باہر نکلا اور ہسپتال کی بلڈنگ میں بھاگتے ہوئے داخل ہوا...... اس کی افراتفری اور ہراساں انداز دیکھ کے بہت سے لوگ ٹھٹکے۔

''چہ چہ...... بے چارہ شاید اس کا کوئی عزیز بہت سیریس ہے۔'' وہ پاگلوں کی طرح ایک ایک وارڈ میں اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ ایک ایک چپہ چھان مارا ہسپتال کا...... مگر وہ نہ ملی تب جا کے اسے ریسپشن سے پتا کرنے کا خیال آیا۔

''سسٹر! مجھے گل سے ملنا ہے؟'' وہ بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔

''گل؟''

''نرس ہیں گل ناز...... دو دن پہلے ان کی میرے روم میں...... میرا مطلب ہے۔ روم نمبر سیون میں ڈیوٹی تھی۔''

کچھ دیر تک ریسپشنسٹ رجسٹر چیک کرتی رہی اور یہ چند سیکنڈ اسے سخت گراں

زرے۔

''جی...... اس نے تو ریزائن کر دیا ہے۔''

اور بالآخر اس نے جو جواب دیا، وہ یاسر کے پیروں تلے زمین کھسکانے کے لیے کافی ا۔

☆======☆======☆

نرمین بیڈ پہ بیٹھی تھی...... یاسر زمین پہ اور اس کی گود میں سر رکھ کے اونچی آواز میں رو رہا ا۔

''میں نے اسے کھو دیا نمو......! میں نے اسے پھر سے کھو دیا۔''

''ہم اسے ڈھونڈ لیں گے یاسر...... مل کے ڈھونڈیں گے۔ وہ مل جائے گی یاسر۔''

نرمین نے اس کے بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے تسلی دی۔ یاسر کا بچوں ں طرح دھاڑیں مار کے رونا اس کا دل چیرے دے رہا تھا۔ بس نہ چل رہا تھا کہ کہیں سے ل کو لا کے اس کے سامنے کھڑا کر دے۔

''نہیں ملے گی...... میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے ملنے کے لیے نہیں بنی...... میں اسے ھونے کے لیے بنا ہوں۔ بار بار کھو دیتا ہوں۔''

''اگر وہ آپ سے محبت کرتی ہے تو ضرور آئے گی آپ کے پاس۔''

''کیوں آئے گی؟ میں نے کیا دیا ہے اسے......؟ اس نے میری خاطر اپنے آپ کو داؤ لگا دیا...... ایک بار نہیں، بار بار انگاروں پہ چلی۔ ایک بار اپنی محبت ثابت کرنے کے لیے اور سری بار اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے لیکن نمو! میں نے نہ اس کی محبت پہ اعتبار کیا نہ سچائی ...... پتا ہے اس نے تمہارے ابا سے شادی کے بعد مجھے بھلا کر سچے دل سے ایک پاکباز وی بننے کا فیصلہ کیا تھا مگر میں نے اس سے یہ موقع بھی چھین لیا...... میری بے اعتباری نے ے چھت سے بھی محروم کر دیا...... در بدر کر دیا نمو! اسے در بدر کر دیا۔''

''اسی کی سزا خود کو دینے کے لیے تو آپ بھی سالوں سے در بدر پھر رہے ہیں۔ وہ اکیلی ہیں یاسر...... آپ بھی تو انگاروں پہ چلے ہیں...... میں گواہ ہوں آپ کے شب و روز کی...... ھالے صرف اس کے پیروں پہ نہیں ہیں...... میں بتاؤں گی اسے۔''

''وہ ملے گی تب ناں...... میں جانتا ہوں، وہ مجھے نہیں ملے گی...... میں اسے پانے کے اہل نہیں ہوں...... میری سزا اتنی جلدی ختم نہیں ہو سکتی...... نہیں ہو سکتی۔''

وہ روتا رہا...... سسکتا رہا۔

اور نرمین اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی کچھ سوچتی رہی۔

☆======☆======☆

''تمہارے ایک جاننے والے ڈاکٹر ہیں اس ہسپتال میں، تم نے بتایا تھا۔'' وہ سمیرا سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں مگر...... خیریت؟''

''مجھے کسی کے بارے میں معلومات لینا ہیں۔''

''معلومات...... مگر کس کے بارے میں؟''

''ایک نرس جو یاسر کے روم میں اپائنٹ تھی...... تمہیں یاد ہوگا۔''

''وہ اداس آنکھوں والی پُراسراری جو اچانک دوسرے دن غائب ہوگئی؟''

''ہاں...... وہی اس نے ریزائن دے دیا ہے اور ہسپتال کا عملہ اس کا ایڈریس بتانے پہ تیار نہیں...... تمہارے جاننے والے ڈاکٹر اگر کوشش کریں تو اس کا پتا مل سکتا ہے...... پلیز تم ان سے کہو۔''

''کہہ تو دوں مگر نرمین......! بات تو بتاؤ...... کیا اس نے کچھ چرا لیا ہے؟''

''ہاں...... شاید۔'' وہ یاسیت سے مسکرائی۔ ''یا پتا نہیں اس نے ہمارا کچھ چرایا ہے یا ہم نے اس کا۔''

سمیرا اسے غور سے دیکھتی اس کی عجیب سی بات کا مطلب نکالتی رہی۔

☆======☆======☆

وہ کمرہ بند کیے اندھیرے میں اوندھے منہ بستر پر گرا پڑا تھا۔ نہ جانے کب سے، کتنے گھنٹوں سے۔

نرمین گھر پہ نہیں تھی جو اس کے منٹ منٹ کا حساب رکھتی۔ جو اسے بار بار دیوانگی کی سرحد سے ہوش کی حدود تک کھینچ کر لاتی۔ اس لیے وہ آزادانہ ماتم کر رہا تھا۔

اس کے آنسو گر گر کے خشک ہو چکے تھے۔

اور ان کی خشکی اس کے پپوٹوں...... آنکھوں اور رخساروں کی جلد کو اکڑا چکی تھی۔

☆======☆======☆

نرمین ہاتھ میں چٹ پکڑے محلہ سرداراں کی ان تنگ و تاریک گلیوں میں کب سے بھٹک رہی تھی۔

محلہ تھا کہ بھول بھلیاں۔

بار بار راستہ بھٹک کے وہ اس عجیب سی گلی میں آنکلتی...... لمبی سی باریک بل کھاتی ہوئی۔

اور اس گلی کے دونوں طرف بنے درجنوں لکڑی کے کواڑوں والے دروازوں میں سے سی پر بھی نمبر درج نہ تھا...... اسے ہر دروازے پہ دستک دے کر پوچھنا پڑ رہا تھا...... اور وہ یہ م دو بار کر چکی تھی۔ اس لیے جب تیسری بار گھوم گھما کے اسی گلی میں آنکلی تو مایوسی سے سر ک کے واپس مڑنے لگی۔

ایک پندرہ سولہ سال کے ہوشیار سی شکل والے لڑکے کو سامنے سے آتا دیکھ کے اس نے ے رکنے کا اشارہ کیا۔

''جی باجی!'' وہ جھٹ سائیکل سے اترا۔

''یہ پتا بتا سکتے ہو؟''

''ادھر کا ہی ہے جی۔''

''وہ تو میں جانتی ہوں مگر گھر مل نہیں رہا۔''

''لو...... باجی...... سامنے ہی تو کھڑی ہو، نرس کا پتا ہے ناں؟''

''ہاں...... ہاں تم جانتے ہو اسے؟'' وہ بے تابی سے پوچھنے لگی۔

''یہ سبز دروازہ ہے جی...... جس میں موریاں ہی موریاں (سوراخ) ہیں۔''

''یہ...... مگر میں نے پوچھا تھا...... یہ تو گیارہ نمبر نہیں ہے۔''

''اس کے پیچھے ہے باجی...... اسی دروازے سے نکلتا ہے راستہ...... ویسے گھوم کے ھے راستے سے جاؤ تو چار گلیاں آتی ہیں درمیان میں اور وہ راستہ ویسے بھی بند ہے۔ یانے والے کا چاچا مر گیا ہے...... اس نے تمبو قنات لگا کے راستہ بند کیا ہے۔''

''ہاں...... وہ میں نے دیکھا تھا۔''

اسے یاد آ گیا کہ ایک گلی میں وہ اسی وجہ سے داخل نہ ہو سکی تھی...... اور وہ راستہ خاصا فا۔ دوبارہ جانے کی ہمت نہ تھی اور نہ ہی فائدہ، راستہ تو بند تھا۔

''ادھر کھڑکاؤ کنڈا...... وہ جو سوکھے منہ والی مائی نکلے گی۔ اسے منہ نہ لگانا۔ اسے عادت بک بک کرنے کی...... اس کے باپ کا گھر نہیں ہے۔ آپ بھی کرائے دار ہی ہے جی ...مگر ٹھکہ ایسا جماتی ہے جیسے جاگیردارنی ہو...... اسے پراں دھکا دے کر آپ سیدھے جانا...... تنگ ڈیوڑھی سے پوڑیاں (سیڑھیاں) اوپر جاتی ہیں...... چڑھ جانا وہی پوڑیاں ایک اور ڈیوڑھی میں اتریں گی۔ وہ آٹھ نمبر گلی ہے، اس میں ہے گیارہ نمبر گھر۔ نرس نخرے ہا۔''

بہت کوفت سے اس کے منہ سے تفصیل سنتے سنتے بالآخر زمین مسکرادی نرس نخرے والی کے ذکر پہ۔

کچھ دیر بعد وہ گیارہ نمبر تنگ و تاریک سے کوٹھڑی نما مکان کے چندفٹ کے دروازے پہ دستک دے رہی تھی...... دروازہ کھلا اور گل سامنے تھی۔

دونوں چند لمحے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھ کے بت سی بن گئیں۔

گل اس لیے کہ اسے زمین کے یہاں تک پہنچ جانے کی توقع ہرگز نہیں تھی۔

اور زمین...... اس لیے کہ وہ یہاں تک آ تو گئی تھی...... مگر اب اس سے کہنا کیا تھا...... یہ وہ نہیں جانتی تھی۔

☆======☆======☆

زمین مکان کے چندگز کے رقبے والے صحن میں کھڑی تھی۔

اکھڑی اینٹوں والا صحن۔

جس کے سامنے برآمدہ۔

اور برآمدے کے پیچھے گھر کا اکلوتا کمرہ...... اور باورچی خانہ نظر آ رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ آدھا بھڑا ہوا تھا...... مگر برآمدے اور کچن کی حالت دیکھ کے کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ گھر کو خالی کیا جا رہا ہے۔ بستر باندھ کے رکھے گئے تھے۔ ایک لوہے کا ٹرنک تالا لگا کے صحن میں رکھا گیا تھا۔ گتے کے کچھ بند کارٹن...... ایک بڑے سے ٹوکرے میں برتن۔

''تو جا رہی ہیں آپ؟''

''ہاں تمہارے کہنے سے پہلے ہی۔'' وہ مسکرائی۔

''لیکن میں تو یہ نہیں چاہتی کہ آپ کہیں جائیں۔''

''یاسر کے ساتھ رہ رہ کے تمہیں بھی جھوٹ بولنا آ گیا؟ تم بھی یہ سیکھ گئیں کہ کیسے دل کی بات کو چھپایا جاتا ہے؟''

''بہت کچھ جانتی ہیں آپ یاسر کے بارے میں؟''

''ہاں...... سب کچھ۔'' وہ الگنی سے ڈھلے کپڑے اتارنے لگی۔

''یہ بھی...... کہ وہ آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''ہاں......'' گل نے ایک بڑی چادر چارپائی پہ کھول کے بچھائی اور کپڑے اس میں رکھ کے گٹھڑی باندھنے لگی۔

''اور یہ بھی...... کہ وہ میرے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔''

زمین آگے بڑھی اور گٹھڑی کو گرہ لگاتے اس کے ہاتھ تھام کے منت کرنے لگی۔

''پلیز...... پلیز...... مت جائیں آپ کے ایک بار جانے سے ہی یاسر نے اپنی آدھی موت دیکھ لی تھی۔ اب دوسری بار کا جانا وہ برداشت نہیں کر پائیں گے۔''

''لیکن میں اسے تمہیں سونپ کے گئی تھی۔'' گل نے حیرت سے سوال کیا۔ ''تم اسے سنبھال بھی نہ سکیں...... تم نے اس کی قدر نہیں کی نمو؟ کیسے...... کیسے وہ اس حال تک پہنچا...... کیوں کی اس نے اپنی جان لینے کی کوشش؟''

''آپ کی خاطر۔''

''ہیں...... اگر وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے تو میرے لیے جان کیوں دے گا اور اگر محبت کرتا ہے تو تب بھی کیوں دے گا۔ کیونکہ محبت کرنے والے محبوب کو دکھ نہیں دیتے۔ اس سے کہو، اگر مجھے زندگی میں کوئی ایک خوشی دینا چاہتا ہے تو تمہیں خوش رکھے...... اگر تمہارے دل میں میری تھوڑی سی بھی عزت ہے تو تم اسے خوش رکھو۔''

''آپ عزت کی بات کرتی ہیں...... آپ نے تو میری عزت بچائی تھی...... میرے ابا کا سر جھکنے سے بچایا تھا۔ مجھے تو آپ کا احسان مند ہونا چاہیے تھا لیکن میں اس احسان کو بھول کے آپ سے حسد کرتی رہی۔ اب میں یہ احسان چکانا چاہتی ہوں اور وہ بھی اسی طرح جیسے آپ چاہتی ہیں یعنی یاسر کو خوش رکھ کر۔''

''محبت احسان سے بہت آگے کی چیز ہے۔ میں نے تم پہ کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ تب میں صغیر احمد کے نکاح میں تھی اور اس حوالے سے ان کی...... ان کے گھر کی عزت بچانا میرا فرض تھا...... تب میرے دل میں یاسر کے لیے جو محبت تھی۔ اس کے حوالے سے اس کی ہونے والی بیوی کی عزت بچانا بھی میرا فرض تھا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا کسی پہ۔''

اور پھر التجا کرنے کے انداز میں اسے کہنے لگی۔

''اب تم مجھ پہ ایک احسان کرو...... تم جاؤ یہاں سے...... یاسر کو بھی مت بتانا کہ تم مجھ سے ملی تھیں...... مجھے یہاں سے دور جانے دو۔''

''ہاں...... تاکہ یاسر ایک بار پھر دَر دَر کی خاک چھانتے پھریں۔ سڑکوں پہ آپ کو ڈھونڈتے پھریں ایک بنجارے کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر۔''

وہ غصے میں آ گئی...... پھر اچانک پسپائی اختیار کرتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"خدا کا واسطہ ہے، آپ یاسر کی غلطی معاف کر دیں۔"

"کیسی معافی؟" گل نے تڑپ کے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "کیسی معافی نرمین......؟ میرے دل میں اس کے لیے کبھی کچھ ایسا نہیں تھا نہ ہو سکتا ہے کہ اسے معاف کرنے کی نوبت آئے۔ لیکن نمو......! میں نے کہا ناں کہ میں اسے تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ اسے وہ چند مہینے برداشت نہیں ہوئے جو میں نے اس کے بغیر تمہارے گھر میں گزارے تھے۔ میں اپنی پاک دامنی کا ثبوت دیتے دیتے ہار گئی تھی۔ اب ان گزرے سالوں کا حساب کیسے دوں گی میں اسے۔"

"کیا مطلب؟"

"ان تین سالوں نے مجھے اس کا نہیں رہنے دیا نرمین۔"

گل نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور نرمین ہکا بکا رہ گئی...... پھر ایک جھٹکے سے اس نے اپنے ہاتھ گل کے ہاتھوں سے چھڑائے۔

گل نظریں جھکائے...... پست آواز میں کہہ رہی تھی۔

"اب اگر وہ میرے ساتھ رہا تو میرا بٹا ہوا وجود اسے تکلیف دے گا۔ تم تو گزر چکی ہو اس تکلیف سے۔ کیا تم سے برداشت ہوتا تھا جب یاسر تمہارے ساتھ ہوتے ہوئے بھی کسی اور کی یاد میں۔"

"تو کیا آپ......" وہ اب تک بے یقین سی تھی۔

"ہاں...... اب میرے دل میں صرف یاسر کی حکومت نہیں ہے۔ کوئی اور بھی ہے جو...... جس سے میں۔"

مگر نرمین نے اس کی بات پوری سنے بغیر نفرت سے اسے گھورا اور تیزی سے وہاں سے نکل گئی۔

☆======☆======☆

یاسر بے یقینی سے اسے دیکھتا انکار میں سر ہلا رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم چلا اٹھا۔ "نہیں...... جھوٹ کہہ رہی ہو تم۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں یاسر...... اس نے خود کہا ہے کہ وہ۔"

"تو پھر وہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔" وہ پورے وثوق سے بولا۔

مگر اسی وثوق سے نرمین نے اس کا دعویٰ جھٹلایا۔ "نہیں...... وہ بھی جھوٹ نہیں کہہ رہی...... کیونکہ میں نے ان آنکھوں میں وہ درد دیکھا ہے جو کافی عرصے سے آپ کی آنکھوں

میں دیکھ رہی ہوں۔ دو حصوں میں بٹے رہنے کا دکھ...... جس طرح آپ میرے ساتھ رہتے ہوئے بھی گل کی محبت کا حق ادا کرتے رہے کیونکہ اس کی محبت کی جڑیں آپ کے دل میں زیادہ گہری تھیں۔ اسی طرح وہ بھی اس وقت کسی اور محبت میں جکڑی۔"

"نہیں نمو! ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ گل ہے یاسر نہیں، جس کے دل میں کوئی اور جگہ بنالے۔ محبت اس کے لیے لباس نہیں کہ ایک بدل کے دوسرا پہن لیا۔ محبت اس کے لیے عبادت ہے۔ وہ میری محبت میں شرک کر ہی نہیں سکتی۔ مجھے بتاؤ...... کہاں ہے وہ؟ میں خود بات کرتا ہوں اس سے۔"

"وہ اب وہاں نہیں ہے، کوئی فائدہ نہیں۔"

"تو پھر میرے جینے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔" وہ بھربھری ریت کی طرح ڈھے گیا۔

نرمین کے بتائے پتے پہ وہ وہاں پہنچا...... تالا لگا تھا...... دروازے پہ لکھے نام پہ انگلیاں پھیرنے لگا...... وہ نام جس پہ نرمین کی نظر نہ گئی تھی۔

"یاسر......"

"اور تم کہتی ہو، تمہیں اب مجھ سے محبت نہیں...... کسی اور سے ہے۔ تم نے اس گھر کے باہر بھی میرا نام لکھ دیا ہے گل، جس میں مَیں تمہارے ساتھ نہیں۔"

پاس سے گزرتا ایک آدمی ٹھٹک کے رکا۔

"آپ نرس بی بی سے ملنے آئے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"ابھی ابھی رکشہ کرا کے اسٹیشن گئی ہے۔" یاسر تیزی کے ساتھ گلی کے کونے میں کھڑی اپنی گاڑی تک گیا۔

☆======☆======☆

"جی ابا......!" صغیر احمد نے اپنی آمد کی اطلاع کچھ ایسے اچانک اور غیر متوقع انداز میں دی کہ وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"بھئی، ہماری بٹیا کے پاس تو وقت نہیں رہا ہم سے ملنے کا۔ ہم نے سوچا ہم لوگ ہی مل آئیں۔"

"ہم لوگ؟ یعنی آ...... آپ سب؟"

"سب کون......؟ تین تو لوگ ہیں گنتی کے۔" وہ یاسیت سے بولے۔

جنت بیگم کا انتقال نرمین کی شادی کے کچھ عرصے بعد ہوا تھا۔

"دادی اماں سفر کر لیں گی؟" وہ ہراساں تھی...... اس صورتِ حال میں کن الفاظ میں ان کو آنے سے منع کرے کہ برا بھی نہ لگے۔

"تم سے ملنے کے شوق میں کر لیں گی۔"

"اور...... آپ کا کام؟ اسٹور؟"

یاسر کی حالت اس کو رہ رہ کر یاد آ رہی تھی...... کیسے وہ بات کو سنبھالے گی...... کیا جواز پیش کرے گی سب کے سامنے یاسر کی اس کیفیت کا۔

"کام تو چلتے رہتے ہیں بیٹا......! لیکن رابطے تو توڑے نہیں جا سکتے...... ہم لوگ کل صبح نکلیں گے...... ان شاء اللہ شام تک تمہارے پاس ہوں گے۔ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتانا...... لیتے آئیں گے۔"

"جی...... جی نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

وہ زبردستی لہجے میں بشاشت پیدا کر رہی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ ان کے اچانک آنے کی خبر سے اسے جو پریشانی لاحق ہوئی ہے اس کا ہلکا سا اندازہ بھی انہیں ہو سکے۔ شادی کے بعد پہلی بار تو ایسا ہونے جا رہا تھا کہ اس کے میکے والے خود اس سے ملنے اس کے گھر تک آ رہے تھے ورنہ وہ ہی چھ سات ماہ بعد مل آیا کرتی تھی۔

"پھر بھی میں نے تمہاری پسند کی مٹھائیاں خرید لی ہیں...... تمہاری امی نے تمہارے اور یاسر میاں کے لیے کچھ موسم کے لحاظ سے کپڑے بھی بنوائے ہیں۔"

وہ اور بھی بہت کچھ کہتے رہے مگر اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے...... ان میں صرف یاسر کی بات گونج رہی تھی۔ جو اس نے صرف دس منٹ پہلے فون کر کے بتائی تھی۔

"زمین...... گل کا پتہ چل گیا ہے...... وہ اسٹیشن پہ ہے۔ میں اسے لینے جا رہا ہوں...... اور میں اسے لے کر ہی لوٹوں گا۔"

ریسیور رکھتے ہی بیل دوبارہ ہوئی تھی اور اب صغیر احمد کی آمد کی اطلاع نے اس کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔

اب وہ شدت سے دعا کر رہی تھی کہ گل، یاسر کو نہ ملے۔

ملے تو آنے سے انکار کر دے۔

نہیں...... ملے ہی نہ تو بہتر ہے......

دل کو تسلی نہ ہوئی دعاؤں سے تو وہ یاسر کا نمبر گھمانے لگی...... کپکپاتی انگلیاں نمبر ملا رہی تھیں اور کپکپاتے لب دعا مانگ رہے تھے۔

"ہاں...... نمو! میں ابھی تک نہیں پہنچ پایا۔" اس کا فون ملتے ہی یاسر نے سوال سنے بغیر بے تابی سے بتایا۔

"ٹریفک جام میں بری طرح پھنس گیا ہوں۔"

"اتنی گرمی میں آپ ٹریفک جام میں پھنسے ہیں...... واپس ٹرن لینے کا کوئی راستہ نہیں۔"

"واپس...... مگر۔"

"اتنی دیر ہو گئی...... اب تک تو ٹرین نکل بھی گئی ہو گی۔"

"کیسے نکل گئی ہو گی...... اور تمہیں کیا پتا، وہ کس ٹرین سے جا رہی ہے؟ کہاں جا رہی ہے؟" اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی۔ وہ نادم سی ہو گئی۔

"نہیں...... میں تو ایسے ہی۔"

"اچھا، فون بند کرو...... شاید راستہ کھل رہا ہے۔"

"یاسر...... وہ نہیں آئے گی۔" کسی موہوم سی امید کے آسرے وہ کہنے لگی۔

"آئے گی، تمہیں پتہ ہے نمو...... میں نے اس کے گھر کے دروازے پہ اپنا نام دیکھا ہے۔"

زمین چونک اٹھی۔

"وہ آج بھی میرے نام کے سہارے جیتی ہے...... میں اسے اپنا نام دوں گا زمین......! ساری کوتاہیوں کی تلافی کروں گا۔"

"یاسر...... ابا" کانٹے اُگے حلق سے بمشکل وہ کہہ پائی اور یاسر کسی خیال سے ہڑبڑا کے چونکا۔

"اوہ...... صغیر بھائی!" وہ اب اس کے سسر بن چکے تھے لیکن یاسر ان کو ابھی بھی صغیر بھائی ہی کہتا تھا۔

"ہاں، اس صورتِ حال کے بارے میں تو میں نے سوچا نہیں...... لیکن نمو! تم میرے ساتھ ہو ناں۔"

وہ نہ انکار کر سکتی...... نہ اقرار۔

کیا کہتی۔ خود ہی تو دل کڑا کر کے اسے گل کے پاس جانے کا کہا تھا...... لیکن یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسے میں اگر اس کے امی ابا آ گئے تو کیا جواز پیش کرے گی وہ۔

یہ سب ہوتا دیکھنے کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھی لیکن یہ سب امی اور ابا بھی دیکھیں

گے......اس کے لیے تیار نہ تھی۔

''تمہارے ساتھ کے بل بوتے پہ ہی تو میں گل کی جانب بڑھنے کی ہمت کر بیٹھا ہوں نمو......اب تمہیں ہی سب سنبھالنا ہے۔''

اس نے فون بند کر دیا اور نرمین ریسیور ہاتھ میں لیے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆======☆======☆

''نمو کے ابا......فون کر دیا؟'' حلیمہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں......کر دیا۔''

''بہت خوش ہوئی ہو گی ناں نمو ہمارے آنے کا سن کر۔'' حلیمہ کے پورے وثوق سے کیے دعوے پہ صغیر احمد تولیے سے چہرہ خشک کرتے کرتے ٹھٹکے۔

تھوڑا سا ذہن پہ زور ڈالا تو حیرت اور الجھن میں مبتلا ہو گئے کیونکہ یاد کرنے پہ بھی یاد نہ آ رہا تھا کہ نرمین نے خوشی کا اظہار کیا بھی تھا یا نہیں؟

اسی الجھن کے عالم میں تولیہ چہرے سے ہٹایا تو سامنے حلیمہ کا تجسس اور اشتیاق سے بھرا مسکراہٹ سے سجا چہرہ تھا۔ وہ بمشکل مسکرائے۔

''ہاں، ظاہر ہے، وہ خوش نہیں ہو گی تو کون ہو گا؟'' وہ اسے یہ الجھن سونپنا نہیں چاہتے تھے۔

''ہیں......یاسر میاں بھی خوش ہوئے ہوں گے۔''

حلیمہ اترا اترا کے مسکرانے لگی اور اس کی یہ ادائیں جن سے کبھی صغیر احمد کو کوفت اور جھنجلاہٹ ہوا کرتی تھی۔ اب وہ مسکرا دیئے۔

''ہاں......نمو نے بتایا ہو گا تو خوش ہوئے ہوں گے۔''

''ہم کچھ دنوں کے لیے نمو کو اپنے ساتھ یہاں لے آئیں گے۔''

''پتا نہیں وہ آتی ہے یا نہیں۔'' صغیر احمد کے دل میں بھی کچھ خواہش جاگی۔ سُونا آنگن اب دل کو بھی سُونے پن کی کسک دیتا تھا۔

''کیوں نہ آئے گی......میکے آنے کے تو ارمان ہی اتنے ہوتے ہیں......پتا ہے مجھے بھی بہت تھے......سب سکھیاں میکے جانے کی بات کرتی تھیں......میرا کوئی میکہ ہی نہیں تھا۔'' وہ منہ بسورنے لگی۔

''کیوں نہیں تھا......؟ ایسے نہیں کہتے حلیمہ۔''

''مگر وہ تو اسی گھر میں ہی تھا......جا کے رہ تو نہیں سکتی تھی۔ واپسی پہ سوغاتیں اور تحفے

بھی تو نہیں لا سکتی تھی۔'' صغیر احمد ہنسنے لگے۔

''لیکن میری نمو میکے آئے گی......مزے مزے کے پکوان کھائے گی......سکھیوں کے سنگ گھومنے نکلے گی......واپسی پہ خوب جوڑے، پھل اور مٹھائیاں بٹور کے لے جائے گی......ہے ناں......ہم واپس لے کے آئیں گے اسے، بس مجھے نہیں پتا۔''

''ہاں، ٹھیک ہے......میرا بھی دل چاہتا ہے وہ یہاں آئے۔ آ کے چند دن رہے۔ مگر یاسر میاں کو اکیلے میں تکلیف نہ ہو۔''

''تو وہ بھی آ جائیں، آپ کہیں گے تو آ جائیں گے۔''

''مرد ذات کیسے کام وام چھوڑ کے بیوی کے ساتھ چلا آئے۔''

''ہاں......یہ تو ہے۔'' وہ مدبرانہ انداز میں سر ہلانے لگی۔ اب بے جا ضد کرنا یا اپنی بات پہ اڑے رہنا اس نے ترک کر دیا تھا۔

''نمو کے ابا......بڑا دل چاہتا ہے کہ نمو کے ہاں ایک منا ہو......یا منی......ہمیں نانا، نانی کہہ کر پکارے۔''

اس کے حسرت بھرے لہجے پہ صغیر احمد بھی اداس سے ہو گئے......ایک آہ بھر کے آسمان کی جانب نظر اٹھائی۔

سو سو دعائیں تھیں اس ایک نظر میں۔

☆======☆======☆

''تم نے خود اسے اکسایا......اب تڑپ رہی ہو۔ یہ بہت بڑے حوصلے کا کام ہے زرمین......پہلے تم اپنے ظرف اور ضبط کو آزما تو لیتیں پھر یہ قدم اٹھاتیں۔''

سمیرا نے دل سوزی سے کہا۔

''میرا ظرف......میرا ضبط کمال کا ہے سمیرا......صرف بھرم ہے جو کمزور پڑ رہا ہے......اور میں اسے ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتی۔ کم از کم اپنے ماں باپ کے سامنے تو ہرگز نہیں۔ جن کی واحد اولاد ہوں میں، جن کی زندگی میں ہر امید، ہر آس......ہر خوشی مجھ سے وابستہ ہے۔ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہیں کہ انہوں نے مجھے ایک بہترین شخص کے ہاتھوں میں سونپا ہے۔ جو مجھ سے محبت کرتا ہے......میری قدر کرتا ہے......انہیں میرے اس گھر کے دم سے سکون ہے......میں نہیں چاہتی کہ ان کے سامنے ہی اس گھر کے پُرزے اُڑیں......وہ کل آ رہے ہیں اور آج گل۔''

''ضروری نہیں کہ وہ آئے۔ ضروری نہیں کہ وہ یاسر کو ملے۔''

''اور یہ بھی تو ضروری نہیں کہ نہ ملے...... نہ آئے۔''

''تم یاسر کو بتا کیوں نہیں دیتیں اپنے والدین کے آنے کے بارے میں۔''

''کہنے کو تو میں یہ بھی کہہ سکتی تھی فون پہ...... کہ میری طبیعت بہت خراب ہے...... مجھے یقین ہے، وہ سب چھوڑ چھاڑ کے آ جاتے لیکن ایک اعتماد ہی تو ہے جو میں نے ان کا جیتا ہے۔ نہ محبت جیت سکی نہ دل...... میں جھوٹ بول کے ان کا اعتماد نہیں کھونا چاہتی۔''

''لیکن تمہارے امی، ابا اور دادی کل آ رہے ہیں۔ اس میں جھوٹ کیا ہے؟''

''وہ تو سمجھ سکتے ہیں ناں...... یہ خیال آ سکتا ہے ان کے دل میں کہ میں نے ان کو روکنے کے لیے۔''

''پاگل ہو تم...... بتا دیتیں اگر یہ فضول خیال آتا بھی تو گھر آنے کے بعد یاسر خود اس خیال کو جھٹلا دیتے جب تمہارے میکے والوں کو دیکھتے۔''

نرمین متفق سی ہوئی۔

''میری مانو تو اب بھی وقت ہے...... فون کر دو۔''

☆======☆======☆

دور سے ایک بنچ پہ اسے کالی چادر ہوا سے پھڑ پھڑاتی نظر آئی۔

یاسر نے سکون کا سانس لیا اور پُرسکون قدموں سے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اس کی جانب پشت کیے پٹڑی کی جانب رخ کیے بیٹھی تھی۔ زمین پہ بیگ...... دو سوٹ کیس، ایک جستی صندوق اور بستر بندھے پڑے تھے جیسے جانے کی مکمل تیاری ہو۔

چند قدم کے فاصلے پہ وہ رکا......

بلکہ گل کی آواز نے اسے رکنے پہ مجبور کیا۔

''یاسر......!'' وہ مسکرا دیا...... اور شاد سا ہو کر سوچنے لگا۔

''تم آج بھی میری آہٹیں پہچانتی ہو گل۔''

''اب میرے پاس سے کہیں نہ جانا یاسر...... میں کہاں ڈھونڈتی پھروں گی تمہیں۔''

''کہیں نہیں جاؤں گا میں۔'' یاسر قدم آگے بڑھاتے بولا تو گل نے تڑپ کے اسے مڑ کر دیکھا...... وہ بالکل پیچھے آتا نظر آ رہا تھا۔

''اور نہ تمہیں جانے دوں گا گل!'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔

''تمہارے دل پہ میرا نام ہے...... تمہارے گھر کے دروازے پہ میرا نام ہے اور تمہارے ہونٹوں پہ بھی میرا نام ہے۔ پھر بھی تم کہتی ہو کہ تم کسی اور سے......''

یہ کہتے کہتے وہ رک گیا۔ اب وہ بنچ کے بالکل پاس کھڑا بنچ پہ بیٹھے ایک ننھے سے بچے کو دیکھ رہا تھا جو گل کی سیاہ چادر کا پلو کھینچ کر اسے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

''ماما!'' گل نے اسے بنچ سے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا اور یہ کہتے ہوئے مڑی۔

''چلو یاسر۔''

وہ سکتے کے عالم میں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ بچے کی انگلی تھامے آگے اور آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

''گل......!'' پہلے اس کے لبوں سے سرسراہٹ سی نکلی اور اب یہ ہلکی سی سرگوشی جیسے اسے ہوش میں لے آئی، اب وہ حلق پھاڑ کر چلایا۔

''گل......''

گل کے قدم تھمے...... مگر وہ نہ پلٹی...... نہ دیکھا...... البتہ کتنے ہی لوگ تھے جو پلٹ پلٹ کے اس وحشت زدہ شخص کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جو چلا کے پکارنے کے بعد اب بھاگتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔

''گل...... مت جاؤ......'' نزدیک آتے ہی اس نے گل کا ہاتھ تھام کر التجا کی۔

''مجھے مت روکو یاسر......!'' گل نے جھٹکے سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

''پلیز تم خود کو مجھ سے دور مت کرو۔''

''دور تو تم ہو چکے، دسترس سے باہر۔''

''نہیں گل! یہ غلط فہمی تھی، میری بھی اور تمہاری بھی۔ محض ایک گمان تھا کہ الگ ہونے کے بعد ہم دور بھی ہو سکتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی بھی نہیں۔''

''ماما!''

یاسر بچے کی آواز پہ چونکا...... گل کے ہونٹوں پہ ایک طنزیہ مسکراہٹ ٹھہر گئی۔ اس نے نظر بھر کے اس کے رنگ اُڑے چہرے کو دیکھا اور جتا کے کہنے لگی۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے یاسر!''

وہ ٹکر ٹکر بچے کو دیکھ رہا تھا، جو ایک انگلی منہ میں ڈالے چوستا ہوا بالکل گل جیسا لگ رہا تھا۔

''یا پھر اسے دیکھ کے بات کرنا بھول گئے؟''

ذرا ٹھہر کے اس نے اپنے ہی جملے میں تبدیلی کی۔

''بھول گئے یا بات سے مکر گئے؟''

''نہیں گل...... اب نہیں، اب کچھ ایسا نہیں ہوگا، جو مجھے میری بات سے پھر جانے پہ مجبور

کر سکے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''یہ بھی نہیں؟'' گل نے بچے کی جانب اشارہ کیا۔

''نہیں......''

''ٹھیک ہے، آزمالیتی ہوں، ایک بار پھر......''

گل کی نگاہوں میں ایک نہ سمجھ میں آنے والا تاثر تھا...... کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا ٹھانے بیٹھی ہے، مگر یاسر اس کی اس پُراسرار کیفیت سے بے نیاز اسی میں شانت ہوگیا کہ وہ اس کو ایک بار پھر آزمانے پہ رضامند ہے، وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اس بار اس آزمائش پہ پورا اُترنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بیگ اٹھایا اور گل کو پیچھے آنے کا اشارہ کرکے قلی ڈھونڈنے لگا، جو دوسرا سامان اس کی گاڑی میں رکھوا سکے۔

☆======☆======☆

یاسر بہت خاموشی سے کار چلا رہا تھا۔ گل کو اس کی خاموشی سے الجھن ہو رہی تھی، وہ بار بار اس کی جانب دیکھ رہی تھی، جیسے اس کی جانب سے کسی سوال کا انتظار ہو، بچہ پچھلی سیٹ پر سو رہا تھا۔ اچانک گل بے تابی سے کہہ اٹھی۔

''روکو...... روکو یاسر!''

یاسر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''میں کہہ رہی ہوں، گاڑی روکو۔''

اب کے وہ چلا کے بولی۔ یاسر نے سائیڈ پہ کار کرتے ہوئے بریک لگائی۔ وہ فوراً نیچے اُتری اور پچھلا دروازہ کھولنے لگی۔

''کیا کر رہی ہو گل؟''

''مگر کہاں؟'' یاسر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''جا رہی ہوں میں۔'' وہ سوتے ہوئے بچے کو گود میں اٹھا رہی تھی۔

''کہیں بھی...... مگر تمہارے ساتھ نہیں۔''

''ایسے مت کرو گل! خدا کے لئے مت جاؤ، میں تمہیں دوبارہ نہیں کھو سکتا۔''

وہ گھگیاتے ہوئے نیچے اُتر آیا۔ گل بچے کو کاندھے سے لگا کے جانے کے لئے مڑی، مگر یاسر کو سامنے پا کے رکی۔

''لیکن تم مجھے کب کا کھو چکے یاسر! بلکہ میں تو خود اپنا آپ کھو چکی ہوں۔ گم ہو چکی ہوں اپنے بیٹے میں۔''

''اور میں تم میں اپنا آپ گنوا چکا ہوں گل! مجھے کوئی ایک سرا تو ہاتھ آنے دو، جس سے میں ان بھول بھلیوں میں سے نکل سکوں۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں گل...... تم سے......''

ایسے بے تاثر چہرے کے ساتھ سڑک پر جاری ٹریفک کا جائزہ لیتے دیکھ کر یاسر جھنجھلا اٹھا اور اس کے بازو کو زور سے پکڑ کے جھٹکا دے کر بولا۔

''تم سن کیوں نہیں رہیں؟''

گل کے چہرے پہ اس کی وحشیانہ گرفت سے تکلیف کے آثار پیدا ہوئے تو یاسر نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے بازو سے ہٹا لیا اور نرمی سے بولا۔

''بہت تھک چکیں تم گل! بہت بھگت لیں تم نے سزائیں، اب چلو میرے ساتھ، میں اپنی ہر غلطی اور ہر بے اعتباری کا کفارہ ادا کروں گا۔''

''کفارہ ادا کرو گے؟ یعنی حق تو پھر بھی ادا نہیں کرو گے؟'' گل نے دکھ بھری مسکراہٹ سے دیکھا۔

''صرف اپنے دامن کے چھینٹے صاف کرنے کے لئے لے جا رہے ہو مجھے، اپنے دل سے احساسِ جرم اور پچھتاوے کو کم کرنے کے لئے؟''

''تمہارا جو دل چاہے کہہ لو، مگر میرے ساتھ چلو۔'' یاسر نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''اسے ساتھ لے کر جاؤ گے؟'' گل نے گود میں سوئے بچے کی جانب اشارہ کیا۔

''لے کر تو جا رہا ہوں۔''

''یہ نہیں پوچھو گے یہ کون ہے؟''

''یہ...... تمہارا...... بیٹا۔'' بہت تکلیف کے ساتھ تین الفاظ یاسر کے حلق سے نکلے۔

''اور یہ نہیں پوچھو گے کہ اس کا باپ کون ہے؟''

یاسر کا سر آہستہ سے انکار میں ہلا۔

''اور یہ بھی نہیں کہ یہ کسی گناہ کا پھل ہے یا کسی جبر کا نتیجہ؟''

ضبط کرنا اس کے لئے مشکل تھا۔ مگر وہ یہ مشکل عبور کر گیا اور ایک بار پھر انکار میں سر ملا دیا۔

''اچھی بات ہے کہ تم یہ سب نہیں پوچھو گے۔'' وہ آہستگی سے مسکرائی۔

''کیونکہ میرے پاس تمہارے ان سوالوں کے کوئی جواب نہیں، میں خود نہیں جانتی اس کا باپ کون ہے؟''

یاسر نے منہ دوسری جانب پھیر لیا، وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا، مگر وہ سنا رہی تھی زبردستی جبراً۔

''فٹ پاتھوں پہ گزاری راتیں یہ یاد بھی کب رہنے دیتی ہیں کہ کس کس نے......''

''بس کرو گل!'' اب یاسر کی برداشت کی حد ختم ہوگئی، وہ پھٹ پڑا۔ ''بس کرو، خدا کے لئے، تمہیں اللہ کا واسطہ ہے، بس کرو۔ اب کیا میرا دل پھٹتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہو

''بس......اتنا حوصلہ تھا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا، نہ جاننا چاہتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ تم نے زندگی میں جو بھی غلطیاں کی، میرے لئے کیں اور تمہارے ساتھ جو بھی غلط ہوا، وہ میری وجہ سے ہوا، میں کس چیز کا الزام دوں تمہیں؟ اور کس منہ سے دوں؟''

گل نے چند لمحوں تک بغور اس کو دیکھنے کے بعد کار کی جانب قدم بڑھا دیئے اور یاسر نے ایک سکون کا سانس لیا۔

☆======☆======☆

زمین جلے پیر کی بلی کی طرح چکر کاٹ رہی تھی۔ کال بیل کی آواز پہ اس کے تلوؤں کے نیچے بجھے انگارے سلگ اٹھے۔ وہ تڑپ کے دروازے کی جانب لپکی اور دروازہ کھولتے ہی بت بن گئی۔

سامنے یاسر اور گل کھڑے تھے۔

ان دونوں کو ایک ساتھ اپنے سامنے کھڑا دیکھ کے اسے کیسا لگے گا؟ کیا گزرے گی دل پہ؟ یہ سوچنے کی......اندازہ لگانے کی مہلت ہی نہ ملی تھی۔

گل کا چہرہ بے تاثر تھا اور وہ زمین پہ نظریں جمائے کھڑی تھی، یاسر کے چہرے پہ شرمندگی اور ممنونیت کے ملے جلے احساسات تھے۔

''زمین! میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا، اگر تم مجھے یہ احساس نہ دلاتیں کہ گل میرے لئے کتنی ضروری ہے تو میں کبھی یہ اعتراف نہ کرتا اور اگر تم مجھے اجازت نہ دیتیں تو۔''

''سانس لینے کے لئے بھی کیا اجازت کی ضرورت ہوتی ہے؟''

زمین نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا، پھر گل کا ہاتھ تھام کے محبت اور احترام کے ساتھ کہا۔

''آئیں گل......''

گل نے کسی معمول کی طرح اندر قدم بڑھایا اور زمین اس کے عقب میں موجود بچے کو دیکھ کر ششدر رہ گئی، جو اس کی سیاہ چادر کا پلو تھامے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

''یاسر......یہ بچہ؟''

یاسر نڈھال اور تھکے ہارے انداز میں بیٹھا تھا۔ سر جھکائے ہوئے اور سامنے کھڑی حیرت زدہ سی زمین پوچھ رہی تھی۔

''گل کا۔'' اسی جھکے سر کے ساتھ یاسر نے جواب دیا۔

''گل کا؟ اور......اور کس کا؟''

یاسر کا سر مزید جھک گیا، وہ چپ رہا تو زمین پاس آئی، پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے

ہوئے، اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''میں نے پوچھا یاسر......! وہ بچہ کس کا ہے؟ کون ہے اس کا باپ؟''

''پتا نہیں۔'' وہ نظر چرا گیا۔

''آپ نے پوچھا نہیں؟''

''نہیں......اور تم بھی نہ پوچھنا۔''

''مگر کیوں؟''

اس بار بھی وہ چپ رہا۔ زمین کھوجتی نظروں سے اسے دیکھتی اندازے لگانے کی کوشش کرتی رہی۔

''اس نے شادی کر لی تھی......ایک اور؟'' پہلا اندازہ اس نے ظاہر کیا۔

''پتا نہیں۔''

''آپ کو کچھ تو پتا ہونا چاہئے۔''

وہ جھنجلا اٹھی اور اس کی جھنجلاہٹ نے یاسر کو بھی جھنجلانے پہ مجبور کر دیا۔

''کیا پتا ہونا چاہئے؟ جب خود گل کو نہیں پتا کہ اس بچے کا باپ کون ہے؟''

زمین پھٹی پھٹی آنکھوں سے یاسر کو دیکھتی رہی، جواب دوبارہ سے نظر چراتا......سر جھکائے نڈھال بیٹھا تھا۔

اس کے اندر بہت سے سوال مچل رہے تھے مگر یاسر نے نہ تو تسلی بخش جواب دیا تھا اور نہ ہی اسے یہ اجازت دی تھی کہ وہ گل سے کوئی سوال کر سکے۔

وہ بچہ اور گل......یہ معمہ اسے ایسے الجھائے ہوئے تھا کہ وہ صغیر احمد اور باقی گھر والوں کی آمد کے بارے میں یاسر کو نہ بتا سکی۔

وہ گل کو لے کر کمرے میں آئی۔

''یہ آپ کے لئے......کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیے۔''

گل نے ناقدانہ نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔

سادہ سا......مگر صاف ستھرا کمرہ تھا، کھڑکی پہ پھول دار پردہ لٹک رہا تھا، پردے کے عین نیچے کین کے دو موڑھے رکھے تھے، جن پر پردے کے کپڑے جیسا غلاف منڈھا تھا، کمرے کے وسط میں سنگل بیڈ، اوپر سفید چادر، جس پہ براؤن بیل بوٹے، سرہانے دو تکیے اوپر تلے اور پائنتی براؤن کمبل تہہ کیا رکھا تھا، سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی الماری تھی، ایک پٹ بند تھا۔ دوسرے میں مختلف شیلف اور خانے بنے تھے۔ ایک میں جائے نماز، تسبیح اور قرآن پاک رکھا تھا، نیچے والے میں کچھ کتابیں، اس سے نیچے ایک گلدان اور ایک ایش ٹرے رکھی تھی، سب سے نچلے میں کچھ رسائل اور میگزینز ترتیب سے رکھے تھے، صاف لگ رہا تھا کہ یہ کمرہ کم استعمال

میں آتا ہے، دوسرے لفظوں میں گیسٹ روم......

اس کے لبوں پہ ایک خودترس سی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

''گیسٹ روم...... مہمانہ خانہ...... چلو، تمہاری زندگی میں مہمان ہی سہی، کچھ تو بنی۔''

''کمرہ پسند نہیں آیا؟'' نرمین اس کی خاموشی سے گھبرا گئی۔

گل چونکی، آگے بڑھی، تکیہ کو ہاتھ لگا کے دیکھا۔

''کوئی اور تکیہ ہے نمو؟ نرم سا...... میرے بیٹے کو نرم تکیے کی عادت ہے۔''

''ابھی لادیتی ہوں۔''

وہ عجیب سی نظروں سے گل کو دیکھ رہی تھی، جو اب اپنے بچے کو ایسے بانہوں میں سمیٹ رہی تھی، جیسے وہ کوئی کانچ کی نازک سی چیز ہو، اسے بستر پر لٹاتے ہوئے وہ محبت بھرے گداز کے ساتھ بولی۔

''اب سو جاؤ میری جان! بہت رات ہوگئی۔''

''کھانا تو کھالیں گل۔''

''یہ صرف دودھ پیتا ہے رات کو۔''

''ایسا لگ رہا تھا جیسے گل کی زندگی اسی بچے سے شروع ہوتی ہو، اسی پہ ختم۔''

''اور آپ؟''

''مجھے بھی عادت نہیں رہی، اب اپنے لئے کیا پکاتی، میرے دن رات اب اسی کے دن رات کے ساتھ بندھے ہیں۔''

اس نے بچے کی پیشانی سے بال ہٹائے اور اسے چوم لیا۔

☆======☆======☆

نرمین سوچ میں گم ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھی تھی، اکیلی...... اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا یاسر کو کیسے بتائے اپنے میکے والوں کی آمد کے بارے میں، اب بتانے سے حاصل ہی کیا ہوتا، سوائے یاسر کی پریشانی کے، گل کے آنے سے پہلے بتادیتی تو شاید کچھ فائدہ بھی ہوتا۔''

''گل کہاں ہے؟'' یاسر شاور لے کر کمرے سے نکلا اور ڈائننگ ٹیبل پر نرمین کو اکیلا پاکے پوچھا۔

''سلا رہی ہے، اپنے بچے کو۔'' نرمین کے لہجے میں جتانے کی کیفیت تھی، جسے نظرانداز کر کے یاسر نے کہا۔

''اسے کھانے کے لئے تو بلالو۔''

''اسے نہیں کھانا۔'' نرمین نے ڈش اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟'' وہ پلیٹ لینے کے لیے آگے سرکتا سرکتا رک گیا۔

''کیونکہ اس کے بیٹے کو نہیں کھانا۔'' وہ پھر سے جتلانے لگی۔

یاسر خالی پلیٹ میں چمچہ ہلانے لگا۔

''یاسر! مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔''

وہ ہنوز اپنے خیال میں گم تھا۔

''یاسر......'' نرمین نے قدرے بلند آواز میں پکارا۔

''ہوں......'' وہ چونکا۔

''میں یہ کہہ رہی تھی کہ آج شام کو ابا کا فون آیا تھا۔''

''پتا نہیں اس نے سارا دن کچھ کھایا بھی تھا یا نہیں۔'' نرمین کو اپنی بات کے جواب میں یہ عجیب سی بات سن کر کوفت ہوئی، مگر وہ تحمل سے بتانے لگی۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ کل صبح وہ، امی اور دادی......''

''ایسا کرو، اسے دودھ کے ساتھ دو سلائس ہی دے آؤ، خالی پیٹ رات کو سونا اچھا نہیں۔''

یاسر کے چہرے پہ صرف گل کے لئے پریشانی تھی۔ پتا نہیں اس نے نرمین کی بات سنی بھی تھی یا نہیں۔

مارے بے بسی کے نرمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ ضبط کرتی، اثبات میں سر ہلاتی فوراً اٹھی۔

یاسر نے اس کی آواز میں رچی آنسوؤں کی نمی کو بھی محسوس نہ کیا۔

☆======☆======☆

یاسر نے بیڈ پر چت لیٹے لیٹے سگریٹ پیتے ہوئے کوئی سولہویں، سترہویں بار گردن موڑ کے برابر لیٹی نرمین کو دیکھا۔ اس بار وہ سوتی نظر آئی، یاسر نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کچھ سوچا، پھر چپکے سے بستر سے اٹھا۔

آہستگی سے دروازہ کھول کے وہ جیسے ہی باہر نکلا۔ نرمین نے آنکھیں کھول لیں، ایک گہری سانس لے کر چند لمحے وہ چھت کی جانب دیکھتی رہی، پھر بے چین ہو کر اٹھ گئی۔ بے تابی سے دروازے کی جانب آئی پھر رکی جیسے خود کو باز رکھنا چاہ رہی ہو، مگر رکھ نہ پا رہی ہو۔

☆======☆======☆

اب وہ گل کے کمرے کے باہر کھڑی تھی۔

اسی تذبذب اور کشمکش کے عالم میں...... جس کے ساتھ وہ اپنے کمرے سے نکلی تھی۔

اس کا ہاتھ بار بار ہینڈل کی جانب بڑھتا، مگر رک جاتا تھا، جیسے کوئی تھام لیتا ہو، تب ہی اسے عقب سے یاسر کی آواز آئی۔

''نمو!''

وہ بدک کے اچھلی۔

یاسر عین اس کے پیچھے پانی کی بوتل ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔

"میں پانی لینے گیا تھا، گل کے کمرے میں نہیں۔"

شرمندگی کے مارے نرمین کی ہتھیلیاں تک پسیج گئیں، اس نے وضاحت کے لئے کچھ کہنا چاہا، مگر الفاظ نے ساتھ نہ دیا، شاید انہیں خود اپنے بودے پن کا احساس ہوگیا تھا۔ بے بسی کے احساس سے چور ہوتے ہوئے اس نے فرار کی راہ اختیار کی اور تیزی سے مڑ کے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

یاسر نے گل کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا، ایک گہری سانس لی اور ہلکے بوجھل قدموں کو اپنے کمرے کی جانب گھسٹنے پر آمادہ کرنے لگا۔

☆======☆======☆

باقی کی ساری رات نرمین نے جاگ کے گزاری، اسے صبح کا انتظار تھا۔ ایسی صبح کا انتظار جو اس کے بھرم کا پردہ چاک کرنے والی تھی۔

ایسی صبح جس کا سورج وہ نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

جیسے دیکھنا نہ چاہتے ہوں، جس کا سامنا نہ کرنا چاہتے ہوں، اس کا انتظار کرنا کیسا لگتا ہے؟

ایک ان چاہا بوجھ لگتا ہے اور کیا؟

اور نماز کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہی اس نے فون کی گھنٹی سنی، اس کا دل سکڑ کے سہم گیا، اس نے یاسر کی جانب دیکھا جو اپنے آپ سے لڑتا، شاید رات کے آخری پہر سو چکا تھا۔

وہ ریسیور اٹھاتے ہوئے باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔

"ضرور ابا ہوں گے۔ یہ بتانے کے لئے فون کیا ہوگا کہ وہ سفر پر نکل پڑے ہیں اور سفر ہے ہی کتنا؟ چند گھنٹے؟"

"ہیلو؟"

"ہاں...... نمو بیٹی...... صبح بخیر...... کیسی ہو؟ سو تو نہیں رہی تھیں! تمہیں بے آرام تو نہیں کیا؟" دوسری جانب صغیر احمد تھے۔

"نہیں نہیں ابا...... کہئے۔"

وہ مصنوعی بشاشت سے بولی اور دل کراہ اٹھا۔ (مگر خدا کے لئے وہ مت کہئے جو میں سننا نہیں چاہتی)

"تمہیں یہ بتانے کے لئے فون کیا تھا کہ آج ہم نہیں آسکتے۔"

نرمین دنگ رہ گئی...... اس کی زندگی میں بہت سی دعائیں قبول ہوئی تھیں...... بہت بار اللہ نے کرم کیا تھا، لیکن کوئی دعا اتنی بروقت اور اتنی جلدی بھی قبول ہوسکتی ہے اس کا اندازہ نہ تھا۔

دعا کی اس قبولیت پہ شکر گزار ہوتی وہ صغیر احمد سے وجہ دریافت کرنا تک بھول گئی۔

وہ خود ہی بتانے لگے۔

"اسٹور پہ کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔ انکم ٹیکس کا...... میرا آج وہاں ہونا ضروری ہے، ان شاء اللہ پھر سہی۔"

"لیکن ابا...... میں تو بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

قدرے سنبھل کے اس نے کہا...... اوپرے اوپرے سے لہجے میں۔

"کل تو جمعہ ہے اور تم جانتی ہو کہ اماں جان جمعے کے دن کے وظائف اور نمازِ تسبیح قربان نہیں کرسکتیں...... ان شاء اللہ پرسوں علی الصبح نکلیں گے۔"

"جی...... !"

(یعنی تلوار پرسوں پھر سے لٹکے گی)

اس نے ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔ پھر ایک اطمینان بھری سانس لے کر خود کو دلاسہ دیا۔

"پرسوں کا سورج چڑھے گا تو دیکھیں گے...... کم از کم دو دن تو ملے۔"

☆======☆======☆

وہ چاروں ڈائننگ ٹیبل پہ تھے۔

اور چاروں چپ تھے۔

گل اپنے ہاتھ سے نوالہ توڑ کے بچے کے منہ میں ڈال رہی تھی...... اس کی آواز نے ہی سکوت توڑا۔

"لونا یاسر......"

یاسر اور نرمین دونوں بیک وقت چونک کے اسے دیکھنے لگے...... مگر وہ پوری طرح اپنے بیٹے کی جانب متوجہ تھی۔

"تھوڑا سا تو لونا۔"

نرمین نے سوالیہ نظروں سے یاسر کی جانب دیکھا۔ وہ ناشتے کی پلیٹ پہ جھک گیا۔

"تو یہ ہے وہ یاسر...... جس کا نام گل کے دروازے پہ لکھا دیکھ کے تمہیں خوش فہمیوں نے گھیر لیا تھا اور یہی ہے وہ تیرا وجود جس کے بارے میں گل نے اعتراف کیا ہے کہ وہ اسے تم سے زیادہ چاہنے لگی ہے۔"

وہ چپ چاپ اس بچے کو دیکھنے لگی۔ سوچے گئی جو گل کے بڑھائے ہر نوالے پہ منہ پھیر رہا تھا۔

"شاید اسے یہ پسند نہیں ہے، مجھے پتا نہیں تھا کہ کیا شوق سے کھاتا ہے، ورنہ وہی بنا دیتی۔"

''اسے چینی کے ساتھ پراٹھا کھانا پسند ہے۔''

زمین کی بات کے جواب میں گل نے بتایا۔

''ارے......تو پہلے بتا دیتیں۔'' وہ فوراً اٹھی۔

''میں بھی بچپن میں چینی اور پراٹھا بہت شوق سے کھاتی تھی۔'' اس نے کچن کی جانب جاتے جاتے بتایا تو گل اسے دیکھ کے رہ گئی، اس کے جانے کے بعد چند لمحوں تک سکوت کا راج رہا......پھر یاسر کی کرسی کے دھکیلنے کی ہلکی سی آواز نے گل کو چونکایا۔

''میں آفس جا رہا ہوں۔'' وہ کچھ جھجک کر بولا۔

وہ دھیان دیئے بغیر بچے کی پلیٹ میں پراٹھے کے چھوٹے چھوٹے نوالے توڑنے لگی۔

''بس ابھی آ رہی ہے چینی۔''

''تمہیں کچھ منگوانا ہے گل؟''

''مجھ سے کچھ کہا؟''

''میں نے کہا......کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتا دو......میں لیتا آؤں گا۔''

''نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' صاف انکار کرتے ہی اگلے لمحے اسے کچھ یاد آیا۔ ہاں، اس کے لئے کچھ بسکٹ اور چاکلیٹ لے آنا۔ یہ کریم بسکٹ کھاتا ہے۔''

وہ دوبارہ سے پوری طرح بچے کی جانب متوجہ تھی۔ یاسر کچھ دیر منتظر نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر مایوس ہو کر نکل گیا۔

☆======☆======☆

زمین ناشتے کے برتن وغیرہ نپٹا کے معمول کے چند چھوٹے موٹے کام کر کے گل سے دوپہر کے کھانے کے بارے میں پوچھنے لگی۔ فی الحال تو وہ اسے مہمان والا ہی پروٹوکول دے رہی تھی۔

گل بیگ سے کپڑے نکال نکال کے الماری میں لگا رہی تھی۔ بچہ زمین پہ بیٹھا کسی پرانے سے ٹوٹے ہوئے کھلونے سے کھیل رہا تھا۔

''آؤ نمو......''

اسے دروازے میں ایستادہ دیکھ کر گل مسکرائی۔

''کتنے سال کا ہے یہ؟'' اس نے اندر آتے ہی جھجک کر پوچھا۔

''کیوں؟'' گل نے ترنت کہا اور وہ اس ''کیوں'' پہ جی بھر کے حیران ہوئی۔

''ویسے ہی......دراصل مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ یہ کچھ بولتا کیوں نہیں۔''

''بولتا ہے مگر بہت کم......ضرورت کے چند الفاظ......ماما......دودھ......نینی اور وہ بھی ہر کسی کے سامنے نہیں۔''

''اس عمر کے بچے تو نیا نیا بولنا سیکھ رہے ہوتے ہیں اور بہت بولتے ہیں۔''

''ہاں......انہیں باتیں سکھانے والے بھی تو بہت ہوتے ہیں۔ یہ باتیں تب سیکھتا جب سنتا......گھر میں میرے سوا اور کون ہوتا ہے اس کے پاس۔ پوری دنیا میں سے صرف مجھے جانتا ہے، مجھے ہی پہچانتا ہے اور میں بھی کون سا سارا دن اس کے ساتھ ہوتی تھی۔''

''چلیں اب گزار لیجئے گا وقت......جی بھر کے۔''

''کتنے دن؟ میں نے تو ہاسپٹل سے بھی ریزائن کر دیا تھا؟ اب نئے سرے سے کام ڈھونڈنا پڑے گا۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے، اب آپ ہماری......میرا مطلب ہے یاسر کی ذمہ داری ہیں۔''

''کس رشتے سے؟'' اس نے چبھتے لہجے میں کہا۔

''رشتہ بھی بن جائے گا گل!''

''کس سے......؟ مجھ سے......؟ یاسر سے......؟ بچے سے......؟''

زمین لاجواب سی ہو گئی۔

''میں نے آج تک اپنے بچے کو کسی کا دیا ایک نوالہ تک نہیں کھلایا، نہ کھلاؤں گی۔''

''لیکن......'' زمین کی سمجھ میں نہ آیا، اس سے کہے تو کیا کہے۔

''یاسر! مجھے بہت مجبور کر کے یہاں لایا ہے۔ یاد رہے......لایا ہے......میں آئی نہیں ہوں۔ میں یہاں رہتی ہوں یا نہیں......اس کا فیصلہ مجھے کرنا ہے اور اگر رہتی ہوں تو کس حیثیت سے رہتی ہوں، یہ فیصلہ بھی مجھے کرنا ہے، تم دونوں کو نہیں۔''

اتنا کہہ کر وہ دوبارہ الماری سیٹ کرنے لگی، زمین کے وجود سے یکسر بے نیاز ہو کر۔

☆======☆======☆

یاسر پچھلے دو گھنٹے سے مارکیٹ میں خوار ہو رہا تھا۔ بالآخر ایک بہت بڑے ڈپارٹمنٹل سٹور کے بے بی کارنر پہ اسے اپنی مطلوبہ اشیاء نظر آ گئیں۔

ریموٹ سے چلنے والا ہیلی کاپٹر۔

بیٹری سے چلنے والی کار جس میں میوزک بھی تھا اور لائٹیں بھی جلتی تھیں۔

بہت سے خوبصورت ٹوائز۔

اور ایک رنگ برنگی ٹرائی سائیکل......

☆======☆======☆

وہ سکون سے چاولوں کے بگھار کے لئے پیاز کاٹ رہی تھی اور سمیرا اسے حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔

''ڈونٹ ٹیل می......یہاں......؟ اس گھر میں......؟''

""ہاں۔""
اس نے کٹی ہوئی پیاز گرم ہوتے ہی گھی میں ڈالی، شوں کی آواز ایک دم ابھر کے ٹھنڈی پڑ گئی۔
""تمہارے سامنے لے آیا وہ اسے؟""
""میرے کہنے پہ لے کر آئے ہیں۔""
""مگر زمین......""
""تم نے ہی تو کہا تھا سمیرا...... کہ جو پاس رہ کے پھڑ پھڑاتا ہے، اسے پرواز کے لئے کھلا چھوڑ دو۔ تم نے بھی تو یہی کیا ہے۔""
""ہاں...... میں نے اسے پرواز کے لئے چھوڑ دیا ہے، وہ چلا گیا اپنی محبت کے پاس۔ اب میرے لئے دل اور دھیان بٹانے کے لئے بہت کچھ ہے۔ تنہائی اور کچھ کھونے کا احساس ہوتا ہے مگر ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کی اذیت تو نہیں سہتی میں اور تم...... تم پاگل ہوگئی ہو، وہ دن رات تمہاری آنکھوں کے سامنے رہے گی...... یاسر کے ساتھ...... اور تم......""
""ہاں...... وہ یاسر کے ساتھ رہے گی...... یاسر کے دھیان میں گم...... اس کی محبت میں شرابور...... اس کے وجود میں کھوئی...... مگر کسی اور یاسر کے ساتھ۔""
""کیا مطلب؟""
""اب اس کی زندگی میں ایک اور یاسر ہے۔""
اس نے سُرخ ہوتے پیازوں میں پانی کا چھینٹا دیا۔ شوں شوں کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

☆======☆======☆

""یہ سب کیوں اٹھا لائے ہو تم؟""
گل نے یہاں وہاں ڈھیر لگے کھلونوں اور دیگر سامان کو حیرت اور پریشانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
""تمہیں پسند نہیں؟""
""میں نے تمہیں صرف چاکلیٹ اور بسکٹ لانے کو کہا تھا اور میرے پاس صرف ان ہی کے پیسے تھے، اب ان سب کی قیمت میں کیسے ادا کروں؟""
""تم سے مانگ کون رہا ہے گل؟""
""میں نے پتا نہیں کس کس کی پلیٹ سے بچی ہوئی روٹی اٹھا کے کھائی ہے، کس کس کی جھوٹن چاٹی ہے، کس کس کی اُترن پہنی ہے، مگر اپنے بچے پر بھیک یا ہمدردی کی ایک نظر تک نہیں ڈالنے دی کسی کو۔""

""یہ بھیک نہیں ہے گل!"" یاسر کو حقیقتاً دکھ ہوا۔
""تو پھر کیا ہے؟"" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ""یہ تمہارا فرض بھی نہیں ہے، یہ میرے بچے کا حق بھی نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟""
""جب میں تمہیں تمہاری تمام ذمہ داریوں سمیت قبول کروں گا تو یہ خود بخود میرا فرض اور اس کا حق بن جائے گا۔""
""تو تم یہ طے کئے بیٹھے ہو کہ میں ضرور تمہاری بات مان لوں گی۔""
""ہاں۔"" اس نے وثوق سے کہا۔
""اور وہ بھی کسی شرط کے بغیر؟""
""کیا شرط ہے تمہاری؟""
""پوری کرو گے؟""
""تم کہو تو۔""
""سوچ لو۔""
""سوچنے میں بہت وقت گنوا چکا، تمہیں بھی گنوا دیا تھا۔""
""میں کوئی بھی شرط رکھ سکتی ہوں یاسر......""
گل کے لہجے اور پُراسراری مسکراہٹ میں وارننگ تھی۔
""کوئی بھی؟ اور اگر تم ماننے سے انکاری ہوئے تو یہاں سے جانے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں لگاؤں گی۔""
""نہیں، ایسا مت کرنا۔"" وہ گھبرا اٹھا۔
""مجھے منظور ہے...... تمہاری ہر شرط...... بغیر سنے منظور ہے۔""
""ٹھیک ہے پھر زمین کو چھوڑ دو۔""
یاسر جہاں کا تہاں رہ گیا اور ٹیبل پہ کھانا لگانے کے لئے آتی زمین کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ کے نیچے جا گری۔

☆======☆======☆

وہ یاسر کا ردِعمل جاننے کے لئے وہاں نہیں رکی تھی، اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے الماری کھولی اور ایک کے بعد ایک کر کے اپنا تمام ضروری سامان نکال کر بیڈ پہ پھینکنے لگی۔ آنکھوں کے سامنے بار بار چھاتی آنسوؤں کی دیوار کو وہ ہتھیلی کی پشت سے رگڑ کر صاف کرتی۔ اس کی ہچکیاں ماتم کر رہی تھیں۔

☆======☆======☆

"لیکن گل...... وہ...... وہ تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہونے دے گی۔ اس نے خود مجھے کہا تھا تمہارے پاس لوٹنے کے لئے۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"وہ مجھے تمہارے ساتھ بانٹنے کے لئے تیار ہے۔"

"مگر میں نہیں ہوں، نہ پہلے کبھی تھی...... نہ اب۔"

"گل...... وہ...... وہ بے چاری...... وہ...... گل پلیز...... ایسی شرط مت رکھو...... میں کیسے اسے......"

لفظ یاسر کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ یہ صرف ایک شرط ہی تو ہے، کوئی جبر ہے نہ زبردستی۔ منظور تو ٹھیک...... نہیں تو......" وہ جانے کے لئے مڑی۔

"ایک منٹ گل...... ایک منٹ...... مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت دو۔"

گل رک کر مڑی۔ طنز اور تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھ کے کہنے لگی۔

"وقت......؟ کسی کو خود سے الگ کرنے کے لئے...... کسی کو چھوڑتے ہوئے تم نے پہلے تو کبھی اتنا وقت نہیں لگایا؟"

یاسر بے بسی کے احساس تلے دب کے رہ گیا۔ اس کے پیروں میں اس کا بوجھ سہارنے کی سکت نہ رہی تو وہ صوفے پہ ڈھے گیا۔

"مجھے بھی نرمین سے ہمدردی ہے۔"

گل اس کے قریب آ کے نرمی سے مگر ٹھوس لہجے میں بولی۔

"میں اس کے ساتھ کچھ بُرا نہیں کرنا چاہتی، اسی لئے نہ تو تمہارے ساتھ آ رہی تھی، نہ ہی اب تیار ہوں تمہاری زندگی میں شامل ہونے کے لئے لیکن اگر تم بضد ہو۔ تو یہ بات تمہیں ماننا پڑے گی، ویسے بھی یہ میں اپنے لئے نہیں، اپنے بچے کے لئے کر رہی ہوں۔ میرے لئے وہ سب کچھ ہے جب کہ تمہارے لئے صرف ایک ذمہ داری اور یہ ذمہ داری تم تب تک ہی نبھا سکتے ہو، جب تک تمہاری زندگی میں کوئی اور ایسا نہ ہو جو تمہیں اتنا ہی پیارا ہو جتنا مجھے میرا بچہ......"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔"

"تمہارا اپنا بچہ یاسر...... تمہاری اولاد...... اس کے سامنے تمہیں میرا بچہ نظر نہیں آئے گا۔ میں نے کبھی اسے جھوٹن نہیں کھلائی، اُترن نہیں پہنائی، محبت بھی اسے پہلے درجے کی دیتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کسی کی بھی زندگی میں اسے دوسرا درجہ حاصل ہو۔"

"لیکن گل......؟"

"میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی یاسر۔ نہ میری شرطیں تمام ہوئی ہیں۔ میری زندگی میں

میرے بیٹے کے علاوہ کوئی دوسرا بچہ نہیں آئے گا۔ یہ طے ہے، اسے ذہن میں رکھ کے میری طرف بڑھنا لیکن نرمین۔ اس سے تو تمہاری اولاد ہو سکتی ہے...... تمہاری اپنی اولاد...... میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ جسے میرا بچہ اپنا باپ سمجھے...... وہ اسے نہیں، کسی اور کو اپنی حقیقی اولاد سمجھتا ہو۔"

"بس؟" یاسر نے گہری نظروں سے اسے دیکھ کے پوچھا۔

"ہاں۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور خطرہ تو نہیں ہے، تمہیں نرمین کی ذات سے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر بے فکر رہو، ایسا کچھ نہیں ہوگا، نرمین کبھی ماں نہیں بن سکتی۔"

گل نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس کی قسمت میں یہ سکھ ہے ہی نہیں، بہت علاج کرایا مگر...... وہ......"

اداس نظروں سے یاسر نے گل کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

☆======☆======☆

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک سا گیا۔

نرمین اپنا سوٹ کیس تیار کئے اٹھانے کو تھی۔

"یہ سب کیا ہے نمو؟"

"تیاری......" وہ سکون سے بولی۔

"کس چیز کی؟"

"باعزت رخصتی کی۔"

"نرمین...... تم پاگل تو نہیں ہو گئیں۔"

"میں نے ہمیشہ آپ کو آسانیاں دینے کی کوشش کی ہے، خیال رکھا ہے کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی پریشانی، کوئی تکلیف نہ ہو، اب کیسے آپ کو مشکل میں دیکھ سکتی ہوں۔ آپ خود مجھے جانے کو کہتے...... کتنا مشکل ہوتا آپ کے لئے...... اس لئے میں خود ہی......"

"میں......؟ اور تمہیں جانے کے لئے کہتا......؟ یہ تم نے سوچا بھی کیسے نمو؟"

"گل کی شرط تو یہی ہے۔"

"مگر میں نے مانی تو نہیں۔"

"کب تک نہیں مانیں گے؟"

یاسر کچھ کہتے کہتے رک گیا، نہ جانے کیوں؟

"کبھی تو مانیں گے، جب وہ دوبارہ نظر سے دور جاتی نظر آئے گی تو آپ مانیں گے

یاسر......! ہر شرط مانیں گے۔ سب کچھ مانیں گے کیونکہ زندہ رہنے کے لئے سب کرنا پڑتا ہے اور میں جانتی ہوں گل! آپ کے لئے زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ اس کا آنا زندگی اور جانا موت...... مجھے آپ کی زندگی عزیز ہے۔"

"میری زندگی میں تم بھی شامل ہو نمو۔"

"ہاں......شامل ہوں۔"

وہ یاسیت سے مسکرائی۔

"زندگی میں شامل ہونا اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہونا الگ بات ہے اور زندگی ہونا الگ بات۔"

اس نے دوبارہ سوٹ کیس اٹھایا اور کمرے سے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

"مجھے جانے دیں یاسر......! یہی بہتر ہے ہم سب کے لئے۔" یاسر اس کے پیچھے گھبرا کے لپکا۔

"نمو......رکو......رکو......خدا کے لئے رک جاؤ نمو......"

دونوں لاؤنج کے عین وسط میں ایستادہ گل کو دیکھ کے وہیں رک گئے۔

گل نے باری باری دونوں پہ ایک ایک گہری نظر ڈالی۔

"تو تم نے اسے جانے کے لئے کہہ دیا۔"

"نہیں......میں......"

یاسر بتانے لگا مگر نرمین نے اسے مہلت نہ دی۔

"نہیں......میں خود جا رہی ہوں گل......آپ یہی تو چاہتی ہیں۔"

"نہیں......میں یہ نہیں چاہتی۔"

"یعنی تم نہیں چاہتیں کہ نرمین یہاں سے جائے؟"

یاسر نے خوش فہمیوں میں گھر کے سوال کیا۔

"میں یہ نہیں چاہتی کہ وہ جائے......میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تم اسے جانے کے لئے کہو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم میں صرف مجھے زندگی سے نکالنے کا حوصلہ ہے یا کسی اور کو بھی۔"

یاسر دنگ رہ گیا اور منت سماجت پہ اُتر آیا۔

"ایسا مت کرو گل......میرا بدلہ اس سے مت لو۔"

"کیوں نہیں ہو رہا حوصلہ۔" گل مسکرائی۔

"آپ یاسر کو مشکل میں مت ڈالیں، میں جا رہی ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے آپ کے لئے؟"

نرمین کے پوچھنے پر گل اس کی جانب مڑی۔

"نہیں، یہ کافی نہیں ہے۔ مجھے دیکھنا ہے کہ یاسر میرے لئے کیا کر سکتا ہے۔"

"سب کچھ......" یاسر جلدی سے بولا۔ "سب کچھ کر سکتا ہوں، تمہیں ہر خوشی دے سکتا ہوں، گل۔"

"لیکن نرمین کو دکھ نہیں دے سکتے؟" اس نے طنز سے پوچھا۔

یاسر بے بسی سے سر جھکا کے رہ گیا۔

گل پاس آئی اور اس کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر مسکرائی۔

"تم آج بھی وہیں کھڑے ہو یاسر! میرے اور نرمین کے درمیان......آج بھی تم یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو کہ تمہارے لئے کون ضروری ہے۔ میں یا نرمین؟"

"نہیں گل......ایسا نہیں ہے۔"

"ایسا ہی ہے یاسر......"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں گل!" نرمین نے یاسر کی حمایت کی۔ "یہ صرف آپ سے عشق کرتے ہیں صرف آپ سے۔ میں تو......میں تو بس......" وہ رو پڑی۔

"نہیں نرمین......تم نہیں سمجھ سکیں اسے......یہ عشق مجھ سے کرتا ہے، طلب اسے تمہاری ہے۔ دیوانہ یہ میرے لئے ہے اور چاہ اسے تمہاری ہے اور اب تو اس کی وہ دیوانگی......وہ عشق بھی مرنے والا ہے جو کبھی میرے لئے تھا۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا گل!"

"ایسا ہونے والا ہے یاسر! میں نے ہر سانس کے ساتھ تمہیں چاہا اور یہی بات تمہیں میری جانب کھینچتی تھی۔ میری دیوانگی......میری عبادت......جو سب تمہارے لئے تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے یاسر......میں بٹ چکی ہوں، مجھے میرے بیٹے نے نچوڑ لیا ہے۔ تمہیں شاید ایک قطرہ بھی اپنے لئے نہ ملے تمہارا عشق اس بنجر عورت کو دیکھ کے خود ہی مر جائے گا۔"

اور پھر نرمین کو دیکھنے لگی۔

"لیکن نرمین کے اندر آج بھی تمہاری محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ جو تمہیں چاہئے وہ صرف یہ دے سکتی ہے اور میں یہی سمجھانا چاہتی تھی تمہیں۔"

"کیا مطلب؟" یاسر چونکا۔

"مطلب یہ کہ......میں ایسی کوئی شرط نہ عائد کر رہی ہوں نہ کروں گی۔"

"یعنی......یعنی آپ کو بغیر کسی شرط کے یاسر کا ساتھ منظور ہے......یہی کہنا چاہ رہی ہیں نا آپ۔"

گل کچھ نہ بولی، صرف مسکرا کے رہ گئی۔ نرمین سوٹ کیس رکھ کے آگے بڑھی اور اسے گلے لگا لیا۔ یاسر اب بھی الجھن بھرے عالم میں گل کو دیکھے جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

''شکر ہے، سب ٹھیک ہو گیا۔''

زرمین نے سوٹ کیس سے نکالے کپڑے دوبارہ الماری میں لگاتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

یاسر جو سوچ میں گم تھا، اسے ان نظروں سے دیکھ کے رہ گیا جیسے اس بات پہ سخت اختلاف ہو۔

''اب تو خوش ہو جائیں یاسر...... اب تو آپ کو وہ مل رہا ہے جو آپ چاہتے تھے۔''

''پتا نہیں زرمین...... ملنے والا ہے یا کھونے والا ہے۔ پتا نہیں کیوں میرے دل کو کچھ کھونے کا احساس ہو رہا ہے۔''

''وہم ہے آپ کا۔''

☆======☆======☆

یاسر کا رنگ بدلتا جا رہا تھا پھر وہ خط آنکھوں سے لگا کے رونے لگا۔ زرمین نے آگے بڑھ کر اس سے خط لیا اور پڑھنے لگی۔

''میں جا رہی ہوں یاسر! کیوں؟ یہ تم آج نہیں سمجھ سکتے مگر کل ضرور جان جاؤ گے۔ آج بھی تمہاری محبت میں ہوں مگر ضرورت زرمین ہے۔ ہاں یاسر! تمہیں ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جس پہ تم آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکو۔ میں وہ اعتبار تمہیں آج بھی نہیں دلا سکتی۔ آج بھی تم مجھے دیکھتے ہو تو تمہاری آنکھوں میں کئی سوال ہوتے ہیں، میرے گزرے کل کے بارے میں، میرے بچے کے بارے میں۔ یہ سوال تم زبان تک نہیں لاتے مگر دل سے نکال بھی نہیں سکتے۔ تمہیں زرمین جیسی عورت کا ساتھ سکون دے سکتا ہے، جو تمہارے اندر سوال نہیں جگاتی۔

اور ہاں میں اپنے یاسر کو تمہارے پاس چھوڑے جا رہی ہوں...... نہیں...... کوئی احسان نہیں کر رہی...... نہ تمہارا احسان لے رہی ہوں۔ صرف زرمین کو یہ جتانا چاہتی ہوں کہ صرف اس کا حوصلہ ہی اتنا بڑا نہیں ہے کہ وہ مجھے اپنا یاسر سونپ دے۔ میں بھی اپنا یاسر اسے سونپ سکتی ہوں۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ وہ اسے ماں کی محبت دے گی۔

اور ہاں یاسر! جاتے جاتے تمہارے اس سوال کا جواب...... جو تم کر نہیں پائے۔

میری زندگی میں آنے والے تینوں مردوں نے مجھے کچھ نہ کچھ دیا۔

ٹیپو نے عمر بھر ختم نہ ہونے والا پچھتاوا اور احساسِ جرم۔

تم نے عشق میں فنا ہو جانے کی ہمت دی......

اور صغیر احمد...... صغیر احمد نے مجھے یاسر دیا...... میرا بچہ......''

زرمین نے یہ پڑھتے ہی مڑ کے سوئے ہوئے بچے کو دیکھا اور بھاگ کے اس کے پاس گئی، اس کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے اسے چومنے لگی، بے تحاشا۔

☆======☆======☆

گل مزار کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

اس کی سیاہ چادر مٹی اور گرد سے بھری سیڑھیوں پہ رُلتی خود بھی مٹی مٹی ہو رہی تھی۔

''اور میں خالی ہاتھ ہو کر بھی خالی ہاتھ نہیں ہوں یاسر...... میں ہاری ضرور ہوں مگر صرف تمہارا ساتھ...... تمہیں نہیں ہاری...... میں تمہارے اور زرمین کے درمیان زندہ رہوں گی۔''

''مزے...... آہا...... مزے......''

گل کے پیر ایک دم تھم گئے۔

وہ جھٹکے سے مڑی۔

اس سے چند قدم کے فاصلے پہ سیڑھی پر بیٹھا مجذوب لفافے پہ ذرا ذرا سے چنوں کو انگلی سے چاٹتا سر ہلا ہلا کے کہہ رہا تھا۔

''ٹیپو۔''

وہ تیزی سے نیچے اُتری اور اس کے سامنے جا بیٹھی۔ وہ عمر سے کئی سال آگے لگ رہا تھا۔ بال پہلے سے کئی گنا گھنے، کئی گنا میلے اور الجھے ہوئے۔ ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی، چہرے پہ میل دَر میل جمی جھریاں۔

''اور میں سوچ رہی تھی، اب زندگی میں اور کیا رہ گیا ہے کرنے کو۔ صغیر احمد سے جو لیا تھا وہ اس کی بیٹی کو سود سمیت لوٹا دیا۔ یاسر کی زندگی کا خلا بھی پُر کر دیا۔ یہ بھول گئی کہ ایک اور وجود تھا جو میرے، اندھے عشق کی زد میں آ کے برباد ہوا۔ ابھی اس کے بھی تو قرض اتارنے ہیں۔''

اس نے فیصلہ کن انداز میں ٹیپو کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر سیڑھیاں اُترنے لگی۔

☆======ختم شد======☆